DUE DATE

Cl No. Acc. No.

Late Fine Ordinary books 25 Paise per day Text Book Re. 1/- per day Over Night book Re. 1/- per day.

عالمگیر ہندوستان بھر کے تمام علمی و ادبی معیاری رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

جلد ۳۵ | فہرست مندرجات ماہ اگست ۱۹۴۱ء | نمبر ۳

ملاحظات

زیر نظر اشاعت پر ایک نظر

از:- ادارہ

زیر نظر اشاعت کا افتتاح مولانا ظفر علی خاں کے حقائق و معارف سے ہوتا ہے جن میں بعض تاریخی واقعات پر روشنی ڈالی گئی ہے تاریخ کو سحر کارانہ الفاظ کا جامہ پہنانا مولانا ہی کا حصہ ہے امید ہے قارئین اس سلسلے کو بیحد دلچسپ پائینگے۔ جناب پیر غلام دستگیر نامی نے علامہ اقبال کے وہ تمام اشعار یکجا جمع کر دیئے ہیں جن میں مدینہ منورہ کی زیارت کا اشتیاق ظاہر کیا گیا ہے امید ہے قارئین اس ادبی شراب سے اپنی روحانی پیاس بجھائینگے۔ الحاج مولانا عبد القیوم ندوی نے امام بخاری کے دلچسپ سوانح قلمبند کرکے قارئین کی دلچسپی کے لئے پیش کئے ہیں۔ علم حدیث کو وسیع اور بلند پایہ بنانے میں حضرت امام علیہ الرحمۃ نے جو قابلِ قدر حصہ لیا ہے وہ اہل علم سے پوشیدہ نہیں۔ آپ کے حالات زندگی کا تذکرہ آج کل کے نوجوانوں کے لئے شمع راہ ثابت ہوگا۔ بلوچی ادبیات پر جناب مولائی فیدائی کا ایک مقالہ سالنامہ عالمگیر میں شایع ہو چکا ہے۔ اب آپ نے اسی موضوع پر مزید روشنی ڈالی ہے۔ جس میں بلوچی ادب کے تمام خد و خال نمایاں طور پر نظر آ سکتے ہیں۔

امراء القیس کی شاعری پر تو کافی گفتگو ہو چکی ہے لیکن جناب عبد الرحمن اصلاحی ستیقیمی نے عرب کے اس بے نظیر شاعر کے ذاتی حالات کا تجزیہ کیا ہے۔ "قدیم ہندوستان کی عورت" میں بتایا گیا ہے کہ ہندو راج میں عورت کی معاشری اور تعلیمی حالت کیا تھی اور آج کل کی لڑکیاں ان سے کیا سبق حاصل کر سکتی ہیں؟ امید ہے خواتین ہند اس مختصر مقالہ کے اصلاحی پہلو سے مستفید ہو سکیں گی۔ جناب کمال عظیم آبادی نے عراق کے مشہور رسالہ "المستمع العربی" سے ایک مقالہ کا ترجمہ کرکے دیا ہے۔ غالباً آپ نے ترجمہ میں اختصار سے کام لیا ہے تاہم یہ مضمون اُردو دان طبقہ کو ایک نئے موضوع سے روشناس کرتا ہے۔

افسانے سب کے سب منتخب اور موضوع کے لحاظ سے کافی بلند پایہ ہیں۔ "نئی دنیا" انگریزی کا ایک مشہور ڈراما ہے جس کا ترجمہ جناب اسحٰق الہ آبادی نے نہایت کامیابی سے کیا ہے "آدم خور درخت" جنگل کی ایک خوفناک کہانی ہے اُردو میں صحرائی افسانوں کی کمی خاص طور پر محسوس کی جاتی ہے یہ کہانی اس خلا کو بوجوہ احسن پُر کرتی ہے جناب عبد الواسع عصری کا افسانہ "دولت کی قربانگاہ پر" بامقصد ہے آپ نے ایک اہم معاشری برائی کی طرف توجہ دلائی ہے۔ جناب ابراہیم بھوپالی کا افسانہ "ٹوٹا ہوا آئینہ" بھی طرز بیان کے لحاظ سے خوب ہے۔

منظومات کے حصہ میں نوجوان شعرا کے ساتھ ساتھ کہنہ مشق اساتذہ بھی نظر آتے ہیں۔ حضرت نوح ناروی۔ حضرت ہادی مچھلی شہری۔ حضرت نشور واحدی حضرت ماہر القادری۔ حضرت شرر میرٹھی۔ حضرت مخمور جالندھری اور حضرت وفا ڈبائیوی کا ایک ہی اشاعت میں اجتماع ہوگیا ہے اس لئے ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ اس پرچے میں نظم کا حصہ قابل رشک طور پر بلند ہے۔

[illegible]

ترجمہ کے متعلق مفید ہدایات

از:- ادارہ،

اخبار و افکار

شیخ عنایت اللہ صاحب دہلوی بی۔اے ہندوستان کے ایک کامیاب اور مشاق مترجم ہیں۔ آپ نے شیکسپیر کے اکثر ڈراموں کو اردو زبان کا جامہ پہنا کر دنیائے ادب میں خاص شہرت حاصل کر لی ہے کچھ عرصہ ہوا آپ نے ترجمہ کے متعلق اپنے ذاتی خیالات کا اظہار کیا تھا ان خیالات کو اب ایک مضمون کی صورت میں "معارف" میں شایع کیا گیا ہے۔ ہم ذیل میں اس مضمون کے بعض حصے پیش کرتے ہیں امید ہے ہندوستان کے تمام مترجم شیخ صاحب کے خیالات و افکار سے مستفید ہونگے۔ (ادارہ)

"ترجمہ کا آیڈیل کیا ہونا چاہئے؟

آیڈیل درحقیقت کسی چیز میں کمال کے ایک ذہنی تصور یا نمونے کا نام ہے۔ ذہن مختلف ہیں اس لئے کمال کے نمونے بھی ان میں مختلف ہیں۔ ترجمہ کے آیڈیل کی دو صورتیں میرے ذہن میں ہیں۔

(۱) بعض لوگ بالخصوص یورپ کی درسگاہوں کے تعلیم یافتہ اصحاب ترجمہ کا کمال اس میں سمجھتے ہیں کہ لفظ کی جگہ لفظ ہو بلکہ ایک ہی لفظ کی جگہ ایک ہی لفظ ہو۔ فقروں کی نحوی ترکیب بھی جہاں تک ممکن ہو انگریزی کے مطابق ہو اس میں اردو کے قواعد صرف و نحو سے بھی کہیں کہیں قدم ڈگمگا جائے تو مضائقہ نہیں۔

(۲) دوسرا آیڈیل ترجمہ کا یہ ہے کہ اپنی عبارت میں کسی حال میں بھی ادب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ یہ آیڈیل پہلے آیڈیل کو اپنی زبان کی تخریب و تحقیر کا موجب قرار دیتا ہے۔ اس دوسرے آیڈیل کے ماننے والوں کے نزدیک ایسی کتابوں کے ترجمے کا جو مطلقاً اصطلاحی علوم کی نہیں ہیں بہترین طریقہ یہ ہے کہ انگریزی فقرے کا مفہوم بالکل صحیح طور پر سمجھا جائے اور پھر اس مفہوم کو اپنی زبان میں اس طرح ادا کیا جائے کہ عبارت شروع ہی سے اپنی زبان کی لکھی ہوئی معلوم ہو اور جو ادبی محاسن اصل میں موجود ہیں وہی حتی الامکان اردو ترجمے میں بھی ہوں۔

میرے خیال میں پہلے آیڈیل میں بعض امور کی پابندی سے بالخصوص اصطلاحی علوم میں مثلاً ریاضی، سائنس، قانون وغیرہ میں گریز کرنا عبث ہے۔ دوسرا آیڈیل ایسی کتابوں کے ترجمے میں پیش نظر رکھنا ضروری ہے جن کا ادب سے زیادہ تعلق ہو۔ مثلاً تاریخ۔ جغرافیہ۔ فلسفہ کی بعض شاخیں اور سیرت وغیرہ۔

ترجمہ کے اچھے بُرے ہونے کا اندازہ دو طریقوں سے ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ صرف ترجمہ پڑھتے چلے جایئے۔ اگر مطلب صاف سمجھ میں آ رہا ہے۔ بیان کی خوبی اور قوت دونوں چیزیں عبارت میں موجود ہیں اور اس کا علم بھی ہے کہ ترجمہ پڑھ رہے ہیں تو ایسے ترجمہ کی تعریف بے اختیار زبان سے نکلے گی اور وہ اچھا ترجمہ کہلائے گا۔ اور اگر بیان میں کوئی خوبی نہیں ہے اور عبارت میں بے ربط فقرے۔ غیر مانوس الفاظ۔ کریہہ الصوت جملے۔ حل طلب ترکیبیں ہوں تو ترجمہ خواہ اصل مفہوم سے کتنا ہی قریب ہو خراب ترجمہ سمجھا جائے گا۔

مترجم کا فرض ہے کہ وہ اصل کا صحیح مطلب سمجھ کر اس کو اپنی زبان میں صفائی اور سلاست سے بیان کرے۔ اور جہاں تک ممکن ہو مطلب سے نہ ہٹے اور اپنی زبان کی خوبیوں سے بے پرواہ نہ ہو۔ اس طرز پر ترجمہ کرنے میں بڑی مشکلات ہیں انگریزی سے اردو کے ترجمے میں مترجم کو جو چیز سب سے زیادہ پریشان کرتی ہے وہ انگریزی زبان کے (Adjectives) اور (Adverbs) اور ایک ہی فقرہ میں جملے کے ساتھ جملہ جوڑ کر بہت دور جا کر خبر نکالنے کی مشکل صورتیں ہیں۔ اردو نو عمر اور کم مایہ زبان ہے اس میں اسم و فعل جس قدر قریب ہوگا اسی قدر زبان فصیح ہوگی۔ جس قدر ضمیریں کم آئیں گی۔ اسی قدر مطلب جلد سمجھ میں آئے گا۔ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھنا نہ پڑے گا۔ جدید طرز کی انگریزی میں بھی لمبے فقروں سے پرہیز ہونے لگا ہے۔ لیکن پرانے انشا پردازوں کے ہاں فقروں کا طول قیامت انگیز ہوتا ہے۔ اور اب بھی اگر ضرورت ہو تو کسی سے پرہیز نہیں۔

ایسی صورتوں میں مترجم کا یہ کام ہے کہ وہ فقروں کو اس کے اجزا میں تحلیل کرے پھر اپنے قواعد کے مطابق ان میں سے ہر ایک کو

جوڑ کر یہاں جڑ سکیں، اور چند کو جو نہ جڑ سکیں انھیں مستقل فقرے بنا کر ترجمہ کرنے۔

اس کے علاوہ مترجم کے لئے ایک بات اور نہایت ضروری ہے اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ دو فقروں کا جو یکے بعد دیگرے آئے ہیں صحیح ترجمہ ہو گیا ہے لیکن جو ربط دونوں فقروں میں انگریزی میں ہے وہ ترجمہ میں پیدا نہیں ہوا۔ یہ ترجمہ کا سخت عیب اور مترجم کی نالائقی سمجھی جاتی ہے۔ تھوڑی سی توجہ سے دوسرے فقرے میں لفظوں کے اُلٹ پھیر سے یہ عیب رفع ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ایک پیراگراف کو دوسرے پیراگراف سے جہاں تعلق ہو اپنی زبان میں بھی مربوط و متعلق کرنے میں غفلت نہ کی جائے۔ اور اس خیال کی طرف جس کے سلسلہ میں دوسرا پیراگراف آیا ہے کچھ اشارہ کر کے ترجمہ شروع کیا جائے، یہ زیادتی نہ ہوگی بلکہ ضرورت ہوگی۔ ضمیروں پر بھروسہ نہ کیا جائے۔ اُردو زبان اس کی بہت کم متحمل ہے۔ انگریزی مصنف اپنی زبان پر قادر ہے، مترجم کو بھی وہی قدرت پیدا کرنی ہے، اس سے غفلت نہ کرنی چاہئے مطلب اُس کا ہے۔ زبان اپنی ہے، اس لئے جب تک پورے طور پر مصنف کے ہم خیال نہ بن جائیے گا۔ اس کے مفہوم کو بیان کرنے سے قاصر رہئیے گا۔ ترجمہ میں محنت سے جی چرانا اور بے پروائی کرنا گناہ ہے۔

تھوڑی سی ذہانت اور جرأت سے ترجمہ کے بہت سے عیب رفع ہو سکتے ہیں۔ یہ جرأت مطالعہ سے پیدا ہوتی ہے۔ خواہ آپ کیسے ہی ماہر فن ہوں مگر کسی خاص کتاب کا ترجمہ شروع کرنے سے پہلے اس کے مضمون سے ضرور طبیعت کو آشنا کر لیجئے۔ اس مضمون پر اُردو کتابیں کبھی مشکل اور کبھی آسان مل جائینگی۔ ضرورت اس کی ہوگی کہ بہت سا وقت ان کے مطالعہ میں صرف کیجئے۔ جب مضمون سے آپ مانوس ہو جائیں گے اور اس پر قدرت ہو جائیگی تو پھر ترجمہ کے وقت مصنف کے مُنہ سے بات نکلتے ہی آپ سمجھ جائینگے کہ آگے کیا کہنا چاہتا ہے اس وقت آپ کو ترجمہ کرنا آسان ہو جائے گا اور جو کچھ لکھئے گا اس میں صحت، روانی اور بے تکلفی پیدا ہو جائیگی۔ کسی کتاب کا ترجمہ تاوقتیکہ اس موضوع پر اور دوسری کتابیں پڑھ کر تھوڑی بہت قدرت حاصل نہ کر لیں ہرگز شروع نہ کیجئے۔ مطالعہ اور مطالعہ ہی زیادہ اچھا ترجمہ کرنے کے لئے ضروری شرط ہے۔

تاریخ کے ترجمے کا مجھے کسی قدر تجربہ ہے، اس کی نسبت یہ عرض ہے کہ جس ملک کی تاریخ کا ترجمہ کیجئے جب تک اس کا جغرافیہ اور جغرافی نقشہ سامنے نہ رکھ لیجئے ترجمہ شروع نہ کیجئے۔

ڈکشنری دیکھنے سے کبھی دل نہ چرائیے۔ یہ بہت بڑی خطا ہے ڈکشنری وہیں بکار آمد نہیں ہوتی جہاں لفظ کے معنی نہ معلوم ہوں بلکہ اچھے لفظ کی تلاش میں بار بار نا امید ہونے کے بعد بھی اسے دیکھنا پڑتا ہے۔ انگریزی سے اُردو ترجمہ کرنے میں ذیل کی کتابوں کو دیکھنا لازمی ہے۔

۱۔ ڈکشنری انگریزی سے انگریزی میں تاکہ انگریزی لفظ کے تمام معنوں پر عبور ہو جائے۔

۲۔ ڈکشنری انگریزی سے اُردو میں تاکہ اُردو لفظ معلوم ہو۔

۳۔ انگریزی سے فارسی اور عربی کی لغت تاکہ اُردو ڈکشنری میں جو فارسی یا عربی لفظ آئے ہیں اور کام کے نہیں معلوم ہوتے ان کے فارسی یا عربی مترادف الفاظ دیکھے جائیں۔ ممکن ہے کوئی لفظ ڈھنگ کا مل جائے۔ فارسی اور عربی لغات سے اس بارے میں اچھی مدد مل سکتی ہے

۴۔ تلمیحات کی ڈکشنریاں، قصص اسنام۔ جو لغت کی صورت میں لکھے گئے ہیں، بیوگرافیکل ڈکشنریاں، تاکہ تاریخی لوگوں اور مشاہیر کے حالات معلوم ہو سکیں۔

۵۔ انسائیکلوپیڈیا جس سے نمبر ۳ کے بہت سے عقدے حل ہوتے ہیں مگر سب نہیں۔

۶۔ اٹیلس نئے اور پرانے مشہور شہروں کے خاکے اگر کسی پرانے شہر کا ذکر آیا ہے۔

۷۔ مشہور تعمیروں کا اگر ذکر آیا ہے تو ان کی تصویریں جہاں کہیں ملیں ضرور دیکھیئے۔ انگریزی مصنف تاریخوں میں بہت کچھ نقشوں اور تصویروں کی مدد سے عبارتیں اس طرح لکھ جاتے ہیں کہ اصل صورت سامنے آجاتی ہے پھر جس قدر محنت مصنف نے کی ہے مترجم کو چاہئے کہ اتنی ہی زحمت خود بھی گوارا کرے۔

ترجمہ کرنے کے بعد اس کو پڑھئے جن کو زیادہ اصلاح منظور ہوتی ہے وہ اکثر کمرہ بند کر کے زور زور سے پڑھتے ہیں، پڑھنے میں جہاں زبان اٹکتی ہے، سمجھ لیتے ہیں کہ خامی ہے، اس پھانس کو نکالنے کی کوشش کرتے ہیں، میرے ایک معزز استاد نے ایک مرتبہ نصیحت کی تھی کہ فقرے کی آواز درست کر لوگے تو مطلب بھی درست ہو جائے گا۔

مترجم شکریہ کا مستحق نہ ہو۔ لیکن اگر دنیا میں مترجم نہ ہوتا تو روئے زمین پر علم کی جھیلیں اور دریا تو بہتیرے ہوتے مگر ان کو ملا کر علم کا بحر ناپیدا کنار بنانے والا کوئی نہ ہوتا۔

تحقیق و تصحیح

مَعرکہ آرا۔ مَعرکتہُ الآرا۔ مَعرکۂ آرا :۔

گزشتہ اشاعت میں معرکہ آرا اور معرکتہ الآرا کے محلِ استعمال پر مختصر سی گفتگو کی گئی تھی لیکن یہ اس مسئلہ کا اجمالی پہلو تھا۔ اس لئے ممکن ہے کہ بعض قارئین کو تفہیم مطلب میں ابہام و غلط فہمی کا سامنا ہو در اصل بات یہ ہے کہ معرکہ آرا اور معرکتہ الآرا دو علیحدہ علیحدہ الفاظ ہیں اور ان کا محلِ استعمال بھی مختلف ہے۔ اگر "معرکتہُ الآرا" کو آرا کی جنگ کے معنی میں استعمال کیا جائے تو صحیح ہوگا کیونکہ عربی میں "مَعرکہ" جنگگاہ کو کہتے ہیں اور "آرا" رائے کی جمع ہے۔ ان دونوں لفظوں کو عربی اضافت کے ساتھ مشترک کیا گیا ہے۔ مثلاً یہ مسئلہ بڑا معرکتہُ الآرا ہے۔ یعنی اس مسئلے کے متعلق مختلف رائیں لڑ رہی ہیں۔ اگر اس کا فارسی مرادف بنایا جائے تو وہ "مَعرکۂ آرا" ہوگا۔ لیکن دونوں لفظ چونکہ عربی کے ہیں اس لئے "معرکتہُ الارا" زیادہ صحیح ہوگا۔ باقی رہا "معرکہ آرا" تو اس کے معنی ہیں "میدان جنگ کو سجانا"۔ مثلاً روس و جرمنی آج کل معرکہ آرا ہیں۔

غور طلب امر یہ ہے کہ "معرکہ آرا" اور "معرکۂ آرا" دونوں مشابہ نظر آتے ہیں صرف ہمزے کا فرق ہے لیکن معنی و مفہوم کے اعتبار سے دونوں میں بعد المشرقین ہے۔ معرکۂ آرا کا مطلب یہ ہے کہ فکر و نظر میں جنگ ہو رہی ہے اور معرکہ آرا کے معنی عام جنگ کے ہیں۔ الغرض معرکہ آرا اور معرکتہُ الارا دو علیحدہ علیحدہ تراکیب ہیں البتہ "معرکۂ آرا" فارسی کی ترکیب ہے جو "معرکتہُ الارا" کے ہم معنی ہے۔

درمیانی

"درمیانی" کوئی لفظ نہیں ہے اس کی بجائے "درمیانہ" استعمال کرنا چاہیے۔ مثلاً وہ درمیانہ کمرے میں بیٹھا تھا۔

خاطر و مدارات

یہ ترکیب غلط ہے کیونکہ مدارات فارسی لفظ ہے اور خاطر (یعنی تواضع) ہندی۔ البتہ "خاطر مدارات" (یعنی بغیر واؤ کے) صحیح ہے۔

غلط الفاظ

از۔ شبلی بی۔ کام

چیخ و پکار

"چیخ و پکار" غلط ہے "چیخ پکار" یعنی بغیر حرف عطف کے استعمال کرنا چاہیے۔

برائے مہربانی

"برائے" اسم فعل کے ساتھ آتا ہے۔ اگر "برائے مہربانی" یا "برائے کرم" لکھا جائے تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ مہربانی یا کرم کوئی ہستی ہے جس کا واسطہ دیا جا رہا ہے۔ اس لئے "براہ مہربانی" یا "براہ کرم" لکھنا چاہیئے۔ "از راہ کرم" بھی صحیح ہے۔ اگر "خدا کے واسطے" کہنا ہو تو "از برائے خدا" یا "برائے خدا" کی ترکیب استعمال کرنا چاہیئے۔

بمع

"مع" کے معنی بھی ساتھ کے ہیں اور "ب" کے معنی بھی ساتھ کے ہیں اس لئے ان دونوں کو جمع کر دینا سخت غلطی ہے صرف "مع" لکھنا چاہیئے۔ مثلاً ـــ "وہ مع اپنے ساز و سامان کے لاہور سے چلا گیا"۔

مترجم

یہ لفظ "مُتَرجِّم" نہیں ہے۔ بلکہ "مُتَرجِم" ہے۔ جس کے معنی ہیں ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنے والا۔ "مُتَرَجَّم"۔ "رَجْم" سے ہے جس کے معنی سنگسار کرنا ہے۔

دولو اور دونوں

ان دونوں لفظوں میں فرق ہے۔ "دونو" صرف جمع مخاطب کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً "تم دونو وہاں جاؤ"۔ جمع متکلم اور جمع غائب کے لئے "دونوں" استعمال کرنا چاہیئے۔ مثلاً "وہ دونوں لاہور گئے" یا "ہم دونوں آج یہیں رہیں گے"۔

دار الخلافہ

دار الخلافہ صرف خلافت کے زمانہ میں دار السلطنت کو کہتے تھے موجودہ زمانہ میں "دار الحکومت"، "پائے تخت"۔ یا "دار السلطنت" استعمال کرنا چاہیئے۔ اس سلسلے میں یاد رکھنا چاہیئے کہ صحیح لفظ "پایہ تخت" نہیں بلکہ "پائے تخت" ہے جیسے رشک ؎

پائے تخت شہان حسن ہے دل۔

حقائق و معارف

تاریخی جواہر ریزے

از ― مولانا ظفر علی خاں۔

دیوجانس کی گرفتاری

رومانس دیوجانس کی گرفتاری کا واقعہ تاریخ کے عبرت انگیز عجائبات میں سے ہے۔ ابن اثیر نے لکھا ہے کہ الپ ارسلان کے دربار کے ایک امیر سعد الدین گوہر آئین کے پاس ایک غلام تھا جو ایسا کم رُو اور کم حیثیت تھا کہ جب اسلامی فوجیں آرمینیا کی طرف روانہ ہونے لگیں تو صدر اعظم نظام الملک کو اسے فوج کے ہمراہ بھیجنے میں تامل تھا۔ غلام کو اصرار تھا کہ میں ضرور لشکر کے ساتھ جاؤنگا اور گوہر آئین کی بھی سفارش تھی کہ اسے جانے دیا جائے۔ اس پر نظام الملک نے مزاحاً کہا کہ کیا یہ ایسا ہی بڑا تیس مار خاں ہے کہ قیصر روم کو گرفتار کرکے ہمارے پاس لائیگا؟ بہرحال گوہر آئین کی سفارش منظور کرلی گئی اور نظام الملک کے مُنہ سے جو بات بطور مزاح کے نکلی تھی تقدیر نے اسے پورا کر دیا۔ جب بازنطینی فوج شکست کھا کر اور اپنے شہنشاہ کو میدان جنگ میں اکیلا چھوڑ کر فرار ہوئی تو اسی غلام نے رومانس کو گرفتار کرکے الپ ارسلان کے حضور میں پیش کیا۔

الپ ارسلان کی حکومت

سلطان الپ ارسلان ۱۰۲۹ء میں پیدا ہوا۔ اور اپنے چچا طغرل کی وفات پر سریر آرائے سلطنت ہوکر نو سال کی قلیل مگر شاندار فرمانروائی کے بعد ۱۰۷۲ء میں جبکہ اس کی عمر ابھی ۴۴ ہی برس کی تھی رہگرائے عالم باقی ہوا۔ خراسان اسے اپنے باپ چغری بیگ داؤد سے ترکہ میں ملا تھا۔ طغرل کی وفات نے وسطی اور مغربی ایشیا میں اس کا سکہ بٹھا دیا۔ سارا ترکستان۔ سارا ایران۔ سارا عرب اور سارا ایشیائے کوچک اس کے زیر نگین ہو گیا اور اس کے انصاف اور فیاضی اور سخاوت نے اس وسیع مملکت کے گوشہ گوشہ کو خدا کی رحمتوں اور برکتوں کا مورد و مہبط بنا دیا۔ ایک بھی شخص اتنے بڑے علاقے میں محتاج نظر نہ آتا تھا۔ ہر حاجتمند اور مستحق شخص کے لئے بلحاظ حیثیت و مرتبہ سلطنت کی طرف سے وظائف مقرر تھے نظام سلطنت ہر طرح سے کامل و مکمل تھا۔ انصاف کا دور دورہ تھا۔ عدل کی گرم بازاری تھی۔ ارتشا اور استحصال بالجبر کے تمام دروازے بند کر دیئے گئے تھے ظلم کو کہیں سر چھپانے کی بھی جگہ نہ ملتی تھی۔

الپ ارسلان کی موت

سکندر کی طرح الپ ارسلان نے عین عالم شباب میں انتقال کیا۔ جن سعادت فرجام الفاظ پر اس کا خاتمہ ہوا کاش اس کا ایک حرف مقدونی تاجدار کی ساعت احتضار کے حصہ میں آیا ہوتا۔

رومانس کو شکست دینے کے بعد الپ ارسلان ۱۰۷۲ء میں دو لاکھ کا لشکر لے کر ایک تادیبی مہم پر بجانب ترکستان روانہ ہوا جب دریائے جیحون کے کنارے پہنچا تو ایک سرکش امیر یوسف خوارزمی جس نے قلعہ بند ہوکر سلطانی افواج کا مدتوں مقابلہ کیا تھا اس کے مواجہ میں لایا گیا۔ الپ ارسلان نے اسے واجب القتل سمجھ کر حکم دیا کہ اس کی گردن ماری جائے۔ یوسف خوارزمی نے بمصداق "ہرکہ دست از جاں بشوید ہرکہ در دل آید بگوید" سلطان پر مغلظات کا یوں کا جھاڑ باندھ دیا۔ سلطان کو غصہ آگیا اور اس نے ان سرداروں کو جنہوں نے قیدی کی مشکیں باندھ رکھی تھیں حکم دیا کہ اسے چھوڑ دیا جائے میں خود اسے قتل کرونگا۔ یہ کہہ کر کمان میں تیر جوڑا لیکن ادھر سے پیکان قضا خود اس کی طرف چھوٹ چکا تھا۔ الپ ارسلان کا نشانہ عمر بھر خطا نہ ہوا تھا۔ یہ پہلی اور آخری کوشش تھی کہ تیر نشانہ پر نہ بیٹھا۔ قیدی جو اس وقت آزاد تھا۔ آستین میں سے ایک چھپا ہوا دشنہ نکال کر الپ ارسلان پر جھپٹا۔ اور اس سے پہلے کہ حاضرین میں سے کوئی بیچ بچاؤ کرتا اس کے سینے میں گھونپ دیا۔ گوہر آئین نے جو پاس ہی کھڑا تھا بیچ میں پڑنے کی کوشش کی اور قاتل کے ہاتھ سے جس کا فوراً ہی گرزوں سے کچومر نکال دیا گیا۔ کئی زخم بھی کھائے لیکن الپ ارسلان کو زخم کاری لگ چکا تھا۔ دوسرے دن اس کی پاک اور سعید روح جسم سے پرواز کر گئی۔ ابن اثیر نے اس کے آخری الفاظ ہم تک پہنچائے ہیں۔ جن کو پڑھ کر دنیا کی بے ثباتی

کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے اور بے اختیار زبان پر وهو القاهر فوق عباده کے آسمانی الفاظ جاری ہو جاتے ہیں۔ وہاں اس اس بات کا معترف ہونا پڑتا ہے کہ الپ ارسلان کتنا بڑا اور کیسا برگزیدہ انسان تھا۔ وہ الفاظ یہ ہیں۔

"میں نے خداوند جل وعلا سے بعجز والحاح مدد مانگے بغیر کبھی کسی ملک پر چڑھائی نہ کی تھی۔ اور کسی دشمن پر حملہ آور نہ ہوا تھا لیکن کل جب میں سلطان ایک پہاڑی پر کھڑے ہو کر اپنے فشون قاہرہ کی کثرت پر نظر ڈالی جن کے قدموں کی دھمک سے زمین متزلزل ہو رہی تھی تو میں نے جی میں کہا کہ میں دنیا کا شہنشاہ ہوں مجھ پر کوئی غالب نہیں!

آسکتا اس پر خدائے بزرگ و برتر کی غیرت کو حرکت ہوئی اور مجھے اس کے ضعیف ترین بندہ کے ہاتھوں پست و زبون ہونا پڑا میں صدق دل سے توبہ کرتا ہوں اور خدائے پاک سے اپنے اس گنہگارانہ خیال کی معافی مانگتا ہوں۔"

ایشیا کے کہسار کا یہ شیر جس کی گونج سے آدھی دنیا کے دل ہل گئے تھے آج مرو کی خاک میں خاموش سو یا پڑا ہے اور اس کے مقبرہ کا یہ کتبہ ہمیں بتا رہا ہے کہ خدا کی قدرت آسمان کو بھی زمین بنا دیا کرتی ہے۔

سر الپ ارسلاں دیدی ز رفعت رفتہ بر گردوں
بہ مرو آتا بخاک اندر سر الپ ارسلاں بینی!

کشتئ بحرِ محبّت

ہمیں بھی یاد ہے اک واقعہ اپنی محبّت کا

از حضرت نوحؔ ناروی

یہ باعث تھا ہماری گو مگو تقریرِ حسرت کا — وہ معنی پُوچھ کر مطلب بھی کچھ پُوچھیں محبّت کا

وہ فرماتے ہیں یہ بھی اک طریقہ ہے شکایت کا — محبت سے نہیں سنتے فسانہ بھی محبّت کا

اُنھیں اغماضِ حسرت ہے مجھے ارمان حسرت کا — یہ صُورت ہے یہ عالم ہے محبّت کی محبّت کا

وہ دیکھیں مہرباں ہو کر تماشا میری وحشت کا — یہ ہے بازی گری قسمت کی کرتب ہے محبّت کا

تعجب کیا جو وہ پہنچے ہمارے خانۂ دل تک — کہ آنکھوں میں سما کر مل گیا رستہ محبّت کا

خدا جانے خدا کے سامنے کیا بحث چھڑ جائے — شہادت رنج و غم کی اور دعوٰی بھی محبّت کا

کرینگے احترامِ شوق میرا حُسن والے بھی — بھکاری ہوں تمنّا کا پُجاری ہوں محبّت کا

اسی سے حُسن کی شہرت ہوئی سارے زمانے میں — مرے دل کو سمجھ لو اشتہار اپنی محبّت کا

مری کم مائگی پر معترض کیوں آپ ہوتے ہیں — جو داغِ دل ہے وہ بھی ایک سکّہ ہے محبّت کا

ازل ہی سے مری تقدیر میں تھا داغ ناکامی — سرِ لوحِ جبیں لکھا گیا طغرا محبّت کا

کہانی غم کی تم سنتے ہو سب تم کو سناتے ہیں — ہمیں بھی یاد ہے اک واقعہ اپنی محبّت کا

بالآخر کثرتِ مشکل نے مشکل میری آساں کی — جہاں سے اُٹھ گیا صدمہ اُٹھا کر میں محبّت کا

سرِ دربار شاید وہ مرا بھی مدّعا سُن لیں — کوئی کہدے کہ حاضر ہے نمائندہ محبّت کا

جنابِ نوحؔ بھی طوفانِ غم میں دل ڈبو بیٹھے — خدا ہے ناخدا اب "کشتئ بحرِ محبّت" کا

سوئے شہرے کہ بطحا در رہِ اوست

زیارت مدینہ اور علامہ اقبالؒ

از جناب پیر غلام دستگیر نامی

"ارمغانِ حجاز" کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال مرحوم کو مدینہ منورہ تشریف لے جانے اور حضور سرورِ کونین کو "حالِ زارِ اُمت" سنانے کی کتنی آرزو تھی۔ کتاب مذکور میں "حضورِ حق" کے تحت عنوان آخری بند میں آپ نے بتا دیا ہے کہ میں بوجہ کمزوری بدن رہ گیا ہوں۔ ہاں جان دیارِ حبیبؐ کے لئے سرگرمِ تگ و دو ہے۔ یا اللہ تجھے تیرے خواص مبارک، مجھے تو تیرے حبیبؐ ہی کی چاہ ہے۔

وہ بند ملاحظہ ہو:

سوئے شہرے کہ بطحا در رہِ اوست — بدن واماند و جانم در تگ و پوست
گر من دارم ہوائے منزلِ دوست — تو باش اینجا و با خاصاں بیامیز

زیارت رسولؐ کے لئے دل کی بیتابی کا اظہار اقبال سے پہلے مولانا جامیؒ فرما چکے ہیں۔ دونوں کا مقصد ایک ہی ہے مگر اندازِ ادا مختلف ہے قارئین دونوں کے انداز عاشقانہ ملاحظہ فرما کر حظ اٹھائیں۔

محمل رحلت بہ بند اے ساربان کز شوقِ یار — می کشد ہردم برویم قطرہ ہائے خوں قطار
زود ترا آہنگ رہ کن کارزوئے او مرا — بردہ است از سینہ صبر از دیدہ خواب از دل قرار
قطع این وادی بترکِ اختیارِ خود تواں — می نہم در قبضۂ حکمت زمامِ اختیار
اشترِ مستم کہ بیخودی روم در راہِ او — نیست در بینی مرا جز رشتۂ مہرش مہار
پائے کوباں می برد شوقِ جمالِ او مرا — زیرِ پایم چوں حریر و گل بود خارا و خار
ہر کسے بر ناقہ بہر تحفۂ بارے می نہد — بارِ من فاقہ است و من بے تحفہ ہستم زیر بار
ہر نشانِ پا کہ می بینم ز ناقہ در رہش — می نماید چہرۂ مقصود در آئینہ وار
محملِ امشب دیر می جنبد حدی آغاز کن
بے نوایاں را نوائے دیگر از نو ساز کن

یک طرف بانگِ حدی یک جانب آوازِ درا — از گراں جانی بود آں راکہ ماند دل بجا
ناقہ چوں ذکرِ حبیبؐ و منزلِ او بشنود — گرچہ باشد در گرانی کوہ گردد بادپا
لیلی اندر حجلہ چو محمل کشاد گوئے پیرہن — کز نسیمِ نجد می آید شمیمِ جانفزا
حالِ مجنوں فرود از بوئے جاں افزائے نجد — سوئے نجوم اے صبا بہرِ خدا راہے نما
منزلِ جاناں و کاں لطف و احساں آں ستجد — آبِ او خوش خاکِ او دلکش ہوائش دلکشا
لالہ صحرائے او بر چہرۂ گل داغ نہ — سبزۂ اطلال او چوں سنبلِ مشک سا

در بیاباں رم کنیم نجد را ما ولئے خویش — گر نیابم دایۂ خود دوائے من صدبار دائے
نجد می گویم و زاں قصدم زمین یثرب است
کافتاب جود و خورشید کرم را مغرب است

مفہوم اشعار۔ اے دیارِ محبوب تک پہنچانے والے ساربان جلدی سفر کی تیاری کر کیونکہ محبوب کے شوق دیدار میں میرا خون دل آنکھوں کی راہ قطار باندھے بہ رہا ہے۔ منزل مقصود کی طرف گامزن ہونے میں دیر نہ کر کیونکہ محبوب کی آرزوئے دید نے میرا صبر و قرار اور خواب و خور حرام کر دیا ہے۔ میں بے اختیار ہو گیا ہوں مجھے کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ ناچار اے ساربان! اپنے اختیار کی باگ تیرے قبضۂ حکم میں دیتا ہوں کہ جلد مجھے منزلِ جاناں تک پہنچا دے۔ میں تو ایک مست اونٹ کی طرح یار کی راہ میں بے خود چل رہا ہوں۔ میری ناک میں دلدار کی محبت کی مہار ہے جس سے میں اسی طرف کھنچا جا رہا ہوں۔ اس کے جمال جہاں آرائے کی دید کا شوق مجھے حالتِ رقص میں لے جا رہا ہے اب اگر میرے پاؤں کے نیچے سخت پتھر آتا ہے تو مجھے ریشم کی طرح معلوم ہوتا ہے اور کانٹا پھول سا لگتا ہے۔ ہر شخص جو یار سے ملنے جاتا ہے ناقہ پر کوئی نہ کوئی تحفہ بار کر لیتا ہے۔ اور میں نقر و فاقہ کے تحفہ سے لدا ہوا چلا جا رہا ہوں محبوب کی راہ میں ناقہ کے ہر نشان پا سے مجھے چہرۂ مقصود صاف آئینہ دار دکھائی دیتا ہے۔ اے ساربان محمل کی تیز روی میں فرق آ گیا ہے۔ حدی شروع کر دے اور مجھ جیسے بے نواؤں کے لئے از سرِ نو نغمہ ریز ہو جا۔

وہ سنو! ادھر حدی خواں نے حدی اور ادھر اونٹوں کے تیز چلنے سے جرس نے نغمہ زنی شروع کر دی۔ اب ایسی لوگوں کا دل قابو میں رہ سکتا ہے جو سنگدل ہوں۔ ہم تو دیوانوں میں ہیں ہم حدی خوانی سے کیوں نہ شیفتہ ہوں۔ ناقہ کا یہ حال ہے کہ جب اس کے کان میں حبیبؐ اور دیارِ حبیبؐ کی آواز پڑتی ہے تو خواہ اس پر بوجھ کا پہاڑ پڑا ہو وہ ایسا سبک خرام ہو جاتا ہے کہ گویا اس پر بوجھ ہے ہی نہیں۔ یہ جو (نجد) یثرب کی طرف سے روح پرور ہوا آ رہی ہے یہ پتہ دیتی ہے کہ لیلی یثرب (محبوب رب العالمینؐ) نے مشتاقانِ دیدار کے لئے پھول کی طرح اپنا

پیراہن کھول دیا ہے۔ یثرب کی روح افزا خوشبو نے میرے حال اور وجد کو بڑھا دیا ہے۔ اے صبا! جلد اس طرف میری رہنمائی کر۔ یثرب وہ مقام ہے جو ہمارے محبوب کی منزل اور لطف و احسان کی کان ہے جس کا پانی خوش ذائقہ جس کی خاک دلکش اور ہوا دلکشا ہے۔ جس کے صحرا کا لالہ گلاب کے چہرے پر داغ رکھنے والا اور جس کے ٹیلوں کا سبزہ سنبل کے گھنگھریالے بالوں پر رشک ملنے والا ہے۔ میری مراد یہ ہے کہ میں یثرب کو جائے پناہ بناؤں۔ اگر میں اس مقصد میں کامیاب نہ ہوا تو مجھ پر صد افسوس ہے۔ میرا انجد یثرب ہے جو سخاوت کا مہر منیر اور خورشید کرم کا منتہیٰ ہے۔

مولانا جامی کا ایک اور عاشقانہ بند ہے چونکہ اقبال نے اس مضمون کو نہیں لیا اس لئے میں اسے نقل نہیں کرتا۔ اب اقبال کا اشتیاق ملاحظہ ہو جس کے سفر سے ہم شروع کرتے ہیں ؎

۱۔ الا اے خیمگی خیمہ فرو ہل ‎ ‎ کہ پیش آہنگ بیروں شد ز منزل
خرد از راندن محمل فرو ماند ‎ ‎ زمام خویش دادم در کف دل

۲۔ بپرس از کاروان جلوہ مستاں ‎ ‎ ز اسباب جہاں بگسستہ دستاں
بجان شاں ز آواز جرس شور ‎ ‎ چو از موج نسیمے در نیستاں

۳۔ سحر با ناقہ گفتم نرم تر رو ‎ ‎ کہ راکب خستہ و بیمار و پیر است
قدم مستانہ زد چنداں کہ گوئی ‎ ‎ بپایش ریگ ایں صحرا حریر است

۴۔ مہار اے سارباں او را نشاید ‎ ‎ کہ جان او چو جان ما بصیر است
من از موج خرامش می شناسم ‎ ‎ چو من اندر طلسم دل اسیر است

۵۔ نم اشک است در چشم سیاہش ‎ ‎ دلم سوزد ز آہ صبحگاہش
ہماں مے کو ضمیرم را برافروخت ‎ ‎ پیاپے ریزد از موج نگاہش

۶۔ چہ خوش صحرا کہ در وے کارواں ہا ‎ ‎ درودے خواند و محمل براند
بہ ریگ گرم او آور سجودے ‎ ‎ جبیں را سوز تا داغے بماند

۷۔ چہ خوش صحرا کہ شامش صبح خند است ‎ ‎ شبش کوتاہ و روز او بلند است
قدم اے راہرو آہستہ تر نہ ‎ ‎ چو ما ہر ذرۂ او دردمند است

۸۔ غم راہی نشاط آمیز تر کن ‎ ‎ فغانش را جنوں انگیز تر کن
بگیر اے سارباں راہ درازے ‎ ‎ مرا سوز جدائی تیز تر کن

۹۔ بیا اے ہمنفس باہم بنالیم ‎ ‎ من و تو کشتۂ شان جمالیم
دو حرفے بر مراد دل بگوئیم ‎ ‎ بپائے خواجہ چشماں را بمالیم

۱۰۔ مسلماں آں فقیر کج کلاہے ‎ ‎ رمید از سینۂ او سوز آہے
دلش نالد چرا نالد؟ نداند ‎ ‎ نگاہے یا رسول اللہ نگاہے

ترجمہ اشعار اقبال (۱) ہاں اے خیمہ نشین! خیمہ سے نکل کر باہر چل کیونکہ رہنمائے قافلہ منزل سے باہر نکل چکا ہے۔ عقل محمل چلانے سے رہ گئی ہے اس لئے میں نے اپنی باگ دل کے ہاتھ میں دے دی ہے۔

(۲) جلوہ مست قافلہ والوں کی بابت پوچھتے ہو؟ وہ تو اسباب جہاں سے دل ہٹا چکے ہیں۔ آواز جرس کے شور سے ان کی جان پر ایسا ہی اثر ہوتا ہے جیسے موج نسیم سے نیستان پر۔

(۳) صبح میں نے ناقہ سے کہا کہ آہستہ چل کیونکہ تیرا سوار خستہ و بیمار اور بوڑھا ہے مگر یہ ان کر وہ اور مستانہ قدم مارنے لگا گویا اس کے پاؤں کے نیچے ریت نہیں ریشم ہے۔

(۴) اے ساربان! اس ناقہ کی ناک سے مہار اتار دے کیونکہ وہ میری طرح ذی بصیرت ہے۔ میں اس کی مستانہ چال سے سمجھ گیا ہوں کہ وہ ویسا ہی طلسم عشق میں اسیر ہے جیسا کہ میں ہوں۔

(۵) اس کی سیاہ آنکھ آنسوؤں سے تر ہے۔ اس کی آہ صبحگاہی سے میرا دل پرسوز ہے۔ جس شراب عشق نے میرا دل روشن کیا ہوا ہے۔ وہی ہر دم اس کی موج نگاہ سے ٹپک رہی ہے۔

(۶) مدینے کی راہ میں جو صحرا ہے وہ کیسا عجیب ہے کہ اس میں قافلے والے درود پڑھتے ہوئے محمل چلاتے ہیں اے زائر تو اس کی گرم ریت پر سجدہ کر کے پیشانی کو تاب دے تاکہ اس پر نشان (داغ) رہ جائے۔

(۷) یہ صحرا کیا ہی عمدہ ہے کہ اس کی شام سے صبح کی بہار پیدا ہے رات چھوٹی اور دن بڑا ہے۔ اے مسافر یہاں نرمی سے قدم رکھ! کیونکہ میری طرح اس کا ہر ذرہ دردمند ہے۔

۸۔ اے ساربان! مسافر کے غم کو زیادہ مسرت آمیز بنا دے اور اس کی فغان کو زیادہ جنون انگیز کر دے۔ دور دراز راستہ اختیار کر تاکہ میرا سوز جدائی اور تیز ہو جائے۔

(۹) اے رفیق! آکہ مل کر آہ وزاری کریں کیونکہ ہم دونوں شاہدِ گل کے کشتے ہیں ہماری جو دلی مراد ہے وہ کہہ ڈالیں اور وہ یہ کہ ہم حضور سرورِ کائنات کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کے قدموں پر اپنی آنکھیں ملیں۔

(۱۰) ٹیڑھی ٹوپی والے مسلمان فقیر کو دیکھئے کہ خود بخود اس کے سینے سے آہ نکل رہی ہے اس کا دل رو رہا ہے۔ کیوں رو رہا ہے؟ اسے خود معلوم نہیں۔ یا رسول اللہ اس کی طرف نگاہ کرم کیجئے اور ضرور کیجئے۔

مولانا جامی اور علامہ اقبال کے اشعار سوزِ عشق اور درد و اشتیاق کا آئینہ ہیں۔ ایک اپنی آتشِ فراق کو آبِ وصالِ محبوب ذوالجلال سے جلد بجھانا چاہتا ہے اور ساربان سے تیز خرامی کی سفارش کرتا ہے اور دوسرا اس سوز کو تا دیر قائم رکھنے کی غرض سے آہستہ خرامی کی آرزو کرتا ہے مگر اقبال کا اونٹ جامی سے سبق یافتہ ہے وہ اور تیز گام ہو جاتا ہے اور اسے زیرِ پا خار و خارا حریر و گل نظر آتے ہیں۔

مولانا جامی نے اشتیاق زیارت کے اظہار میں قلم توڑ دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ حضور کی خوابگاہ زمین پر موجود ہے اگر حضرت عیسیٰ کی طرح حضور آسمان پر تشریف فرما ہوتے تو ہمارے لئے فرض ہو جاتا کہ وہاں تک پہنچنے کے لئے نردبان کی تلاش میں عمر بسر کر دیں۔ پس حیف ہے کہ ہم اس کے گرد طواف کی سعادت سے محروم رہیں اور سلام نہ پڑھیں۔ اس کے بعد آپ سلام پڑھتے ہیں اور بار بار پڑھتے ہیں۔ آخر میں فرماتے ہیں کہ ؎

صد سلامت می فرستم بر تو اے فخرِ کرام
بو کہ آید یک علیکم در جواب صد سلام

یعنی میرے سو سلام کے جواب میں اگر حضور ایک دفعہ وعلیکم السلام فرما دیں تو میری مرادیں حاصل ہو جائیں۔

اقبال مرحوم حضور حبیب خدا مسلمانوں کی بے حسی۔ تباہ حالی، خوف مرگ اور ناخودداری کا شکوہ کرتے ہوئے التجا کرتے ہیں کہ آپ نے جو فقر صدیق اکبرؓ کو عطا فرمایا تھا ان کو بھی عطا کریں تاکہ یہ آسودہ جان فقر کی بدولت صدق و صفا حاصل کریں اور دنیا ان کی مطیع و منقاد ہو جائے۔

غزل

از جناب سید اکبر عباس سہارنپوری

آتشِ عشق کو پھر آج فروزاں کر دے
اپنے جلووں کو سرِ طور نمایاں کر دے

کشتۂ ناز پہ یہ آخری احساں کر دے
دے کے کاندھے مجھے ہمدوشِ سلیماں کر دے

کون پھر ہجر کے صدموں سے بچیگا جیتا
اس دفعہ اور وفا کیش ذرا ہاں کر دے

نہ سہی طرزِ ستم ہائے تبسم نہ سہی
دل کے بہلانے کا کچھ اور ہی ساماں کر دے

گوشۂ امن نشیمن کو سمجھنے والے
برق کی لرزشِ پیہم کو نگہباں کر دے

اس کا مرنا بھی ہے صد نازشِ آئینِ حیات
جس کا ماتم تری زلفوں کو پریشاں کر دے

خوب ہو جائے اگر اسکا تغافل اکبر
تیرے شیرازۂ ہستی کو پریشاں کر دے

آدم خور درخت

جنگل کی خوفناک کہانی

از جناب خان شبیر احمد خاں

"موت کے منہ میں کودنے سے کیا فائدہ؟" ہنری نے سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے کہا۔

ہنری کیمپ کے بستر پر نیم دراز ہو کر سگریٹ کے دھوئیں کے حلقے بنا بنا کر اڑا رہا تھا جو چھت کے پاس پہنچتے ہی نظروں سے غائب ہو جاتے تھے۔ میں کرسی پر بیٹھا باہر کے نیم روشن مناظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ کیونکہ ابھی تاریکی کافی مسلط نہیں ہوئی تھی۔ میرا ٹھیکہ ختم ہو چکا تھا۔ اس لئے مجھے حکم ملا تھا کہ فوراً کیمپ پہنچ جاؤں۔ میں نے سوچا کہ ساحل کے کنارے کنارے چکر لگا کر جانے میں کوئی لطف نہیں۔ جنگل میں سے سیر کرتا ہوا جلد پہنچ جاؤنگا اور سچ پوچھو تو اس بات کا میں عرصہ سے خواہشمند تھا کہ کسی طرح موقع ملے تو ان جنگلوں کی سیر کروں جن کے متعلق عجیب عجیب کہانیاں مشہور تھیں۔

مگر یہ بات بالکل ظاہر تھی کہ ہنری مجھے دیوانہ سمجھتا تھا۔

"پہلی بات تو یہ ہے تم راستہ بالکل نہیں جانتے جنگل کس طرح پار کر سکو گے؟" ہنری نے پوچھا۔

"بنگو تو جانتا ہے۔ وہ تو یہیں کا باشندہ ہے" میں نے جواب دیا۔

"بہت ممکن ہے کہ تم بھٹک جاؤ اور اگر راستہ بھول گئے تو ہڈیاں بھی نہ بچینگی۔ یہ جنگلات بہت خطرناک ہیں مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کچھ روز ہوئے ایک اور شخص جو تمہاری طرح دیوانہ تھا انہی جنگلوں میں چند میل ہی گیا تھا کہ ایک پچاس فٹ لمبے اژدھے نے اس کا پیچھا کیا۔ بمشکل تمام وہ اپنی جان بچا کر واپس بھاگا۔"

"میرے دوست" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اگر ہمیں صرف ۳۰ فٹ لمبا اژدھا مل جائے تو عجائب گھر والے صرف اس کے چمڑے کیلئے بہت گراں معاوضہ دیں گے۔"

ہنری نے گویا میری بات ہی نہ سنی "یہاں کے چیونٹے بھی غیر معمولی طور پر بڑے ہیں۔ وہ سب کچھ ہضم کر لیتے ہیں۔ ایک فوج کی فوج کو ایک ہی رات میں نیست و نابود کر دیتے ہیں۔"

میں نے ہنستے ہوئے دوسری سگریٹ جلائی میں نے قطعی فیصلہ کر لیا تھا کہ کچھ بھی ہو میں اور بنگو صبح اپنی خطرناک مہم پر روانہ ہو جائیں گے۔

تھوڑی دیر بعد تاریکی زیادہ بڑھ گئی تو مجھے بھی کچھ ڈر معلوم ہونے لگا۔ استوائی خطہ، تاریک رات، جنگل کا کنارا۔ ہوا کی سائیں سائیں یہ سب منظر کو خوفناک بنا رہی تھیں۔ بہت دور افق پر بجلی چمکی اور پھر زور سے بادل گرجا۔ بجلی تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد چمکتی رہی۔ بڑے بڑے پتنگے لیمپ کے چاروں طرف چکر لگا رہے تھے۔ بالکل یہ معلوم ہوتا تھا کہ اجڑی ہوئی بستیوں کی روحیں بھوت بنکر گھوم رہی ہیں۔

"دوست ان جنگلوں میں ضرور کچھ عجیب و غریب اسرار نہاں ہیں۔ سب باتیں جھوٹ اور بناوٹی نہیں ہو سکتیں۔ صرف بچے اور مرد ہی نہیں بلکہ قبیلے کے قبیلے ناپید ہو گئے ہیں۔ کئی گاؤں بالکل خالی پڑے ہیں۔ کوئی نہیں بتا سکتا۔ وہاں کے لوگ کب۔ کہاں اور کیسے غائب ہو گئے؟"

شام کا وقت تھا کچھ کچھ تاریکی پھیل رہی تھی ہم جنگل کو طے کر کے ایک میدان کی طرف بڑھے جہاں چند جھونپڑے دور دور بنے تھے۔ صبح صادق سے جب ہنری کو خیمہ کے دروازے پر الوداعی سلام کیا اس وقت تک دشوار گذار تاریک جنگل میں بھٹکتے رہے۔

آسمان کے افق پر شفق کی سرخی سیاہ بادلوں میں غائب ہو رہی تھی۔ بادل کی گرج سے نظر آ جاتا تھا لیکن پھر تاریکی اور زیادہ بڑھ جاتی تھی۔

ہم لمبے لمبے قدم بڑھا کر چلے تاکہ جلد ہی کسی محفوظ جھونپڑے میں پہنچ جائیں۔

"بنگو جلدی" میں نے زور سے کہا "دیکھتے نہیں کتنا تیز طوفان آ رہا ہے۔"

روشنی بہت تیزی سے غائب ہو رہی تھی لیکن مدھم روشنی میں صاف نظر آ رہا تھا کہ بہت سے جھونپڑے خالی پڑے ہیں اور جو دو چار لوگ دور چھپتے نظر آتے وہ بالکل نحیف بلکہ ڈھانچے جنگلی بخار سے مردہ ہو رہے تھے۔ شاید یہ خطہ "مرض النوم" کا ہو یا

شاید ....
مگر یہ کمبخت بنگو کہاں مر گیا۔

میں ایک جھونپڑے کے نزدیک پہنچا۔ یکایک بجلی زور سے چمکی میں نے دیکھا یہ جھونپڑا دوسرے جھونپڑوں سے بالکل مختلف ہے۔ تمام جھونپڑا ایک قسم کی موٹی بیل سے ڈھکا ہوا ہے لیکن یہ دوسرے ٹوٹے پھوٹے ہیبتناک جھونپڑوں کی بہ نسبت کافی اچھا تھا میں دروازہ تلاش کرنے لگا۔ ایک طرف چھوٹا سا رستہ دکھائی دیا۔ یہی دروازہ تھا لیکن باقی حصہ بیل سے ڈھکا ہوا تھا۔ میں نے اسی کلہاڑی سے جو جنگل میں راستہ بنانے کی غرض سے لایا تھا دروازہ کی بیلیں کاٹ کر دروازہ صاف کیا۔ یہ بالکل عجیب جگہ تھی صاف ظاہر تھا کہ یہ مدت دنوں سے غیر آباد ہے۔ لیکن پھر بھی شکستہ حال نہ تھی۔ اور رات کے طوفان سے بچنے کے لئے بہت محفوظ جگہ تھی۔ دھندلی روشنی میں دیکھا کہ اس درخت کی شاخیں یا بیلیں سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی تمام دیوار اور چھت پر پھیلی ہوئی ہیں۔ چھت کے درمیان سے ایک سُرخ پھول لٹک رہا ہے اس میں عجیب قسم کی تیز خوشبو تھی۔ سانپ کی مانند لٹکتی ہوئی شاخیں بہت خوفناک معلوم ہوتی تھیں۔ بلکہ ایک مرتبہ تو میں چونک اُٹھا کیونکہ ایک شاخ زندہ سانپ کی طرح میری طرف بڑھی۔ مگر شاید آنکھوں کا قصور ہو کیونکہ غنودگی سی محسوس ہو رہی تھی۔

بنگو کو پکارا تو کوئی جواب نہ ملا۔ پلٹ کر دیکھا تو بنگو دروازے پر کھڑا بھیگ رہا تھا۔ پانی اور تیزی سے برسنے لگا کسی جانور کے غرانے کی آواز قریب ہی جنگل سے آئی۔

"سامان لیکر اندر آجاؤ" میں نے کہا "یہ اچھی جگہ ہے اور طوفان تیز ہے جلدی کرو"

"نہیں آقا" اس نے تھرائی ہوئی آواز سے کہا "بہت خراب۔ شیطان"

"بیوقوف۔ کیا خرابی ہے اس میں کہاں ہے شیطان" میں نے چیخ کر کہا۔

وہ اس کے سوا اور کچھ نہ کر سکا کہ خراب جگہ ہے اور عاجزی سے کہنے لگا کہ اس میں پناہ لینا ٹھیک نہیں ہے۔ دفعتاً بجلی زور سے چمکی اور بادل گرجا۔ طوفان سر پر آگیا تھا وقت بالکل نہیں تھا کہ بیکار باتوں میں ضائع کیا جاتے۔ میں نے اسے سختی سے حکم دیا کہ سامان لیکر فوراً اندر آجائے۔

میں واپس آیا۔ چند بیل کے ٹکڑے جو راستہ میں لٹک رہے تھے انہیں بھی کاٹ کر رستہ صاف کیا۔ ایک مرتبہ میں پھر دفعتاً اچھل پڑا کیونکہ ایسا معلوم ہوا کہ بیل کا ایک سرا میری طرف سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا دوڑا اور مجھے لپیٹنے کی کوشش کی۔ لیکن اس بات کو سوچنے کا موقع ہی نہیں تھا کیونکہ طوفان بہت تیز ہو گیا۔

بنگو کی تلاش میں میں دروازے کی طرف بڑھا۔ دیکھا کہ بنگو ابھی تک دروازے کے باہر کھڑا ہے اور پانی میں بھیگ رہا ہے اور خوف سے تھرتھرا رہا ہے۔ اس کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ دروازے کے اندر قدم رکھے، وہ تقریباً واپس بھاگنے ہی والا تھا کہ میں نے اسے زور سے ڈانٹا "کیا شیطان صرف تمہارا ہی انتظار کر رہا ہے۔ جلدی ادھر آ"

وہ بالکل سہما ہوا آگے بڑھا اور دروازے کے اندر آکر کھڑا ہو گیا۔ اس کا دم گھٹتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔

"موم بتیاں جلد نکال کر جلاؤ۔ دیکھیں یہ کیسی جگہ ہے"۔

یہ مکان جس میں ہم لوگ ٹھہرے ہوئے تھے ایک عیسائی مشن کا بنوایا ہوا تھا۔ جو وعظ اور تلقین کے لئے آتے تھے لیکن سب کے سب کسی نامعلوم طریقہ سے غائب ہو گئے۔ دوسرے لوگ کئے ایک رات رہے اور اسی عجیب طریقہ سے غائب ہو گئے۔ گاؤں کے باشندے اس جھونپڑے کے پاس گذرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ اور کسی کو بھی اس میں جانے نہیں دیتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس پر موت کے فرشتے کا قبضہ ہے جس کا نتیجہ ہمیشہ موت ہوتا ہے۔

"اچھا کچھ بھی ہو" میں نے بنگو سے کہا "تم گوشت کے ڈبے نکالو کھانا تو کھالیں خواہ یہ آخری ہی کیوں نہ ہو۔ اس مرتبہ ہم تم دو آدمی ہیں اگر ایک سوئے تو دوسرا جاگتا رہے"

موم بتیاں جلائی گئیں۔ ہمارا کمرہ عمدہ حالت میں تھا۔ اسی سے ملا ہوا ایک دوسرا کمرہ تھا لیکن وہ کسی قدر اس سے چھوٹا تھا۔ بارش کا زور شور، بجلی کی چمک، بادل کی گرج سب ایک خوفناک منظر پیش کر رہی تھیں۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ہم کو ایسی عمدہ اور محفوظ جگہ ملی ورنہ خدا جانے کیا حشر ہوتا۔

بنگو کھانا کھانے کے دوران میں ایک لفظ بھی نہیں بولا۔ وہ بہت زیادہ خوفزدہ تھا۔ ایک مرتبہ بادل بہت زور سے گرجا بنگو دہشت کی وجہ سے گر پڑا۔ کچھ دیر تک وہ بالکل بے حس و حرکت پڑا رہا۔ میں نے اُسے سہارا دیکر اُٹھایا۔ بنگو میرا پرانا ملازم

تھا وہ بہت ہی دلیر تھا۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ میں جنگل میں شکار کھیلنے گیا۔ بنگو میرے ساتھ تھا۔ ٹانکے پر تھا کہ یکایک ایک چیتے نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میرے ہوش و حواس غائب ہو گئے۔ بندوق ہاتھ سے گر پڑی۔ یکایک بنگو تیر کی طرح جھپٹا اور جھٹکے کے ساتھ چیتے کو مجھ سے علیحدہ کیا۔ اور خود اس سے لڑنے لگا۔ اتنے عرصے میں میں نے بندوق سنبھالی اور چیتے کو مار ڈالا۔ مجھے بہت حیرت تھی کہ وہ اتنا بزدل کیوں ہو گیا اور کس چیز سے اتنا خائف ہے۔ ارادہ یہ ہوا کہ اوّل شب میں بنگو سوئے اور میں جاگتا رہوں۔

کچھ دیر بعد جنگل میں موت کی سی خاموشی طاری ہو گئی۔ کیونکہ بارش ختم ہو چکی تھی اور رات بھی کافی گذر چکی تھی۔ رات کے سناٹے میں کلائی گھڑی کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ اُف کس قدر خوفناک رات تھی ۔۔۔!

مجھے ایک قسم کی غنودگی محسوس ہونے لگی۔ وہ سرخ پھول جو چھت کے درمیان لٹک رہا تھا اس کی تیز خوشبو سے میرے قویٰ مضمحل ہو رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کمرہ گھوم رہا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں ایک مرتبہ لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔ چاند درختوں کے اوپر چمک رہا تھا۔ آسمان بالکل صاف تھا۔ قریب ہی جھاڑی سے ایک جنگلی جانور کے غرانے کی آواز آئی۔ مجھے ایک قسم کا نشہ محسوس ہوا شاید اسی عجیب پھول کا اثر ہو۔ اتنا یاد ہے کہ میں کھڑکی کے سامنے سے ہٹا اور کمبل پر بیٹھ گیا جو بنگو نے میرے لئے بچھایا تھا۔

..... میرا خیال ہے کہ میں سو گیا۔ شاید کچھ دیر تک نیم خوابی حالت میں رہا اس کے بعد بیشک ڈراؤنے خواب دکھائی دینے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام بیلیں زمین پر سانپ کی مانند رینگ رہی ہیں۔ ایک دم دہشت معلوم ہوئی اور ......

ایک خوفناک چیخ سن کر میں جاگ اٹھا۔ دہشت آمیز چیخ نے میرے نیم مردہ دماغ کو ہوشیار کر دیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ہم سخت خطرے میں ہیں۔ میں فوراً تیزی سے اٹھا لیکن گر پڑا کوئی چیز رسی کی مانند سختی سے میرے پیر میں لپٹ گئی۔ چیخ دوبارہ سنائی دی۔ خوف اور ناامیدی سے ملی ہوئی چیخ اسی کمرے سے آ رہی تھی جس میں بنگو سو رہا تھا۔ میں ایک وحشیانہ طریقہ سے جھٹکے کے ساتھ اٹھا۔ لیکن پیر کی گرفت اور سخت ہو گئی اور میں

پھر گر پڑا۔ میں نے اپنی پوری قوت صرف کر دی کہ کسی طرح گرفت سے آزاد ہو جاؤں اور دروازے تک پہنچ جاؤں کیونکہ کلہاڑی دروازے کے پاس ہی پڑی تھی۔

پھول کی تیز بو پھر مجھ پر غالب آنے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں دروازے تک نہیں پہنچ سکتا۔ میں نے ایک مرتبہ اور آخری انتہائی کوشش کی کہ گرفت ڈھیلی ہو جائے اور شاید کامیابی ہوئی کیونکہ میں کلہاڑی تک پہنچ گیا۔ اور فوراً آزاد ہو گیا۔ پلٹ کر کمرے میں غور سے دیکھا تو سینکڑوں سانپ لہراتے ہوئے معلوم ہوئے۔ چاندنی کھڑکی سے آ رہی تھی۔ سب بیلیں کھڑکی کی طرف رینگ رہی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کچھ ڈھونڈ رہی ہیں۔ اُف کتنا لرزہ خیز منظر تھا۔ وہ سماں جب کبھی یاد آتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ایک دبی ہوئی چیخ پھر سنائی دی جیسے کسی کا گلا گھٹ ہو رہا ہو۔ بنگو!

کانپتے ہوئے ہاتھوں سے میں نے موم بتی جلائی۔ اُف وہ منظر میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ زمین پر ایک بیل سانپ کی مانند میری طرف کھسک رہی تھی۔ اور بہت سی دیواروں پر خاموشی کے ساتھ میری طرف بڑھ رہی تھیں۔ کتنا خوفناک منظر تھا۔

اس کے بعد کیا ہوا مجھے اچھی طرح یاد نہیں البتہ چیخ کی آواز بند ہو گئی تھی لیکن گھڑگھڑاہٹ کی آواز آ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی چیز کھینچی جا رہی ہو۔

میں چند لمحہ کے لئے رکا تاکہ سانس قابو میں آ جائے، اس کے بعد موم بتی اور کلہاڑی لیکر تیزی سے دوسرے کمرے میں داخل ہوا۔

خوف سے شمع میرے ہاتھوں سے چھوٹ گئی۔ مدھم چاندنی میں یہ معلوم ہو رہا تھا کہ تمام کمرہ اسی قسم کی بیلوں سے پٹا ہے اور سب بیلیں ایک گٹھڑی کی شکل میں گتھی ہوئی ہیں۔ بنگو کا کوئی نشان ہی نہیں تھا البتہ وہ بیلوں کا بڑا بھاری بنڈل کھڑکی کی طرف کھسکتا جا رہا ہے ......

یہ بیان کرنا کہ ناامیدی کی حالت میں میں نے کیا کیا ناممکن ہے۔ کلہاڑی سے اس بنڈل پر پے درپے وار کرنا شروع کر دیئے۔ ایک مرتبہ ایک بیل میری کمر سے لپٹ گئی؛

اور مجھے پٹخ دیا۔ دوسری پیر میں لپٹ گئی تیسری کلائی میں لیکن میں نے سب کو کاٹ کر رکھ دیا۔ ایک مرتبہ تو میرا خاتمہ ہی ہوگیا تھا کیونکہ ایک بیل گردن میں لپٹ گئی۔ لیکن میں نے اُسے بھی فوراً کاٹ ڈالا۔

مجھے یہ اچھی طرح یاد نہیں کہ کب تک میں اس طرح لڑتا رہا۔ اور کتنی مرتبہ گرا اور اُٹھا البتہ وہ وقت یاد ہے جب میں نیم مُردہ بنگو کو بیل کے گچھے میں سے کھینچ رہا تھا۔ آخرکار ہم دونوں ہانپتے کانپتے باہر نکل آئے۔ چاندنی پھیکی پڑ چکی تھی اور صُبح صادق کے آثار نظر آرہے تھے۔ ہم دونوں تھک کر چُور ہوگئے تھے اور وہیں قریب ہی گر پڑے۔ ہم میں اتنی سکت باقی نہ رہی کہ اُٹھ سکیں۔ زخم خوردہ شاخیں اب بھی ہماری تلاش میں لہرا رہی تھیں لیکن ہم ان کی پہنچ سے کافی دُور ہوچکے تھے۔

آپ نے ایسے درختوں کے بارے میں واقعات سُنے ہونگے کہ کوئی کیڑے مکوڑے کھا جاتے ہیں کوئی چڑیاں ہڑپ کر لیتے ہیں لیکن یہ شیطانی درخت بالکل نرالا تھا۔ سانپ کی مانند شاخیں انسانوں کو اژدہوں کی طرح جکڑ کر ختم کر دیتی تھیں۔

میں بہت زیادہ تھک جانے کے باعث کچھ دیر کے لئے اسی جگہ سو گیا۔ یکایک بنگو کی چیخ نے مجھے چونکا دیا۔ "آقا دیکھئے" میں نے پلٹ کر دیکھا کہ جنگل میں سُرخ روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ وہ آفتاب کی روشنی سے مختلف تھی۔ وہ صرف ایک چیز تھی۔ آگ۔

تھوڑی دیر بعد وہ منحوس جگہ جہاں سے ہم موت کے مُنہ سے بچ کر آئے تھے آتشیں چادر سے چھپ گئی۔

"آگ۔ آقا! آگ۔ شیطان جل گیا۔ موم بتی آقا۔ شیطان"

یکایک مجھے خیال آیا موم بتی میرے ہاتھ سے گھبراہٹ میں گر گئی اُس نے آگ لگا دی۔

کچھ دیہاتی دُور کھڑے شعلوں کو نہایت غور سے دیکھ رہے تھے۔ لیکن بالکل خاموش ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب گونگے ہیں۔

کتنا دہشتناک منظر تھا۔ حالانکہ شاخیں آگ میں جل رہی تھیں۔ گویا شکار ڈھونڈ رہی ہیں۔ رفتہ رفتہ آگ سرد ہوگئی۔ اور سوائے راکھ کے ڈھیر کے کچھ نہ بچا۔

سُورج کافی بلند ہوچکا تھا۔ کچھ لوگ اس سیاہ ڈھیر کے قریب کھڑے تھے بنگو نے بتایا کہ انسانی ڈھانچہ اور کچھ ہڈیاں پائی گئی ہیں۔

ہم لوگوں نے فوراً تیاری کی اور جس راستے سے آئے تھے اُسی طرف روانہ ہوگئے۔

(ہربرٹ)

سیہ بختی کا باعث شعلۂ سرکش [illegible] آرا ہوں
برنگِ شمع [illegible] آرا ہوں

[illegible] واعظ
[illegible] دامن باقی تماشا آرا ہوں

از: حضرت نشتر مقتدری

ایسا تو نہیں ہے

زاہد تری جنت کہیں دھوکا تو نہیں ہے

از حضرت ہادی مچھلی شہری

تمہیدِ ستم ذوقِ تمنا تو نہیں ہے
دل مائلِ غم ہو کہیں ایسا تو نہیں ہے

دُنیائے تصوّر سے مری آپ کو کیا کام
یہ آپ کی بزمِ ستم افزا تو نہیں ہے

نازاں تو عبادت پہ مَیں رحمت کا طلبگار
زاہد تری جنت کہیں دھوکا تو نہیں ہے

ہونٹوں پہ مرے ہے جو تبسّم کی جھلک سی
یہ بھی غمِ امید کا تقاضا تو نہیں ہے

مَیں جس کو سمجھتا تھا تمنا تری اب تک
معلوم نہیں کیا ہے تمنا تو نہیں ہے

پہلو میں وہ بیٹھے ہیں مگر اُف رے غمِ ہجر
ہوتا ہے گماں دل کو کہ دھوکا تو نہیں ہے

مسرور جو مَیں بزمِ تمنا سے اُٹھا ہوں
کچھ اس کی توجہ کا اشارا تو نہیں ہے

جس شے پہ مجھے ناز ہے اے رحمتِ باری
ٹوٹے ہوئے دل کا وہ سہارا تو نہیں ہے

بہکی ہوئی ہے آج کچھ اس کی نگہِ شوق
برباد کرے گی مجھے ایسا تو نہیں ہے

کیونکر نہ کہوں اسکے تصوّر کو دل افروز
میری شبِ فرقت میں اندھیرا تو نہیں ہے

اللہ رے غمِ ہجر کہ کہہ اُٹھتا ہوں اکثر
دُنیائے تمنا مری دھوکا تو نہیں ہے

کٹنے کو کٹ جاتی ہیں غمِ ہجر کی گھڑیاں
لیکن مری قسمت کو گوارا تو نہیں ہے

کیوں ہو مجھے اپنے دلِ محزوں کی شکایت
راحت ہی فقط حاصلِ دُنیا تو نہیں ہے

کیا چیز ہے پھر مانعِ احساسِ نوازش
تم غم کو نہ سمجھو مرے ایسا تو نہیں ہے

ہادی مجھے کیا کام ہے تزئینِ چمن سے
سب کچھ ہو مگر وہ بتِ رعنا تو نہیں ہے

عالمگیر بکڈپو کی بالکل تازہ مطبوعات

اس مہینے عالمگیر بکڈپو کی چند نئی کتب شائع ہوئی ہیں۔ ذیل میں ان کی فہرست اور تعارف نامہ درج ہے، اسے مُلاحظہ فرماکر کتابوں کی دلچسپی کا اندازہ کیجئے، اور اُن کی خریداری کا آرڈر بھیج کر ممنونیت کا موقع بخشئے۔

مینجر،

"خونیں تحریکیں"

مصنفہ مولانا اظہر امرتسری مدیر "زمیندار"

بغاوت کا اُٹھتا ہوا طوفان۔ انقلاب کی آگ کے لپکتے ہوئے شعلے۔ سیاسی شورش کے زلزلہ افگن کارنامے۔ شہنشاہی کی جانکنی۔ غلامی کی تاریخ میں آزادی کی عالم افروز روشنی کا ظہور۔ انسانی نعشوں پر قومی مستقبل کی تعمیر اور پرانے فرسودہ نظام کے کھنڈروں پر نئی دنیا کے سورج کی تجلیاں۔ یہ تمام مناظر اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو

خونیں تحریکیں ملاحظہ فرمائیے

اس کتاب میں ان تمام انقلاب انگیز، حشر خیز اور ہمہ گیر تحریکات کا تذکرہ ہے جن کے ایک ایک اشارے پر شہنشاہوں کو بھی رقص کرنا پڑا۔ لیکن تاریخی حقائق کو ادیبانہ تخیل نے اس درجہ دلچسپ بنادیا ہے کہ ایک ہی نشست میں ساری کتاب پڑھے بغیر اطمینان نہیں ہوسکتا۔ ضخامت تین سو صفحات سے زیادہ۔ کاغذ و طباعت عمدہ جلد رنگین و باصرہ نواز قیمت مجلد صرف ایک روپیہ آٹھ آنے عہ

نادر شاہ اور ستارا

از جناب عبدالرحیم شبلی - بی - کام

اُس نے قفقاز کی پہاڑیوں سے لے کر گنگا کے میدانوں تک تمام سلطنتوں اور راجدھانیوں کو اپنے ترکمانی گھوڑے کے سموں سے روندیا۔ لیکن ایک راجپوت دوشیزہ کی نگاہ ناز کا شکار ہو کر رہ گیا۔ نادر شاہ اُن جابر و قاہر شہنشاہوں میں سے تھا جو ہنگامہ آتش و خون کا ناخدا ہونے کے علاوہ دُنیائے حسن و عشق کا دامق وتیس بھی تھا۔ اس بے نظیر تاریخی ناول میں نادر شاہ اور ستارا کی داستان عشق بیان کی گئی ہے۔ یہ تاریخی ناول سنہ ۱۹۴۰ء کا شاہکار ہے۔ آج ہی طلب فرمائیے۔ ضخامت ڈھائی سو صفحات سے زیادہ۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے عہ

زرتشتِ اعظم کا رومان

از جناب سید احسان علی شاہ بی۔ اے

وہ بلند پایہ تاریخی ناول جس کی سطر سطر کیف و سرور اور عشق و شوق کی آئینہ دار ہے۔ یہ اس زمانہ کا واقعہ ہے جب سلطنت آشوریہ آخری ہچکی لے کر ماضی کے خوفناک دھندلکوں میں روپوش ہوگئی۔ اور جب دانیال نبی اکباتنا کے ایک آہنی قلعہ میں اپنے بڑھاپے کے ایام بسر کر رہے تھے۔

یہ ناول پڑھ کر دیکھئے کہ کس طرح زرتشت اعظم یہود کی حسین و جمیل شہزادی کے قدموں پر گر گئے۔

اگر آپ ایک ایسا ناول پڑھنا چاہتے ہیں جو شروع سے لیکر اخیر تک نغمہ بار و سرور انگیز ہو تو زرتشت اعظم کا رومان ضرور منگائیے۔ ضخامت تین سو صفحات۔

قیمت مجلد ایک روپے آٹھ آنے عہ

تاریخی افسانے

از مولانا احمد صاحب ایم ۔ اے

تین بہترین اور طویل تاریخی افسانے جن کا ترجمہ انگریزی زبان سے ہندوستان کے مشہور اہل قلم مولانا احمد صاحب ایم۔اے نے اردو میں کیا ہے۔

پہلے افسانے کا نام **نور جہاں** ہے جو تقریباً ۸۰ صفحات اور ۷ ابواب پر مشتمل ہے۔ دوسرے افسانے کا نام **یوسف عادل شاہ** ہے جو ۹۵ صفحات اور ۵ ابواب پر ختم ہوا ہے۔ تیسرا افسانہ **آتش انتقام** ہے جو پانچ باب میں ۴۰ صفحات کو محیط ہے۔

ان افسانوں کی دلچسپی کا اندازہ مولانا آفتاب کے ان الفاظ سے ہو سکتا ہے — "پہلا افسانہ نور جہاں میری طبیعت پر اس درجہ اثر انداز ہوا کہ میں اسے متعدد بار پڑھنے پر مجبور ہوا۔ بعض حصے تو اس درجہ موثر تھے کہ مجھے ہر لفظ کا خیر مقدم ایک ایک آنسو سے کرنا پڑا۔" وغیرہ وغیرہ

ضخامت دو سو صفحات قیمت مجلد صرف ایک روپیہ آٹھ آنے

روسو کی داستانِ عشق

مفکر اعظم روسو کا شمار دنیا کے مشہور فلاسفہ میں ہوتا ہے۔ یہ کتاب اس کی آپ بیتی ہے جس میں روسو نے اپنی رنگین و رومان پرور زندگی کو بے نقاب کیا ہے۔ اس کتاب کا ہر باب پڑھ کر آپ کے سراپا میں سنسنی دوڑ جائیگی۔

گناہ و معصیت اور عشق و رومان کی وادی میں بھٹکنے والے فلاسفر کی داستان حیات کا ایک ایک ورق آپ کے دل کی گہرائیوں میں اتر جائے گا۔

قیمت مجلد صرف بارہ آنے ۱۲؍

مضامین محمد علیؒ

حصہ دوم ——— مطبوعہ جامعہ

مرتبہ جناب محمد سرور صاحب پروفیسر اسلامیہ

یہ کتاب مولانا محمد علی مرحوم کے قابل مطالعہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ اس ہنگامہ خیز دور کی تاریخ ہے جو ۱۸۵۷ء سے شروع ہو کر سنہ ۱۹۳۰ء پر ختم ہوتا ہے سر سید نے کانگریس کی مخالفت کس بنا پر کی؟ وہ مسلمانوں کو تمام سیاسی تحریکوں سے الگ رکھنے پر کیوں مصر تھے؟ مسلم لیگ کا قیام کہاں اور کیسے عمل میں آیا؟ اس طرح کے اہم مسائل پر نہایت مفصل بحث ہے۔

ان مضامین کی دلچسپی کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ مضامین محمد علی کا پہلا مجموعہ ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گیا اور آج اس کی ایک کاپی بھی کسی قیمت پر نہیں ملتی۔

آپ یہ مجموعہ ضرور خریدیے

قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے ؎ ۸؍

چند ایسی کتابیں جو پچھلے سال شائع ہوئی تھیں اور غالباً اب تک آپکی نظر سے نہیں گزریں

یہ کتابیں بھی آپ کو عالمگیر بک ڈپو سے مل سکتی ہیں!

نظارے

مختصر افسانوں کا مجموعہ۔ مصنفہ کرشن چندر ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی مصنف "طلسم خیال" — کرشن چندر ترقی پسند افسانہ نگاروں کی پہلی صف میں جس جگہ کے مالک ہیں۔ منشی پریم چند مرحوم کے بعد بہت کم لوگوں کے حصہ میں آئی ہے۔ کرشن چندر کی نظر سوسائٹی کے فرسودہ ضوابط کا پردہ ہٹا کر تمدن کی حقیقتوں تک جا پہنچتی ہے۔ ان کے

افسانے داستان غم بھی ہیں اور نغمۂ فردوس بھی۔ اور یہی ہے زندگی کی حقیقی تصویر کشی۔ ضخامت ۲۰۰ صفحات قیمت ایک روپیہ

ہوائی قلعے

از کرشن چندر ایم۔ اے ایل ایل بی۔ دلکش مضامین اور لطیف افسانوں کا بیش بہا مجموعہ۔ یہ افسانے اور مضامین اپنے اچھوتے بیان اور لطیف مزاح کے اعتبار سے اردو ادب میں سنگ میل کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان میں انسانی فطرت کا گہرا نفسیاتی مطالعہ اس پاکیزہ انداز میں پیش کیا ہے جو کرشن چندر کی خصوصیت ہے زندگی کی سب سے بلند چوٹی سے جزویات کا مشاہدہ وہ آرٹ ہے جس کی جھلک اب آپ اردو میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔

مجلد کتاب گرد پوش دیدہ زیب قیمت ... ۱۲ر

ڈاچی و دیگر افسانے

موجودہ دور کے بہترین افسانہ نگار اوپندر ناتھ اشک بی اے کے گیارہ سیاسی و معاشرتی افسانوں کا مجموعہ جنھیں مقبولیت عام نصیب ہوئی۔ اوپندر ناتھ اشک کے افسانے ہندوستان کی سیاسی بیداری کے آئینہ دار ہیں۔ اگر آپ مشرق کی سیاسی تگ و دو کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو ڈاچی و دیگر افسانے پڑھئے مجلد ۱۲ر

موپساں کے افسانے

مترجمہ سید نصیر حیدر صاحب۔ موپساں دنیائے ادب میں لازوال شہرت کا مالک ہے۔ اس نے فطرت کو خوب سمجھا ہے اور نہایت کھلے طور سے بغیر جھجک اور حجاب کے بے نقاب کرنے کی بھی جرأت کی ہے۔

موپساں کی عریاں نگاری مخرب اخلاق نہیں بلکہ انھیں پڑھ کر ہم مجبور ہو جاتے ہیں کہ اپنے ارد گرد کی دنیا کو ذرا تنقیدی اور قدرے غائر نظر سے دیکھیں۔

مجلد گرد پوش دیدہ زیب
قیمت ایک روپیہ

نازی ازم

از عبدالرحیم شبلی۔ بی کام

ہماری متمدن دنیا اس وقت نئے نئے معاشی نظریوں اور سیاسی تخیلات کا معرکہ کارزار بنی ہوئی ہے ہم روزانہ جنگ کی خبریں پڑھتے ہیں اور حیرت و استعجاب سے ایک گہری فکر میں مبتلا ہو جاتے ہیں کیا دنیا کی تباہی یقینی ہے؟ لیکن معاشی مدبر اور سیاسی مفکر کو دنیا کی تباہی و بربادی سے کیا کام؟ آیئے اس کتاب میں ملاحظہ فرمایئے نازی ازم کیا ہے؟ قیمت ٦ر

کالیداس

از چودھری جے کرشن ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی۔ "شکنتلا" اور "میگھ دوت" کے مصنف کالیداس کا نام مشرق و مغرب میں اب تک واجب التعظیم سمجھا جاتا ہے اس کا پریم رس سے بھرا ڈراما "شکنتلا" دنیائے ادب کے لئے پرکیف تر و تازگی کا موجب ہے۔

چودھری جے کرشن صاحب نے اس مختصر سی کتاب میں کالیداس کے سوانح بھی بیان کئے ہیں اور اس کی شاعری پر تبصرہ بھی کیا ہے۔ لیکن کتاب کی جان اس تصنیف کا وہ حصہ ہے جس میں اس کے ڈراموں اور نظموں کو کہانی کی شکل میں پیش کیا ہے قیمت رعایتی ۱۲ر

خنداں

پروفیسر رشید احمد صدیقی کی نئی تصنیف۔ یہ ان مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے جو موصوف نے وقتاً فوقتاً دہلی ریڈیو اسٹیشن سے نشر کئے ان میں آپ کو وہی اعلیٰ قسم کا مزاح۔ لطیف طنز اور خواہ مخواہ دل کو گدگدا کر محظوظ کرنے کی صلاحیت ملیگی جو مضامین رشید کی جان ہیں۔ خنداں ڈاکٹر بھی ہیں اور شاعر بھی مگر لوگوں کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ ان کی ڈاکٹری زیادہ وبال جان ہے یا ان کی شاعری۔ ممدوح نے اسی قسم کے کرداروں نیز زندگی کے دوسرے دلچسپ پہلوؤں پر نظر ڈالی ہے۔

قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے ۲؍۸

عالمگیر بکڈپو کی بعض ایسی کتب جن کا اشتہار آپ کی نظر سے گزر چکا ہوگا اور بہت ممکن ہے کہ آپ ان کتابوں میں سے بعض یا کچھ کتابیں اپنے مطالعہ کے لئے منگا چکے ہوں تاہم ایک نظر ان کتابوں کے اشتہارات کو دیکھ لیجئے ممکن ہے ان دلچسپ کتابوں میں سے کوئی آپکی نظر سے نہ گزری ہو!

موتیوں کا درخت

مصر کے شہرۂ آفاق ناول نویس علامہ جرجی زیدان کے زبردست تاریخی ناول شجرۃ الدُر کا اردو ترجمہ جن کا پہلا ایڈیشن چند ہی دنوں میں ختم ہو گیا تھا اور اب دوسرا ایڈیشن فروخت ہو رہا ہے۔ بیحد دلچسپ تاریخی ناول ہے قیمت مجلد ایکروپیہ آٹھ آنے ؏

ماہ و انجم

اگر مختصر افسانے کی تعریف یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے جذبات کی آوازیں سنائی دیں اور سوسائٹی و معاشرت کی صحیح تصویر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے تو ماہ و انجم کا مطالعہ ضرور کیجئے۔ یہ بیحد دلکشانہ اور جذباتی کتاب ہے۔ مجلد قیمت ایکروپیہ آٹھ آنے ؏

روپ متی اور باز بہادر

تاریخ ہند کا ایک ایمان آفریں واقعہ جس کے لفظ لفظ سے حسن و محبت کے ہنگامے اٹھ رہے ہیں۔ باز بہادر والی مالوہ نے کس طرح اپنا تخت و تاج حسن کی خاطر قربان کر دیا حضرت محشر عابدی بی۔ اے کا ایک بہترین ڈراما کتاب مجلد ہے قیمت ایکروپیہ ؏

کتاب التقدیر

علامہ ابن قیم کی شہرۂ آفاق کتاب کا اردو ترجمہ۔ اس کتاب میں مسئلہ قضاء و قدر کے ہر پہلو پر عقلی و نقلی دلائل کی رو سے مثالیں پیش کی گئی ہیں جو اس قدر دلچسپ ہیں کہ آپ بیحد محظوظ ہوں صفحات ۸۰۰ بڑا سائز قیمت صرف ایکروپیہ بارہ آنے ؏

تاج شاہی حسن کے قدموں میں

شاہان یورپ کے عشق و عاشقی کی سچی اور دلگداز داستانیں، افسانہ تاریخی حقائق سے لبریز اور سوز و گداز میں ڈوبا ہوا ہے اور وقار شاہی کو حسن کے قدموں میں سجدہ ریز دیکھئے۔ کتاب مجلد ہے قیمت صرف ایکروپیہ چار آنے ؏

لیلیٰ کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری

ملک کے مشہور ادیب قاضی عبد الغفار صاحب کا شاہکار۔ دکھ ہے فطرت انسانی کے۔ ایک فریاد ہے غم نصیب عورت کی۔ ایک داستان ہے عیش پرست مرد کی۔

لیلیٰ کے خطوط ؏ — مجنوں کی ڈائری ؏

آپ کو مرغی خانہ سے دلچسپی ہے اور اس سلسلہ کی مستند اور اعلیٰ پیمانہ کی کتابیں پڑھنا چاہتے ہیں تو مندرجہ ذیل کتابیں پڑھئے۔

بیاض طبیب مرغی خانہ باتصویر (؏) تجارتی مرغی خانہ باتصویر (؏) کامیاب مرغی خانہ باتصویر ؏ طبیب مویشی باتصویر ؏ بطخ فیل مرغ (؏)

اسلام کا ایک روشن چراغ

امام بخاریؒ

ازمولٰنا الحاج عبدالقیوم ندوی

نام ونسب

امام بخاری کا نام نامی محمدؒ کنیت ابوعبداللہ والد بزرگوار ابوالحسن اسمٰعیل تھا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے اپنی تحقیق کے مطابق سن پیدائش ایک سو چورانوے لکھا ہے لیکن ابن خلکان نے بجائے ۱۹۴ھ کے ۱۹۰ھ لکھا ہے۔ سرزمین بخارا کو اس وجود گرامی کی ولادت باسعادت کا شرف بخشا گیا۔ ابھی آپ کمسن ہی تھے کہ والد بزرگوار کا سایہ عاطفت سر سے اٹھ گیا اور بظاہر صرف گہوارۂ مادر تمام امیدوں اور تمناؤں کا مرکز بن گیا جب کچھ ہوشیار ہوئے اپنی والدۂ عالیہ کے ساتھ شرف حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے۔ والدہ عالیہ تو حج بیت اللہ سے فارغ ہو کر واپس تشریف لے آئیں لیکن امام بخاری وہیں حصول تعلیم کی غرض سے رک گئے۔ حافظ ابن حجر نے اس کی تصریح فرمائی ہے کہ سفر حج آپ کا پہلا سفر تھا اگر آپ کچھ دنوں پہلے سفر فرماتے تو طبقہ عالیہ کے شیوخ سے لقاء ہو سکتا تھا اگر ایسا ہوتا تو آپ کا شمار بھی تبع تابعین میں ہو جاتا۔ پھر بھی یزید بن ہارون اور ابوداؤد طیالسی کا زمانہ آپ کو مل گیا تھا۔ سفر حج کے لئے جب تشریف لائے تھے تو حدیث کی بعض کتابیں مثلاً کتب ابن مبارک۔ کتاب ابن وکیع آپ کو حفظ تھیں۔ اٹھارہ برس کی عمر سے آپ کی تصنیفات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے چنانچہ اٹھارہ ہی سال کی عمر میں آپ نے کتاب قضائے صحابہ وتابعین تصنیف فرمائی اور اس کے بعد روضہ اطہر کے پاس بیٹھ کر راتوں کو جاگ جاگ کر چاند کی روشنی میں تاریخ کبیر تصنیف فرمائی۔ تاریخ کبیر کے متعلق آپ نے یہ بھی دعویٰ فرمایا ہے کہ اس میں جو نام بھی آیا ہے اس کے متعلق کوئی نہ کوئی قصہ آپ کو معلوم ہے لیکن محض طوالت کتاب کے خوف سے آپ نے اس کی طرف اعتنا نہیں فرمایا۔

علمی ذوق وشوق

اٹھارہ ہی سال کی عمر میں آپ نے اس کتاب مستطاب کی تصنیف شروع کی جو کہ آج تک آپ کی شہرت ومقبولیت عزت وعظمت کا باعث بنی ہوئی ہے۔ [illegible] ۱۶۰۰

معلوم ہوتا ہے کہ اس کی قلت تصنیف پر کچھ تبصرہ کیا جائے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے مقدمہ فتح الباری میں اس بحث کو نسبتاً ذرا تفصیل سے لکھا ہے۔ آپ فرماتے ہیں ابتدائے زمانہ میں تو تدوین حدیث اس غرض سے نہیں ہوئی تھی کہ التباس حدیث [illegible] کا اندیشہ تھا لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اور محدثین اقطار ارض میں پھیل گئے اور اس کے ساتھ ہی خوارج وقدریہ وغیرہ نے سر اٹھایا تو اس کی ضرورت سمجھی گئی کہ وہ حدیثیں جواب تک انسانوں کے ذہن و دماغ میں محفوظ تھیں [illegible] قلمبند کی جائیں ورنہ خطرہ تھا کہ لوگ اپنے مقاصد کی تائید کی خاطر اس میں کمی یا زیادتی کر دیتے۔ چنانچہ یہ تحریری صورت تابعین [illegible] دور سے ظہور میں آچکی تھی۔ سب سے پہلے ربیع بن صبیح اور سعید بن ابی عروبہ نے حدیثیں جمع کیں۔ لیکن جب یہ خیال عام طور پر فقہاء و محدثین میں شائع ہو گیا تو پھر اعلیٰ طبقہ کے محدثین بھی اس کی جانب متوجہ ہوئے۔ [illegible] انھوں نے جمع وتدوین شروع کر دی۔ چنانچہ امام مالکؒ نے اہل حجاز سے صحیح حدیثوں کو لے کر موطا تصنیف فرمائی اسی طرح امام اوزاعیؒ نے شام میں حضرت سفیان ثوری نے کوفہ میں اور حضرت حماد بن سلمہ نے بصرہ میں تصنیفیں کیں [illegible] جہاں اہل علم موجود تھے وہاں ان حضرات کی اتباع کی گئی۔

لیکن دوسری صدی کے محدثین کو یہ خیال پیدا ہوا کہ احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو علیحدہ اور مستقل صورت میں جمع کیا جائے اور فتاویٰ مجتہدین کو اس سے علیحدہ کر دیا جائے۔

چنانچہ مسانید اسی خیال کا نتیجہ ہیں۔ اس خیال کے پیدا ہوتے ہی مسانید کی تصنیف شروع ہو گئی حضرت عبداللہ بن موسیٰ العبسی الکوفی مسدد بن مسرہد البصری۔ اسد بن موسیٰ الاموی اور حماد الخزاعی نے ایک ایک مسند تصنیف فرمائی۔ نیز امام احمد بن حنبل، اسحٰق بن راہویہ اور عثمان بن ابی شیبہ وغیرہم نے مسانید لکھیں حضرت امام بخاری نے فرمایا کہ کتابیں [illegible] وضع وترتیب کے لحاظ سے بہت خوب ہیں اور زیادہ تر ان میں صحیح حدیثیں جمع کی گئی ہیں لیکن چونکہ ان میں [illegible]

سمجھا کہ ایک ایسا مجموعہ حدیث ترتیب دیں جو اپنی صحت کے لحاظ سے آپ اپنی نظیر ہو۔ یہ ایک مبارک خیال تھا جو اس اصح الکتاب بعد کتاب اللہ کے وجود میں آنے کا باعث ہوا اس کے علاوہ مورخین نے اور بھی وجوہ لکھے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ایک روز حضرت امام بخاری شیخ اسحق بن راہویہ کی خدمت میں حاضر تھے کہ شیخ نے امام بخاری کو مخاطب کر کے فرمایا کہ کاش تم کوئی ایسی مختصر و جامع کتاب تصنیف فرماتے جو احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مشتمل ہوتی چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ایک تو ذاتی اپنا خیال تھا دوسرے استاد کی تشویق و ترغیب نے حضرت امام بخاری کو تصنیف صحیح بخاری پر بالکل آمادہ کر دیا۔

تحصیل حدیث

جب یہ خیال عزم مصمم کی شکل میں تبدیل ہو گیا تو آپ نے اس کی ضرورت محسوس فرمائی کہ جمع حدیث کے لئے صرف اہل حجاز ہی پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ اقطاع ارض کا سفر کیا جائے چنانچہ خود امام کا بیان ہے اور اسے مورخین نے نقل کیا ہے ـــــ کہ میں نے سماعت حدیث کے لئے بلاد اسلامیہ کے کئی سفر کئے۔ مصر و شام کا دو دفعہ سفر کیا۔ چار دفعہ بصرہ گیا اور چھ دفعہ حجاز میں مستقل قیام کر کے اپنے مقصد کی تلاش کی اور کوفہ کا تو کوئی شمار ہی نہیں کہ کتنی بار محدثین کی معیت میں کوفہ و بغداد کا سفر کیا اور یہ سفر آپ کے حق میں ایسے مبارک ثابت ہوئے کہ آپ کو اسی ہزار محدثین سے روایات صحیح کرنے کا موقع ملا۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس عاشق صادق کو جمع احادیث کے سلسلے میں بڑی بڑی تکالیف کا سامنا بھی ہوا لیکن وہ ساری تکلیفیں اس کے لئے راحت تھیں

محمد بن حاتم اوراق بیان کرتے ہیں کہ امام موصوف نے ارشاد فرمایا کہ ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ سفر میں میرے پاس جو خرچ تھا وہ ختم ہو گیا اب میرا گزر برگ وبا اور ساگ پات پر ہونے لگا۔ دو دن اسی طرح گزر گئے تیسرے دن اسی سفر میں ایک شخص میرے پاس آیا اور مجھے ایک تھیلی دے گیا جس میں کئی دینار تھے۔ سچ ہے من کان للہ کان اللہ، لہٗ جو اللہ کا ہو جاتا ہے اللہ بھی اس کا ہو جاتا ہے۔

خدا داد حافظہ

امام بخاری رحمۃ اللہ کی دیگر خصوصیات کے ساتھ آپ کا حافظہ بھی آپ کی ایک زبردست خصوصیت ہے۔ حاشد بن اسمٰعیل ایک بزرگ ہیں ان کا بیان ہے کہ امام صاحب ہم لوگوں کے ساتھ محدثین کے حلقہ درس میں تشریف لے جایا کرتے تھے ہم لوگوں کو بڑا تعجب ہوتا تھا جب ہم یہ دیکھتے کہ امام صاحب احادیث کا املا نہیں فرماتے تھے چنانچہ کئی دن ایسے ہی گزر گئے بالآخر ایک روز ہم لوگوں نے موصوف سے سوال کیا کہ آخر آپ کو احادیث یاد کیسے رہتی ہوں گی۔ کیونکہ آپ احادیث کو قلمبند تو فرماتے نہیں ہیں؟ اس پر امام صاحب نے جواب دیا کہ اچھا تمہارا یہ خیال ہے تو اب تک جو کچھ تم نے لکھا ہے وہ میرے پاس لے آؤ چنانچہ ہم لوگ اپنی اپنی بیاضیں لے کر آئے تو انھوں نے احادیث زبانی پڑھنا شروع کیں چنانچہ ہماری بیاضوں سے پندرہ ہزار سے زیادہ حدیثیں انھوں نے پڑھ کر ہم لوگوں کو سنائیں پھر تو ہم لوگوں کو ان کے حافظے پر اس قدر وثوق و اطمینان ہو گیا کہ ہم نے اپنی بیاض کو ان کی یادداشت سے درست کیا۔ اسی طرح محمد بن الازہر السجستانی نے بیان فرمایا ہے کہ ہم اور امام بخاری رحمۃ اللہ سلیمان بن حرب کے حلقہ درس میں شریک تھے کسی نے استہزا کیا کہ یہ تو کچھ لکھتے لکھاتے نہیں آپ نے فرمایا کہ میں بخارا جا کر اپنی یادداشت لکھا کرتا ہوں۔

محمد بن حمدویہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے امام بخاری کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ مجھے تین لاکھ حدیثیں یاد ہیں جس میں ایک لاکھ تو بالکل صحیح ہیں دو لاکھ غیر صحیح۔ علی بن الحسین البیکندی بیان کرتے ہیں کہ امام صاحب ایک دفعہ ہمارے یہاں آئے کسی نے ہمارے حلقہ میں سے کہا کہ میں نے اسحق بن راہویہ کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ مجھے اپنی کتاب سے گویا ستر ہزار حدیثیں یاد ہیں آپ نے فرمایا کہ لوگ اسے تعجب کیوں سمجھتے ہیں۔ بھلا آپ لوگ اسے کیا کہیں گے جو دس لاکھ حدیثوں پر نظر رکھتا ہو۔

بخاری شریف

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے امام صاحب نے بخاری کی تصنیف و تدوین اٹھارہ برس کی عمر میں شروع کی چنانچہ اس تحقیق و تدقیق سے تصنیف کے مکمل کرنے میں آپ کے پورے اٹھارہ برس صرف ہو گئے امام صاحب نے جب کوئی حدیث جمع بخاری کے وقت لکھی تو غسل فرمایا اور دو رکعت نماز ادا فرمائی یہ خصوصیت کسی امام اور محدث کو حاصل نہیں ہے آپ نے فرمایا کہ میں بخاری شریف کو اپنے اور اپنے معبود کے درمیان حجت قرار دیتا ہوں۔ باوجود اس حزم و احتیاط کے مزید احتیاط کی غرض سے بخاری کے مسودات کو تین مرتبہ شروع سے لیکر آخر تک دیکھا اور اس کو درست فرمایا۔

کسی ادبی شاہکار کی قدر ایک ادیب ہی کر سکتا ہے اور کسی

فلسفیانہ عقدہ کشائی پر ایک فلسفی ہی داد تحسین دے سکتا ہے اسی طرح علم حدیث کی اس خدمت کی قدر وہی لوگ کر سکتے ہیں جو خود اس کی اہمیت و عظمت سے واقف اور اس کے عاشق و دلدادہ تھے۔ چنانچہ امام ابوجعفر بن العقیلی بیان فرماتے ہیں کہ جب امام بخاری نے جامع صحیح بخاری تصنیف فرمائی تو اس کو انھوں نے اپنے زمانے کے چوٹی کے علماء و محدثین کے سامنے پیش کیا امام احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین اور علی المدینی وغیرہ نے اسے بہت پسند کیا اور اس کی صحت و خوبی کی بڑی تعریف فرمائی مگر چار حدیثوں پر ان حضرات نے جرح فرمائی جس پر امام صاحب نے انھیں بھی صحیح ثابت کر دیا۔

صحیح بخاری کے فضائل

ابو زید مروزی فرماتے ہیں کہ میں ایک دن خانہ کعبہ میں رکن اور مقام کے درمیان سو رہا تھا کہ میں نے روحی فداہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آپ مجھ ہیچمرز کو مخاطب کر کے فرما رہے ہیں کہ اے ابو زید تو کتنے عرصہ سے کتاب شافعی کا درس دے رہا ہے اور میری کتاب کا درس نہیں دیتا میں نے عرض کیا فداک ابی وامی یا رسول اللہ آپ کی کون سی کتاب ہے فرمایا جامع محمد بن اسمٰعیل (یعنی صحیح بخاری) خطیب بغدادی نے فرمایا ہے کہ محمد بن یوسف الغزیری کے متعلق روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں یہ سوال کرتے ہوئے سنا کہ کہاں جاتے ہو؟ محمد بن یوسف نے عرض کیا کہ محمد بن اسمٰعیل (جامع بخاری) کے پاس آنحضرت نے فرمایا انھیں میرا سلام کہنا۔

علما اور ائمہ نے بخاری شریف کے ختم کو بھی بہت زیادہ مفید و موثر قرار دیا ہے چنانچہ حافظ ابن کثیر نے فرمایا ہے کہ صحیح بخاری وہ متبرک اور مقبول بارگاہ خداوندی کتاب ہے کہ اس کا ختم پڑھ کر باران رحمت طلب کیا جاتا ہے۔ شیخ عبداللہ بن ابی حمزہ نے فرمایا ہے کہ میں نے اہل عرفان کی ایک جماعت سے ملاقات کی ہے جنھوں نے مجھ سے یہ بیان کیا کہ بخاری شریف کا ختم بڑی بڑی مصیبتوں میں کام آیا ہے اور جب پڑھا گیا مصیبتوں کا خاتمہ ہو گیا حضرت شیخ عبدالحق صاحب نے اشعۃ اللمعات میں تحریر فرمایا ہے کہ بہت سے مشائخ و علماء و ثقات نے اپنی مرادوں کے حصول اور بلاؤں کے دفیعہ وغیرہ کے لئے بخاری شریف کا ختم پڑھا ہے اور ان کے حوائج و مقاصد بفضل الٰہی پورے ہوئے ہیں اور یہ ختم اب ایسا مجرب و آزمودہ ہو گیا ہے کہ علما کے درمیان بہت زیادہ مشہور و معروف ہے مذکورہ بالا علماء کے علاوہ ایک کثیر تعداد علماء و محدثین کی اس کی تائید میں ہے۔

دوسری تصانیف

آپ کی تصانیف میں اگرچہ صحیح بخاری نے زیادہ اہمیت و شہرت حاصل کی لیکن اس کے علاوہ بھی آپ نے مختلف کتابیں تصنیف فرمائی ہیں چنانچہ آپ کی کتابوں میں سے ایک کتاب تاریخ اوسط ہے جس کو عبداللہ بن احمد بن عبدالسلام الخفاف نے آپ سے روایت کیا ہے ایک دوسری کتاب برالوالدین ہے جسے محمد بن دلویہ الوراق نے روایت کی ہے ایک کتاب کتاب الضعفاء ہے جس کی روایت ابو بشیر محمد ابن احمد ابن حماد الدولابی نے کی ہے اس کے علاوہ الجامع الکبیر۔ المسند الکبیر۔ التفسیر الکبیر۔ کتاب الاشربہ۔ کتاب الہبہ۔ کتاب المبسوط وغیرہ آپ کی تصنیفات سے ہیں۔ آپ کی تصنیفات کا اندازہ چالیس مجلدات تک ہے۔ مگر اکثر ان میں زمانہ کے ہیر پھیر سے ضائع ہو کر ہمیشہ کے لئے معدوم ہو گئی ہیں۔

اخلاق و عادات

نہایت حق گو۔ شریف النفس بلا امتیاز، صاف گو اور صاف معاملہ تھے شاگردوں سے نہایت نرمی اور حسن خلق سے پیش آتے امرا اور روسا سے پرہیز کرتے تجارت ذریعہ معاش تھا نہایت درجہ متقی تھے بحد غد لشکر رہنے والے۔ عموماً دن روزے سے اور رات عبادت میں گزرتی تھی۔ ان کے علاوہ جو وقت ملتا علم کی خدمت میں گزرتا تالیف و تصنیف ان کا مشغلہ خاص تھا فیاضی اور سیر چشمی میں دور دور مشہور تھے زہد اور قناعت میں امتیازی درجہ حاصل تھا۔

حلیہ

قد متوسط مائل بہ کوتاہی جسم قدرے فربہ چہرہ بھرا ہوا گول گردن لمبی پیشانی چوڑی بینی بلند اور رخسار گداز تھے داڑھی گھنی اور متوسط تھی چال تیز اور سبک تھی گفتگو صاف اور سادہ ہوتی تھی چہرہ سرخ و سفید اور پر رعب تھا۔ کثرت سفر اور علم دین کی کثرت خدمت کی وجہ سے آنکھوں میں گڑھے پڑ گئے تھے لباس سفید زیادہ تر مرغوب تھا عمامہ عموماً سبز ورنہ سیاہ باندھتے تھے۔ پاجامہ اور تہبند دونوں پہنتے تھے مگر آخر الذکر زیادہ استعمال میں رہتا۔

وفات

دنیا میں کسی چیز کو بقا نہیں۔ جو آیا ہے جانے کے لئے اس اصول سے امام موصوف بھی مستثنیٰ نہیں ہو سکتے تھے بالآخر ۶۲ سال کی عمر

میں [illegible] میں علامہ موصوف نے بعد نماز عشار رحلت فرمائی۔
وفات کا بھی مورخین نے عجیب واقعہ لکھا ہے آپ اپنی حق گوئی کی وجہ سے اُمراء اور رؤسا کے نزدیک محبوب نہیں تھے اس لئے جہاں بھی آپ جاتے حرص دنیا کے بندے آپ کے پیچھے پہنچتے اور بالآخر آپ کو وہ مقام چھوڑنا پڑتا۔ ساری عمر یونہی تحصیل علم اور صحرا نوردی میں گذری تھی اب زمانہ تھا کہ بڑھاپے میں کچھ آرام ملتا تو امراء نے آپ کا پیچھا کیا آپ ایک شہر سے دوسرے شہر جاتے مگر ہر جگہ آپ کے دشمن آپ کے ساتھ جاتے اور تنگ کرتے ایک دن ظہر کی نماز پڑھ کر بیٹھے تھے کہ اس شہر کے امیر کا آدمی آیا اور اس شہر سے نکل جانے کا حکم دیا۔ آپ پہلے ہی روز روز کی گردش سے ملول ہو چکے تھے بارگاہ خداوندی میں ہاتھ اٹھائے اور دعا مانگی کہ اے خدا اگر تو میرا جینا ناسپاس اور اچھا خیال فرماتا ہے تو جیتا رکھ ورنہ اب تو مجھے اٹھالے۔ خدا نے یہ دعا قبول کی اور اسی رات عشاء کی نماز کے بعد اچانک آپ کے بدن سے بہت سا خوشبودار پسینہ خارج ہوا اور چند لمحات میں اچھے بھلے صحیح و تندرست اس دار فانی سے عالم جاودانی کی طرف رخصت ہو گئے روایتوں میں ہے کہ آپ کی قبر سے مدتوں اس قدر خوشبو نکلتی رہی کہ لوگ قبر کی مٹی کو بطور مشک و عنبر استعمال کرتے رہے۔

رحمۃ اللہ علیہ و برکاتہ

غزل

از جناب آئی۔ بی۔ شمر میرٹھی

جذبۂ دل سے کام لے آہ کو پُر اثر بنا — منزل ابھی تو دُور ہے شوق کو راہبر بنا

مانا کہ رُوئے یار پر پردے پڑے ہیں صد ہزار — تُو بھی نظر سے کام لے اپنی نظر نظر بنا

جلوۂ حُسن راز ہے پردۂ راز ہی میں دیکھ — دل کو بنا تو کیا مگر آنکھ کو رہگذر بنا

طُولِ شبِ فراق سے آہ کا سلسلہ نہ توڑ — تُو بھی نفس کی چال سے آہ کو مختصر بنا

قبلہ ہے کس طرف مرا دُوں میں کسی کو کیا پتہ — اُس نے جدھر کو رُخ کیا کعبہ مرا اُدھر بنا

گردشِ روزگار بھی ایک عجیب خواب ہے — آگ لگی کسی کے گھر اور کسی کا گھر بنا

حُسن کی جلوہ ریزیاں خاص نہیں ہیں عام ہیں — دیدۂ دل سے کام لے آنکھ بنا نظر بنا

زینتِ عشق کے لئے سیکھ کمالِ زندگی — دیدۂ تر سے اے شمر مثلِ صدف گہر بنا

انداز رندانہ

اذاں میں کہہ گیا میں ایکدن یا پیر میخانہ

از حضرت نشور واحدی کانپوری

یہاں سجدہ وہاں سجدہ معاذ اللہ دیوانہ ۔۔۔ نہ کعبہ دیکھتا ہے اپنے عالم میں نہ بتخانہ

تو میرا ذکر میری یاد چھوڑ اے حسن فرزانہ ۔۔۔ جلا دے داستاں میری بھلا دے میرا افسانہ

جفائے بے حسابانہ ادائے دلربایانہ ۔۔۔ کوئی انداز ہو لیکن حجابانہ حجابانہ

تری آنکھیں جمال یار پر ٹھیریں تو کیا ٹھیریں ۔۔۔ نظر اک رشتۂ شبنم تجلی آفتابانہ

دیار عشق کی دشواریاں العظمۃ للہ ۔۔۔ سفر پہلا مسافر نے یہاں اور ملک بیگانہ

معاذ اللہ میخانے کے اوراد سحرگاہی ۔۔۔ اذاں میں کہہ گیا میں ایک دن یا پیر میخانہ

مری دنیائے مے کو لوگ جانیں کیا سمجھتے ہیں ۔۔۔ کسی کی پاک مسجد اور مرا ناپاک میخانہ

نشور واحدی کی بھی غزل کیا خوب ہوتی ہے
تخیل پاکبازانہ مگر انداز رندانہ

نئی دنیا

ہرمن آؤلڈ کا ایک تاریخی ڈراما

ترجمہ جناب محمد اسحاق الہ آبادی

افراد

کرسٹوفر کولمبس ....
پیڈرو گوٹیرز .... جہاز کا ایک افسر
پے پے .... ایک خدمتگار لڑکا

جوان پیٹینو ....
ڈائیگو گارسیا ....
فرانسسکو .... } ...... دیگر خلاصی
گیلر مو آئرش ....

مقام .... تختہ جہاز
زمانہ .... ۱۱ اکتوبر ۱۴۹۲ء کی رات

منظر۔ جہاز ایک طرف سے نظر آرہا ہے جس کی وجہ سے جہاز کا پچھلا حصہ کچھ بائیں طرف کو جھکا ہوا ہے۔ تختہ جہاز سٹیج کا زیادہ حصہ لئے ہوئے ہے اگر نظر آسکے تو بیچ کا مستول ایک صلیب کی شکل اختیار کئے ہوئے ہے جس کے گھماؤ میں ہر شخص کا جسم قدرتی طور پر دکھائی دیتا ہے۔ تختہ کے اوپری حصہ پر ایک فانوس رکھا ہے جس میں شمع جل رہی ہے۔ رات ساکن ہے اور بادبان بھی دو خلاصی نظر آرہے ہیں جو بالکل داہنی طرف ہیں جوآن دو زانو بیٹھا رسیاں درست کر رہا ہے۔ ڈائیگو اس کا ہاتھ بٹا رہا ہے یہ محض دکھاوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنا اصل مطلب چھپانا چاہتے ہیں کبھی کبھی دونوں ذرا کانا پھوسی کر لیتے ہیں۔

ڈائیگو۔ آدھ گھنٹہ کے اندر اندر ہی تختہ جہاز کے سرے پر اس کے وجود سے خدا کے وجود کی طرح انکار نہیں کیا جا سکیگا۔ اس کی آنکھیں آسمان کی طرف اٹھی ہوئی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی آرزو کی (وہ نئی دنیا) ربلی کی طرح اس کی گود میں ٹوٹ پڑیگی۔

(قہقہہ مار کر ہنستا ہے)

جوان۔ بیچارہ۔ بدقسمت!

ڈائیگو۔ جوان! ---- پھر ڈرنے لگے۔

جوان۔ جھوٹ! میں کیوں ڈرنے لگا۔ آخر ڈرنے کی کون سی بات ہے

(تھوڑے وقفہ کے بعد) مگر مجھے اس پر ترس آتا ہے۔

ڈائیگو۔ اپنا رحم کیوں برباد کرتے ہو! وہ ایک پاگل ہے اس کا دماغ اوہام باطلہ سے پر ہے۔ جب ہی تو چالیس خدا پرست خلاصیوں کو وطن کے لئے ترسا رہا ہے۔؟

جوان۔ مگر وہ ایک مہربان پاگل ہے۔

ڈائیگو۔ (بات کاٹتے ہوئے) مہربان اس وقت جب سب کچھ اس کی خوشی پر نچھاور کی جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ ایک خونخوار درندے سے بھی زیادہ سنگدل بن جاتا ہے۔

(خلاصیوں کے ایک کا ترانہ گانے کی آواز آتی ہے)

آواز۔ ملوکیت قائم کرنے کیلئے یہاں شراب کا پیپہ رکھا ہے شیطان زور سے ہنس رہا ہے لیکن خدا بہرہ ہے کچھ نہیں سنتا۔

جوان۔ (تیزی سے) انہیں یہ بند کر دینا چاہیئے کیونکہ جب کپتان اسے سن پاتا ہے تو بہت خفا ہوتا ہے۔

۱؎ کرسٹوفر کولمبس نے سب سے پہلے نئی دنیا کی روشنی ۱۱ اکتوبر ۱۴۹۲ء کی شب کو دیکھی۔ اسے بعض اوقات اپنے جہازیوں کے ساتھ کھلے ہاتھوں مقابلہ کرنا پڑا بس یہی دو واقعات تاریخی ہیں ان کے علاوہ یہ تمام کا تمام مختصر سا ڈراما ایک گہرے تخیل پر مبنی ہے۔ (مترجم)

ڈائیگو۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ ہم لوگ اپنی دلبستگی کے لئے بھی نہ گائیں؛ واہ ——! (وہ لوگ رسّی کے درست کرنے میں محو ہو جاتے ہیں۔ پیڈرو گوٹیرز اندر آتا ہے۔ وہ وہاں خلاصیوں کو دیکھکر کچھ متعجب سا ہوتا ہے۔

پیڈرو۔ کون ہے ——؟

ڈائیگو۔ (کھڑے ہوتے ہوئے) ڈائیگو گارسیا اور جوان پنٹو جناب؟

پیڈرو۔ (شک دور کرتے ہوئے) اندھیرا کافی ہے۔ اگر چاند دکھائی پڑے تو میں اس کا خیر مقدم کروں۔

ڈائیگو۔ ہاں! ہاں! پیڈرو صاحب! اگر ساحل سپین نظر آئے تو ہم لوگ اس کا خیر مقدم کرنے کو تیار ہیں۔

پیڈرو۔ (تنبیہ کرتے ہوئے) بے صبر ڈائیگو۔

ڈائیگو۔ (بے رخی سے) صبر کی بھی حد ہوتی ہے جناب۔

پیڈرو۔ (مزاحیہ انداز میں) اور تم اس کی حد تک پہنچ چکے ہو نا؟

ڈائیگو۔ ہم لوگ اس چمگادڑ سے ہیں جو دن کے وقت اڑنے کی ناکام کوشش کر رہا ہو۔ کیوں اٹکے کے چلتے دس کا خون ہو۔

پیڈرو۔ (اپنا رعب قائم رکھتے ہوئے) مجھے اُمید ہے کہ تم لوگ غداری نہیں کرو گے۔ ڈائیگو!

ڈائیگو۔ غدر ایک مکروہ لفظ ہے جناب!

جوان۔ اور وہ ایک مکروہ فعل بھی ہے۔

(جوان رسّی کی درستی کا کام ختم کر کے کھڑا ہوتا ہے اور ایک سلام کے ساتھ باہر چلا جاتا ہے۔ کولمبس اندر آتا ہے وہ ایک لمبے قد اور بھرے بدن کا آدمی ہے۔ عمر چھیالیس سال۔ رنگ سانولا، سر کے بال بھورے رنگ کے ہیں۔ وہ ایک جلد خفا ہو جانے والا انسان ہے اس کے چہرے پر غم کے آثار نمایاں ہیں۔ پیڈرو کو ڈائیگو کے ساتھ گفت و شنید کرتے دیکھ کر اسے کچھ شبہ ہوتا ہے مگر فوراً ڈائیگو کی طرف گھوم جاتا ہے)

کولمبس۔ دیکھو مستول کی شمع ٹپک رہی ہے اُسے ٹھیک کر دو۔

ڈائیگو۔ (بدحواسی میں) جی!...... جی سرکار ——! (جاتا ہے)

کولمبس۔ (واپس بلاتے ہوئے) اور —— ڈائیگو!

ڈائیگو۔ (لوٹتے ہوئے) جی سرکار!

کولمبس۔ یہ تختہ جہاز ہے۔

ڈائیگو۔ جی سرکار!

کولمبس۔ ایک نیک خلاصی کو اپنی جگہ اچھی طرح جاننا چاہیئے۔

ڈائیگو۔ (ڈرتے ہوئے) جی سرکار!

(کولمبس باہر جانے کا اشارہ کرتا ہے۔ ڈائیگو اپنی بے چینی چھپاتا ہوا نکل جاتا ہے۔)

کولمبس۔ (پیڈرو کو مخاطب کر کے) بدتمیز کتا!

ڈائیگو۔ بدتمیز اور خطرناک کتا حد سے بڑھ چلا ہے۔

کولمبس۔ میں نے اُسے جتا دیا ہے۔

(کولمبس کچھ دیر وہیں کھڑا کچھ سوچتا ہے دفعۃً تختہ جہاز کے اوپری حصہ پر جاتا ہے اور سمندر کی طرف دیکھنے لگتا ہے۔ پیڈرو اس کی تقلید کرتا ہے۔ خدمت گار لڑکا چپکے چپکے تختہ جہاز پر آنے کے راستے سے اس طرح جھانکتا ہے کہ کوئی اسے دیکھ نہ لے جب وہ باتیں کرنے لگتے ہیں تو وہ بڑی آرزو مندی سے ان کی سنتا ہے۔)

کولمبس۔ بادِ شرقی! ہمیشہ بادِ شرقی! خدا ہوا میں رہتا ہے۔ کیوں پیڈرو!

پیڈرو۔ (دلی ہنسی سے) مگر کپتان! جہازی تو کہتے ہیں کہ ہوا میں شیطان ہے۔ ہر روز —— دن بھر ہوا یورپ ہی کی طرف سے چلتی ہے اور انہیں ان کے گھر بار، بیوی بچے، دوست آشنا سے دُور —— بہت دور —— بہا لے جاتی ہے!

کولمبس۔ (جلدی سے) تم بھی پیڈرو کیا مجھ پر شک کرتے ہو؛

پیڈرو۔ کیپٹن! میں نے ایسا کب کہا۔ میں تو آپ ہی کا طرفدار ہوں۔

کولمبس۔ معاف کرنا دوست! تم تو ان چند لوگوں میں سے ہو جو وفادار ہیں۔ میرے خیال میں تمہاری وفاداری اوروں کی وفاداری سے کہیں بڑھ کر ہے سنتے ہو؟

(خلاصیوں کے گانے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ کولمبس اور پیڈرو تختہ جہاز کے اُوپری حصہ سے اتر آتے ہیں)

کولمبس۔ وہ لوگ حد سے زیادہ پی گئے ہیں۔

پیڈرو۔ وہ سادہ لوح انسان ہیں۔ عیش کرنا ان کے حق میں ضروری ہے (دوسرا جملہ اس کی زبان سے بیساختہ نکل پڑا۔) ہم لوگوں کو تو آپ کی طرح بصیرت نہیں ملی۔

کولمبس۔ تم پھر شک کرنے لگے پیڈرو! مجھے اپنے دلی مقصد سے آگاہ کرو میں ایک بے صبر انسان ہوں۔ کہیں تمہارے حق میں بُرا نہ بن جاؤں مگر (مسکراتے ہوئے) اسی میں بھلائی ہے پیڈرو اسی میں بھلائی ہے تم بے دھڑک کہہ ڈالو۔

پیڈرو۔ (شروع میں خلاف رہتا ہے مگر آخیر میں طرفدار بن جاتا ہے کہ) آخر کار ...... [illegible]

ہوگئی ہے کہ ہم لوگوں نے سان سپین کو پیچھے ہٹتے ہوئے دیکھا تھا آپ نے ہم لوگوں کے سامنے تلاش کی ایک جھلکتی ہوئی امید پیش کی تھی اور ہم لوگوں نے آپ پر اعتبار کیا۔ دن پر دن گذرتے گئے اور ہم لوگوں نے اپنے آپ کو ایک بے پایاں سمندر میں پایا مگر اب بھی ہم کو آپ پر اعتبار ہے...... کم از کم مجھے تو آپ پر اعتبار ہے۔ (فخر کے ساتھ) میں کچھ تعلیم یافتہ شخص ہوں آسانی سے قدرت کی غیر معمولی باتوں پر تعجب نہیں کرتا۔ جیسا کہ جاہلوں کا شیوہ ہے۔ لیکن میں تسلیم کرتا ہوں کہ جہاز کی سوئی سیدھے شمال کی سمت اشارہ کرنے کی بجائے گھوم گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ شیطان نے اس پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور شمال مغرب کی سمت اشارہ کرنے لگی تو مجھے کچھ بے چینی سی محسوس ہوئی۔ میں بچہ نہیں، احمق نہیں ایک وہمی جہازی نہیں۔ مگر ایک ایسے معمہ میں جو ہماری نگاہوں میں ٹھیک نہیں، ہم اپنے آپ کو الجھانا نہیں چاہتے۔ اپنی تمام عاجزی اور انکساری کے ساتھ کیپٹن میں دریافت کرسکتا ہوں کہ کیا یہ خدا کی مرضی ہے کہ ہم لوگ اس سفر کو قسمت کی تمام بدبختیوں سے مقابلہ کرتے ہوئے جاری رکھیں؟

کولمبس: (بے صبری سے) یہ میری مرضی ہے۔ کیا یہ کافی نہیں؟

پیڈرو۔ (سر کو خم کرتے ہوئے) میں جواب دے چکا ہوں۔

کولمبس: (جلدی سے) معاف کرنا پیڈرو۔ میری بے لگام زبان ــــــ آہ زبان۔ میں لگام نہیں۔ میرا بدترین دشمن! (ذرا اطمینان کے ساتھ) میری مرضی دوست! چونکہ خدا کی مرضی ہے کیا یہ کافی نہیں؟

پیڈرو: (اظہار اطمینان کے بغیر) میں آپ کے دعوی کی تردید نہیں کرتا حضور۔

کولمبس: (گرجتے ہوئے) مگر میں تمہارے دعوی کی تردید کرتا ہوں (خلاصیوں کے گانے کی آواز پھر سنائی دیتی ہے) ان کے گانے پر خدا کی مار ہو انہیں خاموش کرو۔ (پیڈرو غمگین صورت بنائے جاتا ہے۔ اب کولمبس تنہا رہ جاتا ہے۔ وہ سمندر کی طرف دیکھ کر بڑبڑاتا ہے) معمہ! کیا خدا نے معمہ حل کرنے کی صرف خواہش پیدا کی اور اس کا حل نہیں بتایا۔ (دفعتہً پے پے دوڑ کر تختہ جہاز پر قدم رکھتا ہے کولمبس چونک پڑتا ہے) کون؟

پے پے۔ میں ہوں کیپٹن! پے پے ــــــ!

کولمبس: (خفگی ظاہر کرتے ہوئے) کیا تم وہاں بہت دیر سے بیٹھے ہو

پے پے: جی ــــــ حضور، مگر میں اپنا فرض پورا کرچکا۔

[illegible]

پے پے۔ (جھجکتا ہوا اسے بات کرنے کا حق مل گیا ہے اس لئے ہچکچاتے ہوئے) میں ان کی رفاقت پر آپ کی رفاقت کو ترجیح دیتا ہوں (نیچے کی جانب اشارہ کرتا ہے) کیا میں اس جگہ رہ سکتا ہوں حضور؟

کولمبس: (اس کا مذاق اڑاتے ہوئے) کیسے لڑکے ہو۔ بھلا وہ لوگ اس ترجیح دہی کے متعلق کیا کہیں گے؟

پے پے۔ میں ان سے باتیں نہیں کرتا۔ میں ان سے نفرت کرتا ہوں۔

کولمبس: دیکھو پے پے تم چلے جاؤ۔ (پے پے بیدلی سے پلٹتا ہے) جلدی! (لڑکا اور تیزی سے جاتا ہے) سنو! تم نے سنا ہے پیڈرو نے کیا کہا ــــــ؟

پے پے۔ سنا ہے کیپٹن! اور وہ ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔

کولمبس: لیکن پھر بھی وہ شک کرتا ہے۔

پے پے۔ ہر کوئی شک کرتا ہے ــــــ سوا میرے۔

کولمبس: (تلخی سے) ہر کوئی۔

پے پے۔ (آرزومندی سے) سوا میرے کیپٹن! سوا میرے۔

(وہ اس کے پاس تیزی سے آتا ہے)

کولمبس۔ (لڑکے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) تم کمسن ہونے کے باوجود مجھ پر اعتبار کرتے ہو۔ شکریہ لڑکے!

(خلاصیوں کے گانے کی آواز پھر سنائی دیتی ہے)

پے پے۔ جب وہ زیادہ پی لیتے ہیں تو بہت خطرناک ہو جاتے ہیں اور اپنے قول و قرار کو بھول جاتے ہیں۔

کولمبس: بیچارے ــــــ!

پے پے۔ (نزدیک آتے ہوئے) کیپٹن ذرا ہوشیار رہئے گا۔ بعض اوقات وہ آپ سے مایوس ہو جاتے ہیں۔

(گانے کی ترنگ ایک شور و غل کے ساتھ بڑھتی ہے)

کولمبس: کتنا برا لگتا ہے۔ میں نے پیڈرو سے کہہ دیا ہے کہ اسے بند کروا دیا جائے کیا تم اسی لئے سمجھتے ہو کہ وہ خطرناک ہو جائیں گے (پیڈرو واپس آتا ہے) اچھا تم جاؤ۔ (پے پے اپنی جگہ سے ہٹتا ہے مگر باہر نہیں جاتا) اچھا پیڈرو! ان کا گانا اب ایک شور و غل میں بدل گیا ہے۔ ان کی حد سے زیادہ بے صبری نحوست ہے۔

(شور و غل اور بھی بڑھتا ہے)

پیڈرو۔ کیپٹن! وہ لوگ میرا کہنا نہیں مانتے۔

کولمبس: (غصے میں) ان میں سے ایک کی مثال پیش کرتا ہوں (دفعتہً دیکھ کر) شیطان تختہ ... [illegible]

(فرانسسکو داہنی طرف سے دکھائی دیتا ہے)

کولمبس۔ اوہ فرانسسکو! ۔۔۔ تم ہو؟

فرانسسکو۔ جی ہاں! مگر میں شیطان نہیں!

کولمبس؛ تو پھر ایسی حرکت کیوں کرتے ہو؟ تم یہاں کیوں آئے ہو؟ کیا سمندر میں فرمانبرداری نہیں ہوتی؟ کیا ان دونوں خادم و مخدوم میں کوئی فرق نہیں ۔۔۔!

فرانسسکو۔ (لجاجت سے) آپ کے الفاظ بڑے دلخراش ہیں حضور!

کولمبس؛ ہوں! میں خلاصیوں کی بیجا بڑبڑاہٹ سے تنگ آگیا ہوں۔ میں بہت دنوں تک صبر کر چکا۔

فرانسسکو؛ میں آپ کو ہوشیار کرنے آیا ہوں حضور! خلاصیوں کا غصہ بہت خطرناک ہے۔

کولمبس؛ میری زندگی کی ہر سانس خطرے میں ہے۔ مجھے اپنے زندہ ہونے میں شک ہونے لگتا ہے ۔۔۔ جب خطرے سے دور ہوتا ہوں۔

(الفاظ اس کی زبان سے ایک اینٹھن کے ساتھ ابلنے لگتے ہیں) صبر کی حد ہوتی ہے ہم آگے بڑھنا نہیں چاہتے۔ میں آپ کی شخصیت کی قدر کرتے ہوئے آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں ۔۔۔ میں بالکل حق بجانب ہوں۔ مگر ایک بہت بڑے سمندر میں کبھی نہ ختم ہونے والی جہازرانی کرنا انسانی طاقت سے باہر ہے۔

کولمبس؛ (پیڈرو سے) پیڈرو! جہاز تمہارے ہاتھ میں ہے۔ میں اپنے دوست کے ساتھ براہ راست گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ (پیڈرو تختۂ جہاز کے اوپری حصہ پر جاتا ہے۔ کولمبس دھیمی مگر موثر انداز میں فرانسسکو کی طرف مخاطب ہوتا ہے جو پہلے ہی سے غیر معمولی قربت سے حواس باختہ ہو رہا تھا) فرانسسکو! مجھے تم سے دو باتیں کرنی ہیں۔ بہتوں کو خدا نے اپنی مرضی پوری کرنے کو چھوڑ رکھا ہے۔ میں بھی انہی میں ہوں۔ ہم میں اس جہاز سے زیادہ قوت نہیں۔ ہم دونوں خدا کے اوزار ہیں۔ بعض اوقات اس کا انتخاب کچھ عجیب سا ہوتا ہے۔ غالباً اس کی مرضی کو مجھ سے زیادہ بہادر انسان زیادہ آسانی سے پوری کر سکتا تھا مگر خدا نے یہ کام میرے سپرد کیا۔ تو اب مجھے اس سے کون روک سکتا ہے؟ چار دانگ عالم میں حضرت مسیح کا پیغام پہنچنا ضروری ہے میری بصیرت نے اس حقیقت کو بے نقاب دیکھا ہے جو مقدس انجیل کی پیشین گوئی میں ہے اور میں یہ جانتا ہوں کہ یہ مہم میرے سر ہے میں ہی دنیائے عظیم کو جو سمندر پار ہے تلاش کروں گا۔ اور اسے پاؤں گا۔ اس کے وجود سے ٹھیک خدا کے وجود کی طرح کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

فرانسسکو؛ آپ کی بصیرت تو ان بیچاروں کے لئے وبال جان ہے۔

کولمبس؛ (جلدی سے) بیچاروں کو اپنا فرض ادا کرنا چاہیئے۔

فرانسسکو؛ فرض کی بھی کوئی حد ہے۔ انسان فرض اور منفعت کے لئے کیا کچھ نہیں کرتا مگر آپ حد سے زیادہ طلب کرتے ہیں۔ وطن، عزیز، اقارب، دوست، آشنا، اور شاید زندگی بھی، یہ سب کچھ آپ طلب کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آپ کی شہرت کے لئے ہم یہ سب کچھ دیدیں۔ ہم لوگ خدا کے منتخب نہیں ہیں کہ نئی راہیں تلاش کرتے پھریں۔ ہم بیچارے ادنیٰ قسم کے لوگ ہیں مدتوں سے اپنے گھروں کیلئے ترس رہے ہیں۔

کولمبس؛ یا خدا! فرانسسکو! تم میرا امتحان لے رہے ہو؟

فرانسسکو؛ (ہمت کرکے) اس سے کہیں زیادہ آپ ہمارا امتحان لے رہے ہیں حضور میں آپ کے پاس ایک دوست کی حیثیت سے آیا ہوں، حضور ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے اور اب چھلکا ہی چاہتا ہے۔ انھیں بغاوت پر آمادہ ہی سمجھئے۔ آپس میں پھوٹ پڑ جائیگی (گانے کی ترنگ پھر بڑھتی ہے اور رکے ہوئے الفاظ گانے میں جذب ہو جاتے ہیں۔ گیلر مو آرش کی آواز اوروں سے تیز ہو جاتی ہے) سن رہے ہیں حضور؟

کولمبس؛ میں خونخوار درندوں کی غراہٹ سن رہا ہوں۔

فرانسسکو؛ آپ نے تو صرف مظلوم انسانوں کی فریاد سنی ہے حضور! (پھر گیلر مو کی آواز چیخ پکار میں بدل جاتی ہے۔ کولمبس ان کے الفاظ سننے کی کوشش کرتا ہے) سن رہے ہیں حضور؟

پیپے۔ (جواب تک بغور سن رہا تھا) وہ ایسا نہیں کر سکتے ۔۔۔ وہ ایسا نہیں کر سکتے ۔۔۔!

کولمبس؛ ادھر آؤ لڑکے! وہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟

پیپے۔ (تقریباً روتے ہوئے) وہ کہتے ہیں "ماننا یہریا" اب کولمبس کا مزید بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

کولمبس (تلخی سے) وہ یہ کہہ رہے تھے سچ مچ؟

(کچھ دیر آنکھیں جھپکائے کھڑا رہتا ہے)

فرانسسکو؛ معاف کیجئے گا حضور: ..... میں جانتا ہوں کہ اس کا ان پر کتنا برا اثر پڑا ہے۔

کولمبس؛ (حاکمانہ لہجہ میں) گیلر مو آرش کو میرے پاس بھیجو۔

فرانسسکو۔ (اختلاف کرتے ہوئے) معاف کیجئے گا حضور ۔ ۔ ۔ مگر

کولمبس۔ تادیب ؟ اگر گرفتنی جانتا ہے۔

فرانسسکو۔ (غصے سے) تادیب ماضی کی شے ہے، حضور یہ آپ کے لئے ہے۔ ہمارے لئے نہیں۔

کولمبس۔ (پیڈرو سے) پیڈرو! گیلرمو آئرش میرے پاس بھیجا جائے، آپ جانتا ہے کہ زنجیروں میں کیا رکھا ہے۔

(پیڈرو تختہ جہاز کے نصف ہی پر ہوتا ہے کہ گیلرمو آئرش اور دوسرے خلاصی غصے کے ساتھ دیوانے جانوروں کی طرح غراتے ہوئے کولمبس کی طرف جھپٹتے ہیں)

کولمبس۔ (ایک گرجدار آواز کے ساتھ) ٹھہرو! اس طرح کی وحشیانہ چیخ پکار کے کیا معنی ہیں؟ (لوگ بے بس ہو کر کھڑے ہو جاتے ہیں) ذرا بھی حرکت ہوئی تو تمام رات زنجیروں میں کاٹنی پڑے گی۔

(تھوڑا سا وقفہ جس کے درمیان کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتا پھر ایک وحشیانہ چیخ کے ساتھ گیلرمو آئرش مجمع سے نکل کر کولمبس کی طرف بڑھتا ہے)

گیلرمو۔ کوئی ہے جو اسے زنجیروں میں جکڑ دے ہم ایک مقابلہ میں تین ہیں

کولمبس۔ (ملائمت سے) اگر اس کے لئے کوئی تیار نہیں تو میں خود اسے انجام دونگا۔ ہٹ جاؤ۔ میں کچھ نہیں سننا چاہتا۔

گیلرمو۔ (انتہائی برانگیختگی سے) ہم حد سے زیادہ صبر کر چکے۔ ہم لوگ بہت دنوں فریب میں مبتلا رہے۔ ہم میں عامیانہ جذبہ ہے۔ ہم وطن لوٹنا چاہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں "سانٹا میریا" اپنا رُخ سپین کی طرف پھیر دے ورنہ ہم انسان نہیں بھیڑیا بن جائینگے۔

کولمبس۔ (مزید ملائمت سے) کیپٹن کے فرائض کون سر انجام دیگا؟

گیلرمو۔ اس کے لئے لوگوں کی کمی نہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ شیطان ہوا پر سوار ہو کر آپ کا ساتھ دے رہا ہے۔ مگر ہمیں بھی سمندر کا تجربہ ہے ایک دفعہ شیطان کے پنجے سے چھوٹ کر ہم وطن کی راہ ضرور لینگے

(باقی خلاصیوں سے رضامندی کے آثار نمایاں ہوتے ہیں۔ کولمبس خاموش رہنے کے لئے اپنا ہاتھ اٹھاتا ہے۔ وہ خلاف معمول زرد پڑ جاتا ہے مگر ملائمت سے پیش آتا ہے۔)

کولمبس۔ گیلرمو! تم ایک تجربہ کار خلاصی ہو۔ تم میں بہت سی خوبیاں ہیں، اگر کچھ دنوں پہلے تمہاری زبان اور تمہاری عقل میں اَن بن ہوتی تو شاید تم اپنے پیشے میں ترقی کرتے۔ آج تم صرف ایک پختہ کار خلاصی ہو اور میں تمہارا کیپٹن۔ تمہیں میرا حکم ماننا چاہیئے۔ جس طرح میں شاہی فرمانروائے سپین کا حکم مانتا ہوں جس نے مجھے بھیجا ہے۔ یہ چیز ہر وقت پیش نظر رہے اور اس سے روگردانی کی کوشش نہ کی جائے — جاؤ اب اپنے کام پر جاؤ —!

(پھر تھوڑا سا وقفہ۔ کولمبس کی افسرانہ گفتگو انہیں خاموش کر دیتی ہے دفعتہً ڈائیگو پھر خاموشی توڑتا ہے۔)

ڈائیگو۔ یہ بول بچوں کو فریب دے سکتے ہیں ۔ ۔ ۔ یہ بھول بھلیاں گورکھ دھندا ہمارے لئے نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم سمجھدار ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہمیں دلیل چاہیئے۔

کولمبس۔ خاموش —!

(حاکمانہ طرز گفتگو انہیں خاموش کر دیتی ہے جو آپس میں پھر بھی بڑبڑاتے ہیں۔ کولمبس گھوم کر زینے کے ذریعے سے جہاز کے اوپر بھی اوپری حصے پر جاتا ہے۔ جہاں کھڑے ہو کر نیچے کی طرف نظر ڈالتا ہے۔)

ڈائیگو۔ (غراتے ہوئے) غالباً آپ اپنے خیال میں اب ارضِ مقدس پر ہونگے۔ (زینے کی طرف بڑھتا ہے)

آوازیں۔ (ایک ساتھ) نیچے کھینچ لاؤ۔ سمندر میں دھکیل دو۔ زنجیروں میں جکڑ دو۔ شیطان کا اوزار۔ اٹالین آوارہ۔

(قریب تھا کہ وہ لوگ تختہ جہاز کے گندگاہ کو اکھاڑ پھینکیں کہ پے پے دوڑتا ہے اور زینے کے سامنے اپنے بازو پھیلا کر کھڑا ہو جاتا ہے)

پے پے۔ بزدلو! بزدلو!! تمہیں چاہیئے کہ پہلے مجھے مار ڈالو۔

آوازیں۔ راستہ سے ہٹ جا۔ شیطان کا بچہ۔ تھوک چاٹنے والا۔

کولمبس۔ کیا وہ لڑکا میرے اور موت کے درمیان کھڑا ہے؟ (اس کی تقریر کے آغاز سے خموشی چھا جاتی ہے) پے پے یہاں آؤ۔

پے پے۔ (جلد جلد اس کے پاس جاتے ہوئے) میرے کیپٹن!

(سب لوگ شرمندہ ہو جاتے ہیں)

کولمبس۔ پے پے یہ تلاش کا ایک بحری سفر ہے (آواز بھرا جاتی ہے) میں ایک نئی دنیا تلاش کرنے نکلا تھا۔ بے پایاں سمندروں کے پیچھے ایک نور افشاں زمین۔ ہمارے فرمانروا بادشاہ اور ملکہ کے لئے نئی دولت و ریاست اور اپنے مسیح پر قربان کرنے کے لئے نئے نفس تاکہ ہمیں نجات ملے۔ مگر ان دنوں میں میں نے صرف ایک چیز تلاش کی ہے (ٹھہرتا ہے مگر پھر کچھ سوچ کر تقریر جاری رکھتا ہے) میں نے تلاش کی ہے کہ جب کسی

انسان کو بصیرت ملتی ہے تو اُسی کام کیلئے ہی انجام دینا پڑتا ہے وفاداری دریا کے کنارے اُگنے والے پودے کی طرح ایک ہی موج میں بہہ جاتی ہے۔ دوستی ایک کھوکھلے ستون کی طرح جسے کیڑوں نے کھا لیا ہو ٹوٹ جاتی ہے۔ فرض، تادیب اور اطاعت سب حباب کے مانند ہیں۔ جو پہلے ہی ملاپ میں ٹوٹ جاتے ہیں۔ اب صرف ایک چیز باقی رہ گئی ہے اور وہ سیکر تلاش ہے پے پے!

پے پے۔ (اس کی آنکھیں اضطراب سے چمک اُٹھتی ہیں) کیپٹن! میں وفادار ہوں۔ میں فرمانبردار ہوں اور آپ کا جاں نثار خادم ....

کولمبس۔ (جوش کے ساتھ) میں احسان فراموش نہیں۔

پیڈرو۔ (کھانستے ہوئے تمکنت کے ساتھ) امید ہے کہ میری وفاداری بھی ہمیشہ کی طرح قائم رہے گی حضور۔

(آداب بجالاتا ہے)

کولمبس۔ (جواب دیتے ہوئے) پیڈرو! تم بعض اوقات خاموش رہتے ہو۔ باتیں کرو تو تمہاری وفاداری اور بھی بڑھ جائے۔ پھر بھی میں تمہارا شکرگذار ہوں۔

(کولمبس گھوم کر سمندر کی طرف دیکھتا ہے چند لمحے تک اُس کی توجہ مستحکم رہتی ہے۔ وہ تاریکی میں کسی چیز پر نظر گاڑے رہتا ہے لوگوں میں ایک حرکت ہوتی ہے وہ رُخ پھیرتا ہے)

جوان۔ ہم معمولی حیثیت کے لوگ ہیں۔

کولمبس۔ (جلدی سے) کیا معمولی حیثیت کے لوگ اپنا انصاف خود اچھی طرح کر سکتے ہیں؟

گیلرمو۔ (بے مروتی سے) بہرصورت ہم لوگ صرف کل تک ٹھہر سکتے ہیں

کولمبس۔ سیاہ رات میں نامۂ اعمال خوب سیاہ کیا جاسکتا ہے۔

(گیلرمو ناک بھوں چڑھاتے ہوئے گرجتر مستعدی سے چلا جاتا ہے خلاصیوں میں سے ایک یا دو اس کی تقلید کرتے ہیں۔)

فرانسسکو۔ مایوس ہمیشہ ایک طرح کے برتاؤ نہیں کرتے حضور!

کولمبس۔ (صلح پسند سختی سے) تمہاری وفاداری کا شکریہ! فرانسسکو عمر دراز ہو۔ تمہارا ہر کام قابل تعریف ہوتا ہے — اچھا! شب بخیر۔

(فرانسسکو پھر کچھ کہنا چاہتا ہے مگر یہ سوچ کر کہ اور کچھ ٹھیک نہیں کھسیانا سا ہو جاتا ہے۔ باقی لوگ بھی اس سے کم شرمندہ نہیں ہوتے۔ ایک مختصر سی خاموشی، کولمبس اپنی جگہ کھڑا رہتا ہے لیکن فرط جوش سے کانپتا ہے جب وہ باتیں کرتا ہے تو اس کی آواز میں غیر معمولی لڑکھڑاہٹ پیدا ہو جاتی ہے)

کولمبس۔ جاؤ لڑکے!

(پے پے اس کا ہاتھ پکڑ کر پیار کرتا ہے اور جلدی سے تختۂ جہاز کے پچھلے حصے پر اُتر کر باہر چلا جاتا ہے۔)

کولمبس۔ (پیڈرو کی طرف گھومتے ہوئے) دو منٹ پہلے .... پیڈرو! میں نے دیکھا .... میرے خیال میں میں نے دیکھا .... (تاریکی میں کسی چیز پر نظر جمائے رہتا ہے) وہ تھا — وہ ہے۔

پیڈرو۔ (اضطراب میں) کیا ہے حضور ....؟

کولمبس۔ ایک مدھم سی روشنی۔ ہلتی ہوئی۔ اوپر جاتی اور نیچے آتی ہوئی۔ وہ دیکھو — (اشارہ کرتا ہے)

پیڈرو۔ وہ ہے حضور! خدا کا شکر ہے

(اسی وقت دُور سے ایک جہازی کی چیخ پکار کی آواز سنائی دیتی ہے)

آواز۔ (دور سے) روشنی! روشنی! زمین! زمین!

(ایک جہازی فرط مسرت اور اضطراب سے بدحواس دوڑتا، ہانپتا، کانپتا اوپر آتا ہے)

جہازی۔ آپ نے اسے دیکھا حضور؟ روشنی! خدا کی مہربانی! روشنی!

کولمبس۔ (صلح پسند لہجہ میں) بادبان اوپر اٹھانے کا حکم دیا جائے۔

—— (پردہ) ——

عالمگیر کے مستقل خریداروں کی خدمت میں تین معرکہ آرا خاص نمبر مفت پیش کئے جاتے ہیں تفصیل کیلئے منیجر عالمگیر کو لکھئے۔

جنوری ۱۹۳۴ء کی بات۔

جب میں باپ نہیں تھا

ایک ناسمجھ ہندوستانی کی سبق آموز آپ بیتی

میری شادی کو گیارہ سال ہو چکے ہیں۔ لیکن بہت عرصہ تک ...... میں یہ احساس نہیں کر سکا کہ شادی شدہ لوگ کیونکر خوش رہ سکتے ہیں۔ شادی کیوں ہوتی ہے۔ اور پھر اس کے بعد کیا ہوتا ہے۔ میرے دوست جب اپنی بیوی کے قصے مجھے سنایا کرتے تھے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نے میرے دل کو مسل کر سینے سے باہر نکال دیا ہے۔ اور اس کی جگہ انگیٹھی میں آگ بھر کر رکھدی ہے۔ بہت دن کے بعد میرے ایک خاص دوست کو میری خفیہ بیماری کا پتہ چل گیا۔ اُس نے پوچھا۔

کیا تمہیں جریان کی بیماری ہے۔ میں نے کہا نہیں۔ لیکن پھر اس نے کہا۔ کیا پیشاب سے پہلے اور اس کے بعد کوئی رطوبت خارج ہوتی ہے۔ میں نے کہا ہاں، پھر اس نے خاص بات پوچھی۔ میں نے کہا میں یہ بات جانتا تو ضرور ہوں کہ ایسا ہوتا ہے لیکن آج تک ......

میرا یہ جواب سنکر وہ چونک اُٹھا۔ اور تعجب سے کہا کہ تم نے مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی۔ اگر اُسی زمانے میں بتا دیتے، جب تمہاری شادی ہوئی تھی کہ تم جریان کے مریض ہو، تو میں تمہیں صرف پندرہ دن میں تندرست کر دیتا۔ چنانچہ میرے دوست نے اسی وقت "زنانہ دواخانہ" کو خط لکھ کر "جوہر اعظم" دوا کی ایک شیشی تین روپے آٹھ آنے کو منگائی اور مجھے استعمال کے لئے دی۔ میں نے ترکیب کے مطابق اس دوا کا استعمال شروع کر دیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب میں نے دیکھا کہ دوا شروع کرنیکے ساتویں یا شاید آٹھویں دن پیشاب کے وقت وہ رطوبت خارج ہونی بند ہو گئی۔ اور مجھے اپنے اندر ایک خاص بات محسوس ہوئی دوا ابھی پوری ختم نہ ہوئی تھی کہ ایک روز .... بیوی

جنوری ۱۹۳۶ء کی بات } اپنے دوست کی مہربانی کی بدولت اب میں اس جوانی کی ہری بھری دنیا میں ایک ایسے خوش و خرم نوجوان کی طرح ہوں، جیسے کہ مجھ جیسی عمر کے انسان کو ہونا چاہیئے میری بیوی ایک بچہ کی ماں ہے۔ اور وہ جب اپنے بچے کو کھلاتی ہے۔ اور بچہ ہمک ہمک کر ماں کیطرف دوڑتا ہے اور ماں کے سر کے بال نوچتا ہے تو مجھے یہ بات یاد آتی ہے کہ اس بچے کے باپ کا نام "جوہر اعظم" ہے۔ کیونکہ "جوہر اعظم" دوا سے ہی میری جریان کی بیماری دور ہوئی۔ اور میری خفیہ طاقت پھر مجھے مل گئی۔ کاش جریان کے تمام مریضوں کو معلوم ہو جائے، کہ اس دنیا میں جریان کی اگر کوئی بھرپور دوا ہو سکتی ہے۔ تو وہ "جوہر اعظم" ہے ایک شیشی کی قیمت صرف تین روپے آٹھ آنے ہے۔ اس دوا پر عام فائدے کے خیال سے محصول ڈاک معاف ہے۔

پس ناظرین میں سے جو لوگ میری طرح جریان کی بیماری میں مبتلا ہوں۔ اور پیشاب سے پہلے یا بعد میں قوت مردمی پانی کیطرح بہہ جاتی ہو یا رات کو سوتے میں ناپاکی ہو جاتی ہو یا بعض وقت ...... شرمندگی ہوتی ہو تو انہیں چاہیئے کہ

مینیجر زنانہ دواخانہ ۳۴ اے۔بی دہلی کو خط لکھ کر "جوہر اعظم" دوا کی شیشی بذریعہ وی۔پی پارسل منگالیں۔ صرف ایک ہی شیشی تندرست بنا دیگی۔

"جوہر اعظم" وہی مشہور دوا ہے جسے ۱۹۲۸ء میں آل انڈیا کا مرید سوسائٹی نے کافی تجربہ کر کے عام اعلان کے ذریعہ پبلک کو مطلع کیا تھا کہ "جوہر اعظم" دوا جریان کے مریض کو یقیناً تندرست کرتی ہے۔ اور تمام ملک سے پرزور اپیل کی تھی کہ جریان کے مریضوں کو اس دوا سے فوراً فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ کیونکہ آل انڈیا کا مرید سوسائٹی نے جوہر اعظم کا کافی تجربہ کرایا ہے۔ اور ہر جگہ ہر مریض کو اس دوا نے تندرست کر دیا۔ چنانچہ ۱۹۲۸ء سے آجتک انجمن مذکور کی ہدایت کے مطابق اس دوا پر محصول ڈاک معاف ہے۔ اور کسی خریدار سے محصول پارسل نہیں لیا جاتا۔ صرف دوا کی قیمت لی جاتی ہے۔

بلوچی ادب

تاریخ ادب

از جناب مولائی شیدائی

آج کل بلوچستان کی آبادی تقریباً دس لاکھ ہے۔ بلوچستان سے باہر کرمان سے لے کر جیسلمیر اور شمال میں وادیٔ ہیلمند، دیرہ جات سے لیکر سوراشٹر (گجرات) تک اس غیرفانی قوم کی آبادی تقریباً ۳۰ لاکھ ہے۔ اس رقبہ میں بلوچستان، مغربی پنجاب، سندھ اور گجرات شمار ہوتے ہیں یہاں مختلف بلوچی قبایل آباد ہیں۔ مگر افسوس کہ قوم کی غفلت کی وجہ سے دنیا ان کی تاریخ اور ادبی ترقیات سے اب تک بے خبر ہے یورپ کے چند محققین اور ادیبوں نے جہاں ادبیات مشرق پر خامہ فرسائی کی۔ وہاں بلوچی زبان کو بھی نظرانداز نہیں کیا انڈین سول سروس کے ایک انگریز ملازم مسٹر ایم ڈانگورتھ ڈیمس M. Longworth Dames نے ردھڑی سے لیکر سیوی (Sibi) تک بلوچستان کا سفر اختیار کرکے ایک ضخیم کتاب "پاپولر پوئیٹری آف دی بلوچیز" (Popular Poetry of The Baloochies) تصنیف کی۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی والوں نے مصنف کی کافی حوصلہ افزائی کی ۱۹۰۷ء میں "فوک لور سوسائٹی لندن" والوں نے اس کتاب کو گلاسگو یونیورسٹی پریس سے شائع کرایا۔ اور اس مرتبہ دنیا بلوچی اشعار سے پہلی دفعہ واقف ہوئی مگر افسوس یہ ہے کہ مسٹر ایم ڈیمس کی یہ تصنیف بلوچی ادبیات کے متعلق ایک مستند و مکمل کتاب نہیں ہے۔ اولاً یہ کہ اس میں اخلاق سے گرے ہوئے بعض اشعار درج ہیں۔ ثانیاً یہ کہ کتاب کی زبان سندھ سے لیکر ڈیرہ غازی خاں اور سیوی تک ایک محدود علاقہ سے متعلق ہے۔

مسٹر ایم۔ ڈیمس۔ اگر سراوان۔ خاران، جھلاوان اور مکران کا سفر اختیار کرتے جو خاص بلوچی علاقے ہیں تو انھیں بلوچی زبان کا پورا پورا علم حاصل ہوتا اور کتاب بھی ایک اچھی خاصی مقبول عام تصنیف ہوتی۔ تاہم اس علمی قحط کے زمانے میں ایم ڈیمس کی یہ کتاب اس امر کی گواہ ہے کہ بلوچی زبان میں فصاحت اور بلاغت بدرجہ کمال موجود ہے اور بعض اشعار تو صددرجہ رقت انگیز ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بلوچستان کی سنگلاخ اور صحرائی زمین نے متعدد ایسے بلند پایہ اور نامور سخنور پیدا کیئے ہیں جنھوں نے فارسی۔ بلوچی۔ جٹکی (سرائیکی) اور اردو یا سندھی زبانوں میں خوب طبع آزمائی کرکے دنیائے ادب میں نام پیدا کیا۔ فارسی زبان کا چرچا ایشیا کے ایک بڑے حصہ میں مدت تک رہا اور خود بلوچی اقتدار کے زمانہ میں دفتری زبان فارسی ہی تھی۔ لہذا بلوچی شعرا کے کلام کا بہترین حصہ فارسی میں موجود ہے۔ افسوس ہے کہ ہندوستان کے مشہور محققین و مورخین مولانا شبلی نعمانی اور شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد جیسے بلندپایہ ادیب فارسی زبان کے شعرا کا تذکرہ لکھتے وقت بلوچستان کے متعلق جو ایران کی بہ نسبت ہندوستان سے بہت قریب ہے بالکل خاموش ہیں۔

بلوچی زبان کی اہمیت، کیفیت، وضاحت اور فصاحت کو معلوم کرنا دشوار نہیں بلکہ آسان ہے سنہ ۱۹۱۲ء میں فوجی دفتر کے ایک انگریز ملازم مسٹر ایچ نکال (H. Nicholl) نے رومن رسم الخط میں بلوچی زبان کی گرامر تیار کی جسے رائے صاحب گلاب سنگھ نے لاہور سے شائع کرایا۔ ایک انگریزی دان اس کتاب کے ذریعہ سے بلوچی زبان باسانی سیکھ سکتا ہے۔ عظیم الشان بلوچ قوم نے اپنی تاریخ اور ادبیات کے متعلق کوئی کتاب شائع نہیں کی۔ تاہم شعرالعجم۔ نگارستان۔ مجمع الفصحا اور تذکرہ دولت شاہ سمرقندی سے معلوم ہوسکتا ہے کہ فارسی زبان کی آبیاری کرنے میں بلوچی شعرا کا کافی حصہ ہے۔ فارسی شاعری۔ فارس اور ایران کے سوا ان ممالک میں بھی خوب پھلی پھولی، جہاں مادری زبان فارسی نہ تھی مثلاً غزنی، سیستان، بلخ، سمرقند وغیرہ۔ سیستان، بلوچستان کا ایک حصہ تھا۔ یہی وہ سیستان ہے جو شاہنامے میں زابلستان کے نام سے مشہور ہے اور عرب اُسے سجستان کہتے تھے جس کی حدود کرمان سے لیکر ہرات اور مرو تک پھیلی ہوئی تھیں۔ خراسان بھی اس کا ایک حصہ تھا حضرت فاروق اعظمؓ کے زمانے میں اس علاقہ کا رقبہ ۲۵ ہزار میل کے قریب تھا اگر یہ ذکر وہ بیان صحیح ہے تو سمجھنا چاہئے کہ سیستان اور خراسان بلوچی آبادیاں تھیں موجودہ بلوچستان میں سیستان کا وہ حصہ شامل ہے جس کو جنوبی

سیتان (South Sistan) کہتے ہیں۔ مگر بلوچ اپنی قدیم روایات کے مطابق اب تک بلوچستان کے شمالی مغربی حصہ کو خراسان کہتے ہیں۔

تاریخی اور جغرافیائی لحاظ سے جب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ سیستان بلوچستان کا ایک حصہ تھا تو ہم بلا شبہ کہہ سکتے ہیں کہ سرزمین بلوچستان میں بہت سے ایسے بلند پایہ شعرائے کرام پیدا ہوئے جنہوں نے اقلیم سخن میں صدر جہ ناموری حاصل کی کیونکہ فرخی سیستانی تھا جسے سلطان محمود غزنوی نے اپنے درباری شعرا میں ایک ممتاز عہدہ بخشا۔ شہابی خراسانی اور شمس الدین خراسانی بھی بلوچستان ہی کے فرزند تھے۔ شعرا کے علاوہ بلوچستان کی سرزمین سے کئی ایک بلند پایہ محدث بھی پیدا ہوئے جو علم حدیث اور فقہ میں آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔ جیسا کہ تیسری صدی ہجری میں مشہور امام ابوداؤد ہو گزرے ہیں جو سیستانی تھے ان کی کتاب "سنن ابوداؤد" صحاح ستہ میں تیسرے درجہ پر شمار کی جاتی ہے۔ امام غزالی کا قول ہے کہ جس مسلمان کے گھر میں سنن ابوداؤد موجود ہوگی وہ فقہ کا محتاج نہ ہوگا۔ الغرض اگر مجمع الفصحا اور تذکرہ دولت شاہی سے بلوچی شعرا کی فہرست تیار کی جائے تو یقیناً فارسی زبان کے بلوچ شعرا کا رتبہ چمنستان ادب فارسی میں ممتاز نظر آئے گا۔ غضب ہے کہ بلوچ قوم کے افراد نے بلوچی ادبیات پر آج تک کوئی توجہ نہیں دی۔ یہی سبب ہے کہ اس ترقی و تحقیق کے دور میں جہاں دوسری زبانیں آفتاب و مہتاب بن کر آسمان ادب پر چمک رہی ہیں وہاں ایک عظیم المرتبت اور شجاع قوم کی تاریخ اور ادبیات سے دنیا اس وقت تک بے خبر اور غافل ہے اور اسی لئے بلوچی زبان کا دائرہ بھی محدود ہو گیا ہے۔

بجرم عشق تو ام می کشند و غوغائیست
تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشائیست

ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ فارسی زبان کا سکہ سمرقند سے حیدرآباد دکن اور قونیہ سے لکھنؤ تک جاری تھا۔ بلوچستان، ایران کی سرحد سے ملا ہوا ہے۔ غیر ممکن تھا کہ فارسی زبان کے اثر سے اس کا بلوچی دربار موسوم بہ "میری قلات" Miri of Kalat محفوظ رہ سکتا۔ چنانچہ وہاں بڑی دیر سے فارسی زبان چلی آ رہی تھی۔ ادبا، خواہ شعرا فارسی زبان ہی میں طبع آزمائی کرتے تھے کیونکہ ان دنوں تمام اسلامی ممالک پر فارسی تہذیب و تمدن کا اثر چھایا ہوا تھا۔ بیسویں صدی میں یورپین اقوام کی باہمی کشمکش سے جب یورپ میں قومیت کا مسئلہ چھڑا تو صدیوں کی سوئی ہوئی قومیں بھی نعرۂ قومیت کے شور سے جاگ اٹھیں۔ قومیت کا یہ سیلاب مشرق تک آ پہنچا۔ ترک ہو یا افغانی۔ ایرانی ہو یا تورانی۔ عربی ہو یا چینی غرض کہ ہر قوم اپنی ہی قومیت کا راگ الاپنے لگی۔ اسی مسئلہ قومیت نے زبان کے سوال پر بھی زیادہ اثر ڈالا اور ہر ایک قوم اپنی قومیت اور زبان کا دم بھرنے لگی۔ اور صدیوں سے مروجہ فارسی زبان کا طلسم ٹوٹ گیا اب جبکہ سب قومیں اپنی مادری زبان کی بقا اور نشو و نما کے لئے سرگرم عمل ہیں تو شیدائی اس دور میں کیوں چپ بیٹھا رہے اور اپنی مادری زبان بلوچی کو نظر انداز کر دے۔ اپنی قوم اور وطن کی خدمت کرنا ملت کے ہر فرد کا فرض ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

فارسی زبان کا سکہ براعظم ایشیا میں رائج تھا۔ سمرقند، قلات، کابل، اصفہان، قونیہ، جہاں آباد، لکھنؤ، مرشد آباد، دکن، اور حیدرآباد سندھ تک کے اسلامی درباروں کی زبان فارسی ہی تھی۔ اور فارسی تہذیب و تمدن اقبال مند فرمانرواؤں اور زندہ قوموں پر چھائی رہی۔ اس لئے جس قدر بھی بلوچ تاجدار بلوچستان یا بلوچستان سے باہر ہو گزرے ہیں وہ فیاض ہونے کے علاوہ سخندان اور نکتہ داں بھی تھے۔ بلوچی ادب سے دنیا صرف اس لئے بے خبر ہے کہ آج تک کوئی ایسی کتاب شائع نہیں ہوئی جس سے بلوچی ادبیات کا پورا پورا پتہ چل سکے۔ اور یہی وجہ ہے کہ بلوچ ناموران سخن کا کلام بھی پردۂ تاریکی میں گم ہے۔ اگر تھوڑی سی نقاب کشائی کی جائے تو ایک نگارستان بن سکتا ہے۔ اور بلوچی کیفیات ادب کا صحیح اندازہ پھر ایک نقاد اور ادیب اچھی طرح بآسانی کر سکتا ہے۔ حیدرآباد سندھ کے تالپور بلوچ امیر فارسی زبان کے اچھے خاصے ماہر اور بلند پایہ ادیب و شاعر تھے۔ چنانچہ میر کرم علی خان تالپور ایک مشہور شاعر تھے کرم تخلص تھا۔ ان کی فارسی غزلیات کا مجموعہ "دیوان کرم" کے نام سے مشہور تھا۔ جسے ۱۲۳۲ھ میں عبداللہ خان کاتب قندھاری نے لکھ کر ختم کیا۔ دیوان کی پہلی غزل یوں ہے ؎

لطف ایزد ہست ہر دم یار ما	زیں سبب گرفت رونق کار ما
از نسیم فیض او خواہد شگفت	تازہ گل در گلشن گلزار ما
نیست حاجت تا کرم سازد بیاں	کارساز ما بہ فکر کار ما

یہ تمام بیانات شعرا البلوچستان کے دیوان خرمن کے بکھرے ہوئے برگ و گل ہیں۔ ان کو اگر ایک جگہ چن چن کر اکٹھا کر لیا جائے تو شگفتہ پھولوں کا ایک گلدستہ بن سکتا ہے۔

اُردو زبان بلوچوں کی ثانوی زبان Second Language

رہتی چلی آئی ہے۔ بلوچ اسے ایک محبوب زبان سمجھتے ہیں۔ چونکہ اس لشکری زبان "اردو" کی ابتدائی تشکیل و ترویج میں بلوچ فوجوں کا بھی خاص حصہ ہے۔ آج تک مورخین یہ بات تو مانتے چلے آئے ہیں کہ ہندوستان پر جن جن فاتحوں نے حملے کئے ان کے لشکروں میں جدا جدا قومیں شامل تھیں خصوصاً بلوچی قوم تو محمود غزنوی۔ شہاب الدین غوری تیمور۔ بابر۔ ہمایوں۔ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کی فوجوں میں شامل رہی۔ کیونکہ یہ ایک شجاع اور جنگجو قوم تھی۔ میر چاکر خاں اند بلوچ ہی کی مدد سے ہمایوں نے سکندر سوری کو سرہند کی جنگ میں شکست دیکر دوبارہ قلعہ دہلی پر مغلیہ جھنڈا گاڑا۔ اسی طرح ایک اور بلوچ امیر میر نصیر خاں اعظم غازی احمد شاہ درانی کے ساتھ پانی پت کی تیسری لڑائی میں شریک رہا۔ اس ہولناک معرکہ میں مرہٹوں نے شکست کھائی اور مہاراشٹر کے مرہٹی اقبال کا ستارہ غروب ہونے لگا۔ مذکورہ بیان سے قارئین کرام اندازہ فرماسکیں گے کہ بلوچ قوم کس زمانہ سے اردو زبان سے مانوس رہی ہے۔ دورِ حاضر میں نواب یوسف علی خاں مگسی مرحوم کو اردو زبان سے ایک والہانہ عشق تھا۔ مرحوم خلد آشیانی بلوچ قوم کا ایک بلند ہمت رہنما اور ایک بلند پایہ شاعر تھا۔ عزیز تخلص فرمایا کرتے تھے

آہ، افسوس! بلوچستان کا یہ لعلِ بے بہا کوئٹہ کے ۱۹۳۵ء کے دردناک زلزلہ میں مٹی میں مل گیا اور آسمانِ ادب کا یہ اخترِ تابندہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے غروب ہوگیا۔

ع حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

مرحوم نواب یوسف علی خاں بلوچستان کی ایک مایہ ناز ہستی تھی جس نے قوم و وطن کی خاطر قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں اور اپنے زورِ بازو سے قدامت پرستی کا وہ خیال جو بلوچ قوم پر مسلط تھا جڑ سے اکھاڑ پھینکا اور بلوچ نوجوانوں میں شعر و ادب کے ذوق کی روح پھونکی۔ سندھ کے ترنم ریز ریگستانوں۔ کچھی کے صحراؤں۔ سراوان کے کوہستانوں، جھلاوان اور مکران کے نخلستانوں میں یا ڈیرہ جات کے مرغزاروں پر جس قدر بھی بلوچی آبادی ہے ان کا نشۂ نیم شبی کا خمار اس بطلِ جلیل کے استقلال و استحکام سے ٹوٹ گیا۔

مرحوم نواب کے حلقۂ احباب میں اکثر حصہ اسلامیہ کالج لاہور، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور سندھ مدرسۃ الاسلام کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کا تھا اور کچھ حصہ فضلاء دیوبند کا بھی تھا۔ یہ لوگ متبحر عالم اور خوش الحان قاری تھے۔ اس لئے اسی حلقۂ احباب میں نواب مرحوم کا ذوقِ ادب خوب پروان چڑھا اور اردو میں طبع آزمائی کرنے کا انہیں اچھا موقع مل گیا۔

دیکھ کر تشنۂ مے دل کی تسلی کر دی
شیخ خوش رنگ و دی خوشبو نے القصہ دی تجری
ست تھوڑے سے میں ایسا کر دیا
منکشف ہو گئے دو
آج ساقی نے مرے جام میں دنیا بھر دی

چھلکی ہوئی چاروں طرف گلشن پہ سجائی
ہر ایک کلی مست ہے ہر پھول شرابی
مستی میں ہے عالم سبھی مست نظر ہے
خمخانۂ بہشت آج ہے گلابی

از حضرت نشتر مقتدری سکندر آبادی

آب و آتش

کاش! وہ بیتابیٔ دل کا بھی اندازا کریں

از حضرت ماہر القادری

تا کجا یہ گردشِ شام و سحر دیکھا کریں
اے نگاہِ شوق اک دنیا نئی پیدا کریں

اپنا یہ مقدور ہی کب ہے، تجھے رسوا کریں
درد آنسو بن کے ظاہر ہو تو اس کو کیا کریں

اُن کے بیمارِ محبت کا یہی شکوا کریں
وہ اگر تھوڑی سی بھی تکلیف فرمایا کریں

جذبۂ منصور تو اپنا فسانہ کہہ گیا
اب اُسے اہلِ جہاں جس طرح بھی سمجھا کریں

عشق میں اُن کی نوازش کا سہارا کیا ضرور!
ڈوبنا ٹھہرا تو ساحل کی تمنا کیا کریں

صبح ہوتے ہی نہ جانے کون دیتا ہے پیام
اوس کی بوندیں کرن میں جذب ہو جایا کریں

اے مرے جوشِ جنوں! اب اور کوئی مشغلہ!
دامنوں کی دھجیوں سے کب تلک کھیلا کریں

آہ پر خفگی مناسب اشک پر طعنے بجا!
کاش! وہ بیتابیٔ دل کا بھی اندازا[1] کریں

سب کی آنکھوں سے چھپا کر آؤ سب کچھ دیکھ لیں
چشمِ نرگس بن کے اس دنیا کا نظارا کریں

حضرتِ ناصح! محبت نشۂ صہبا نہیں
آپ سمجھاتے ہیں ماہر کو تو سمجھایا کریں

[1] اندازہ!

داستانِ حیات

افسانہ

از جناب مشتاق احمد

آہ نجمہ! ـــــــــ ہوسکتا ہے کہ تم اپنی عزیز ترین سہیلی "ثریا" کو فراموش کرچکی ہو۔ یا تم نے اپنے تخیل میں اپنی ثریا کی زندگی کو ایسا خوشگوار دیکھا ہو جو خود تمہارے لئے باعث رشک بن گئی ہو۔ یا پھر ممکن ہے کہ اس عالم ہستی میں میری ہستی کا وجود محسوس کرتے ہوئے میرے لئے چند آنسو بہاتی ہو۔

زندگی کا بوجھ اب ناقابلِ برداشت ہوتا جارہا ہے۔ ہرطرف وحشت خیز منظر دکھائی دے رہا ہے۔ دنیا کی ساری دلچسپیاں، ساری رعنائیاں ایذا رساں بنتی جارہی ہیں۔ حیران ہوں کہ زندگی کا دنیا میں کیا مقصد ہے؟ سب کچھ کھو کر بھی کچھ نہ حاصل کیا۔ رات کا چین، دن کا آرام برباد ہوگیا۔ اداسی میں عمیق خاموشی کی ہلکی سی سلسناہٹ، ـــــ دور سے مسرت کی دیوی میری حرماں نصیبی پر قہقہہ لگا رہی ہے۔ رات کو روز موت کی لوریوں کی صدائیں ہوا کے پردوں سے چھن چھن کر میرے کانوں میں آتی رہتی ہیں۔ لیکن موت آنے نہیں پاتی کہ صبح کا منحوس چہرہ خوفناک شکلوں سے پھر مجھے ڈرانے لگتا ہے۔ میری دل کی دنیا ایسی برباد ہوئی کہ پھر آباد نہیں ہوسکتی۔ ناامیدی کی گھنگھور گھٹائیں یوں چھاگئیں کہ امید افزا بجلی اب کبھی نہیں چمک سکتی۔

کبھی وہ بھی دن تھا کہ میری زندگی میرے لئے خود باعثِ فخر بنگئی تھی۔ شادمانی میرے قدم چوم رہی تھی۔ ہر منظر اک مکمل افسانہ بن گیا تھا۔ دنیا کی ساری نکہتیں، ساری بہاریں، میرے لئے صرف میرے لئے پیدا ہوا کرتی تھیں۔ عشرت بداماں ہواؤں کے فرحت بخش جھونکے روح پرور خواب سے مجھے بیدار کرنے کی ناکام کوشش کرتے تھے۔ اور جب جوانی محبت سے ہمکنار تھی۔ نہیں نہیں بلکہ زندگی محبت تھی، محبت زندگی تھی۔

اور آج زندگی اس خواب پریشاں کے مانند ہے جس کی تعبیر بجز موت کے تشنۂ تکمیل۔ محبت کی پرستش کرنے والے دو دلوں کو موت نے اس قدر دور ایک دوسرے سے علیحدہ کردیا ہے کہ جہاں انسان کا بلند سے بلند تخیل بھی دنیا کے چاروں گوشے میں بھٹک بھٹک کر واپس آجانے پر مجبور ہوجاتا ہے ـــــ ہر سعی ناکام، ہر عزم سرنگوں، ہر فعل نامکمل، جوانی کی گھڑیاں خاموش زندگی میں لرز رہی ہیں۔ یہ ہے زندگی اور یہ ہے زندگی کا راز۔ اب تو آنسوؤں نے بھی ساتھ دینا چھوڑ دیا، صرف آنکھوں میں جلن سی محسوس ہوتی رہتی ہے۔ اکثر اوقات دل کی دھڑکنیں تیز تر ہوکر منتظر لمحوں کو فریب نظر بنا دیتی ہیں۔

یہ سب کیوں؟ صرف اس لئے کہ قدرت نے "سوسائٹی" کے ہاتھوں میں زندگیوں کی تقسیم دے رکھی ہے۔ وہ جسے چاہیں زندہ رکھیں اور جسے چاہیں صفحۂ ہستی کی طرح مٹا کر خاکستر کردیں۔ سو جو ان کے معیار پر پورا اتر سکتے ہیں انہی کو جینے کا حق حاصل ہے۔ اور جو معیار سے گرگئے وہ جہان سے گرگئے۔ ان لوگوں کی زندگی اس بھاگے ہوئے "چور" کے مانند ہے جو دن کو "تاریک گوشوں" میں دنیا سے نظریں بچائے، چھپتا چھپاتا اپنی زندگی کے ایام گزار رہا ہو۔ ان کے ایک ادنیٰ سے اشارے پر غریبوں کی بھینٹ چڑھ جانا ہی تو سوسائٹی کی شان ہے اور یہی تو اس کا انصاف ہے .... ہر طرف آجکل مظلومیت ظلم کا سہارا لئے کانپ رہی ہے ـــــ یہ میری داستان، یہ میری خونچکاں کہانی بھی اسی سوسائٹی کے اصولوں سے پیدا ہوکر چند اوراقِ پریشاں پر منقش ہوکر رہگئی ہے ـــــ

اُف ہر لمحہ بھیانک منظر پیش کر رہا ہے۔ مایوسیوں کی المناک سرگوشی، جیسے کوئی کلیجہ مسوسے ڈال رہا ہو۔ محبت کا دیوتا میری محبت کی دھجیاں اُڑا کر مسکراتے ہوئے مجھے ہنسا دینے کی ناکام کوشش کر رہا ہے ـــــ وقت کاٹے نہیں کٹتا۔ دل دنیا سے بیزار ہوچکا ہے تو پھر میرا وجود کس لئے؟ اب تو ایک پل بھی گزارنا دشوار ہوتا جارہا ہے۔ شاید موت ہی وجہ سکون بن سکے ـــــ

آج میں اپنی کہانی اپنے ہاتھوں اپنی "نجمہ" کو لکھنے چلی ہوں۔ صرف اس لئے کہ وہ جان جائے اس کی ثریا اس وقت زندگی اور موت کی کشمکش میں سسکیاں لے رہی ہے ـــــ

(۱)

میرے مکان کے قریب ہی ایک عالیشان محل تمام تر خوبیوں کے ساتھ جلوہ گر تھا۔ اُس کی تیسری منزل پر لہراتے ہوئے سُرخ ریشمی پردوں کی دلکشی دُور ہی سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرلیتی تھی۔ تاریکی میں جابجا فانوس اس طرح دکھائی دیتے تھے جیسے آسمان پر تارے جھلملا رہے ہوں۔ اکثر رات کی خاموشی میں محل سے بھینی بھینی خوشبو کی موجیں ہوا کے پردوں سے چھن چھن کر میری خوابگاہ کو معطر کر دیتی تھیں۔ اور میں محل کے رہنے والوں کی قسمتوں کو رشک کی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی دُنیا کے نشیب و فراز، بلندی اور پستی پر غور کرتے ہوئے سوچا کرتی تھی ——

ایک دن جبکہ صبح اپنی آغوش میں ہزار ہا رنگینیاں لئے ہوئے طلوع ہوئی میں حسب معمول بغرض تفریح اپنے مکان سے نکل کر اک ادائے خاص سے سبزے کو روندتی چلی جا رہی تھی۔ نسیم سحر کے ہلکے ہلکے جھونکے میرے آنچل سے بار بار شوخیاں کر رہے تھے۔ فضائے بسیط میں ابر کے چند ٹکڑے منتشر تھے۔ میں کھوئی کھوئی چلی جا رہی تھی —— تھوڑی ہی دیر بعد مجھے محسوس ہوا کہ میرے پیچھے پیچھے کوئی دبے پاؤں آ رہا ہے۔ میں نے گھبرائے ہوئے انداز میں پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ ایک نہایت خوش پوش حسین نوجوان نظروں کو قدموں پر جمائے ہوئے آگے قدم بڑھا رہا تھا۔ میں کچھ دُور جا کر ایک پتھر پر بیٹھ گئی، میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جبکہ میں نے "انہیں" اپنے سے قریب بیٹھے ہوئے دیکھا۔ ہر طرف مکمل سکوت تھا۔ میں محسوس کر رہی تھی کہ بار بار "اُن" کی نگاہیں میرے چہرے کا جائزہ لے رہی ہیں —— غیر ارادی طور پر میری بھی نظریں اُس جانب اُٹھ جاتی تھیں جس طرف وہ حسین مجسم بُت بنا بیٹھا ہوا تھا۔ کئی دفعہ نظروں سے نظریں ملیں —— پیشانی پر پسینے کے ہلکے سے قطرے آ جا رہے تھے۔ چہرہ وارداتِ قلبی کا آئینہ دار ہوتا ہے، پھر کس طرح ممکن تھا کہ ہم دونوں اپنے دلی کیفیات کو ایک دُوسرے سے چھپا سکتے ——؟

"انہوں" نے مُہرِ سکوت توڑتے ہوئے کہا۔

"یہ میں آپ کو پہلی دفعہ نہیں دیکھ رہی ہوں"۔

"لیکن میں تو آپ کو پہلی بار دیکھ رہا ہوں" میں نے نظروں سے نظریں ملاتے ہوئے کہا۔

"ممکن ہے ...... یہ چھوٹے سے مکان میں آپ ہی رہتی ہیں نا؟" میرے گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں"

"اور آپ ہی کا نام ثریا ہے نا؟"

"جی ہاں" میں حیرت سے اُن کی طرف دیکھنے لگی۔

"اور آپ کا وطن لکھنؤ ہے؟"

"جی ہاں" میں نے انہیں پھر ویسے ہی جواب دیا، لیکن میری حیرت میں اور اضافہ ہو گیا۔

"گھبرایئے نہیں" انہوں نے مُسکراتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "میں کوئی جادوگر یا نجومی نہیں۔ انسان کو جس سے دلچسپی ہو جاتی ہے وہ اُس سے بخوبی واقفیت حاصل کرنے کی سعی کرتا ہی رہتا ہے .... یہ میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں؟"

"جی نہیں —— آپ بالکل سچ کہہ رہے ہیں"۔

"اچھا اگر ایک شخص ایک سے بخوبی واقف ہے، مگر دُوسرا ہے کہ اس کی صُورت سے بھی نا آشنا —— بتایئے ایسے شخص کو کیا کہا جائے اور کیا نہ کہا جائے۔"

"پاگل —— بالکل پاگل" میں نے جھلا کر جواب دیا اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"کیوں تھوڑی دیر اور آپ نہیں ٹھیریں گی"۔

"جی نہیں" میں نے آگے قدم بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔ "اماں جان میرا انتظار دیکھ رہی ہونگی"۔

میری رفتار تیز ہو گئی، اور میں خیالات کے طُوفان کو چیرتی پھاڑتی اپنے گھر کی جانب بڑھی چلی جا رہی تھی۔ گھبرائی ہوئی کمرے میں داخل ہو کر سامنے کی کھڑکی کھول دی۔ ہوا کے جھونکے میری اِس دلفریب گھبراہٹ کو دُور کرنے کے لئے پیہم میرے پاس سے ہو کر گذر رہے تھے۔

یکایک کھڑکی سے پھر میں نے "انہی" کو دیکھا۔ وہ ایک رفتار سے چلے جا رہے تھے۔ میں کھڑکی سے لگ کر اُنکی ہر حرکت کا بغور مطالعہ کرنے لگی —— "وہ" سامنے کی کوٹھی کے احاطہ میں داخل ہو کر ... محل سے لپٹے ہوئے زینوں پہ آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

(۲)

زندگی محبت کے طُوفان انگیز سمندر میں غوطہ زن ہو کر افسانۂ حقیقت کیلئے گرد و پیش سے بالکل بے خبر، محبت کی انتہائی گہرائی کی سمت ڈوبتی چلی جا رہی تھی۔ میں محسوس کر رہی تھی کہ اس قدر قلیل عرصے میں باوجود اجتناب کے سلیم کی محبت

رُوح بنکر میری رگ رگ میں سمائی چلی جا رہی ہے' .... قدم ۔۔۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدم جو منزلِ مقصود کی سمت نہ جانتے ہوئے راستہ کے پیچ و خم سے ناواقف ہونے کے باوجود وہاں کی دُشواریوں سے دوچار ہوتے ہوئے' اک شانِ امتیازی کے ساتھ آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے ۔۔۔ میری زندگی ایک ایسے راز سے آشنا ہو چلی تھی .... جہاں اپنی زندگی کے وجود کا انحصار دُوسرے کی زندگی سے وابستہ ہو جایا کرتا ہے ۔۔۔ سفینۂ حیات متلاطم موجوں میں گِھر کر بھی ہچکولے پر ایک نغمہ گنگناتا ہوا سُرعت کے ساتھ ساحل کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ جذبات کے طوفان دل کی گہرائیوں سے بلند ہو کر دُور بہت دُور افق کے اُس پار مستقبل کی حسین سے حسین تر تصویر کھینچ کر میری نظروں کو دعوتِ نگاہ دے رہے تھے۔ اور مَیں اُس طرف سے ایک سکنڈ کے لئے بھی نظریں ہٹانا گوارا نہ کرتے ہوئے تصویر کے رنگین نقشوں میں ایک ابدی لذّت' ایک دائمی مسرّت محسوس کرتے ہوئے آیندہ زندگی کے رُوح پرور اور کیف آور خیالات میں کھو کر اپنے وجود کو بھول جایا کرتی تھی' اور اپنے وجود کو بھول کر ہر حقیقت کو خواب اور خواب کو حقیقت بنانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

مَیں جانتی تھی کہ سلیم بہ نسبت میرے مجھ سے زیادہ قریب ہوتے جا رہے ہیں۔ میری محبّت کا اثر "اُن" کی رگ رگ میں سرایت ہو کر جسم و عقل تک ہی محدود رہتے ہوئے رُوح کی گہرائی تک جا پہنچا تھا ۔۔۔ "اُن" کی دلچسپیوں کا مرکز' آرزوؤں اور تمناؤں کا گہوارہ میرا صرف میرا ہی وجود تھا ۔۔ اور وہ سمجھتے تھے کہ "اُن" کی تاریک زندگی ثریّا ہی کی وجہ سے روشن سے روشن تر ہوتی جا رہی ہے۔ جس طرح ہوا کے بغیر پتّوں کا ہلنا ناممکن ہے ۔۔ بالکل اسی طرح اُن کی زندگی کا ایک لمحہ بھی بغیر میرے گذرنا محض دُشوار ہی نہیں بلکہ محال تھا۔

محبّت ہم دونوں کو یکساں متاثر کرتی ہوئی "امتیازِ دوئی" کو باقی نہ رکھ سکی تھی ۔۔ دونوں کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے خیالات ایک ہی مرکز کی طرف مائل پرواز ہو کر زندگی کا مقصد ڈھونڈ رہے تھے۔ سیلابِ محبّت کے تیز و تند دھارے پر دونوں جوانیاں موجوں کی طرح بل کھاتی ہوئی' لرزتی ہوئی بہتی

بعد مشکل دن اور رات میں صرف چند گھنٹوں کی یکجائی میسّر ہوتی تھی۔ وہ بھی اِس قدر مختصر کہ ابھی افسانوں کے عنوانات ہی مکمل نہ ہونے پاتے کہ مجبوراً افشائے راز کے خوف سے ایک دُوسرے سے علیحدہ ہو جانا ہی پڑتا تھا ...... جیسے ایک قمری کا جوڑا ایک درخت کی ٹہنی پر بیٹھے ہوتے ابھی اچھی طرح اقرارِ محبّت بھی نہ کرنے پاتا کہ کسی شکاری کے تیر کی ہلکی سی آہٹ پاکر ایک تو شمال کی جانب اور دُوسرا جنوب کی سمت بغیر کسی ارادے کے اُڑ جاتا ہو۔

رات کے بڑھتے ہوئے مہیب سائے اپنی آغوش میں ساری دُنیا کو چھپا رہے تھے۔ موسم اِس قدر سرد تھا کہ ہوا کے خنکی آور ہلکے ہلکے جھونکے بے پناہ تاریکی میں جذب ہو کر برف کے مانند منجمد ہو گئے تھے ۔۔۔ شعریت انگیز سکوت' نغمہ بنکر ذرّے ذرّے پر چھا گیا تھا۔ پتّوں کی دلفریب سنسناہٹ' سازِ حیات بنکر ساری فضا پر مسلط تھی ۔۔۔ مَیں اپنے مکان کے عقبی حصّہ میں .... ویران اور بے رونق کھنڈر کے ایک پتھر پر بیٹھی ہوئی' ٹھوڑی کو سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھے .... اپنے محبوب کا اِنتظار کر رہی تھی .... میری آنکھوں کو تو پلک بھی مارنا دُشوار تھا' نظریں اُسی طرف جم کر رہ گئی تھیں ..... جس طرف سے میرا چاند آنے والا تھا۔ کوئی پتّہ کھڑکا اور مَیں بھی کہ لو "وہ" آ گئے ۔۔۔ تھوڑی ہی دیر بعد پاؤں کی ہلکی سی چاپ کے ساتھ سلیم فرکوٹ میں ملبوس' دانتوں میں پائپ دبائے بالکل میرے قریب آ گئے اور آ کر کہنے لگے :۔

"آج مجھ سے پہلے تم' زندگی میں پہلی دفعہ ۔۔"

"یہ تو اپنا اپنا جذبۂ محبّت ہے" مَیں نے مُسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"خُوب .... اوہو تم سردی سے کانپ رہی ہو"

یہ کہتے ہوئے انہوں نے اورکوٹ سے میرا جسم ڈھانپتے ہوئے کہا۔

"لو اب تو تم اور خوبصورت ہو گئیں"

"لیجئے مذاق شروع ہو گیا" مَیں کچھ ٹھہر کر بولی "کل آپ کی طبیعت مضمحل تھی اب کیسی ہے"

"آج تو ٹھیک ہے .... لیکن کل رات کروٹیں بدلتے بدلتے گذری"

"ہاں۔۔۔ تم جو آنکھوں میں آبسی تھیں تو پھر نیند بیچاری کیلئے جگہ کہاں۔"

"خوب" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "الفاظ کی دنیا تو آپ کی بڑی وسیع معلوم ہوتی ہے۔"

"الفاظ کی دنیا" وہ سنجیدگی سے کہنے لگے۔ "تمہارا مطلب یہ ہے کہ میرے الفاظ میرے دل کی صحیح ترجمانی نہیں کر پاتے؟ وہ حقیقت سے دور رہتے ہیں؟ پہلے اوراقِ زندگی کو کیا پھر سے لوٹانے کی ضرورت ہے؟۔۔۔ ثریا تم نے ابھی تک مجھے پہچانا ہی نہیں، کاش تم میری حالت کا صحیح اندازہ لگا سکتیں؟ ــــ میں ایک بیجان جسم ہوں، اور تم نسیم بنکر اس میں زندگی کے آثار پیدا کر رہی ہو۔۔۔ میں چمن کے اس بدنصیب پھول کے مانند تھا جس کو خدا نے خوشبو کی دولت سے محروم رکھتے ہوئے دنیا کی نظروں میں ذلیل و خوار ہونے کے لئے چھوڑ رکھا تھا۔۔۔۔ لیکن تم۔۔۔ خوشبو کی بے پناہ موج بنکر اس کی رگ رگ میں سما گئیں اور وہ رشکِ چمن ہو گیا۔"

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور میں ان آنسوؤں کو نہ ضبط کرتے ہوئے کہنے لگی۔

"بس رہنے دیجئے، ذرّے کو آفتاب کیوں بنا رہے ہیں آپ؟"

تھوڑی ہی دیر بعد میرا سر ان کے شانے پر تھا، اور وہ میری زلفوں سے کھیلتے ہوئے گنگنا رہے تھے ؎

محبت کو تو عمرِ جاوداں بھی مختصر ہوگی
الٰہی کیا کروں میں عمرِ فانی لیکے آیا ہوں

رات کی گردش انجام تک پہنچ گئی تھی۔ آسمان کے چاروں طرف سے نورانی روشنی چھن چھن کر تاریکی کو اپنے بڑھتے ہوئے سیلاب میں جذب کرتی بڑھتی چلی جا رہی تھی ــــ نرم و نازک ٹہنیاں انگڑائیوں سے خواب کی سی کیفیت کو دور کرتے ہوئے نغمۂ خاموش الاپ رہی تھیں۔۔۔۔ میں نے دیکھا۔۔۔۔ رات کا آخری ستارہ دم توڑ رہا تھا۔۔۔۔۔

(۳)

بغیر کسی انقلاب کے دو سال کا ایک طویل عرصہ زندگی کے صفحات پر نہ مٹنے والے نقوش چھوڑتا ہوا گذر گیا۔ وہ ایامِ رنگیں جو دنیا کی پیشانی پر ایسی سنہری داستان لکھ گئے کہ خود کائنات اس کو انجام تک پہنچانے کیلئے مضطرب دکھائی دے رہی ہو ــــ اگر میں یہ لکھوں کہ خدا تعالیٰ نے اتنا حسین ترین زمانہ محبت اور صرف محبت ہی کے لئے پیدا کیا تھا تو کوئی بیجا بات نہ ہوگی۔

ایک طرف محبت کو وہ آتش فشاں کے لاوے کے مانند سرعت کے ساتھ ہماری جانب دوڑتی ہوئی دونوں جوانیوں کو خاکستر کرنے پر تلی ہوئی تھی ــــ تو دوسری طرف بھی جذبۂ قوی سے تر ہو کر کچھ ہی فاصلہ پر مستقبل کی حسین اور رنگین تصویر لئے۔۔۔۔ ہمیں اپنی سمت تیزی سے قدم اٹھانے پر مجبور کر رہا تھا۔ اور ہم جب اس کو حاصل کرنے کے لئے قریب تر پہنچ جاتے تو وہ پھر پہلے ہی کی طرح دور ہو جاتا۔ اور پھر ہم اسی رفتار سے اس کی طرف بڑھتے جاتے اور پھر وہ اسی رفتار سے دور ہوتا جاتا تھا۔

موسمِ برشگال کی وہ نکہت بداماں شام جبکہ پھول پتیوں پر لرزتے ہوئے پانی کے سفید و شفاف قطرے ہوا کے ایک ہلکے سے جھونکے کے ساتھ ہی منتشر ہو کر زمین میں جذب ہو جاتے تھے ــــ میں "اسی مقام" پر بیٹھی ہوئی نرم و نازک پھولوں کی رنگین پتیوں کو، توڑ توڑ کر خاک میں ملا رہی تھی ــــ سلیم "شیکسپیئر" کے کسی ڈرامے کی طرف ساری توجہ مبذول کئے ہوئے میرے پاس ہی ایک اونچے سے پتھر کا سہارا لیکر لیٹے ہوئے تھے ــــ میں نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر کتاب چھین لی، اور وہیں ایک چھوٹے سے گڑھے میں ٹھہرے ہوئے پانی میں پھینک دی ــــ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھے۔ اور کہنے لگے ــــ

"یہ کیوں۔"

"یہ بھلا کتاب پڑھنے کا وقت ہے۔"

"نہیں تو کیا تمہاری صورت تکتا رہوں؟ اتنی خوبصورت بھی تو نہیں ہو" وہ مصنوعی غصے سے کہنے لگے۔ "خیریت اسی میں ہے کہ چپکے سے کتاب اٹھا لاؤ ورنہ کپڑوں سمیت اس بہتے ہوئے نالے میں ڈال آؤں گا۔"

میں نے ایک زور سے قہقہہ لگایا اور شرارت آمیز مسکراہٹ کیساتھ کہنے لگی۔

"اُف ہو آج تو بڑی جرأت سے کام لیا جا رہا ہے۔۔۔۔ اچھا بتلائیے کتاب آپ کی ہے یا میری؟"

"میری۔"

"تو پھر مجھے کتاب سے کیا ہمدردی ہو سکتی ہے۔۔۔۔۔ ارے ارے یہ۔۔۔۔ وہ دیکھئے آدمی سے زیادہ کتاب بھیگ چکی ہے۔ جلدی کیجئے ورنہ تھوڑی ہی دیر میں ساری کتاب بالکل ضائع ہو جائیگی۔"

وہ تیزی سے اٹھے، اور انہوں نے غصے سے کتاب [illegible]

کمبخت بارش کی وجہ سے میرے سارے کپڑے خراب ہو گئے ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔

"میری کتنی اچھی ساڑی برباد ہو گئی۔ بھئی ہمیں تو ذرا بھی ایسا مذاق پسند نہیں جو باعث آزاری ہو"

"خوب" انہوں نے سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے کہا "شاید میری کتاب بے دام تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اپنا کیا تو کچھ نہیں ـــ دوسرں کی ذرا سی حرکت بہت کچھ ـــ"

میں نے گردن موڑتے ہوئے اپنے چہرے کو دوسری جانب پھیر لیا۔

شام تاریکی کی سمت مائل ہو کر ساری دنیا کو خاموشی کا پیغام دیتی ہوئی آہستہ آہستہ تاریک تر ہوتی جا رہی تھی ـــ میں قدرت کے لذت آفرین تغیرات کو دیکھتی ہوئی اپنے آنیوالے اُن لمحات کا تصور باندھ رہی تھی جنکو شباب کے بہترین لمحے کہا جا سکتا ہے ـــ اور میں اسی خیال میں اس قدر محو ہو گئی کہ سلیم کی موجودگی کا احساس بھی باقی نہ رہا۔

"کیا سوچ رہی ہو" میں چونک سی گئی۔

"کچھ نہیں" میں اپنا ہاتھ اُن کے شانے پر رکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"بھلا بتایئے تو اس طرح چھپے چھپے کب تک ملتے رہیں گے۔ کیا اسی طرح زندگی گذار دیجیے گا"

"نہیں نہیں ـــ میں خود اس موجودہ روش سے بیزار ہو گیا ہوں، ہر وقت بدنامی کا خوف چین لینے نہیں دیتا" وہ کچھ رک کر کہنے لگے۔ "میں بہت جلد اماں جان سے تمہارے بارے میں کہونگا اور مجھے یقین ہے کہ وہ میری بات رد نہ کر سکیں گی۔"

"سچ" میں نے فرطِ مسرت سے کہا۔

"ہاں ہاں، میں تمہیں اپنا بنا کر ہی رہونگا۔ چاہے مجھے کتنی ہی مصیبتوں کا سامنا کیوں نہ کرنا ہو"

میری مسرت میرے چہرے سے عیاں تھی۔ میں ایک انگڑائی لیکر اٹھی اور تھوڑے فاصلہ پر ایک بہتے ہوئے نالے کے قریب جا کھڑی ہوئی اور تیز و تند موجوں کی ہلکی سی شورش کو نغمہ سمجھ کر کھو گئی۔ ٹھیک اسی وقت بادلوں کی مسلسل تہوں نے اپنی جگہ چھوڑ دی اور آسمان کا ایک تاروں بھرا گوشہ دکھائی دینے لگا۔ دفعتہً ایک روشنی سی چمکی اور اس کے ساتھ ہی ایک تارہ ٹوٹ کر دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

(۴)

پھر سلیم کی طویل روپوشی نے ساری دنیا کو آنکھوں میں تاریک بنا دیا ـــ مجھے حیرانی تھی کہ تم اپنا اتنا صبر و تحمل کہاں سے لا سکا؟ وہ اتنے روز تک بغیر میرے کیسے زندہ رہ سکتے ہیں؟ طرح طرح کے پریشان کن خیالات سینے میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا کئے ہوئے زندگی کو بے کیف بنا رہے تھے ـــ کبھی یہ خیال کہ وہ معشوق بنکر میری بیقراری کا تماشہ دیکھ رہے ہیں ـــ یہ نداز بے نیازی کیوں؟ اگر یہ صرف ایک ناز ہی ہے تو یہ بھی جان لیوا نہیں تو اور کیا ہے؟ میں سوچتی تھی کہ کہیں محبت کی آزمائش ہی تو نہیں ہے؟ امتحانِ عشق کا وہ پُر اسرار دور جس کا ذکر شاعری میں جا بجا اہمیت رکھتا ہے شاید اسی دَور کا نام ہے جہاں انسانی قدم ڈگمگا جاتے ہیں؟ ـــ کبھی یہ اذیت ساں تخیل سوہانِ روح بن جاتا کہ کہیں "وہ" ابتک مجھ سے دل لگی کر رہے تھے؟ کوئی اُن کے مزاج میں دخیل ہو کر میری محبت کو اُن کے دل سے نہ مٹا رہا ہو؟ ـــ اُف اشکوں کا سیلاب آنکھوں کی راہ سے بہہ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ساری دنیا کو فنا کر دیگا۔

ایک رات میں اُسی بے رونق کھنڈر کے ایک گوشے میں اُن کا انتظار کرتی ہوئی آنسوؤں کے تار سے اپنی ٹوٹی ہوئی مالا جوڑنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی ـــ ہوا کی سنسناہٹ سوکھے پتوں سے ٹکرا کر اس خوفناک اژدہے کی پھنکار سے مشابہ تھی جو غیظ و غضب کی حالت میں آنکھوں سے شعلے بلند کرتا ہوا اسی طرح سے بل کھا کر اپنے شکار کی طرف لپک رہا ہو ـــ ذرے ذرے پر خوف و ہیبت کے مہیب بادل چھائے ہوئے تھے۔ موت سے زیادہ موت کی سی خاموشی بے پناہ تاریکی کا ثبوت دے رہی تھی۔ اچانک ایک ہلکی سی صدا فضا میں تیرنے لگی۔

"تم رو رہی ہو ثریا"

میں گھبرا گئی، اور اپنے ہوش و حواس کو قائم رکھکر یہ کہتے ہوئے دوڑ کر سلیم سے لپٹ گئی۔

"آ گئے، آپ آ گئے، آپ مجھے چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے"

"میں ـــ میں تمہیں چھوڑ کر کہاں جا سکتا ہوں، یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو ثریا ـــ"

"تو پھر کیوں ـــ کیوں اتنے دن تک اپنا چہرہ چھپائے رہے۔ کیا اپنی آنکھوں سے آپ میری بربادی کا تماشہ دیکھنا چاہتے تھے؟ اتنے دن کیسے گذرے، کیا آپ اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے ہیں؟"

"کیوں نہیں" انہوں نے میرے آنسوؤں کو اپنی دستی میں جذب کرتے ہوئے کہا "وہ دل جو خود اس جہنمی آگ میں جلکر خاکستر ہو رہا ہو۔ وہ کیونکر اندازہ نہیں لگا سکتا۔" وہ کچھ رک کر کہنے لگے "غور تو کرو میری یہ غیر حاضری تو تمہیں ہمیشہ کا کرنے کا ذریعہ ہو گی ثریا"

تمہیں میرے حاصل کرنے کی وجہ" میں نے انہیں غور سے دیکھا، آنکھیں بے نور چہرہ بے رونق ہو رہا تھا۔

"ہاں .... قسمت نے ساتھ نہیں دیا، خوشامدیں کیں، بگڑ کر دیکھا مگر میں اپنے خیال میں کامیاب نہ ہو سکا۔ میرے آنسو اُن کے دل کی سختی کو نرم نہ کر سکے۔ زندگی کی دھمکی، جوانی کی بربادی کا وحشت خیز منظر بھی اُن پر اثر انداز نہ ہو سکا — وہ نہیں جانتے کہ اُنکی ذرا سی ضد دو زندگیوں کی ہلاکت کا باعث بنکر خود اُن کے لئے سوہانِ روح بن جائیگی —"

"کیوں آخر یہ سب کس لئے" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"صرف اس لئے کہ دنیا والے اپنی شرافت کے آئینہ میں افلاس کا عکس دیکھنا نہیں چاہتے۔"

مجھ پر بجلی گر پڑی، جیسے کسی نے مجھے جھنجھوڑ دیا ہو۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے مجھے تاریکی میں دھکیل دیا ہو اور میں ایک سمت کو گرتی چلی جا رہی ہوں۔ میں نے دیکھا جیسے کسی نے میرے بربط دل کے تاروں کو توڑ کر پھینک دیا ہو۔

"صحیح ہے" میں نے بصد مشکل کہا۔ "وہ سچ کہتے ہیں، غریبی کا دوسرا نام ہی بدنصیبی ہے تسلیم۔ میں ٹھیک سمجھ رہی تھی، میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔ میں اپنی بھول پر پچھتا رہی ہوں ...... دل سے دل کیوں ملا — محبت ایسے سے کیوں ہوئی۔"

میرے آنسوؤں نے اس سے زیادہ کہنے نہ دیا۔ گلے میں آواز پھنس گئی، جیسے کسی نے طاقت گویائی سلب کر لی ہو۔

"یہ رو رو کر جان کیوں دے رہی ہو — زندگی کا نیا دور شروع ہو گیا۔ زمانے نے کروٹ بدلی، میں نے تصفیہ کر لیا ... ہم ان لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہو کر ہی اطمینان کا سانس لے سکتے ہیں — میں اپنے اس خیال کو بہت جلد حقیقت بنا کے رہونگا اور دنیا کو یہ دکھا دونگا کہ کوئی طاقت مجھ کو تم سے جدا نہیں کر سکتی۔"

آپ محبت میں پاگل ہو رہے ہیں — آپ بھول رہے ہیں کہ آپ ایک امیر خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ یہ محل اور محل کے رہنے والے عزیز ترین ہستیوں کو چھوڑ کر کہیں اور جا کر بس رہیں گے؟ .... آپ خاندان کی پیشانی پر ایسا کلنک کا ٹیکا لگانا چاہتے ہیں جو سالہا سال مٹانے سے نہیں مٹ سکتا؟ ...... یہ کیوں ..... ایک ادنیٰ عورت کیلئے ...... جس کا وجود خود دنیا پر بار ہے ......"

"یہ سب کرنا ہی ہوگا" وہ بیچارگی سے کہنے لگے۔ "میں تمہارے بغیر ایک پل بھی نہیں گزار سکتا۔"

"یہ سب افسانوی باتیں ہیں" میں اُن کے چہرے سے نظریں ہٹاتے ہوئے کہنے لگی۔ "جو غم کل تھا وہ آج نہیں اور جو آج ہے وہ کل نہیں — ایک ماں بچے کو دفن ہوتے ہوئے دیکھ کر یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ وہ بھی اس کے ساتھ دفن ہو رہی ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے وہ زندہ اور زندہ رہ کر اس حادثے کو بھول جانے پر مجبور ہے۔ بالکل اسی طرح آپ بھی مجھے بھول جائیے، چھوڑ دیجئے، مجھے اس دنیا میں تنہا جینے کے لئے — میں آپ کا عیش و آرام چھین کر کبھی خوش نہیں ہو سکتی۔ اپنی زندگی کی حلاوتوں کو میرے لئے کیوں تلخ تر بنا رہے ہیں آپ؟ ... میں جان بوجھ کر آپکی بربادی کا سبب کیوں بنوں! دنیا کی کج روی زمانے کے حوادث سے میں آپ کی زندگی کو ٹکراتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔ مجھے نقش قدم کی طرح مٹا دیجئے، مجھے بھول جائیے، میں اپنی زندگی کی گھڑیوں کو گن گن کر ختم کر دوں گی۔"

"تم سمجھتی ہو کہ اب تک میں تمہیں ایک کھلونا سمجھ کر معصوم بچے کی طرح کھیلتا رہا؟ ..." وہ غضب کی سنجیدگی سے کہنے لگے۔ "کیا محض موسم کی دلفریبی میں اضافہ کرنے کے لئے تمہیں اپنے قریب بٹھا کر یہ خونچکاں رستہ اختیار کیا گیا؟ کیا تم مجھے دنیا کے اُن لوگوں میں سے سمجھتی ہو جو ایک معصوم عورت کی معصومیت سے فائدہ اٹھا کر اس میں کسی قسم کی جاذبیت نہ محسوس کرتے ہوئے محبت کی بازی کسی اور بساط پر کھیلنا چاہتے ہیں ....؟ اگر تم مجھے ایسا نہیں سمجھتیں تو تم اپنے ہاتھوں سے میرا گلا کیوں گھونٹ رہی ہو؟ .... میری بتائی ہوئی راہ پر نہ چل کر میرے زندہ رہنے کی توقع۔ میرے جینے کی تمنا، ممکن نہیں تو اور کیا ہے؟ اگر سینے میں دھڑکتے ہوئے دل کی صدائیں تمہارے کانوں تک پہنچ رہی ہیں اور تم، اُسے بغور سُن رہی ہو تو پھر ...... یہ حوصلہ شکن گفتگو کس لئے؟ .... کس لئے اپنے الفاظ سے میرے جذبات کچلے دے رہی ہو .... محبت کا وہ پودا جس کی تعمیر خمیر انسانی ہو کر زندگی سے وابستہ ہو گیا ہے تم اُسے اکھاڑ پھینکنا چاہتی ہو —؟ .... مجھے محل کی فضا سے نکل جانے دو ..... یہ میری زندگی کا سوال ہے ...... یہ میری التجا ....."

اُن کے آنسوؤں نے انہیں اس سے زیادہ کہنے نہ دیا ....

میں اُن کے آغوش میں لیٹی ہوئی اپنے ہاتھوں کو اُن کے گلے کا ہار بنا رہی تھی — ہر طرف کیف انگیز سکوت مسلط تھا ....

جلوہ نگاہ میں آتشبازیاں چھوٹ رہی تھیں ـــ اُن کے لبوں پہ ایک ہلکا سا تبسم رقص کر رہا تھا۔ میری نظریں نیچی ہوتی جا رہی تھیں ..... جیسے مَیں ہاری ..... وہ جیت گئے .....

(۵)

رات آدھی سے زیادہ گزر گئی انتہائی بھیانک اور ڈراؤنی ہوتی منزلِ مقصود کی طرف بڑھتی چلی جا رہی تھی ـــ چاروں طرف دہشت خیز سناٹا، حدِ نظر تک مسلط ہو کر ذرّے ذرّے کو خوفزدہ بنا رہا تھا ..... مَیں نے حسرت و یاس سے ڈوبی ہوئی نظروں سے اپنے تاریکی میں لپٹے ہوئے مکان کو دیکھا اور بے اختیار آنسو آنکھوں سے نکل کر بہنے لگے ـــ انہوں نے دونوں ہاتھوں کو میرے شانوں پر رکھ کر اپنی سمت کھینچ لیا ..... پھر موٹر اسّی میل کی رفتار سے تاریکی کو چیرتی ہوئی مدّھم شور سے زمین ناپ رہی تھی ـــ اور پھر ..... ٹرین زمین کے سینے پر شعلے برساتی ہوئی ایک خوفناک چیخ مار کر ہوا سے باتیں کرتی ہوئی بھاگی چلی جا رہی تھی ـــ ہوا کے جھونکے کھڑکی سے داخل ہو کر ڈبے کی چھوٹی سی دنیا میں ناچ رہے تھے ..... تعجب ہے کہ مسلسل ہوائی یورش کے بعد بھی پسینے کے ہلکے ہلکے قطرے پیشانی کو چوم رہے تھے ـــ دنیا گھومتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی، انجن اپنی انتہائی تیز گامی سے ہر قدم پر ایک ہنگامہ اُٹھاتے ہوئے آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا ـــ ساری کائنات متحرک تھی ..... لیکن دو دلوں کے دھڑکنے کی صدائیں صاف سُنائی دے رہی تھیں۔

دھک !!! دھک !!! دھک !!!

ٹرین نظام اسٹیٹ میں داخل ہو کر ہندوستان کے مشہور ترین شہر حیدر آباد کے عظیم الشان اسٹیشن پر رُک گئی، اور اپنا آخری سانس توڑ دیا ..... وہاں کی صاف و شفاف وسیع سڑکیں ہر طرف پھیل کر زلفوں کی طرح بل کھاتی ہوئی ہر نو وارد کا استقبال کر رہی تھیں، شہر کے چاروں سمت دلآویز اور خوبصورت عمارتیں بکھری ہوئی تھیں ..... اور ہر عمارت منظرِ نگاہ بن کر رہ گئی تھی۔

رات ایک کیفیتِ خاص میں ڈوبی ہوئی آئی ـــ زمین و آسمان کا ذرہ ذرہ چلا اُٹھا کہ آج محبت نے زندگی کا لباس پہن کر سارے جہان کو منوّر کر دیا ہے ـــ شہر کے ہر کونے سے روشنی کے فوارے چھوٹ رہے تھے، اور شہر جھلک روشنی کے سیلاب میں بہا جا رہا تھا ـــ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے [illegible]

اور اس میں سے رنگ رنگ کی حوریں ہاتھوں میں نور کی مشعلیں لئے ہوئے بے شور بے آواز آہستہ آہستہ رقص کرتی ہوئی زمین کی طرف آ رہی ہیں، ..... اور مجھے ایسا کیوں نہ معلوم ہوتا جبکہ زندگی میں پہلی بار زندگی کا نیا دور شروع ہو رہا تھا ـــ جبکہ حقیقی معنوں میں سلیم اور مَیں دونوں ایک ہو چکے تھے، ..... جبکہ دنیا کی ساری مسرتیں ہمیں اپنے آغوش میں لئے ہم پر سے سنہرے پھول برسا رہی تھیں ..... سلیم نے مجھے دیکھا اور مَیں نے "تم" انہیں" ..... پھر ایک نامعلوم کیف میں ڈوب کر ایسی جگہ پہنچ گئے، جہاں زندگی کی قیمت محبت سے جانچی جاتی ہے .....

شہر کی زندگی گراں ہونے کی وجہ سے ہمیں مجبوراً ایک چھوٹے سے گاؤں میں سکونت پذیر ہونا پڑا ..... یہاں کی زندگی بھی اپنی نوعیت کی ایک ہی زندگی تھی۔ ہنگامہ آرائیوں سے بالکل پاک ـــ نفسیات سے یک لخت علیحدہ ـــ ہر شخص ناواقفِ دستور ہو کر سادہ لوحی میں آپ اپنا جواب بن گیا تھا ـــ ہر طرف اونچے اونچے پہاڑوں پہ لہلہاتے ہوئے سبزوں کی حرکتیں دعوتِ نظر دے رہی تھیں، ـــ اب ہم مٹی سے بنے ہوئے چھوٹے سے گھر کی زینت بنے ہوئے تھے۔ روز شام کی دلفریب خاموشی میں دُور بہت دُور، ایک دوسرے کی انگلیاں تھامے کسی موضوع پہ بحث کرتے ہوئے نکل جایا کرتے تھے ـــ وقت بھاگا جا رہا تھا .....

صبح ..... پھر شام ..... پھر شام .....

پھر صبح ..... ایک دن جبکہ سورج کی اولین کرنیں "دھرتی ماتا" کی پیشانی پہ رنگ رنگ کے نقوش پیدا کرتے ہوئے پھیلتی جا رہی تھیں ـــ مَیں نے پلٹ کر دیکھا "وہ" ابھی تک خلافِ معمول سو رہے تھے .....

"ارے اُٹھئے بھی، دن چڑھ آیا" مَیں اُن کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی، مَیں نے محسوس کیا اُن کا جسم آگ کی طرح جل رہا تھا۔

"ہائیں ..... بخار"

"ہاں" انہوں نے کروٹ لیتے ہوئے کہا "رات غضب کی سردی محسوس ہوئی"

"تو پھر ..... کسی ڈاکٹر ....."

"گاؤں میں تمہیں ڈاکٹر کہاں ملیگا ..... گھبرانے کی کیا بات ہے، بخار کی کیفیت ہے ..... آج نہیں تو کل اُتر جائیگا"

میں سرہانے بیٹھ گئی ــــ اور اُن کا سر دبانے لگی۔

ایک شام، جبکہ آفتابِ عالمتاب کی آخری اور سُنہری کرنیں سطحِ سمندر سے ٹکرا کر چاندی کے سے پھول اُگل رہی تھیں ــــ "وہ" ہلکے ہلکے سُروں میں گنگنا رہے تھے ؎

محبت ہے حاصلِ زندگانی محبت غمِ زندگانی نہیں ہے

"خوب" میں کمرے میں داخل ہو کر کہنے لگی "کیا ہی اچھا شعر ہے۔"

"اچھا۔ تم نے بھی پسند کیا؟"

"کیوں نہیں، کیا آپ کی پسند مجھ سے الگ ہو سکتی ہے؟"

وہ کھانستے ہوئے کہنے لگے "بخار کے بعد یہ کھانسی کیوں"۔

"ایسے ہی ہے چلی جائیگی" میں کچھ کہکر بولی "چلئے گھوم آئیں"۔

"نہیں" وہ لیٹتے ہوئے بولے "طبیعت مضمحل ہے کل چلیں گے"۔

میں نے دیکھا ...... سُورج اپنا چہرہ دامنِ مشرق میں چھپا رہا تھا ...... ــــ

خزاں کے آثار شاداب پھولوں کی پژمردگی سے نمایاں ہو رہے تھے ہری بھری ڈالیوں پر تباہی کے انگارے برس رہے تھے۔ اور موت کے ظالم پاؤں لہلہاتے ہوئے سبزے کو روندے ڈال رہے تھے ــــ ترو تازہ پتیاں، دیکھتے ہی دیکھتے زرد ہو کر درختوں کی ٹہنیوں کا سہارا چھوڑ رہی تھیں۔ آفتاب کی تمازت جنگل کے چاروں سمت آگ برسا رہی تھی، ... اور خاموشی تنہائی میں لرز رہی تھی ....

میں دیکھ رہی تھی کہ "اُن" کی صحت روز بروز گرتی ہی جا رہی ہے، آنکھوں کی چمک، چہرے کی رونق مدھم پڑ گئی تھی ــ دو قدم بھی چلتے تو ہانپ جاتے تھے .... گاؤں کے "وید" کو بھی دکھایا اور انہوں نے یہ کہکر علاج شروع کیا کہ معمولی بخار ہے چند روز میں دور ہو جائیگا۔ ..... دو ہفتوں سے مہینوں میں تبدیل ہونے لگے ــــ لیکن "اُن" کی طبیعت نہ سنبھلنا تھی نہ سنبھلی ــ اب تو وہ آدھے ہو کر رہ گئے تھے۔ گالوں میں ہلکی ہلکی سی زردی ــ آنکھوں کے نیچے حلقے ــ آہ مجھ سے یہ منظر تو دیکھا نہ جاتا تھا ــــ میں نے ایک دن ان سے کہا بھی کہ اب واپس چلے چلئے، وہاں آپ اچھے ہو جائیں گے۔" لیکن "وہ" ناراض ہو کر کہنے لگے "معلوم ہوتا ہے کہ اب تم مجھ سے بیزار ہو گئی ہو"۔ اب بھلا میں کیا کرتی اور کیا نہ کرتی ...... کھانسی کے متواتر دوروں نے اُن کے رگ و ریشے میں درد پیدا کر دیا تھا۔ میں ہر وقت "اُن" کے پاس بیٹھی "اُن" کی دلجوئی میں لگی رہتی تھی ... میری ذرا سی دوری ان دنوں "اُن" کے لئے باعثِ تکلیف ہو جاتی تھی ــــ ایک دن وہ کھانستے کھانستے نڈھال ہو کر کہنے لگے۔

"اُف اب تو کھانسا بھی نہیں جاتا۔ ثریا بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔ سینے میں ایک آگ سی روشن ہے ..... بے پناہ آگ ..... جیسے کوئی بجلیاں سوئیاں چبھو رہا ہے ...... وہ دیکھو ..... وہ دیکھو ..... کوئی مجھے اپنی طرف کھینچ رہا ہے، تم مجھے نہ جانے دو ثریا تم مجھے نہ جانے دو"۔ میں بے اختیار اُن کے سینے سے لپٹ کر رونے لگی ــــ طرح طرح کی قسمیں دیکر "انہیں" چپ کرایا اور کہنے سے روک دیا، ــــ اب میری آنکھوں میں ہر وقت آنسوؤں کے قطرے منڈلانے لگے۔ میں چھپ چھپ کر رونے لگی، .... میری آنکھوں میں ایک چیز چمکنے لگی .... شاید .... شاید وہ مایوسی تھی .....

ایک رات ... ہوا ٹہنیوں سے لپٹ لپٹ کر رو رہی تھی۔ کمرے کے باہر سخت طوفان برپا تھا۔ ہوا کے تیز و تند جھونکے کھڑکی کی راہ سے داخل ہو کر کمرے کی ہر چیز سے وحشیانہ طور پر ٹکرا رہے تھے .... مہیب بادلوں کی دہشتناک اور خوفناک آوازیں، اُس بیکس عورت کی چیخ کے مانند تھیں، جو اپنے بچے کے مُردہ جسم کو سینے سے لگائے جھٹلاتے، چلا چلا کر روتے ہوئے آسمان کے دامن کو چھونے کیلئے ایک سمت دوڑ رہی ہو ــــ

ہوا کے ایک جھونکے نے چارپائی پر رکھے ہوئے ایک گلاس کو گرا دیا۔ کمرے کی فضا میں ایک ہلکا سا شور گونج اٹھا ــــ دفعتاً دروازے کے پٹ آپس میں زور سے ٹکرا گئے ..... وہ چیخ اُٹھے .....

"ثریا" .... میں دوڑ کر لپٹ گئی۔ "وہ" رُک رُک کر کہنے لگے۔

"ثریا تم تم ... تکلیف ــــ اُف انتہائی تکلیف ــــ سینے میں غضب کی بے چینی .... جیسے "نظامِ خاکی" آپس میں ٹکرا کر پاش پاش ہو رہا ہو ..."

"اُن" کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے ــــ میں ایک محویت کے عالم میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گھور رہی تھی ..... تھوڑی دیر بعد ــــ کھانسی کے ایک مہیب دورے نے "اُن" کی ساری قوت سلب کر لی ــــ اور اس کے ساتھ ہی، ایک خون آلود قے ــــ

اُف انتہائی بھیانک منظر ..... گوشت کے گلے سڑے لوتھڑے خون میں تیر رہے تھے ــــ "اُن" کی سُرخ سُرخ بڑی بڑی آنکھیں، دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اپنی اپنی جگہ سے ہٹ کر نیچے آ رہیں گی ــــ تنفس کی آواز تیز ہو کر مدھم پڑتی جا رہی تھی۔ "اُن" کے لب مرتعش ہو کر بمشکل لفظِ "ثریا" ادا کر سکے۔ پھر نظریں اٹھیں اور میرے چہرے پر

تعاقب

نظم

از حضرت مخمور جالندھری

پردۂ سیمیں تھی سنما ہال کا نکھری سحر
ایکٹرس کی طرح غازہ مل کے نکلی تھی سحر

اِک سینہ بجلیوں کے آنکھ میں خرمن لئے
آرہی تھی ساتھ اپنے مغربی فیشن لئے

یُوں بھرے شانے تھے ریشم کے تلے اُبھرے ہوئے
طشتری میں سیب جیسے ڈھانپ کر رکھے ہوئے

پنڈلیاں یُوں غوطہ زن تھیں حال کے سیلاب میں
مچھلیوں کا رقص جیسے نرغۂ گرداب میں

گدگدے گھٹنے، تھرکتی ران، ٹخنے گول گول
نعمتِ نایاب دل کو لے رہے تھے مُفت مول

دیکھتے ہی اس کو رقصاں خوں رگوں میں جم گیا
مجھ کو شک گذرا جہاں پیما زمانہ تھم گیا

کھینچ کر اِس کے تعاقب میں مجھے دل لے چلا
دہر سے بیگانہ، نظاروں سے غافل لے چلا

خواب سے چونکا تو مَیں تنہا اِک اسٹیشن پہ تھا
ہر طرف سے آرہی تھی چھیپے والوں کی صدا

تھال تھے سستی مٹھائی کے بنا خالص گھی سے تر
گر رہی تھی مکھیوں کی فوج جن پر ٹوٹ کر

ریل کے محدود ڈبے اِس طرح لبریز تھے
بند ہوں ڈربوں میں جیسے مُرغیوں کے قافلے

وہ تپش تھی جسم پر چپکے ہوئے تھے پیرہن
بھیگی بھیگی ساریوں میں برق افشاں تھے بدن

ایک ڈبے میں تھا دیہاتی کے حُقّے کا دُھواں
پاس ڈو سکھ ناک پر رکھے ہوئے تھے اُنگلیاں

کوئلے سے چند بچّوں کی تھیں آنکھیں لال لال
گھورتے تھے کچھ پھلوں کو بہہ رہی تھی مُنہ سے رال

اُس کے جیسی اور بھی شمعیں تھیں لیکن وہ نہ تھی
اُس کی ہمرنگ اور بھی شکلیں تھیں لیکن وہ نہ تھی

کیا خبر تھی یُوں مجھے آوارہ سر کر جائے گی
آنکھ کے رستے اُتر کر دل میں گھر کر جائے گی

آج تک اِس کے تعاقب میں پریشاں ہے نظر
آج تک میرے خیالوں میں ہے اس کی رہگذر

اتنی تسکیں ہے وہ عشوہ گر جہاں بھی جائیگی
مُڑ کے دیکھے گی تو مجکو اپنے پیچھے پائیگی

ادبیات عرب

امرؤ القیس کے حالاتِ زندگی

از جناب عبدالرحمٰن صاحب اصلاحی مستقیمی

امرؤ القیس[1] خاندانِ کندہ کا چشم و چراغ تھا جس کا سلسلۂ نسب ثور بن عفیر سے ملتا ہے جو آلِ قحطان سے تھا اور اسے "کندہ" کے لقب سے اس لئے پکارا جاتا تھا کہ اس نے بہت زیادہ ہلاکت و بربادی کی تھی اور خدا کی نعمتوں کو تاراج کر ڈالا تھا۔

۴۸۰ء میں سرزمین نجد میں ایک سلطنت کی بنیاد پڑی جس کا پہلا بانی حجر بن عمرو تھا جو "آکل المرار" کے لقب سے مشہور ہے۔ درحقیقت اسی خاندان کندہ کا فرزند تھا۔ اس سے پہلے اس خاندان میں کوئی بادشاہ یا سردار نہ ہوا تھا کیونکہ وہ حد درجہ غیر منظم اور لڑاکو تھے جس کی وجہ سے ادنیٰ باتوں پر ایک دوسرے سے لڑ پڑتے تھے اور آپس میں خون خرابہ کرتے۔ جب ان میں بادشاہی کا نظام قائم ہو گیا تو آہستہ آہستہ ان کے حالات بھی سدھرنے لگے یہاں تک کہ وہ اپنے معاملات و مسائل نہایت سنجیدگی سے سلجھانے لگے اور پھر کچھ دنوں کے بعد عمدہ نظام حکومت کے ماتحت زندگی بسر کرنے لگے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے حدود سلطنت میں بھی وسعت ہونے لگی۔ "لخمیوں" سے بھی عنانِ سلطنت چھین لی اور تمام بکر بن وائل کے علاقے پر قابض ہو گئے۔

اسے "آکل المرار" اس لئے کہتے تھے کہ وہ بہت زیادہ چڑچڑا اور غضبناک واقع ہوا تھا جب اس کے سامنے کوئی معاملہ پیش ہوتا تو بہت برافروختہ ہوتا اور بات بات میں مشتعل ہو جاتا۔ یہاں تک کہ وہ غصہ کی حالت میں طرح طرح سے منہ بنانے لگتا جیسے معلوم ہو مرار چبا رہا ہے۔ مرار ایک تلخ قسم کی گھاس تھی جب اسے اونٹ کھا لیتے تھے تو اس کی کڑواہٹ اور تلخی کی وجہ سے اپنے ہونٹوں کو چباتے اور بلبلانے لگتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ اس کی والدہ نے اسکے متعلق جب بھی بات کہی تو وہ فرطِ غصہ سے بیتاب ہو گیا۔

آکل المرار کے بعد عمرو اور عمرو کے بعد اس کا لڑکا الحارث رئیس قوم ہوا۔ اسی کے عہد میں ایران میں کسریٰ کے خاندان سے قباد بن فیروز حکمران ہوا۔ جس کے عہد حکومت میں مزدک نے علم بغاوت بلند کیا اور لوگوں کو الحاد و زندقہ کی تعلیم دینے لگا۔ یہاں تک کہ ایک کی حرم دوسرے پر مباح کر دی اور ہر چیز میں اشتراکیت و ملکیت کا جواز ثابت کیا۔ چنانچہ قباد بھی اس کے نئے دین سے متاثر ہوا اور اس کی دعوت پر لبیک کہا اور آہستہ آہستہ اس کے عقائد کی تبلیغ شروع کر دی۔ انہی دنوں میں ایرانی گورنر حیرہ و انبار میں بنی لخم تھے جو حیرہ کے مستقل شہنشاہ بنے بیٹھے تھے۔ یہ لوگ عرب نصرانیوں کے خاندان سے تھے۔ انہی میں قباد کا ایک گورنر منذر بن سماء تھا قباد نے اسے بھی دعوت دی کہ وہ اس کے اس مذہب کو قبول کرلے تو اس نے تعمیل حکم سے انکار کر دیا جس کے بعد اس نے حارث بن عمرو الکندی کو اس کی پیشکش کی تو اس نے قبول کر لیا جس کی وجہ سے منذر کی ریاست چھین کر حارث کو دیدی گئی۔ اور حارث ان دونوں علاقوں پر حاکم ہو گیا۔

قباد کے مرنے کے بعد نوشیروان تخت سلطنت پر متمکن ہوا۔ مؤرخین کے خیال کے مطابق غالباً وہ ۵۲۶ء میں ایران کا حکمران ہوا ہے چونکہ نوشیرواں کو مزدک سے سخت چڑھ تھی اور اس کے حکمران ہونے سے قبل بعض واقعات ایسے پیش آگئے ہو گئے تھے جن کا اسے سخت ملال تھا اسلئے تخت سلطنت پر بیٹھتے ہی جب منذر اس کے دربار میں گیا تو اس نے پہلا کام یہ کیا کہ مزدک کو باریابی کا حکم دیا اور ساتھ ہی کہا کہ منذر بھی موجود ہے۔ چنانچہ جب یہ دونوں حاضر ہوئے تو وہ بولا "میرے دل میں دو آرزوئیں تھیں اور میں چاہتا تھا کہ ان دونوں کی تکمیل ایک ساتھ ہو" مزدک نے سوال کیا "وہ کیا؟" اس نے جواب میں کہا "وہ یہ کہ ریاست منذر کے سپرد کر دوں اور تمام ملحد اور بے دینوں کو موت کے گھاٹ اتار دوں۔" مزدک یہ سنتے ہی بول اٹھا کہ "یہ کیسے ممکن ہے؟" اس پر نوشیرواں سخت برہم ہوا اور ڈانٹ کر کہا "ارے کمبخت جب سے تیرے پاؤں کو چھا... [illegible]

---

[1] یوں تو امرؤ القیس کے حالات اور سوانح زندگی پر اکثر مصنفین نے نہایت شرح و بسط کے ساتھ لکھا ہے لیکن علامہ اصفہانی نے اپنی "کتاب الاغانی" میں نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے جس کا خلاصہ یہاں درج کیا گیا ہے۔ بعض جگہ دوسری کتابوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ (مستقیمی)

ہمیشہ کو میرے دماغ سے نہیں نکلی"۔ یہ کہکر اس نے اسے قتل کرنے کا حکم دیدیا۔ چنانچہ اسے پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا گیا۔ پھر اس کے بعد تمام ملحدوں اور زندیقوں کو بھی قتل عام کا حکم سنا دیا گیا۔ چنانچہ اسوقت حجاز سے لیکر نہروان تک ایک لاکھ بے دینوں کا قتل ہوا اور تمام پیروان مزدک ایک ایک کرکے ختم کر دیئے گئے۔

اسی سلسلے میں نوشیرواں نے حارث کو بھی حاضر ہونیکا حکم دیا لیکن علم ہونے پر وہ اسباب و سامان لیکر انبار سے بھاگ نکلا کسریٰ نے اس کے تعاقب کے لئے تغلب۔ بہراء اور ایاد کے شہسواروں کو بھیجا چنانچہ وہ بھاگ کر کلب کی اس سرزمین میں پہنچ گیا جو حجاز اور عراق کے درمیان واقع ہے لیکن اس تعاقب میں اس کا تمام مال و اسباب لوٹ لیا گیا اور اس کے ساتھیوں میں سے اڑتالیس آدمیوں کو گرفتار کرکے منذر کے پاس لایا گیا اور اس کے سامنے ان سب کی گردنیں ماردی گئیں۔ لیکن حارث بال بال بچ گیا اور جاکر کلب کے پاس پناہ لی لیکن تاہم وہ وہاں بھی نہ بچ سکا اور آخرکار موت کے گھاٹ اترنا پڑا۔ عام خیال کے مطابق اسے قتل کر دیا گیا تھا بہرحال جو کچھ ہوا اس کے مرنیکے بعد اس کے پانچ لڑکے رہ گئے۔ جن کے نام حجر۔ شرحبیل۔ معدیکرب۔ عبداللہ۔ سلمہ تھے۔ اس کے عہد گورنری میں اس کے ماتحت جو قبائل تھے وہ بنو اسد۔ غطفان۔ بکر۔ تغلب۔ حنظلہ۔ دارم عمرو بن قاسط وغیرہ تھے۔ جس زمانے میں وہ حیرہ میں تھا تو ان قبائل کے شیوخ اس کے پاس درخواست لیکر گئے ہیں آپس کے نزاع سے ڈر ہے کہ ہم لڑ کر تباہ و برباد نہ ہو جائیں اس لئے حضور والا اپنے لائق فرزندوں کو ہمارے قبائل میں بھیجدیں تاکہ ہماری آپس کی جنگ و جدال کا خاتمہ ہو جائے چنانچہ اس درخواست کو اس نے منظور کر لیا اور اپنے تمام لڑکوں کو ایک قبیلہ یا اس سے زائد پر حکمران بنا دیا۔ چنانچہ حجر بنی اسد اور غطفان کا سردار مقرر ہوا۔ شرحبیل۔ بنی بکر۔ حنظلہ اور دارم بن تمیم کے لوگوں پر حاکم ہوا۔ معدیکرب۔ بنی تغلب۔ عمرو بن معد اور بنی دارم بن حنظلہ کے چند لوگوں پر حکمران کیا۔ نیز الصنائع اور بنی رقیہ پر بھی (جو ملوک عرب کے ساتھ رہا کرتے تھے اور خود عربی النسل تھے) رئیس ہوا عبداللہ بنی عبدالقیس کا سردار ہوا اور اسی طرح سلمہ بن قیس پر مسلط ہو گیا۔ چنانچہ حارث کے پانچوں لڑکے ان قبائل پر حکمران رہے اور ان علاقوں پر حکومت کرکے لوگوں کے معاملات درست کر دیتے تھے۔ چنانچہ لوگ ایک مدت تک انہیں خراج ادا کرتے رہے لیکن ایک مرتبہ جبکہ حجر تہامہ میں تھا اس کا محصل ٹیکس وصول کرنے کے لئے بنی اسد کے پاس گیا تو ان لوگوں نے اس کی نافرمانی کی اور اسے خراج دینے سے انکار کر دیا یہاں تک کہ حجر کے آدمیوں کو بری طرح زد و کوب کیا چنانچہ یہ خبر جب حجر کو پہنچی تو وہ بہت خفا ہوا اور ایک فوج ربیعہ سے۔ ایک فوج اپنے بھائی کی فوج میں سے بنی قیس وکنانہ کی لیکر ان کی سرکوبی کے لئے روانہ کی۔ چنانچہ اس جنگ میں ان کے تمام سردار گرفتار کئے گئے اور انہیں بید لاٹھیوں سے لہولہان کرکے تہامہ کی طرف بھگا دیا گیا۔ بنی اسد بیچارے مدتوں تک یہ ظلم و ستم سہتے رہے۔ پھر جب ناک میں دم آ گیا تو آپس میں صلاح و مشورہ کرکے طے کیا کہ جب تک جان میں جان ہے ان کا مقابلہ کرنا چاہئے چنانچہ انہوں نے یہاں تک کہا کہ اگر یہ شخص تم پر غالب آ گیا تو پھر غلاموں کا سا برتاؤ کریگا پھر یہ زندگی کس کام کی جو ذلت کی ہو۔ اور تم لوگ اس وقت عرب میں سب سے زیادہ بہادر اور جری ہو اس لئے بہتر ہے کہ عزت کے ساتھ اپنی جان دو۔ یہ کہنا تھا کہ رگ حمیت پھڑک اٹھی اور آتش انتقام نے حجر سے مقابلہ پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ وہ اس گھمسان سے لڑے کہ حجر کی فوج پیچھے ہٹ گئی اور بنی اسد کے نامی شخص علباء نے دوڑ کر حجر کو اس زور کا نیزہ مارا کہ اس کا کام تمام کر دیا۔ اس کے بعد ہی کندہ بری طرح شکست سے دوچار ہوئے اور ان کی رہی سہی عزت خاک میں مل گئی۔ اور اس طرح امراء القیس کے باپ سے تخت سلطنت چھوٹ گیا۔ پھر یہ خاندان بہت دنوں تک زوال سے ہمکنار رہا اور بادشاہی کا سارا ٹھاٹ ختم ہو گیا۔ یہاں اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس جنگ اور خونریزی کے واقعات سے اغماض کیا جاتا ہے ورنہ اگر عربی مؤرخین کی روایتوں پر اعتماد کر لیا جائے اور انکی پوری باتیں نقل کی جائیں تو ایک داستان اتنی ہو جائیگی کہ ناظرین کو شاید اس سے کچھ دلچسپی نہ ہوگی اور ان کی نگاہیں اس میں ناول کی چاشنی ڈھونڈنا شروع کر دیں گی اس لئے واقعات کی تمام جزئیات کو حذف کیا جاتا ہے اور صرف وہی چیزیں پیش کی جاتی ہیں جن سے شاعر کے خاندانی اور ذاتی حالات پر کوئی روشنی پڑے۔

باپ کے مرنے کے بعد تنہا ہی رہ گیا تھا۔ اس کی ماں کلیب و مہلہل کی بہن تھی۔ کلیب وہ شخص ہے جس کی شہرت کا تمام عرب میں چرچا تھا اور لوگ جب کسی شخص کو بڑھانا چاہتے تو کہتے "فلاں شخص کلیب سے زیادہ معزز ہے"۔ غرضیکہ وہ بچپن سے نہایت ذہین و فطین، بیدار مغز اور حساس واقع ہوا تھا اور شروع ہی سے اس کی طبیعت میں شعر و سخن کا ملکہ موجود تھا چنانچہ یہی جوہر آگے چل کر اور نمایاں ہو گیا۔ اور کچھ دنوں کے بعد وہ عرب کی بزم سخن کا رکن قرار پایا۔ پھر اپنے جذبات و واردات کے اظہار اور اپنی بے مثل فصاحت و بلاغت کے

سبب شعرائے سبعہ معلقہ میں جگہ پائی اور تمام عرب کا ملک الشعراء قرار پایا۔

عرب کے بادشاہوں میں شاعری بہت معیوب خیال کی جاتی تھی چنانچہ ان کے یہاں یہ ہدایت رہتی کہ ان کے بچے شاعری سے احتراز کریں۔ چونکہ وہ خود اس سے متنفر تھے اس لئے اپنی اولاد کو بھی منع کرتے تھے لیکن امراء القیس نہایت لاابالی اور عاشق مزاج واقع ہوا تھا اس لئے اس نے اپنا خاندانی وقار پس پشت ڈال کر اس مشغلے کو جاری رکھا اور پھر اس کا ذوق رندی اتنا بڑھا کہ آگے چل کر طرح طرح کی نازیبا حرکتیں بھی شروع کر دیں یہاں تک کہ اپنی سیادت و سرداری کا بھی کچھ لحاظ نہ کیا اور صد درجے بے پروائی کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگا۔ اس کی آوارہ گردی اس قدر بڑھی کہ عرب کے قبائل کا ناک میں دم کر دیا اور علانیہ فحاشی و بدکاری کرنے لگا۔ بنی طے۔ کلیب اور بکر کے اوباشوں کو لیکر چکر لگاتا جہاں کوئی تالاب۔ کنواں۔ باغ یا شکار کا میدان مل گیا وہیں ڈیرے ڈال دیئے۔ پھر کیا ہے سیر و شکار میں مصروف گائیوں، ہرنیوں، دنبوں کو ذبح کیا جا رہا ہے۔ شراب و کباب کی مجلسیں گرم ہیں مغنیوں اور حسینوں کا جمگھٹ ہے اور گیتوں سے ایک دوسرے کو مست و بیخود کیا جا رہا ہے مختصر یہ کہ اس کی عمر کا بیشتر حصہ ان تفریحوں اور عیش و نشاط کی محفلوں میں بسر ہونے لگا۔ اور وہ نہایت بیباکی و بیخوفی کے ساتھ اپنے ہم نشینوں کے ساتھ رہتا اور دوسرے قبیلہ کی عورتوں سے چھیڑ چھاڑ کرتا یہاں تک کہ وہ جن دنوں سرزمین یمن میں (دمون) مقیم تھا قاصد اس کے باپ کی خبر مرگ سنانے آیا تو دیکھا کہ وہ اپنے مصاحب کے ساتھ بادہ نوشی میں مصروف ہے اور جوا کھیل رہا ہے۔ اس نے امراء القیس کو مخاطب کر کے کہا کچھ خبر بھی ہے حجر کا قتل ہو گیا ہے۔ لیکن اس نے توجہ نہ کی۔ مصاحب جب ذرا رکا تو اس سے کہنے لگا کہ اپنی چال چلو وہ پھر کھیلنے لگا یہاں تک کہ جب بازی ختم ہو گئی تو کہا میں ایسا نہیں ہوں کہ تمہارا کھیل خراب کروں، یہ کہہ چکنے کے بعد اپنے باپ کا حال دریافت کیا تو اس نے تمام واقعہ کہہ سنایا۔ یہ سننا تھا کہ آپے سے باہر ہو گیا اور کہا کہ جب تک بنی اسد میں سے سو آدمیوں کو قتل نہ کر لوں گا اور ان کی سو چوٹیاں نہ کاٹ لونگا مجھ پر مے و معشوق حرام ہے۔ چنانچہ آج بھی اس کا یہ مشہور جملہ زبان زد خلائق ہے۔ "الیوم خمر و غدا امر" آج شراب ہے کل امر عظیم۔ سات دن تک مے نوشی کے بعد جب اس کا نشہ اتر گیا تو قسم کھائی کہ جب تک باپ کا بدلہ نہ لے لوں اس وقت تک نہ گوشت کھاؤں گا نہ شراب پیئوں گا۔ نہ تیل لگاؤں گا۔ نہ کسی عورت کے پاس جاؤں گا۔ نہ غسل جنابت کروں گا۔"

حجر کے قتل کے بعد امراء القیس اور اس کے خاندان عویر یا عامر بن جوہر کے پاس پناہ گزین ہوئے۔ عامر کی بیٹی نے ان کے مال و اسباب کی حفاظت کے لئے اپنے باپ سے سفارش کی۔ تو اس نے منظور کر لیا اور حجر کے اہل و عیال اور مال و اسباب کو اپنے اونٹوں پر لاد کر بحران تک پہنچا دیا چنانچہ انہی احسانات کے صلہ میں امراء القیس نے اس کی شان میں قصائد مدحیہ کہے ہیں۔

امراء القیس نے باپ کے قتل کے انتقام کے لئے طرح طرح کی تیاریاں شروع کر دی تھیں اور دمون سے جا کر بکر و تغلب سے بنی اسد کے خلاف کمک مانگی اور ان میں جاسوسوں کو بھی بھیجا۔ لیکن وہ لوگ جاسوسوں کو دیکھ کر خوفزدہ ہوئے اور بنی کنانہ کے پاس جا کر چھپ گئے وہاں علباء نے انہیں بھڑکا دیا تو وہ لوگ وہاں سے بھی بھاگ کر چلے گئے اور بنی کنانہ کو خبر تک نہ ہوئی یہاں تک امراء القیس کے سوار بنی کنانہ پر حملہ آور ہو گئے اور اسی دھوکے میں ان پر تلوار کھینچ دی، اور للکار کر حملہ کر دیا۔ پھر اپنے تمام سپاہیوں کو نعرہ لگا کر بلایا کہ اے لوگو بادشاہ کا قصاص لینے والو! یہ سنکر بنی کنانہ کی ایک بڑھیا نکلی اور اس نے ان کی غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ ہم لوگ تیرے باپ کے قاتل نہیں ہیں۔ اتنا کہنا تھا کہ سب کی آتش غضب ٹھنڈی ہو گئی اور وہ لوگ وہاں سے واپس لوٹ گئے۔ لیکن اب بھی ان کے دل میں بنی اسد سے انتقام کی خواہش بار بار موجیں مارتی تھی اور وہ اس کے لئے کمربستہ ہو چکے تھے چنانچہ انہوں نے پھر پیچھا کیا اور ایک چشمہ کے کنارے جا کر مڈ بھیڑ ہو گئی آخر کار خوب کشت و خون ہوا اور بنی اسد کے بہت سے آدمیوں کو تہ تیغ کر ڈالا گیا۔ بہت سے زخمی ہوئے باقی جو بچ گئے وہ راتوں رات بھاگ گئے۔ صبح کو بکر و تغلب کے سپاہیوں نے باقی ماندہ لوگوں کا پیچھا کرنے سے انکار کر دیا۔ اور امراء القیس سے کہا کہ اب تم بدلہ لے چکے بس کرو۔ امراء القیس اتنے پر راضی نہ ہوا اور کہنے لگا کہ ابھی حسب خواہش میں نے بدلہ نہیں لیا ہے جب تک کہ میں بذات خود بنی اسد کے کسی شخص کی گردن نہ کاٹ لوں گا۔ اس وقت تک میں لڑائی برابر جاری رکھونگا۔ انہوں نے ہر چند اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی بات پر اڑا رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان لوگوں نے اس کا ساتھ ہی چھوڑ دیا۔ اور وہ یکہ و تنہا حمیر کو روانہ ہو گیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ [illegible] گیا اور

وہاں جاکر قبیلہ ازد شنوءہ سے مدد مانگی۔ انہوں نے مدد دینے سے جب صاف انکار کیا تو وہ ایک حمیری رئیس کے پاس گیا جس کا نام مرثد تھا اس نے امراء القیس کو پانسو آدمیوں کا ایک دستہ دیا لیکن پھر وہ اسی اثنائے میں مر گیا جس کے بعد قرمل حمیر کا رئیس ہوا اس نے امراء القیس کو بلاکر انعام واکرام سے نوازا اور ایک زبردست فوج سے اس کی مدد کی جس میں عرب کے اوباشوں کا ایک بہت بڑا گروہ بھی تھا چنانچہ امراء القیس ان کو لیکر بنی اسد سے لڑنے کے لئے روانہ ہوا۔ راستے میں مقام تبالہ پر جہاں ذو الخلصہ نامی بت نصب تھا اور جس کی عرب بڑی تعظیم کرتے تھے اس نے ازلام تقسیم کئے۔ آمر۔ ناہی۔ متربص۔ تینوں تیروں کو جب گھمایا تو ناہی نکلا۔ پھر دوبارہ گھمایا تو وہی نکلا اس کے پھر تیسری مرتبہ جو گھمایا اور وہی ناہی نکلا تو امراء القیس نے ازلام کو سمیٹ کر توڑ پھوڑ ڈالا اور بت کے منہ پر دے مارا اور گالی دیکر کہا کہ اگر تیرا باپ مرا ہوتا تو اس سے ہرگز نہ روکتا اور اس کے بعد وہاں سے چلدیا اور آخرکار بنی اسد سے خوب گھمسان کی لڑائی لڑی جس میں اسے فتح حاصل ہوئی اور ہمیشہ کیلئے بنی اسد کا سر نیچا کر دیا۔

لیکن چونکہ المنذر کو امراء القیس سے خاص طور پر کد تھی وہ برداشت نہ کر سکی۔ چنانچہ ایاد و بہراء و تنوخ کی ایک بہت بڑی فوج بھیجدی چنانچہ اس کی مدد کے لئے نوشیرواں کی بھی ایک فوج آن پہنچی جس نے حمیر کے تمام لوگوں کو منتشر و پراگندہ کر دیا اور امراء القیس خستہ و درماندہ اپنے بھائی بندوں کو لیکر حارث بن شہاب کے پاس چلا گیا۔ ساتھ میں اس کے پانچ زرہیں تھیں جن کے نام الفضفاضہ، المحصنہ۔ الخریق۔ ام الذیول تھے۔ یہ زرہیں آکل المرار کے خاندان کے ہر اس شخص کو وراثۃً ملتی تھیں جو تخت سلطنت پر بیٹھتا تھا۔

پھر چند دنوں کے بعد المنذر نے اس کے پاس کچھ آدمی بھیجے اور کہا کہ اگر تم آکل المرار والوں کو ہمارے حوالہ نہ کر دوگے تو جنگ برپا ہو جائیگی۔ چنانچہ اس نے مارے ڈر کے تمام آدمیوں کو اس کے حوالہ کر دیا لیکن امراء القیس اپنی لڑکی ہند اور یزید بن معاویہ بن الحرث کو لیکر اور اپنے تمام سامان کو لیکر بھاگ نکلا۔ اور سعد بن الضباب کے پاس جاکر پناہ لی۔ سعد اپنی قوم کا رئیس اور سعودی تھا اور ایک مدت سے سرداری کرتا تھا۔ اس کا ذکر امراء القیس کے اشعار میں اکثر ملتا ہے۔ لیکن کچھ دنوں تک رہنے کے بعد وہ وہاں سے بھی چلدیا اور سرزمین طے میں معلی نامی پاس جو بنی جدیلہ کا ایک شخص تھا جاکر قیام کیا۔ اس کے بعد وہ بنی نبہان اور اسی طرح عامر بن جوین کے پاس گیا۔ عامر کے پاس تھوڑے ہی دنوں تک رہنے پایا تھا کہ عامر کی نیت میں فتور آ گیا چنانچہ اس کے دل میں گدگدی پیدا ہوئی کہ کسی طرح اس کے مال واسباب پر قبضہ کرنا چاہیئے۔ امراء القیس تاڑ گیا اور وہاں سے دھوکہ دیکر بنی ثعل کے ایک شخص حارثہ کے پاس پہنچا چنانچہ اسی بات پر عامر وحارثہ کے درمیان بھی لڑائی ٹھن گئی اور بہت سے لوگ مارے گئے۔ وہاں جنگ وخونریزی کا منظر دیکھ کر بنی فزارہ کے ایک آدمی عمرو بن جابر کے پاس آیا اور اس سے پناہ کا خواستگار ہوا۔ لیکن اس نے اس سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ ابن حجر بیشک تم بڑی مصیبت میں گرفتار ہو لیکن کیا کروں مجبور ہوں اگر ہم تمہاری مدد کرتے ہیں تو بنی طے ہم پر چڑھ دوڑیں گے کیونکہ ابھی کل کی بات ہے کہ وہ ہمارے درپئے آزار تھے۔ چونکہ ہم لوگ صحرانشین ہیں اور ہمارے پاس قلعہ وغیرہ ہے نہیں کہ جس سے مدافعت کر سکیں۔ اس لئے ہم تمہاری مدد کرنے سے قاصر ہیں۔ البتہ میں تمہیں ایک ایسے شخص کے پاس پہنچا سکتا ہوں جو تمہاری بخوبی اعانت کر سکے گا۔ وہ ایک زبردست مستحکم قلعہ کے اندر رہتا ہے اور بہت صاحب شوکت ومرتبہ ہے تیماء کا سموأل یہودی۔ امراء القیس نے اس کے پاس جانیکی خواہش کی چنانچہ وہ ایک شخص ربیع بن فزاری کے پاس لے گیا جو سموأل کے دربار میں ہمیشہ آیا جایا کرتا تھا اور سموأل ہمیشہ اس کے ساتھ نرمی اور احسان کا برتاؤ کرتا تھا چنانچہ وہ امراء القیس کو لیکر سموأل کے پاس پہنچا اور اس کے سامنے اپنے گوہر بار اشعار پڑھ کر سنائے۔ اشعار کا سننا تھا کہ سموأل بیخود ہو گیا اور اس کے رتبہ کو پہچان گیا۔ پھر اس کے بعد اس کو بڑی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھتا اور اپنے پاس نہایت عزت سے جگہ دینے لگا۔ اس کی عورتوں کو چرمی خیمہ اور مردوں کو ایک میدان میں اتارا جہاں اس کی نشستگاہ تھی۔ کچھ دنوں تک اس کے یہاں قیام کیا اس کے بعد سموأل نے امراء القیس کو بلاکر اس کی سفارش کا رقعہ الحرث غسانی کے نام پر جو کہ شام میں تھا لکھدیا تاکہ اسے قیصر تک پہنچا دے۔ امراء القیس نے اپنے ساتھ کے تمام مال واسباب اور عورتوں اور زرہوں کو سموأل کے حوالہ کر دیا۔ یزید نے بھی اپنی عورتوں کے ساتھ قیام کیا پھر امراء القیس قیصر کے دربار میں باریاب ہوا اور اس کی نظر میں

خلعت حاصل کی۔ قیصر نے ایک جماعت جس میں شاہزادے بھی تھے امراء القیس کے ساتھ کر دی۔ اور وہ انہیں کے ساتھ رہنے سہنے لگا۔

جب امراء القیس قیصر کے پاس رہنے لگا تو بنی اسد کے ایک شخص طماح نے قیصر سے اس کے متعلق شکایت کی اور کہا کہ وہ حد درجہ فاسق و فاجر ہے اور دن رات بدکاری و عیاشی میں اس کی زندگی کے لمحات گذرتے ہیں جب وہ آپ کے پاس سے لشکر لیکر چلا تو بیان کرتا تھا کہ آپ کی صاحبزادی سے اس کا نامہ و پیام ہوا تھا اور ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ پھر معاملہ اتنا ہی ہوتا تو کوئی بات نہ تھی لیکن وہ یہاں سے جانیکے بعد اپنے اشعار میں اس کا تذکرہ کریگا اور تمام عرب میں آپ کو اور آپ کی بیٹی کو رسوا کریگا۔ یہ سننا تھا کہ قیصر کے دل میں آگ لگ گئی اور وہ غضبناک ہوگیا چنانچہ اب وہ اس کے قتل کے درپئے ہوگیا اور دن رات اسی فکر میں رہنے لگا کہ کس طرح اس کی جان ختم کرے۔ چنانچہ اب وہ اس کے لئے طرح طرح کی تدبیریں سوچنے لگا۔

ایک روز خلعت زریں جس پر زہر کے نقش و نگار بنے ہوئے تھے امراء القیس کے لئے بطور تحفہ بھیجا اور کہا کہ یہ میں نے اپنا خاص لباس محض تمہاری عزت و تکریم کی غرض سے بھیجا ہے اسے بخوشی منظور کرو اور پہن کر قیصر کو ممنون ہونیکا موقع دو۔ اگر ممکن ہو تو راستے کے تمام احوال سے بھی مطلع کرنا چنانچہ جب یہ خلعت امراء القیس کے پاس پہنچا تو اس نے اسے بخوشی پہنا اور بہت خوش ہوا لیکن پہننا تھا کہ تھوڑی دیر کے بعد زہر اس کے پورے بدن میں سرایت کر گیا۔ اس کی جلد کٹ کٹ کر گرنے لگی اسی لئے اس کا نام اس وقت ذوالقروح (گھائل) بھی ہوگیا اور وہ اسی نام سے ہر جگہ مشہور ہوگیا۔ پھر جب وہ بلاد روم کے شہر انگورہ میں پہنچا تو حالت نہایت ابتر ہوگئی اور لوگ اس سے نفرت کرنے لگے۔ چنانچہ وہاں اس نے کوہ عسیب کے دامن میں جا کر ایک شاہزادی کی قبر دیکھی اور جب اس شہزادی کا پورا قصہ اسے معلوم ہوا تو پھوٹ پھوٹ کر رویا اور اپنے جذبات کا اظہار اس طرح کیا:—

"اے ہمسایہ والی ملاقات کا وقت قریب آگیا،
اب میں بھی جب تک کوہ عسیب قائم ہے یہیں قیام
کروں گا۔ ہم تم دونوں یہاں پردیسی ہیں اور پردیسی
آپس میں بھی رشتہ رکھتے ہیں۔" کچھ دنوں تک وہ زندہ رہا پھر اسی جگہ مر گیا اور اسی قبر کے پہلو میں دفن ہے۔ اس کی وفات کا سنہ غالباً ۵۶۵ء ہے۔

قدیم ہندوستان کی عورت

علمی مضمون

از جناب یوسف علی خاں

معاشرتی اعتبار سے عورتوں کی تاریخ بھی ——— دیگر مظلوم و مفتوح اقوام کی المناک داستانِ تخریب کی مانند ایک انتہائی غمناک حقیقت کا انکشاف کرتی ہے۔ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ ابتدا میں عورتوں سے ہر جگہ انتہائی حقارت و تضحیک کا برتاؤ روا رکھا گیا ہے اور مرد کے مقابلہ میں اس کی ہستی نہایت کمتر اور بے بضاعت تصور کی گئی ہے۔ عورتوں کی معاشرتی سرگزشت کے ضمن میں انگلستان کے مشہور شاعر لارڈ ٹینیسن نے ہر چند نسوانی حالت کی رنگین تصویر پیش کرنے کی سعی بلیغ کی ہے لیکن اس شاعرِ اعظم کی عمیق نگاہیں اس حقیقت کی طرف بھی آخر پہنچ ہی گئیں جو نہایت "تلخ" اور "روح فرسا" ہے۔ اس مقالہ میں ہم پراچین بھارت میں عورتوں کی سماجی زندگی کے مختلف پہلو قارئین کے پیش کرتے ہیں:—

قدیم ہندوستان کی تاریخ اس لحاظ سے تین حصوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے، اوّل ویدک، دوم وہ جو ویدک زمانہ کے بعد آیا اور آمد بودھ تک قائم رہا۔ سوم وہ جو بودھ مت سے شروع ہو کر مدت تک کارفرما رہا۔ ہندوستان کے تمام مورخین اس امر پر متفق ہیں کہ عہدِ اوّلیہ میں نسوانی حالت بہت خوشگوار تھی۔ اس زمانہ میں عورت کے ساتھ مساوات کا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ عام تخیل اور نظریہ یہی تھا کہ عورت مرد کے وجود کا نصف حصہ ہے۔ چنانچہ اس عہدِ عظیم میں عورت کی ہستی انتہائی طور پر قابلِ احترام تسلیم کی گئی تھی۔ رگ وید کے پانچویں حصہ کی نظم ۸ کی حمد کی صاف تشریح یہ ہے کہ "مرد اور عورت ایک ہی شے کے دو برابر حصے ہیں اور ہر معنی میں برابر ہیں۔ ہر کام میں خواہ وہ دینی ہو یا دنیوی ہر دو کا فرض ہے کہ وہ مساوی حصہ لیں"۔ . . . . . . اس قابلِ تکریم ہدایت کا نتیجہ یہ ہوا کہ متعدد لائق تعظیم دیویاں اعلیٰ تعلیم اور روحانیت کا منبع و مرکز بن کر منظرِ عام پر جلوہ فگن ہوئیں۔ رومانشا۔ لوپامدرا۔ ادیتی۔ دشوارا۔ ششوتی۔ گارگی۔ ترئی۔ گودا وغیرہ ان محترم دیویوں میں ممتاز نظر آتی ہیں جن کے اوصافِ حسنہ کا تذکرہ "کالیداس" اور "بھاؤ بھوتی" نے اپنی غیر فانی انداز شاعری میں کیا ہے۔ یہ زمانہ تھا جب لڑکیاں اور لڑکے ایک ہی درسگاہ میں تعلیم پاتے تھے اور ایک دوسرے سے پاکیزہ ارتباط رکھتے تھے۔ شکنتلا کے متعلق یہ واقعہ مشہور ہے کہ وہ کنوا کے دارالعلوم میں ایک ممتاز درجہ رکھتی تھی وہ دیگر متعلمین میں انتہائی طور پر ہر دلعزیز تھی۔ نہ پردہ کا غیر فطری قید تھی نہ لڑکے اور لڑکیوں کی یکجا تعلیم پر کوئی معترض ہوتا تھا۔ بھاؤ بھوتی نے بھی "اتریوی" دیوی کا ذکر کیا ہے جو دکھنی سے دارالعلوم اگستیا سے ویدانت کا درس حاصل کرنے آئی تھی۔

اس میں شک نہیں کہ اس درخشاں عہد میں چند ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جن سے شبہ ہو سکتا ہے کہ نسوانی تعلیم صرف اعلیٰ طبقہ تک محدود تھی لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسرے طبقوں کی دیویاں زیادہ تر خانگی زندگی میں اپنا وقت صرف کرتی تھیں۔ اخلاقی اعتبار سے ان کا معیار بہت بلند اور قابلِ رشک تھا۔ کثرتِ ازدواج کی رسم صرف راجوں مہاراجوں میں پائی جاتی تھی۔ تمام تعلیم یافتہ عورتیں اس سے متنفر تھیں۔ بایں ہمہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس زمانہ کی رانیوں نے میدانِ جنگ میں وہ نادر کارنامے پیش کئے ہیں کہ تاریخ ان بہادر عورتوں کی شجاعت کو کبھی فراموش نہ کرسکیگی۔ یہ تھی اس زمانہ کی کیفیت جس کو ہم "قبل از تہذیب" قرار دیتے ہیں۔

دوسرا دور ہم نے اس موضوع کے لئے وہ تجویز کیا ہے جو بودھ مت کے پرچار اور ویدک زمانہ کے درمیان واقع ہوا ہے یہ زمانہ دراصل ایک درمیانہ کڑی ہے۔ یہ وہ دورِ ثانی ہے جس میں ویدک زمانہ کے علوم و فنون کا پرچار کیا گیا تھا۔ مذہبیت کا رنگ ہر شے پر مسلط تھا۔ اس زمانہ میں منوجی اور یجنا ولکیا نیز چند مختلف فلسفوں کے شعبے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن مذہبی لٹریچر کی اس ترقی کے باوجود عورتوں کی حالت اس درمیانہ عہد میں مائل بہ تنزل تھی۔ عہدِ اوّلین کی ترقی اب ختم ہو چکی تھی۔ غریب عورت اور اس کے فطری حقوق تخریب کی کٹھالی میں پگھل رہے تھے اور اس کی قابلِ تعظیم ہستی مرد کے تعصب اور حسد و نفرت کے غبار میں

رُونُش ہو چکی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ منّو جی اور رشی یجنا ولکیا نے آخر عورتوں کے متعلق ایسی تعلیم کیوں دی؟ اِن اعلیٰ ہستیوں نے غریب عورت پر یہ مظالم نازوا کس نظریہ کے ماتحت روا رکھے، حقیقتاً یہ مقامِ تعجب ہے۔ منّو جی کے مسودات میں ہر جگہ "طلبہ" کا ذکر آتا ہے۔ برہم چاریوں کا ذکر آتا ہے۔ مگر سب کچھ مردوں سے متعلق ہے۔ عورتوں کے لئے ایک کنایہ تک بھی ان کی تعلیم میں نہیں پایا جاتا۔ بلکہ منّو جی فرماتے ہیں:-

(۱) لڑکیوں کی شادی کرنا اُن کو مقدس ویدوں کی تعلیم دینے کے مترادف ہے۔ لڑکی کا شوہر کی خدمت کرنا آشرم میں تعلیم حاصل کرنے کے فخر و شرف کا درجہ رکھتا ہے۔ گھر کا کام کاج کرنا اس کیلئے "سندھیا وندن" اور "اگنی ہوترا" کے تقدس کے برابر ہے۔

(۲) ۳۰ سالہ مرد کو چاہئے کہ ۱۲ سالہ لڑکی سے شادی کرے۔ ۲۴ سالہ مرد کو چاہئے کہ ۸ سالہ لڑکی کو اپنے بیاہ میں لائے۔ اور اگر ایک مرد محسوس کرے تو اس سے پہلے بھی اپنی شادی کر سکتا ہے۔ ایک لڑکی کے لئے ۸ سال کی عمر شادی کے لئے موزوں خیال کی گئی ہے اور بلوغت کے بعد شادی نہ کرنا دوزخ کی سزا کو دعوت دینا خیال کیا گیا ہے۔

مذہبی لحاظ سے یہ تعلیم خواہ کتنی ہی قابلِ احترام ہو لیکن بہرحال اس سے ظاہر ہے کہ دورِ ثانی میں عورت کا درجہ بہت پست تھا۔ اسی ضمن میں یہ کہنا غیر متعلق نہ ہوگا کہ منّو جی کے خیال میں عورتوں کو نہ تو برت رکھنے کی ضرورت ہے نہ قربانی کرنے کی۔ یہ ثواب صرف مردوں کی خدمت کر کے حاصل ہو سکتا ہے۔ حتیٰ کہ والدین کی رضامندی کے بغیر لڑکی سے جبری شادی کو بھی ممنوع قرار نہیں دیا گیا۔

قارئین اندازہ فرما سکتے ہیں کہ دورِ اوّل اور دورِ ثانی کی عورت میں کتنا فرق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسرے دور میں عورت کے حقوق کو عبرت انگیز طریقے پر پامال کیا گیا۔

خوش نصیبی تھی کہ مہاتما بودھ کے زمانہ میں ہندوستان کی عورتوں کی حالت میں ایک نمایاں تغیر پیدا ہو گیا۔ اور وہ دھبے جو دامنِ نسوانیت پر عہدِ وسطیٰ میں لگ چکے تھے فی الفور دھو دیئے گئے۔ اور عورت کی شخصیت میں پھر درخشانی پیدا کی گئی اور اس کے اخلاقی و سیاسی وجود کو پھر اُبھارا گیا۔

مہاتما بودھ نے نہ صرف چاروں ذاتوں کو دھرم شاستر پڑھنے کا مساوی حق عطا کیا بلکہ بھکشو عورتوں کو بھی یہ اجازت دے دی کہ وہ اپنے دھرم کی مقدس کتابیں پڑھ سکتی ہیں۔ ورنہ اصل عورتوں کو اس سے قبل شودر کے برابر قرار دیا گیا تھا۔ اس تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ بہت جلد بودھی عبادت خانوں اور خانقاہوں میں کثیر تعداد عورتیں اور مرد تحصیلِ علم میں مصروف ہو گئے۔ یہ وہ دور تھا جب عورتوں کو ان کی سلب شدہ آزادی واپس دی گئی اور ان کے فطری حقوق اُن کو واپس مل گئے۔ مذہبی تعلیم کے علاوہ عورتوں نے اس زمانہ میں ہر شعبہ حیات میں کافی ترقی کر دکھائی۔ اس ضمن میں ہم بھارتی جی کا مقدس نام پیش کرتے ہیں جن کو یہاں تک عروج حاصل ہوا کہ انہیں شنکر جی اور منڈن مسرا جی کے درمیان ایک منصف یا ثالث کا درجہ دیا گیا۔ بھارتی جی کی شخصیت عدیم المثال ہے۔ وہ ماہتاب کا ایک پارۂ درخشندہ ہی نہ تھیں بلکہ کامل ماہتاب تھیں۔ غرضیکہ یہ زمانہ تھا جب عورت حقیقی معنوں میں مردوں کے خود ساختہ، مجرمانہ اور غاصبانہ قوانین سے یکسر آزاد تھی۔ اس کا پیکرِ جمال سماج کی آہنی زنجیروں سے یکلخت دور ہو چکا تھا اور یہ مساوات کے اصول پر فضائے قدیم میں کارفرما نظر آتی تھی۔

یہ تھی سوسائٹی کی اجتماعی اور معاشرتی حالت لیکن صد حیف کہ یہ دورِ گراں خوابی بھی بہت جلد علمبردارانِ مذہب کے ہاتھوں پامال ہو گیا۔ مختلف واقعات اور اثرات نے ایک کیفیت ردِ عمل پیدا کر دی۔ مذہبی منڈلیوں میں ایک انقلاب رونما ہوا اور بودھ دھرم کی تعلیم کے خلاف اطرافِ ہند میں چند جماعتوں نے شورش برپا کر دی اور آخر یہ مذہبی ادارے کامیاب بھی ہو گئے۔ انہوں نے "ویدک دھرم زندہ باد" کا نعرہ کچھ اس طرز پر بلند کیا کہ عوام متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ حقیقتاً ویدک دھرم کی تجدید کا سہرا چند راسخ العقیدہ اربابِ سر ہے لیکن برہمنوں کی جماعت نے بھی اس تحریک کو کافی امداد پہنچائی۔ چونکہ برہمن جانتے تھے کہ ویدک دھرم اور ان کا اقتدار لازم و ملزوم چیزیں ہیں۔ چنانچہ بودھ دھرم کی زبردست معاشرتی طاقت روز بروز انحطاط پذیر ہونے لگی اور برہمنوں کا کھویا ہوا تسلط پھر سے برقرار ہونے لگا اور انہی مذہبی ٹھیکیداروں نے عورتوں کے معاشرتی حقوق پھر منہدم کر دیئے۔ "منّو جی" کی تعلیم کی پھر تبلیغ کی گئی اور یہ تبلیغ کامیاب بھی ہوئی۔ برہمنوں نے عورتوں کی پھر وہی حالت کر دی جس کا تذکرہ ہم اوپر تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ دورِ حاضر میں ایک زبردست کیفیت ردِ عمل پیدا ہو چکی ہے۔ رفتہ رفتہ مختلف قوانین وضع کئے جا رہے ہیں۔ سارداایکٹ اور دیگر مسودہ ہائے قانون مثلاً ہندو کوڈ بل وغیرہ اس امر کی کھلی ہوئی دلیل ہیں کہ عورتوں کی معاشرتی حالت عصرِ حاضر میں بہتر ہو کر رہے گی اور ہمارے مذہبی ٹھیکیدار اپنی مخالفت میں ناکام ہوں گے۔

سوزِ غمِ اُلفت

عشق میں مٹ کر حیاتِ جاوداں پاتا ہوں میں
جوشِ اُلفت میں کبھی اتنا اثر پاتا ہوں میں
اُن کے ہر فرمان کو دل سے بجا لاتا ہوں میں
گردشِ قسمت کے ہاتھوں چین کب پاتا ہوں میں
جام و ساغر کی ضرورت مجھکو اے ساقی نہیں
ہو نہو دُنیا میں کوئی انقلاب آنے کو ہے
ماورائے حدِ تعین سے ہے اُلفت کی کشش
مَیں سراپا عشق ہوں رگ رگ میں ہے اُلفت کا درد
کائناتِ دہر میں طاری مجھی پر ہے جمود
شکوۂ بیداد تو کیا مجھ سے ہوگا ہمنشیں
دل سے بڑھکر رہنما کوئی محبت میں نہیں
مَیں تو پھر بندہ ہوں بندے کی حقیقت کچھ نہیں
پرتوِ نورِ خدا ہے جلوۂ ذاتِ بشر
یا الٰہی خیر وہ کچھ مجھ سے برہم تو نہیں
میرے مذہب میں کسی کا دل دُکھانا کفر ہے
سوچتا تھا ابتدائے عشق میں انجامِ عشق
ساری دُنیا سے الگ ہے میری رسمِ عاشقی
عشق میں آنکھوں سے دیکھا ہے وہ انجامِ وفا
پھونکے دیتا ہے مجھے سوزِ غمِ اُلفت دُعاؔ

اپنی جانب آج اُن کو ملتفت پاتا ہوں میں

از حضرت دُعاؔ ڈبائیوی

لاکھ وہ مجھکو مٹائیں کیا مٹا جاتا ہوں میں
اُن کی صورت میں زمانے کو نظر آتا ہوں میں
کہتے ہیں دیوانہ بن دیوانہ بن جاتا ہوں میں
جب اُنھیں پاتا ہوں اپنے آپ کھو جاتا ہوں میں
تیری آنکھیں دیکھکر مدہوش ہو جاتا ہوں میں
اپنی جانب آج اُن کو ملتفت پاتا ہوں میں
وہ کہیں صورت چھپائیں اُن کو دیکھ آتا ہوں میں
عرش ہل جاتا ہے ایسے شعر فرماتا ہوں میں
ورنہ ہر ذرّے کو سرگرمِ عمل پاتا ہوں میں
سیدھیاں بھی وہ سُناتے ہیں تو پی جاتا ہوں میں
بے خطر اِس راہ سے گذرا چلا جاتا ہوں میں
دردِ اُلفت میں خدا کو مُبتلا پاتا ہوں میں
چشمِ بینا ہو تو ہر شئے میں نظر آتا ہوں میں
دردِ دل میں آج تھوڑی سی کمی پاتا ہوں میں
جب کوئی مجبور کرتا ہے تو پی جاتا ہوں میں
اَب نتیجہ کیا جو اُلفت کر کے پچھتاتا ہوں میں
ظُلم وہ کرتے ہیں مجھ پر اور شرماتا ہوں میں
اَب وفا کا نام سُنکر بھی لرز جاتا ہوں میں
آپ اپنی آگ میں خود ہی جلا جاتا ہوں میں

دولت کی قربان گاہ پر

معاشرتی افسانہ

از جناب عبدالواسع عصری پھلواروی

تنجگا ندی ضلع شیموگہ میں ایک بڑی ندی ہے۔ یوں تو سال بھر ہی اس میں پانی رہتا ہے مگر بارش کے موسم میں اس کا شباب غضب ڈھاتا ہے۔ کئی جانور بہت سے گھر اور درخت اس کی نذر ہو جاتے ہیں۔ یہ دریا کہیں جنگل میں سے گذرتا ہے تو کہیں مسافروں کی طرح رستے کے کنارے کنارے چلتا ہے اور کہیں بستیوں سے اتنا قریب ہو جاتا ہے کہ گھروں کے آنگن میں گھس جاتا ہے۔ اس روانی کو دیکھکر آپ کے دماغ میں فوراً مغربی اقوام کی پالیسی اور چالبازیوں کا خاکہ کھنچ جائیگا۔ کیونکہ یہ قومیں جب اپنا مطلب نکالنا چاہتی ہیں تو آپ سے اتنا قریب ہوتی جاتی ہیں گویا آپ کی قریبی رشتہ دار ہیں۔ اور جہاں آپ سے ان کا کام نکل گیا تو اتنی کشیدہ اور دور ہوئیں کہ گویا آپ ان کے لئے اجنبی ہیں۔ آہ یہی وہ پالیسی ہے جس کے اثر سے سادہ لوح ہندوستانی بچ نہیں سکے۔ اخلاص جاتا رہا، محبت اڑ گئی، اور قومیں ایک دوسرے کے خون کی پیاسی نظر آرہی ہیں۔

اس دریا کے دونوں طرف جنگل بھی ہیں، جانور بھی اور انسان بھی بستے ہیں۔ معلوم نہیں ان سے انہیں ایسی کیا محبت ہے کہ ہر سال اسکی بھینٹ چڑھتے ہیں مگر اس کے قریب ہی رہتے ہیں، وہ اپنی امان سمجھتے ہیں۔ اس رستے سے آپ کتنی دور بھی نکل جائیے آپ کو تھکان محسوس نہ ہوگی بلکہ آپ اس کے البیلے مناظر سے لطف اندوز ہوتے رہیں گے۔ آپ کو اپنی داہنی طرف جوار اور دھان کے کھیت اور باغوں میں سپیاری کے درخت بھورے رنگ کی وردی پہنے، سبزہ پتوں کے گچھے دار عمامے باندھے، قطار در قطار کھڑے ہوتے نظر آئیں گے، بائیں طرف آپ کی آنکھ سبزہ زار جنگل کو دیکھیگی جس میں ہرن اور چیتل چرتے اور کبھی آپ کا منہ تکتے دکھائی دیں گے کہیں مور کی پکار، کوئل کی کوک، فاختہ کی کوکو آپ کے جذبات سے چھیڑ چھاڑ کرے گی۔ کہیں ندی کے پانی کی کھلکھلاہٹ، کہیں اس کی خاموشی آپ کو انسانی زندگی کے گر بتلائے گی؛ اور آپ آگے تو نکل جائیں گے لیکن تھوڑی دیر پر کھیتوں میں کام کرتی ہوئی سیدھی سادی بھولی بھالی کنواری دیہاتی لڑکیوں کے دلفریب گیت آپ کو متوالا بنادیں گے۔ ابھی آپکے کانوں میں یہ لگدار نغمے گونجتے ہی ہوں گے کہ سامنے سے شیر کی آواز سنائی دے گی، چیتے یا ریچھ کا جنگل میں بھاگتے ہوئے نظر آنا آپ کا نشہ ہرن کر دیگا،

آپ خوف کے مارے سہم جائیں گے اور جان بچانے کے لئے ادھر ادھر دیکھیں گے، اتنے میں آپ کو اس رستے پر چند ہمسفر مل جائیں گے اور آپ خوشی خوشی اپنی منزل مقصود پر پہنچ جائیں گے۔

اس دریا کے کنارے کنارے کئی گاؤں آباد ہیں، ان میں سے ایک ایسے گاؤں میں شیر خاں نمبردار رہتا ہے۔ اس گاؤں کی زیادہ آبادی کسانوں کی ہے، ان میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی۔ شیر خاں کی دولت نے انہیں بندۂ بے دام بنا رکھا ہے۔ وہ انہیں ہر فصل پر روپیہ قرض دیتا اور تمام فصلیں خواہ وہ سپیاری کی ہوں یا دھان کی قیمت پر لے لیتا ہے۔ مگر کسی کسان کو اتنی ہمت نہیں کہ شیر خاں کی لگائی ہوئی قیمت سے انکار کر دے۔ بیچارے غریب کسانوں کو سال بھر محنت کرنے پر بھی آرام کا سانس نہیں نصیب ہوتا اور نہ قرض سے نجات ملتی ہے۔ اس نے اس چھوٹے سے گاؤں میں ایک غلے اور کپڑے کی دکان بھی کھول رکھی ہے، تمام کسانوں کو کپڑے سے لیکر ایلی تک ہر ضرورت کی چیز اسی دکان سے مہیا ہو جاتی ہے اور اجناس کی قیمت دگنی لگاکر مجبور اور نادان کسانوں کا گلا گھونٹا جاتا ہے جو چیز شہر میں چار آنے قیمت پاتی ہے وہ اس دکان میں، اس کی قیمت آٹھ آنے لگائی جاتی ہے۔ بے بس کسانوں کو مجبور ہو کر خریدنا ہی پڑتا ہے؛ اور جہاں فصلیں تیار ہوئیں، کھیت کٹنے لگے، جنس کے ڈھیر کھلیان میں لگائے گئے، وہاں شیر خاں اپنے تین چار نوکروں سمیت حساب کی موٹی سی کتاب لئے ہوئے آدھمکا، ایک ایک کر کے قرض کی فہرست پڑھنی شروع کی اور تمام کھلیان کے غلے پر اپنا قبضہ جما کر بیٹھ گیا۔ آفت کا مارا کسان اپنی محنت کو اس طرح برباد ہوتے ہوئے دیکھ اور اپنی قسمت پر روتا ہوا گھر چلا جاتا ہے۔ قرض کی ادائی کی سبیل اور اپنی محنت سے راحت اس غم نصیب کو کہاں میسر۔ سال بھر محنت کرتا ہے، قرض لیکر کھاتا ہے، اور فصلیں قرض خواہ کے حوالے کر کے بھی قرض کے بارے دبا رہتا ہے، زبان بند، جذبہ آزادی فنا، راحت عنقا، خیالات پراگندہ۔ آہ اگر کسان نے ذرا بھی ہوا کی اور خرمن حوالے کرنے سے [illegible]

نوبت آجاتی ہے۔ حکومت اُن کی، عدالت اُن کی، تحصیلدار، پٹیل پٹواری سب حرام خور۔ جہاں جھوٹی ہاں گری وہاں بھوکے گدھوں کی طرح منڈلانے لگے۔ اِنصاف کیسا، صداقت کہاں، یہی ہیں اِس دَور کی خوبیاں۔ سرمایہ داری کے جنون نے اِنسانوں کی مٹی پلید کر رکھی ہے۔ جذبۂ ہمدردی فنا ہو چکا ہے۔ ہر طرف روپے کی پرستش ہو رہی ہے، خدا، بھگوان، ایشور سب روپے کے نام ہیں۔ یہ سب کچھ برکات اور فیض انہی مُورت والے سکوں کی ہیں جن سکوں پر مورتیں نہ تھیں لوگ اِنسانی صُورتوں پر فدا ہوتے اور جان دیتے تھے، آج اِن سے بیزاری اور نفرت پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ یہی وہ مُورت والا روپیہ ہے جس نے مہذّب دُنیا میں اِنسانوں کو مہذّب ڈاکو اور قاتل بنا دیا ہے، اور جہاں دولت ہو وہاں مالک کا سر کچل کر چھیننے کا گُر سکھا دیا ہے۔ یہی حال شیر خاں کا تھا، اُسے روپیہ حاصل کرنے کے تمام گُر معلوم تھے، وہ وحشیانہ طریق سے بھی کام لے سکتا تھا۔

اِس چھوٹے سے گاؤں میں قاسم نامی ایک کسان رہتا تھا، اُس کے پاس بھی کھیت تھے لیکن شیر خاں کے ہتھے نہیں چڑھتا تھا۔ کھیت سے جو بھی غلّہ ملتا، شیر خاں کے ہاتھ فروخت کرتا اور نہایت تنگی سے اپنی زندگی گزارتا تھا۔ لوگ اُس کی زندگی پر رشک کرتے، پڑوسی حسد کی آگ میں جلے بُھنے جاتے اور شیر خاں سے جا کر اکثر اس کی شکایت کرتے مگر غیور قاسم کسی کے بارے میں اپنی زبان سے کچھ نہ کہتا، ہمیشہ شیر خاں کا تابع فرمان رہتا اور اُس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ بُرا کہنے والے اور بُرا کرنے والے دونوں کو قاسم کو نقصان پہنچانے کی جگہ نہ ملتی تھی، قاسم کو رام کرنے کے لیے شیر خاں نے کبھی بہت کھیل کھیلے۔ طرح طرح کے سبز باغ دکھلاتے۔ ہمدردی سے، اخلاص سے، ڈانٹ ڈپٹ سے، کمینگی سے، مگر قاسم کے کان پر جوں نہ رینگی اور وہ اِن سب باتوں کے سامنے گونگا کا گونگا ہی رہا۔ آخر شیر خاں نے ہار مان کر قاسم کو اُس کے حال پر چھوڑ دیا۔

قاسم کی ایک لڑکی تھی، اس کا نام تھا آمنہ۔ لیکن گاؤں والے اسے امّو امّو کہا کرتے تھے، وہ حسین ہونے کی وجہ سے تمام گاؤں میں زیادہ عزیز تھی، کم سن تھی، گاؤں کی آزاد فضا میں، کھیتوں اور میدانوں میں تیتری کی طرح تھرکتی پھرتی تھی۔ لوگوں کی آنکھیں اُٹھتی تھیں اور زبانیں اٹھ کر یہی کہا ہے کہہ کر رہ جاتی تھیں: اللہ نے اُسے جہاں حُسن سے آراستہ کیا تھا وہاں اُسے ایسی سُریلی آواز بھی عطا کی کہ گاؤں والوں کے دلوں کو موہ لیتی تھی۔ کھیتوں کے کاموں سے فارغ ہو کر اکثر کسان امّو کو گیت گانے پر مجبور کرتے، کوئی مٹھائی کا لالچ دیتا، کوئی گڑیا کا، کوئی چنول کا۔ مگر امّو بلبل کی طرح اِدھر اُدھر کودتی اور مچلتی پھرتی اور کہتی کہ کیا میرے گیت اتنے سستے ہیں؟ اس پر یار لوگ ایک قہقہہ لگاتے اور منّت کرتے کہ دیکھو امّو اب کے تیوہار میں ہم تجھے شہر کے بازار میں لیجائیں گے، تماشہ دکھائیں گے اور تیری گود مٹھائی سے بھر دیں گے تو اب ایک گیت گاتی ہے کہ نہیں —— امّو منہ بنا کر، ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہتی دیکھو جھوٹ نہ بولنا، اب کے تیوہار پر ضرور لیجانا —— ہاں ہاں، ہمارے سر کی قسم ضرور لے جائیں گے، امّو خوش ہو جاتی اور گیت گاتی، گاؤں کی ساکن فضا میں امّو کے نغموں کی گونج سے کیف و مستی چھا جاتی، لوگ مست ہو کر جھومتے، کوئی تالیاں بجا بجا کر مزے لیتا، کوئی بے خود ہو کر ناچنے لگتا، اس طرح ہر روز شام کو یہ ڈراما کھیلا جاتا تھا۔ بیٹی کو دیکھ دیکھ کر باپ خوش ہوتا، ماں دُعائیں دیتی تھی۔ دن اسی طرح گذر رہے تھے، گاؤں کے لوگ امّو کے وجود کو ایک نعمت سمجھتے تھے یہی اُن کی دلبستگی کا بڑا سامان تھی۔

شیر خاں کے دل پر بھی اُس کے حُسن کی دھاک بیٹھ چکی تھی، وہ دل ہی دل میں سوچتا اور کُڑھتا رہتا کہ کہیں اس کا حُسن دل افروز گاؤں کے لوگوں کو مسخر کر کے اس کی مہاجنی کو خاک میں نہ ملا دے۔ وہ ہمیشہ امّو کی توجہ کو اپنی طرف پھیرنے کی کوشش کرتا، کبھی لاڈ، کبھی پیار سے، کبھی چمکار کر، پچکار کر۔ مگر امّو فطرتاً اسکی صورت سے بیزار تھی بلکہ اس کی صُورت دیکھنا بھی گوارا نہ کرتی تھی، کسانوں کے مجمع میں امّو جب گیت گانا شروع کرتی تو شیر خاں بھی اُس سے لُطف اندوز ہونے کے لئے کبھی کبھی وہاں آجاتا، مگر جیسے ہی امّو کی نظر شیر خاں پر پڑتی وہ اپنا گانا موقوف کر کے اپنی جھونپڑی کی طرف چل دیتی۔ لوگ پکارتے ہی رہتے وہ کسی کو جواب دیئے بغیر جھونپڑی میں چلی جاتی، گھنٹوں باہر نہ نکلتی۔ لوگ حیران رہ جاتے۔ ایک روز ایسا ہی ہوا تو لوگوں نے کہا۔ میاں جی! کیا آپ کو ہمارا اس طرح مل کر بیٹھنا بھی پسند نہیں آتا، دو گھڑی مل بیٹھ کر دل بہلاتے ہیں تو آپ یہاں بھی آکر اپنا روب زرعب گانٹھتے ہیں —— روپ گانٹھتے ہیں، اور —— تم نے تو اس لونڈیا کو گاؤں کی کنچنی بنا رکھا ہے، ہر روز شام کو ناٹک کھیلا جا رہا ہے —— قاسو! ارے قاسو (قاسم)

یہ تیری بیٹی ہے کیا ---- شیر خاں نے گرجتی ہوئی آواز سے پوچھا۔
کسانوں نے کہا۔ میاں جی! جو انجان کو تمام کر بات کیجے، وہ تو ہمرے
گاؤں کی موہنی ہے، وہ کچھ کیوں ہونے لگی؟ میاں جی! آپ نمبردار
ہوں تو ہوں، پر ہمرے کھیل کود میں آپ کی بڑائی نہیں چلتی، کیا
دل بیٹھا بھی ظلم ہے میاں جی، ہم تو باج آئے آپکی ایسی باتوں سے ----
بس بس ذرا جبانوں کو روکو ---- میں تو اس کا گانا سننے کیلئے آیا تھا،
اس لونڈیا نے میری بے اجتی کی، دیکھتے نہیں وہ میری صورت دیکھ کر
بھاگ گئی اور بھاگ جاتی ہے ---- کیا میں بھوت ہوں جو وہ تمہارے
بلانے پر بھی نہیں آئی، اچھا میں دیکھوں گا ---- شیر خاں نے کہا۔
کسانوں نے یہ بات سن کر کہا۔ ہے ہے بابو جی! ---- وہ تو ابھی
لڑکی ہے، آپ تو ہمرے گاؤں کے نمبردار ہیں، بڑے آدمی ہیں،
سرکار میں، دربار میں، بڑی اجت ہے آپ کی، غلطی ہو گی، ڈر گئی،
آپ کو اس سے بیچاری کیسی بابو جی ---- تم کیا جانو، جاہل کسان ہو،
میں سب سمجھتا ہوں ---- شیر خاں نے غصے سے کہا اور اپنے گھر کی راہ لی
کسانوں نے شیر خاں کے تیور بدلتے دیکھے مگر خاموش ہو گئے۔ رات
ہو گئی تھی، گاؤں کی عورتیں کھانا پکا کر، گھروں کے باہر چبوتروں پہ
بیٹھی باتیں کر رہی تھیں، ارنڈ کے تیل کے چراغ جل رہے تھے۔ انتو بھی
کھانا پکا کر باہر آئی اور آنگن میں آ کر اپنے باپ کو آواز دی۔ گاؤں کے
لوگ اپنی اپنی جھونپڑیوں میں چلے گئے، قاسم بھی اپنے گھر آ گیا،
گاؤں پر سناٹا چھا گیا۔ دن یونہی گزرتے گئے۔ انتو چھوٹی سے
بڑی ہوئی، اب اس میں بچپن کا وہ چلبلا پن نہیں رہا تھا۔ سادگی تو تھی
پر ساتھ ہی حیا اور شرم نے اس کے حسن میں چار چاند لگا دیئے تھے۔ اب
وہ گھروں میں زیادہ بیٹھتی نہ تھی اور نہ مرد اس کو پکارنے کی جرأت
کرتے تھے، وہ دن رات اپنی سہیلی پارملا کے ساتھ رہتی، اسی کے ساتھ
اٹھتی بیٹھتی تھی، اس کی جوانی چودھویں رات کی چاندنی کی طرح
چھٹکی ہوئی تھی۔ گاؤں کے جوان لڑکے اس کو دیکھ کر بےخود ہو جاتے تھے،
شیر خاں کی نیت بھی بدلی ہوئی تھی، مگر وہ فکر میں تھا۔

ایک دن انتو کھیت میں گھاس کاٹ رہی تھی، جھونپڑی میں باپ
سو رہا تھا، گنے اور بیل ادھر ادھر چر رہے تھے، سورج ڈھل چکا تھا
اس نے جلد جلد گھاس کا گٹھا باندھا اور گھر جانے کو تیار رہی لیکن
گھاس کا گٹھا بہت بھاری تھا، اٹھا نہ سکی، پدما کا انتظار کر رہی تھی،
دھوپ کی تیزی سے پسینے میں ڈوبی ہوئی تھی ستانے کے لئے
کھیت کے کنارے ایک درخت کی چھاؤں میں جا بیٹھی، کھیت کی
پگڈنڈی سے کسی کو آتے ہوئے دیکھا، گردن اٹھا کر دیکھا تو وہ نمبردار تھا
خوف سے سہم گئی، شیر خاں نے اس کے قریب آ کر کہا۔ انتو تو یہاں
کیوں آئی تھی؟ ---- گھاس کاٹنے کے لئے، انتو نے رکتے ہوئے
جواب دیا ---- آئیں اٹھا دوں، کتنی دیر سے تو یہاں کھڑی ہے
---- شیر خاں نے محبت بھری آواز سے کہا ---- بابو جی کھیت
میرے ہیں، باوا سو رہے ہیں، ڈر کا ہے کا ---- انتو نے کہا ----
اچھا چل، گھاس کا گٹھا اٹھا لے نمبردار نے کہا ---- بابو جی! آپ
کیوں ظلم کر رہے ہیں، جائیے اپنا راستہ لیجئے ---- میں کیا اب نہیں
تو شام تک آؤں گی ---- انتو نے بے پروائی سے جواب دیا ---- ایں!!
یہ گمزے (غمزے) اور گرور (غرور) تجھے ناک چنے نہ چبواؤں تو نمبردار
نہیں، ذرا میرے پلے پڑ تو سہی ---- باواجی! آپ کے پلے میں کیوں
پڑنے لگی، آپ بڑے آدمی ہو کر کنواری لڑکیوں سے اس طرح کی چھیڑ چھاڑ
کیوں کرتے ہیں، بابو جی! شرم نہیں آتی آپ کو ---- انتو! میں نمبردار
ہوں، تیرے اس گرور کا مجا (مزہ) جرور چکھاؤں گا ---- چپ رہ،
جبان دراجی اچھی نہیں ---- آپ نمبردار ہوں تو مجھے کیا، اجت
اسی میں ہے کہ آپ یہاں سے چلے جائیں، انتو نے غصے سے کہا اور
اپنے کھیت میں چلی گئی۔ نمبردار کباب کی طرح جلا بھنا گاؤں کو چلا آیا۔
تھوڑی دیر میں پدما بھی بیلوں کو ہانکتی ہوئی پہنچی۔ گھاس کا گٹھا انتو کے
سر پہ رکھا، دونوں ہنستی باتیں کرتی گھروں کو روانہ ہوئیں۔

دیوالی تیوہار کے دن قریب تھے، زور شور سے تیاریاں ہو رہی
تھیں، گھر صاف کئے جا رہے تھے، لپائی پتائی ہو رہی تھی۔ مرد کپڑے کی
خرید اور سلائی میں مصروف تھے، گاؤں میں خاصی چہل پہل ہو گئی تھی،
اسی گاؤں کے قریب تھوڑے فاصلے پر تیوہار کے دن بڑا میلہ لگتا تھا
قسم قسم کے کھیل، تماشے ہوتے تھے، آخر تیوہار کا دن بھی آ گیا۔ تمام ہندو
اچھے اچھے کپڑے پہنے، کوئی پیدل، کوئی بیل کی گاڑیوں میں جانے لگے،
مسلمان اپنے ہندو بھائیوں کے ہر میلے میں حصہ لیتے تھے۔ یہ تو ہندوستان کا
عام قاعدہ ہے کہ مسلمان ہندوؤں کے ہر میلے میں جاتے اور شریک ہوتے ہیں
اور ہندو بھی برابر ہمسایہ کا حق ادا کرتے ہیں، یہ کوئی نئی بات نہیں،
اب جو ہندو اور مسلمانوں میں لڑائی ہو رہی ہے، وہ محض دھوکا اور
جعلسازی ہے۔ تیوہار کا دن تھا، پدما سویرے اٹھی، اشنان کیا،
کنوئیں سے پانی لائی، گھر صاف کیا، آنگن میں گوبر کا چوکا کر کے
اس پر بیل بوٹے بنائے، تمام برتن دھو دھا کر انتو کے گھر گئی اور
اسے پکارا، انتو باہر آئی۔ پدما نے کہا۔ آ...

— ہاں ہاں چلیں گے کیوں نہیں، بتاؤ تو سہی کب چلوگی، کپڑے بدل لیں' آنتو نے پوچھا — تو کپڑے بدل لے' میں ابھی آتی ہوں' باوا جی تو گئے ہوں گے، گاؤں میں کوئی نظر نہیں آتا' باپ نے کہا — ہاں وہ تو سب پہلے گئے ہیں، ہمیں کوئی نہیں پوچھتا — آنتو نے جواب دیا۔ آج کون پوچھے گا ہمیں' خیر ہم دونوں چلیں گے' باپ نے کہا اور جلد جلد گھر گئی، کپڑے بدلے، کنگھی چوٹی کی' چوٹی میں پھول لگائے اور آنتو کو لینے آ گئی۔ آنتو بھی کپڑے بدل چکی تھی' باہر نکلی، گھر میں تالا لگایا اور دونوں روانہ ہوئیں۔ وہ تو چڑیوں کی طرح چہکتی، پھدکتی، کودتی، اچھلتی جاتی رہیں۔ رات بھر وہیں رہیں۔ گاؤں پر سناٹا چھایا ہوا تھا، شیر خاں کے سوا کوئی وہاں موجود نہ تھا، اس موقع کو اس نے غنیمت جانا اور فوراً گاؤں کے جتنے مویشی تھے سب قاسم کے کھیت میں ہانک دیئے' صبح ہونے تک تمام جانوروں نے کھیت کا ستیا ناس کر دیا۔

صبح ہو چکی تھی، کہر پڑ رہی تھی، سورج دیوتا نے ابھی آشیانۂ مشرق سے سر باہر نکالا تھا۔ رات بھر کے تھکے ماندے جاتری میلے سے پلٹ رہے تھے، ہر ایک اپنے اپنے کھیتوں کو دیکھتا، ہنستا، خوش ہوتا چلا آ رہا تھا۔ کھیتوں کے کنارے پگڈنڈیوں پر ہری ہری ساریوں میں لپٹی ہوئی تیتریاں تھرکتی ہوئی نظر آ رہی تھیں، قاسو بھی اپنی بیٹی آنتو کے ہمراہ کھیت پر سے گذرا، دیکھا کہ تمام کھیت جانوروں سے بھرا ہے اور مویشی تمام فصل کھا چکے ہیں۔ کہیں کہیں باڑ بھی ٹوٹی ہوئی ہے، تھوڑے سے جانور فصلیں کھا رہے ہیں۔ تھوڑے جگالی کر رہے ہیں۔ یہ حالت دیکھ کر اس کے خرمنِ امید پر بجلی گر پڑی، وہ وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گیا، آنکھ سے آنسو جاری ہو گئے' زبان سے کوئی لفظ نہ نکلا، آنتو باپ کی حالت دیکھتی تھی اور زار زار روتی تھی۔ گاؤں والے نے اس کی رونے کی آواز سنی تو گھبرا کر کھیت کی طرف دوڑے، دیکھا کہ کھیت ستیا ناس ہو چکا ہے' صفاچٹ میدان نظر آ رہا ہے، لوگ حیران تھے کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ ایک دوسرے کا منہ تکتے تھے' قاسو کی بے کسی اور بربادی پر افسوس کرتے تھے' ان میں کچھ تاڑ گئے، سب نے مل کر قاسو کی ڈھارس بندھائی، آنتو کو سمجھایا منایا اور گھر لے گئے مگر قاسو کو ہوش نہ تھا' چارپائی بچھا کر اس پر لٹا دیا گیا گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ گاؤں کے تمام لوگ قاسو کی چارپائی کے اردگرد جمع ہو گئے۔ ہر ایک کی نظریں نمبردار کے گھر کی طرف جاتیں اور پلٹ آتی تھیں، رفتہ رفتہ لوگوں کا گمان یقین سے بدل گیا اور ہر ایک بدلہ لینے پر تُل گیا۔ سب نے مل کر صلاح کی کہ آج نمبردار کے خلاف ضرور کچھ کرنا چاہئے۔ سچ ہے انتقام کی آگ اسی طرح پھیلتی ہے۔

کسی نے نمبردار کو بھی خبر کر دی' وہ غصہ میں گھر سے نکل کر لوگوں کے ہجوم میں گھس آیا' قاسو کی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے اس نے صفائی کی صدہا دلیلیں پیش کیں اور اس قدر محبت و ہمدردی ظاہر کی کہ گاؤں کے سادہ لوح کسانوں کے دل پگھل گئے۔ آن کی آن میں نمبردار کی بیگناہی کی انہوں نے مہرِ صداقت لگا دی، آخر یہ طے پایا کہ قاسو کے خرچ کے لئے نمبردار سَو روپے قرض دے اور آئندہ سال فصل پر روپیہ وصول کر لے۔ شیر خاں نے اس کو مان لیا اور سَو روپے تمام کسانوں کے روبرو قاسو کو دیدیئے۔

گاؤں کے لوگ خوش تھے کہ قاسو کی زندگی سنبھل گئی اب وہ خوشی سے اپنے دن گذاریگا، لیکن یہ ان کا محض خیال تھا، شیر خاں کے اس فریب سے قاسو متاثر ہو چکا تھا، اس کی خوشی رنج سے بدل چکی تھی' اس کی آزادی' غلامی کی حوصلہ شکن اور آہنی زنجیروں میں جکڑی جا چکی تھی' وہ اپنے کندھوں پر ایک وزنی بوجھ محسوس کر رہا تھا' اس کا حال ہو بہو وہی تھا جو ایک سرکاری خطاب یافتہ کا ہوتا ہے' وہ ہمیشہ تنہائی میں بیٹھا ہوا یہی سوچتا کہ لوگوں نے مجھ سے اگر کوئی ہمدردی کی ہے تو یہی کہ انہوں نے میرے گلے میں غلامی کا پٹہ ڈال دیا ہے۔ اِس سوچ اور فکر نے قاسو کی جسمانی حالت میں کمزوری پیدا کر دی اور وہ چند دن کے اندر ہی اندر بیمار نظر آنے لگا' بیٹی کی شادی کا خیال' قرض کا ملال اور وہ بھی شیر خاں جیسے خبیث کا ہر وقت اُسے گھلا رہا تھا، وہ ہمیشہ یہی سوچتا لیکن شیر خاں کے آہنی پنجے سے اُس کی مخلصی دُشوار تھی۔

دِن گذر گئے، بلکہ ایک سال بھی گذر گیا، بارش کا موسم آیا اور چلا گیا۔ کھیتوں میں بیج بھی بو دیئے گئے۔ اس سال تمام کسانوں کی باچھیں کِھلی ہوئی تھیں کہ فصلیں اُن کی میعادوں سے بڑھ کر آ گئیں، کسان پھولا نہ سماتا تھا اور ہر شخص اپنے قرض کی ادائی کے علاوہ کچھ زیادہ روپیہ اپنی گرہ میں رکھنے کا اُمیدوار تھا)۔ فصلیں پک کر تیار ہو چکی تھیں' کھیت کاٹے جا رہے تھے اور کھلیان میں ڈھیر لگا دیئے گئے تھے۔ لیکن خدا کا کرنا کیا ہوا کہ ایک دن ایسی موسلا دھار بارش ہوئی کہ تمام اناج پانی میں تیرنے لگا اور بہت کچھ بہہ گیا۔ کسانوں کی اُمیدیں خاک میں مل گئیں۔ ہنستے ہوئے چہرے باسی پھولوں کی طرح مرجھا گئے قاسو کے دِل پر اس ناگہانی بلا کا اثر حد سے زیادہ ہوا۔ لیکن نمبردار کو ان لوگوں پر ذرا ترس نہ آیا وہ نہایت سختی سے قرض وصول کرنے پر تُل گیا۔ ایک دِن صبح سویرے تمام کسان ایک کھلیان میں بیٹھے نالیل کا

حُقہ جلاتے ہوئے دم لگا رہے تھے اور نمبردار کے قرض کی اَدائی کی سبیل تلاش کر رہے تھے کہ نمبردار اپنے نوکروں سمیت آیا اور نہایت سخت کلامی کے ساتھ قاسو سے اپنے قرض کا مطالبہ کرنے لگا۔ قاسو نے کہا۔ جو کچھ اناج اِس وقت حاضر ہے لے لیجئے، باقی اب کے سال ادا کر دونگا ــــ نمبردار! مَیں نے تجھ کو آنیوالی فصل پر کرجہ کب دیا تھا، تیرا وعدہ تو اس پھسل کا تھا' مجھے روپے کی جرورت ہے ــــ یہ بات نہیں ہونے کی ــ قاسو نے کہا ہماری جندگی تو انہیں پھسلوں پر ہے' جب پھسل نہیں تو پیسے کہاں سے لاؤں ــــ اِس وقت دیا کرو' بڑی مہربانی ہوگی آپ کی ــــ دیا دیا ہوچکی ــ مَیں نے تیری حالت پر ترس کھاکر تو مُٹھی بھر روپے دیئے تھے ــ نمبردار نے غصّے سے کہا ــ قاسو خاموش تھا، اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں، زمانہ آزادی کا خاکہ اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ گاؤں کے لوگوں میں اس کی بے عزتی ہو رہی تھی، وہ شرم سے پانی پانی ہوا جا رہا تھا، قاسو نے سکوت کو توڑ کر کہا۔ باپو جی! آپ کو اگر اتنی ہی جرورت ہے تو میرا کھیت لے لیجیے، مَیں کوئی مجوری کرکے پیٹ بھر لونگا، اپنے پرائے میں ایسی بے لاگ نہ سُنایئے ــــ اب خبر ہوئی کہ نمبردار کون ہے؟ روپیہ ہے میاں یہ روپیہ ــــ کرجہ ادا کر دو' جمین اور اناج کی مجھے جرورت نہیں ــ نمبردار نے کڑک کر کہا ــــ سب کسانوں نے یہ بات سُن کر چلم ہاتھ سے زمین پر رکھ دی اور کہا۔ نمبردار صاحب! آپ چاہتے کیا ہیں، جمین بھی لیں گے تو کیا جان لیں گے ــــ آپ اس کو تنگ کیوں کر رہے ہیں ــ بیچارا کیا دے اور کہاں سے دے ــــ جُلم جوری کس کام کی؟ ــــ اچھا تم ہی پھیسلا کرو، مجھے جمین نہیں روپیہ چاہئے ــــ مَیں اس کا کرجہ ماپ (معاف) کر دیتا ہوں اگر وہ میری بات مان لے ــــ اور دیکھو وہ جمین جو ندی کے اُس پرے ہے اور اُس کو دیدیتا ہوں' وہ کبول (قبول) کرتا ہے کیا؟ کسان یہ غیر معمولی ہمدردی دل ہی دل میں سمجھے کچھ دال میں کالا ہے۔ انہوں نے نمبردار کی بدنیتی کو بھانپ لیا اور پوچھنے لگے۔ باپو جی! بات ہے کیا، بتاؤ تو' ہم قاسو کو سمجھا لیں گے ــــ نمبردار نے کہا۔ کچھ نہیں ــــ اُسکی بیٹی امتو ــــ ایں یہ کیا کہا باپو جی! ہم تو گریب کسان ہیں' گنوار گھر کی بیٹی بڑے گھروں میں نبھے گی کیسے باپو جی! اور آپ کی اِجّت بھی تو اِس بات کو گوارا نہیں کرے گی ــــ نمبردار۔ یہاں معاملہ اِجّت کا تھوڑا ہی ہے' دولت کی بات ہے، مجھے اِجّت نہ ملے تو کیا مگر قاسو کو تو اِجّت نصیب ہوگی ــ بات تو ٹھیک ہے پر لڑکی کا منوانا مشکل ہے باپو جی! سب نے مل کر جواب دیا ــ لڑکی کیوں نہ مانے گی' وہ تو رانی بنکر میرے گھر جندگی بسر کرے گی، نوکر، چاکر، دھن دولت سب کچھ اس کے بس تکدیر اور کس کی ہوگی ــــ ہاں باپو جی پر اس کا جواب ہم شام کو دیں گے ــــ اچھا جواب شام کو دینا، ورنہ مَیں ــــ ہاں ہاں! آپ پھکر نہ کیجئے، ہم جرور آپ کے مکان پر آئیں گے، کسانوں نے جواب دیدیا اور قاسو کو منانے لگے، کوئی نمبردار کی تعریف کرتا، کوئی سرکار، دربار کا حال بیان کرکے نمبردار کی محبت قاسو کے دِل میں جمانا چاہتا، کوئی قاسو کی خوش نصیبی کا ذکر کرکے اُس کو بناتا تھا۔ آخر کسانوں نے قاسو کو راضی کر لیا مگر سوچنے لگے امتو کو کس طرح منایا جائے۔ یہ بڑی ٹیڑھی کھیر تھی، اسی سوچ و فکر میں شام ہوگئی، سب اپنے اپنے گھروں کو واپس ہوئے۔ انہوں نے امتو کو خبر کئے بغیر نمبردار کو قاسو کی منظوری کی خبر کر دی۔ نمبردار کی باچھیں کھل گئیں اور شادی کی تاریخ مقرر ہوگئی۔

چاندنی چھٹکی اور ختم ہوگئی، رات آئی اور گئی۔ پھر چاندنی چھٹکی اور رخصت ہوئی، دو مہینے یوں ہی گذر گئے، شادی کے دن قریب آگئے، گھر گھر چرچے ہونے لگے، گاؤں کی عورتیں امتو کی قسمت پر رشک کرنے لگیں۔ بوڑھی مائیں اپنی اپنی بیٹیوں کو بات بات میں طعنے دینے لگیں کہ اِن نگوڑیوں کے نصیبے اچھے ہوں تو ایسے ہوں، باپ کے گھر گوبر اُٹھاتی تھی، چارہ کاٹتی تھی، میلے کچیلے کپڑوں میں لپٹی رہتی تھی، بھاگ کھلے تو ایسے کہ نمبردار کی جورو بننے والی ہے۔ کل بھکارن تھی، آج رانی بن کر راج کرے گی ــــ امتو چلتے پھرتے یہ باتوں کو سُنتی، دل ہی دل میں کڑھتی مگر زبان سے کچھ نہ کہتی' نہ معلوم یہ کیا راز تھا کہ باپ بھی خوش ہونے کے بجائے روز بروز دُبلا ہوتا جاتا تھا، اِس کے چہرے کی رونق جاتی رہی تھی البتہ ماں بہت خوش تھی۔ اب وہ اپنی بیٹی سے کوئی کام نہ لیتی بلکہ خود کام کرتی تھی۔ سچ ہے دُنیا دولت کو دیکھتی ہے جس کے پاس زر ہے اُس کے لئے قدم قدم پر عزّت ہے' گو وہ کتنا ہی نالائق کیوں نہ ہو جس کے پاس دولت نہیں وہ مردود ہے گو کتنا ہی لائق، مخلص اور شریف کیوں نہ ہو۔ نمبردار کے ساتھ

منگنی ہونے سے پہلے اَمّو کی کچھ قدر نہ تھی، پر اب تو ماں نے اُس کے ناز اُٹھانے میں کوئی کسر نہ رکھی، قدم قدم پر آنکھیں بچھانے لگی۔ آہ دولت بھی کس قدر دُنیا کو اندھا کر دیتی ہے ۔۔۔ آہ کس قدر بدترین دَور ہے یہ سرمایہ داری کا دَور! اَمّو یہ سب کچھ دیکھتی اور باپ کی رنجیدگی کا سبب بھی سمجھتی تھی، شادی کے دن بالکل قریب آرہے تھے، مگر یہاں کچھ تیاریاں نہ تھیں۔ البتہ نمبردار کے ہاں بڑے اعلیٰ پیمانے پر تمام اِنتظام ہو رہے تھے۔ پدما نے ایک روز موقع پاکر اَمّو سے کہا۔ اب تو نمبردار کی جورو کہلائیگی اور ہم غریبوں کو تو آنکھ بھر کر نہ دیکھے گی؟ میل تیرا ساتھ تو بچپن کا ہے، اب بھگوان کی دَیا سے تیرے بھاگ کھُلے، پر اتنا خیال رکھیو کہ ہم غریب گنوار ساتھ کھیلے ہیں ۔۔۔ اَمّو نے کہا۔ بُوا! آج تو میرے دل کے پھپھولوں پر نمک چھڑک رہی ہے، دولت سے محبت نہیں آتی۔ کہتی ہیں، جو آنند ہے وہ دولت میں نہیں، ایمان کی بات تو یہ ہے کہ اِنسان محلوں سے نکل کر غریبوں کی جھونپڑیوں میں آچکا ہے، اپنے پن کی محبت دکھاوے کی ہوتی ہے ۔۔۔ میں تو باج آئی ایسے جینے سے، خوشی کا سوا گُڑ سے میٹھا ہوتا ہے۔ اَمّو نے نہایت غمگین لہجہ میں یہ جملے کہے کہ پدما نادم ہوگئی اور اپنے کہے پر پچھتانے لگی، لیکن تاڑ گئی کہ اَمّو اِس شادی سے ناخوش ہے۔ بات آئی، گئی، ہوئی، دونوں جُدا ہوگئے، دِن گُذر گئے، پھر انہیں ملنے کا موقع نہ مِلا۔ شادی کے دِن آگئے، باجے بجنے لگے، رنگ رلیاں منائی جانے لگیں۔ گاؤں کا بچہ بچہ شادی سے خوش تھا، آخر بیاہ ہوگیا۔ دُلھن نوشاہ کے گھر پہنچی، پلنگ پر سیج بچھی تھی، کمرہ نہایت آراستہ تھا۔ نوشہ کے گھر کی عورتیں دُلھن کو کمرے میں لے آئیں اور پلنگ پر لٹا کر واپس ہوئیں۔ نوشہ نے اپنا زرق برق لباس اُتارا اور سونے کے کمرے میں داخل ہُوا، پلنگ پر بیٹھ کر دُلھن کے بدن پر ہاتھ رکھا تو دیکھا کہ اس کا جسم برف کی طرح ٹھنڈا ہے اور بے حس و حرکت پڑی ہے۔ آہ ۔۔۔ غیور اَمّو نے سوتے وقت سنکھیا کھالی تھی۔

اُس نے دیکھا

نظم

از جناب مشتاق احمد مشتاق

اُس نے دیکھا مجھے محسوس ہوا یوں مشتاق
جیسے آنکھوں سے کوئی دل میں اُتر آیا ہے
شور اُٹھا نخلِ تمنا میں ثمر آیا ہے
آج جا کر کہیں اُلفت میں ثمر آیا ہے

ابکے کچھ ایسی بہار آئی ہے میخانے میں
مے چھلک جاتی ہے آکر مرے پیمانے میں

اُس نے دیکھا نگہ مست سے یوں مستی میں
جیسے دامن میں لئے پھول ہوائیں آئیں
آئیں میخانے پہ گھنگھور گھٹائیں آئیں
کیف برساتی ہوئی آج صدائیں آئیں

دُور سے جلوۂ صد رنگ دکھاتے آئے
آئے وہ فتنۂ خوابیدہ جگاتے آئے

اُس نے دیکھا اُسی انداز بھری نظروں سے
مَیں یہ سمجھا مری آغوش میں آتا ہے کوئی
ہم پہ پر جام محبت کے پلاتا ہے کوئی
حُسن کی شمع کا پروانہ بناتا ہے کوئی

جذبۂ شوق اُٹھا دل سے دُعائیں دینے
آرزوئیں بھی بڑھیں اُن کی بلائیں لینے

اُس نے دیکھا اُسی دزدیدہ نگاہی سے مجھے
مَیں نے جانا کہ محبت کے سوا کچھ بھی نہیں
ایک ہم دونوں ہوئے فرق رہا کچھ بھی نہیں
ساری دُنیا میں جز اُن کے سوا کچھ بھی نہیں

جی اُٹھائیں تو محبت کا سہارا لے کر
زندگی کٹنے لگی نام کسی کا لے کر

دیکھ

(از جناب [illegible] جلیل [illegible])

مجھ کو بھی ایک بار ذرا آزما کے دیکھ

اپنے حریمِ ناز کے پردے اُٹھا کے دیکھ
دُنیائے دل پہ برقِ تبسم گرا کے دیکھ
اکبار پھر سے انجمنِ دل میں آ کے دیکھ
آ! اور میری وسعتِ دل آزما کے دیکھ
تجھ کو خبر نہیں شبِ ہجراں ہے کیا بلا
تو بھی فراق و ہجر کے صدمے اُٹھا کے دیکھ
ہوتا ہے یوں تو روز ہی غیروں کا امتحاں
مجھ کو بھی ایک بار ذرا آزما کے دیکھ
شاید یہی ہو باعثِ تسکینِ اضطراب
بیتابیوں کو اور بھی حد سے بڑھا کے دیکھ
تجھ پر تمام حُسن کی رنگینیاں نثار
تو میری کائنات محبت پہ چھا کے دیکھ
لگتی ہے میرے دل پہ ہر اک آن چوٹ سی
للہ بار بار نہ یوں مُسکرا کے دیکھ
مجھ نامرادِ عشق کو ہے ذوقِ بندگی
میرے سرِ نیاز کو در پر جُھکا کے دیکھ
کوئی مرے مرے نہ مرے تجھ کو واسطہ
تو اپنے دستِ ناز سے تیغ آزما کے دیکھ
پُھنک جائے ایک آن میں شیرازۂ حیات
تو میری کائنات پہ بجلی گرا کے دیکھ
آنکھوں کو بار بار نہ دے دعوتِ نظر
رُخ وقفِ صد حجابِ محبت بنا کے دیکھ
مَیں نے بنا دیا ہے تجھے بادشاہِ حُسن
تو مجھ کو تاجدارِ محبت بنا کے دیکھ
کُل کائنات عشق کو دے درسِ بیخودی
تو سازِ زندگی پہ ذرا آج گا کے دیکھ

رہتا ہے تیرے واسطے بے چین و بے قرار
اکبار پھر جلیل کو اپنا بنا کے دیکھ

پھوٹا ہوا آئینہ

افسانہ

از جناب ابراہیم بھوپالی

رات نہایت پُر کیف اور رُوح پرور تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ دُور کہیں کوئلوں کی آواز آرہی تھی۔ شفیق اپنے کمرہ میں خاموش بیٹھا اپنی گزشتہ زندگی کے واقعات پر ایک خیالی نظر دوڑا رہا تھا۔ کمرہ میں دو کرسیاں، ایک میز اور ایک الماری تھی جس میں چند بوسیدہ کتابیں بے ترتیبی کے ساتھ رکھی ہوئی تھیں۔ الماری میں ایک پُرانا آئینہ نہایت احتیاط کے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ اس وقت شفیق دُنیا سے بالکل بے خبر اپنے خیالات میں محو تھا۔

اس کی عمر اگرچہ تیس برس سے زائد نہ تھی مگر تفکرات نے اُسے پچاس سال کا بوڑھا بنا دیا تھا۔ میرے آنے پر اس کے چہرہ پر ایک مصنوعی مُسکراہٹ آئی جس کی حقیقت سے میں بخوبی واقف تھا۔ غم انسان کو کس قدر تبدیل کر دیتا ہے اور اس کے خوشگوار لمحوں کو بھی کس بے دردی کے ساتھ حسرت و یاس میں بدل ڈالتا ہے۔

"کہو کس فکر میں ہو" میں نے دریافت کیا۔

"انسان جب دُنیا میں ہر طرف سے مایوس ہو جاتا ہے" اس نے کہا "تو اُسے کسی قسم کی فکر نہیں رہتی۔"

"مگر میں تو تمہیں اکثر کسی گہری سوچ میں دیکھتا ہوں" میں نے کہا "اس فکر و پریشانی کا کوئی سبب تو ضرور ہوگا۔"

"ہے" اس نے کچھ حسرت و مایوسی کے انداز میں کہا۔ "اور اس سے ایک بڑا قصہ بھی وابستہ ہے۔ جس میری تمام خوشیوں۔ تمناؤں۔ اُمیدوں اور جذبات کا تعلق تھا۔"

"لیکن" میں نے کہا۔ "مجھے تو آج تک اس کا علم نہیں۔"

"ہاں اب تک میں غم برداشت کرنے کے قابل تھا مگر اب نہیں" اس نے کہا۔ "بات دراصل یہ ہے کہ جب انسان اپنے مصائب سے حد درجہ پریشان ہو جاتا ہے تو اُسے قسمت کا شکوہ کرنے اور اپنا غم دوسروں سے بیان کرنے کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔"

"ہاں اور لوگوں کا یہ بھی خیال ہے" میں نے کہا۔ "کہ اس سے انسان کے غم میں ایک گونہ کمی ہو جاتی ہے۔"

"خیر مجھے غم غلط کرنے کی فکر نہیں" اس نے کہا۔ "میرے اوپر تو "مشکلیں اتنی پڑیں کہ آساں ہو گئیں" مگر پھر بھی میں آج تم سے اپنا قصہ بیان کر دوں گا۔"

یہ کہکر وہ اپنی کرسی پر سے اُٹھا، الماری کھولی اور اس میں سے ایک بوسیدہ اور پُرانا آئینہ نکال کر میز پر رکھا، کچھ دیر تک وہ اُسے خاموشی کے ساتھ دیکھتا رہا پھر بولا۔ "الف لیلیٰ۔ داستانِ امیر حمزہ اور اسی قسم کی دُوسری کتابوں میں پڑھا کرتے تھے کہ فلاں جادوگر نے اپنی جان طوطے میں رکھ دی تھی، فلاں نے بکری میں منتقل کر دی تھی، غرض جادوگر اپنی جانیں جانوروں میں منتقل کر دیا کرتے تھے۔ اسی طرح میری رُوح اس آئینہ میں ہے۔"

اِس پر میں ہنس پڑا اور بولا۔ "خُوب! تو گویا آپ بھی کوئی ساحر ہیں۔"

"ساحر تو نہیں" اس نے کہا۔ "مگر مسحور ضرور ہوں۔ تمہیں اس سے کیا تم قصہ تو سُنو۔"

میں نے سگریٹ جلا کر کش پر کش لگانا شروع کر دیئے۔ دُور سڑک پر کوئی گاتا جا رہا تھا۔

"محبت میں ہم نے جوانی لٹا دی"

اس کی آواز میں کشش تھی اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں مل کر ہمارے کمرہ کی فضا میں ایک عجیب ہیجان پیدا کر رہی تھی۔

شفیق بولا۔ "محبت میں ہم نے جوانی لٹا دی۔ یہی میری زندگی کی تفسیر ہے۔"

"اوہو" میں نے کہا۔ "تو یوں کہئے کہ آپ کسی پر عاشق ہو چکے ہیں۔"

"دیکھو ابراہیم" اس نے کہا۔ "محبت کوئی ایسی چیز نہیں جو پیدا کی جا سکے۔ غالب مرحوم کہہ گئے ہیں نا ؎

عشق پر زور نہیں ہے وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

"خیر چھوڑ دان فضول باتوں کو" اس نے آئینہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہاں تو میں جوان تھا اور نجمہ بھی جوان تھی۔ میری عمر تقریباً

بیس سال کا اور اس کی اٹھارہ سال تھی۔ مجھے اس سے بے حد محبت تھی، جو میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس کی خوبی کی تعریف کرتے ہوئے مجھے شرم محسوس ہوتی ہے کیونکہ میرے پاس ایسے جامع الفاظ نہیں۔ بس یہ سمجھ لو کہ وہ ایک ایسی دوشیزہ تھی جو ہر دل میں فوراً جذب ہو جایا کرتی تھی۔ تعلیم یافتہ اور بہت ہی سلیقہ مند۔ میں اس سے محبت کرتا تھا اور وہ مجھے دل و جان سے پیار کرتی تھی۔"

"ایک روز بادل چھائے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ کبھی کبھی بوندیں بھی پڑنے لگتی تھیں۔ وہ اپنے باغ میں جھولے پر بیٹھی تھی اور میں اُسے جھولا جھلا رہا تھا جب وہ جھولا جھول چکی تو میں نے اپنے دل کی انتہائی گہرائیوں سے کچھ الفاظ نکال کر اس کے سامنے پیش کر دیئے۔ اس پر وہ کچھ سنجیدہ سی ہو گئی اور بولی "مسٹر شفیق میں شادی نہ کرنے کا عزم کر چکی ہوں۔" اس کے بعد میں کچھ نہ بول سکا اور ایک سکوت کے عالم میں رہا۔ وہ مجھے مبہوت دیکھ کر بولی۔ "میں اور آپ دوست ہیں اور رہیں گے لیکن افسوس میں اپنا عہد نہیں توڑ سکتی۔" اس کے بعد بھی ہماری ملاقاتیں ہوتی رہیں مگر میں اُداس رہنے لگا۔ اس کے والدین بھی اس کی مجھ سے شادی کرنا چاہتے تھے مگر وہ اُن کے سامنے بھی انکار کر چکی تھی۔"

"زمانہ گذر رہا تھا اور ہم دونوں کنوارے ہی تھے۔ نہ معلوم کس منحوس گھڑی میں وہ بیمار پڑی جس سے وہ جانبر نہ ہو سکی اور موت نے اپنے آغوش میں اُسے تھپک تھپک کر سلا دیا۔"

اس کے بعد اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور میں بھی کچھ مبہوت سا ہو گیا۔ آخر کار اس نے آنسو پونچھ کر کہنا شروع کیا۔

"اُس کی والدہ نے مجھ سے کہا "شفیق! تم کو نجمہ سے محبت تھی میں چاہتی ہوں کہ اس کی کوئی چیز تم بطور نشانی کے لے لو۔" میں نے یہ آئینہ پسند کیا کیونکہ اس کے سامنے کھڑی ہو کر وہ خود کو سنوارا کرتی تھی اور اب تک یہ آئینہ میری تسکین کا باعث ہے۔"

مجھے اس کا قصہ سُن کر تکلیف ہوئی۔ کیونکہ واقعی اس صدمہ کی وجہ سے وہ تیس سال ہی کی عمر میں بوڑھوں سے بدتر ہو گیا تھا۔ آسمان پر ستارے جھکے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ سڑک پر کوئی تانگے والا گاتا ہوا جا رہا تھا۔

"اُن کے بنا ہے ہنستے ہنستے جینا"

میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے کہا "یہ کام انسانوں کے واسطے بڑا ممکن ہے۔" اس کے بعد میں نے اُسے الوداع کہا اور اپنے گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔ صبح کا وقت تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، دُور کسی مسجد سے اذان کی آواز آ رہی تھی۔ میں اپنے بستر پر پڑا آنکھیں مل رہا تھا۔ کہ میرا نوکر گھبرایا ہوا آیا اور بولا:۔

"میاں شفیق! صاحب کے یہاں سے ایک شخص آیا ہے وہ کہہ رہا ہے اُن کا انتقال ہو گیا۔"

"انتقال ہو گیا ہے" میں نے گھبرا کر سوال کیا۔

"جی ہاں وہ یہ کہہ کر چلا گیا۔" اُس نے جواب دیا۔

میں فوراً بستر سے اُٹھا اور اُس کے مکان کی جانب روانہ ہو گیا۔ وہاں جا کر دیکھا تو آئینہ ٹوٹا پڑا تھا اور اُس کے پاس ہی اس کی نعش۔ ڈاکٹر نے بیان کیا کہ کسی اچانک صدمہ کی وجہ سے اس کے دل کی حرکت بند ہو گئی ہے میرے منہ سے نکلا "آئینہ کے ٹوٹنے کا صدمہ ہو سکتا ہے"

زمزمۂ تغزّل

مے کو بھی آب آب کئے جا رہا ہوں میں

از جناب محمود یار خاں اثرؔ ایم اے

دل سرخوشِ شباب کئے جا رہا ہوں میں
خود کو یوں ہی خراب کئے جا رہا ہوں میں

دل میں سمیٹ کر نگہِ برق بارِ دوست
تعمیرِ اضطراب کئے جا رہا ہوں میں

حُسنِ نظر فروز کے جلووں کی دید سے
ذرّوں کو آفتاب کئے جا رہا ہوں میں

آہ و فغاں سے بارگہِ عیش و ناز میں
پیدا اک انقلاب کئے جا رہا ہوں میں

اظہارِ شوقِ دید کی بیتابیاں نہ پُوچھ
اُب دُور ہر حجاب کئے جا رہا ہوں میں

ہو کر خراب و مست خمستانِ حُسن میں
مے کو بھی آب آب کئے جا رہا ہوں میں

عنوانِ حُسن و عشق سے دل کی کتاب کا
رنگیں ہر ایک باب کئے جا رہا ہوں میں

جب شورشِ الم بھی ہے عنصر حیات کا
کیوں غم سے اجتناب کئے جا رہا ہوں میں

منظور ہے کہ دیکھ لوں پامانِ مغفرت
جب جرم بے حساب کئے جا رہا ہوں میں

ناکامیٔ مُراد سے لیتا ہوں درسِ عزم
یُوں زیست کامیاب کئے جا رہا ہوں میں

قیدِ تعیّنات ہٹا کر نگاہ سے
جلووں کو بے نقاب کئے جا رہا ہوں میں

معمور زمزموں سے ہے سازِ خودی مرا
کیوں خواہشِ رباب کئے جا رہا ہوں میں

اُن کی نگاہِ لُطف کی اُمید میں اثرؔ
دلداریٔ عتاب کئے جا رہا ہوں میں

غزل

جگرؔ قریشی ملتانی

بہاروں کی رنگینیاں مٹ چکی ہیں
خزاں کی حکومت ہے میرے چمن میں

تری چشمِ سرشار کی کیف ریزی
نہ لالے میں ہے اور نہ ہے نسترن میں

چراغِ محبت فروزاں ہوا ہے
اُٹھی ہے جوانی نئے پیرہن میں

نگاہوں کا ذوقِ طلب بڑھ رہا ہے
یہ کون آ گیا اِس بھری انجمن میں

اُجاڑا مرا آشیاں باغباں نے
مری بے بسی رو رہی ہے چمن میں

پلا دے وہی ساقیا پھر کہیں سے
پلائی تھی تُو نے جو عہدِ کہن میں

گُلوں پر جوانی کی رعنائیاں ہیں
یہ کس کی جھلک ہے حجابِ چمن میں

قفس میں گذاری ہو جس نے جوانی
بھلا اُس کا جی کیا لگے گا چمن میں

اُمید و تمنّا کی ناکامرانی
یہی کچھ ملا اُن کو میرے کفن میں

نصیبِ عدو بھی نہ ہو مرگِ غربت
اِلٰہی مجھے موت آئے وطن میں

بھری بزم میں پُوچھتے ہیں وہ سب سے
جگرؔ کہہ گیا کیا حجابِ سخن میں

مستشرقین کی عربی علوم سے دلچسپی

ایک انگریز ڈاکٹر کی عربی تقریر کا ترجمہ

از جناب کمال عظیم آبادی

یہ مضمون فاضل مستشرق ڈاکٹر برنارڈ لوئس کی عربی تقریر کا اردو ترجمہ ہے جو بی بی سی لندن ریڈیو اسٹیشن سے عربی پروگرام کے سلسلے میں نشر ہوئی تھی اور لندن کے عربی رسالہ "المستمع العربی" میں شائع ہو چکا ہے۔

ایک مدت تک محققین کا یہ خیال رہا کہ اسلامی تہذیب اور فرنگی تہذیب پہلے پہل صلیبی لڑائیوں کے سلسلہ میں ایک دوسرے سے روشناس ہوئیں۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ حروب صلیبیہ ہی وہ پہلا موقع تھا کہ جب عربی مشرق اور عیسائی مغرب میں گہرا رابطہ پیدا ہوا اور اسی اثنا میں وہ ایک دوسرے کی تہذیب سے بھی مستفید ہوئے۔

زمانہ حال کی تاریخی تحقیقات سے یہ بات ظاہر ہو گئی ہے کہ یہ باہمی استفادہ اثر اور وسعت کے لحاظ سے بہت محدود تھا اور اگر اس واقعہ کی نمایاں فوجی نوعیت پر غور کیا جائے تو اسے ایسا ہو بھی چاہئے تھا۔

شمالی افریقہ کو فتح کرنے کے بعد فاتح عرب نصرت و کامرانی کا پرچم اڑاتے ہوئے یورپ تک نکل آئے اور ایک عرصہ تک خطہ بحیرہ روم کے دو اہم علاقوں میں اپنی نو آبادیاں قائم رکھیں۔ عربوں نے سپین اور صقلیہ (سسلی) میں ایک ایسی شاندار تہذیب کی بنیاد رکھی جو اس وقت کے تمام عیسائی ممالک کی تہذیب سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھی۔ یہ تہذیب اپنی ہم عصر عیسائی تہذیبوں پر اثر انداز ہوئے بغیر نہ رہی۔ یہاں تک کہ اس وقت بھی جب یہ علاقے پھر عیسائیوں کے ہاتھ آ گئے کچھ عرصہ تک وہاں عربی علوم و فنون کا ویسا ہی چرچا رہا۔ عیسائی بادشاہ خود عربی زبان بولتے اور عرب علماء کی امداد کرتے تھے۔

ابتدا ہی سے عربوں کی اعلیٰ و برتر تہذیب کے اثرات فرنگی ممالک میں پہنچنے لگے۔ اسپین کے عربی بولنے والے مسیحی اس اثر کو آگے بڑھانے کا اہم ذریعہ ثابت ہوتے اور اسپین اور سسلی کے عربی بولنے والے یہودیوں نے بھی جن کی زبان ان کے ہم مذہب فرنگیوں کی طرح عبرانی تھی مغرب میں عربی علوم و فنون کے پھیلانے میں بہت مدد دی۔

ہم اس سلسلے میں ایک ہسپانی یہودی فلسفی اور عالم ابراہیم ابن عذرا کا خاص طور پر ذکر کر سکتے ہیں۔

ابراہیم ابن عذرا شہر طلیطلہ کا رہنے والا تھا۔ اس نے ۱۱۵۸ء میں لندن کا سفر کیا اور کچھ عرصہ وہاں تعلیم و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔

اسی طرح ہم ایک انگریز ٹامس براؤن کا بھی ذکر کر سکتے ہیں جو سسلی میں قاضی تھا اور عربی دستاویزات میں اسے قاضی براؤن کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

بارہویں صدی میں شمالی ممالک خصوصاً انگلستان کے علماء طلب علم کی غرض سے اسپین کی عرب یونیورسٹیوں میں آنے لگے۔ ان علماء میں پہلا اور بزرگ ترین عالم شہر باتھ کا رہنے والا انگریز "ایڈیلارڈ" تھا۔

یہی وہ شخص تھا جس نے مغرب میں عربی علوم و فنون کے پھیلانے کی ابتدا کی۔ بارہویں صدی کے ربع الاول میں ایڈیلارڈ نے عربی زبان اور عربی علوم حاصل کرنے کی غرض سے طویل و عریض سفر کئے۔ اس نے اپنے معاصر عیسائیوں کے لئے بہت سی عربی کتابوں کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا اور واپسی پر انگلستان کے ہونے والے بادشاہ ہنری ثانی کے اتالیق کی حیثیت سے خدمت انجام دی بلکہ اس نے اپنی ایک کتاب بھی شاہ ہنری کے نام معنون کی جس کی اہم ترین تصنیف Natural Question (مسائل طبعیہ) ایڈیلارڈ اور اس کے بھتیجے کے درمیان ایک مکالمہ کی صورت میں ہے۔ بھتیجے نے فرنگیوں کی یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی تھی، اور ایڈیلارڈ نے عربوں کے یہاں۔ اس مکالمہ میں دو مختلف نظریوں اور اصول کے ماتحت بحث کی گئی ہے۔

ایڈیلارڈ اس کتاب کے مقدمہ میں لکھتا ہے کہ "میں عربوں کے نظریئے کی حمایت کرونگا اور خود اپنی ذاتی رائے پیش نہ کروں گا۔" پھر اس نے نہایت تفصیل کے ساتھ عربی تمدن کی برتری بیان کی ہے اور اپنے اثر کو کام میں لاکر مغرب میں اس طریقہ کے پھیلانے میں بہت مدد دی ہے۔ اس نے علم ہیئت اور ریاضی کتابوں کا بھی ترجمہ کیا ہے اور اس طرح یورپ جیسی نامانوس سرزمین میں ان علوم کو ترقی دی ہے۔

ایڈیلارڈ کے بعد بہت سے دوسرے انگریز علماء بھی سپین گئے۔ شہر چیسٹر کے ایک شخص رابرٹ نے بھی بارھویں صدی میں علم ریاضی حاصل کیا اور عربی کتابوں کا ترجمہ کیا۔

پھر ڈینیل آف موریلے بھی اس زمانے کی قابل قدر شخصیتوں میں سے تھا۔ جیسا کہ وہ خود اپنے متعلق بیان کرتا ہے۔ اسے فرنگی یونیورسٹیاں پسند نہ تھیں اس لئے وہ دنیا کے بالغ نظر حکماء کی تلاش میں اسپین گیا۔ جہاں سے وہ کتابوں کا ایک ذخیرہ ساتھ لیکر واپس آیا جسے پڑھنے والوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

میکائیل اسکاٹ نے تیرھویں صدی میں سسلی میں تعلیم پائی اور عربی و عبرانی زبانوں میں دستگاہ حاصل کی۔ اس نے ارسطو کی تصنیفات کا عربی سے ترجمہ کیا اور اس طرح ان کتابوں سے مغرب پہلے پہل روشناس ہوا۔

اس نے ارسطو کی تصنیفات کی عربی شرحوں کا بھی ترجمہ کیا اور خود علم ہیئت اور علم کیمیا پر بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔

ان علماء اور ان کے علاوہ اُن دوسرے حوصلہ مند انگریزوں کی تصنیفات کا تہذیب پر بہت گہرا اثر پڑا جنہوں تحصیل علم کی خاطر مصائب برداشت کرکے عربی ممالک کا سفر اختیار کیا۔

یہ اسی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ انگلستان بلکہ مغرب علوم وفنون کے اُن کارناموں سے واقف ہوا جو عربوں نے انجام دیئے۔ یہ ایک اہم قدم تھا جس نے یورپ کی تہذیب کو آگے بڑھایا اور ان تراجم اور تصانیف کا بہت زیادہ اثر ہوا۔ عربی علوم سے جو لوگ بہت زیادہ متاثر ہوئے ان میں انگلستان کے بلند مرتبہ فلسفی راجر بیکن اور مشہور شعرا چاسر اور لیڈگیٹ بھی تھے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ وہ پہلی کتاب، جو پہلے پہل انگلستان میں طبع ہوئی یعنی (Saying of Philosophy) جو ۱۴۷۷ء میں طبع ہوئی ایک عربی تالیف "کتاب مختار الحکم و محاسن الکلم" سے ماخوذ تھی جسے مصر کے امیر مبشر بن فاتک نے ۱۰۵۳ء میں تالیف کیا۔

یہ عربی کتاب ہنوز غیر مطبوعہ ہے مگر اس کا قلمی نسخہ ہالینڈ میں موجود ہے۔ یہ کتاب فلسفیانہ اقوال و امثال پر مشتمل ہے اور ایک زمانہ میں مشرق میں بہت مقبول تھی۔ یورپ کی بہت سی زبانوں میں اس کا ترجمہ بھی ہوا۔

قرون وسطیٰ کے یورپ، اس کے ہمعصروں اور ان کے مغربی ترجمانوں کا دوگونہ احسان ہے۔ پہلا احسان یہ ہے کہ یورپ کو یونانی علوم وافکار کے اس گرانمایہ ترکہ کا بڑا حصہ عربوں ہی کے ذریعے سے پہنچا جسے مغرب تو گنوا چکا تھا مگر عربوں نے محفوظ رکھا اور بڑھایا۔ دوسرا احسان یہ ہے کہ یورپ نے عربوں سے ریسرچ کا ایک نیا طریقہ سیکھا یا جس نے عقل کو سند پر ترجیح دیکر آزادانہ تحقیق و تجربہ کی اہمیت پر زور دیا۔ یہی وہ دو سبق تھے جنہیں سیکھ لینے کی وجہ سے بہت بڑی حد تک قرون وسطیٰ کے دور کا خاتمہ ہو گیا اور دور احیاء علوم کا آغاز ہوا اور جدید یورپ عالم وجود میں آیا۔ انگریز علماء نے ان سبقوں کو دوسروں تک پہنچانے کے سلسلہ میں اہم خدمات انجام دیں۔ یہ ایک تاریخی حادثہ ہے کہ ٹھیک اسی زمانہ میں عربوں نے وہ باتیں جو انہوں نے یورپ کو سکھائی تھیں خود بھولنا شروع کر دیں اور کئی صدیوں بعد اُنہیں پھر سیکھنا پڑیں۔

آیئے اب خاتمہ پر شہر باتھ کے ایڈیلارڈ سے سنیں کہ وہ اپنے بھتیجے سے اس نئے طریقے کے متعلق جو اس نے اسپین میں سیکھا تھا کیا کہہ رہا ہے اور یہ یاد رہے کہ یہ تحریر آٹھ سو برس پُرانی ہے۔

"میں نے عقل کو اپنا رہبر بنا کر اپنے عرب اُستادوں سے جو بات سیکھی ہے اس سے بالکل مختلف بات تم کو سکھائی گئی ہے، سند کی ظاہری عظمت سے تمہاری آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں اور تم خود اپنے منہ پر دھانہ چڑھا لیتے ہو۔ آخر سند کو دھانہ نہ کہیں تو اور کیا کہیں جس طرح وحشی درندے منہ پر دھانہ چڑھا کر جہاں چاہتے ہیں لے جاتے ہیں وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ اُسے کہاں اور کیوں لیجایا جا رہا ہے، وہ تو اُس ڈوری سے جس سے وہ بندھے ہوتے ہیں کھینچا چلا جاتا ہے ٹھیک اسی طرح تم میں سے بہت ضعیف الاعتقاد لوگ اپنے بھولے پن اور اندھی تقلید کی وجہ سے مُصنفین کی سند سے مرعوب ہو کر خطرات سے دوچار ہوتے ہیں ..... افراد کو عقل اس لئے عطا کی گئی ہے کہ وہ اسے حکم قرار دیکر حق و باطل میں امتیاز کر سکتے ہیں ..... ہمیں سب سے پہلے عقل و خرد کی تلاش کرنی چاہیئے اور جب یہ دستیاب ہو جائے (صرف اس وقت نہ کہ اس سے پہلے) اس کی تائید میں اگر مل جائے تو سند بھی قبول کی جا سکتی ہے۔ سند بذات خود فلسفے کے اعتماد کے لئے کافی نہیں ہے اور سند سے اس غرض کے لئے استعمال کرنا چاہیئے۔"

جو لوگ عربوں کی تحریروں سے واقف ہیں وہ فوراً ایڈیلارڈ کی شناس ہو [illegible]

اولاد سے گھبرا گئی

وہ بیچاری کمزور عورت تھی۔ شادی ہوتے ہی ہر سال بچہ ہونے لگا چنانچہ دس سال میں دس بچے ہوئے۔ اس مصیبت سے عورت عاجز آگئی۔ اس کی صحت خراب ہوئی اور وہ غریب قبل از وقت "دادی جان" کی صورت بن گئی۔ ادھر خرچ بڑھا اور مفلسی اپنا رنگ جمانے لگی اس کا مرد بھی گھبرا گیا۔ جب اس کی صحت زیادہ خراب ہوئی تو اس نے ڈاکٹروں کے مشورہ کے مطابق دوا روہیل سے فائدہ اٹھایا۔ دوا روہیل کی خصوصیت یہ ہے کہ اگر کوئی عورت ...... سے پہلے اس کی ایک خوراک کھائے تو پھر

اُس رات حمل نہیں ٹھہر سکتا

اور استعمال کرنیوالی عورت کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا یعنی ماہواری ایام بھی باقاعدہ آتے رہتے ہیں۔ پس اگر کوئی عورت دو چار سال کیلئے بچہ نہ پیدا کرنا چاہے تو اُسے دوا "روہیل" سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ "روہیل" کی ایک شیشی میں اسّی مرتبہ استعمال کرنے کی دوا ہوتی ہے اور اس شیشی کی قیمت چار روپے آٹھ آنے ہے۔ اور اس پر گیارہ آنے محصول ڈاک لگتا ہے۔ ضرورت مند عورتوں کو چاہیئے کہ وہ — لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ اے۔ بی ۱۲۳ دہلی کو خط لکھ کر دوا روہیل کی شیشی بذریعہ وی۔ پی پارسل منگالیں اور ہدایت کے مطابق ... ... سے پہلے ایک خوراک کھالیا کریں۔ جب تک دوا استعمال ہوتی رہیگی۔ حمل نہیں ٹھہر سکتا اور جب اس دوا کا استعمال بند کیا جائیگا پھر حمل ٹھہرنا ممکن ہے۔ نوٹ:۔ اس دوا کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ عورت کو ماہواری ایام ہر ماہ آتے رہتے ہیں اور اس کے باوجود جب تک عورت چاہے حمل نہیں ٹھہرتا۔ یہ دوا کسی حال میں کسی عورت کو نقصان نہیں کرتی۔

لڑکی کی عمر ۲۰ سال —— جوانی ختم

عورت کی شروع جوانی میں ہی اگر اُس کا سینہ یعنی پستان ڈھیلے اور نرم ہو کر نیچے کو گرے ہوئے معلوم ہوں تو یہ بہت بدصورتی کہلاتی ہے ایسی عورت میں شباب کی کشش ختم ہو جاتی ہے یہ خرابی عورت کے سینہ میں اس وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب وہ ہر سال بچوں کو دودھ پلانے پر مجبور ہو جائے۔ یا کسی بیماری یا بداحتیاطی کے باعث بھی عورت کا سینہ (یعنی پستان) ڈھیلے ہو کر بدنما معلوم ہونے لگتے ہیں اور وہ عین جوانی میں ہی شباب کی کشش ختم کر بیٹھتی ہے۔

ایسی عورت پھر نوجوان لڑکی نظر آسکتی ہے!

سائینس کی جدید کرشمہ سازی کی بدولت ایک ایسی بیش بہا دوا تیار ہوئی ہے۔ جس کے استعمال سے عورت کے ڈھیلے اور نرم اور نیچے کو گرے ہوئے پستان دوبارہ گول اور سخت ہو کر عورت کو از سر نو جوان لڑکی کے روپ میں پیش کرنے لگتے ہیں اور اس پر شباب کی رنگینیاں پھر اپنی بہار پھیلا دیتی ہیں یہ نگلنے کی دوا ہے اور اس کا نام "برسیٹین" ہے۔ یہ وہی دوا ہے جس کی بدولت اب تک سینکڑوں عورتیں اپنے سینہ میں دوبارہ شباب کا رنگ بھر چکی ہیں۔ اور اب وہ کافی عمر کے باوجود نوخیز لڑکیاں نظر آتی ہیں اس دوا کا سب سے زبردست ثبوت یہ ہے کہ اس کے ہر روز کا استعمال عورت کو ثابت کرتا رہتا ہے کہ کتنی جلدی اس کے سینہ میں دوبارہ اُبھار اور سختی پیدا ہو رہی ہے۔ جن عورتوں کو ضرورت ہو وہ

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ اے۔ بی ۲۴ دہلی کے پتہ پر خط لکھ کر ایک شیشی "برسٹین" بذریعہ وی۔ پی پارسل منگالیں۔ ایک شیشی "برسٹین" کی قیمت چار روپے پندرہ آنے ہے۔ پارسل پر سات آنے محصول لگیگا۔ ایک شیشی ایک عورت کو پوری طرح جوان لڑکی بنا دے گی۔ اور اسکے سینہ کی یہ سب خرابیاں دُور ہو کر مستقل اُبھار اور سختی پیدا کر دیگی۔ (نوٹ) اگر کوئی بچہ عورت کی گود میں ہے تب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ دوا بچہ کے دودھ پر کوئی اثر نہیں ڈالتی۔ اور بچہ نہایت اطمینان کے ساتھ دودھ پیتا رہیگا۔ کیونکہ دوا کسی حال میں نقصان نہیں کرتی۔

لمعات

اَب کہاں تک یہ خواب کا عالم

از جناب وزیر زادہ شجاعت خاں تہور جوناگڑھی

اُف یہ ان کے حجاب کا عالم جیسے ماہ وسحاب کا عالم

چشم مستِ شباب کا عالم ہے مجسّم شراب کا عالم

آہ دُھندلی سی آرزوئے وصال دُور جیسے سراب کا عالم

عقدۂ زیست کُھل گیا جس دم نظر آیا حباب کا عالم

کیوں ہے یارب مثالِ برقِ تپاں دلِ خانہ خراب کا عالم

دل کی بستی اُلٹ پلٹ کر دی یہ تمہارے عتاب کا عالم

ہے سرشکِ الم میں جلوۂ درد دیکھ چشمِ پُرآب کا عالم

چاہیئے کچھ تو فکرِ عمل

اَب کہاں تک یہ خواب کا عالم

رفتار زمانہ

اس مہینے کا اہم ترین واقعہ یہ ہے کہ جاپان نے اپنی ایک پرانی خواہش کو مرکار دشی کے سامنے نئے انداز سے پیش کیا اور فرانسی ہند چینی کی بندرگاہوں اور ہوائی اڈوں پر قبضہ جما لیا۔ ان صفحات میں بارہا لکھا جا چکا ہے کہ جاپان جنوبی بحر الکاہل اور مشرقی ایشیا میں ایک نئے نظام کے قیام کا متمنی ہے۔ چنانچہ وہ چین کو ہڑپ کرنے کے علاوہ فرانسی، برطانوی اور امریکی مقبوضات پر بھی ہاتھ صاف کرنا چاہتا ہے۔ فرانسی ہند چینی پر جاپان کا حاکمانہ اقتدار اسی لائحہ عمل کا ایک حصہ ہے۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ جب سے حکومت دشی نے کہ جرمنی کی اطاعت و انقیاد کا جوا اپنی گردن میں پہنا ہے جاپان اس پر زور دے رہا تھا کہ فرانسی ہند چینی کے ہوائی اور بحری اڈے اس کے حوالے کر دیئے جائیں تاکہ وہ ینان ریلوے پر قابض ہو کر بزعم خود چین کے تابوت میں آخری میخ گاڑ دے۔ ادھر یورپ میں واقعات نے کروٹ بدلی اور جرمنی روس کے ساتھ برسرِ پیکار ہو گیا۔ ان حالات میں چونکہ خطرہ تھا کہ برطانیہ و امریکہ کی متحدہ فوجیں جرمنی کی غیر معمولی مصروفیت سے فائدہ اٹھائیں گی اس لئے جاپان نے جو محوریوں کا شریک کار ہے برطانیہ و امریکہ کی توجہ تقسیم کرنے کے لئے یہ نیا قدم اٹھایا ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ جاپان کا اصل مقصد پورا ہوگا یا نہیں۔ تاہم اس اقدام سے سیام اور ہندوستان کا مستقبل تشویش و اضطراب سے خالی نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ اب زرد خطرہ ان ممالک کی مشرقی سرحد پر نئے پیمانے سے کھڑا ہے اور بہت ممکن ہے کہ وہ خلیج بنگالہ کا رخ کرنے کی کوشش کرے چنانچہ آج (۲۹ جولائی) کی خبر ہے کہ جاپان نے سیام کو الٹی میٹم دیا ہے کہ وہ اپنے بحری اور فضائی مستقر اس کے حوالے کر دے۔ جمہوری ممالک نے سیام کے ان مطالبات کو منظور کر لیا تو اس کے یہ معنی ہونگے کہ جاپان کو مشرقی ایشیا میں کھلی چھٹی مل جائیگی۔ اور وہ مشرقی دنیا کے امن و امان کو بہت زیادہ مخدوش بنا سکے گا۔ اس سلسلے میں یاد رہے کہ جاپان کی مالی حالت بہت زیادہ کمزور پیدا ہو چکی ہے۔ اگر اس نے میدان جنگ میں اپنے پاؤں ضرورت سے زیادہ پھیلانے کی کوشش کی تو اس کا تجارتی مستقبل تباہ و برباد ہوئے بغیر نہ رہے گا۔ امریکہ و برطانیہ نے جاپانی جائدادیں پہلے ہی منجمد کر لی ہیں تجارت سرد پڑ گئی ہے اس لئے اب دیکھنا یہ ہے کہ جاپان اپنے سیاسی جنگی جوش کو ٹھنڈا کب کرتا ہے؟

عالمگیر واقعات پر ماہانہ تبصرہ

از:- شبلی بی کام

جرمنی و روس کی خونریز جنگ قریباً پانچ ہفتوں سے جاری ہے۔ اس لڑائی میں قریباً ایک کروڑ سپاہی، لاتعداد طیارے اور بے شمار ٹینک حصہ لے رہے ہیں۔ ہزاروں لاکھوں فوجی لقمۂ اجل ہو چکے ہیں اور ابھی نہ معلوم اس ہنگامۂ کشت و خون میں انسانی مال و جان کا کتنا نقصان ہوگا۔ جرمنی لسمبیا، سفید روس اور یوکرین پر قابض ہو چکا ہے اور اب لینن گراڈ اور ماسکو کے دروازے پر دستک دے رہا ہے تاہم اس کی سست رفتاری سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ فتوحات اسے بہت بڑے نقصان کے عوض حاصل ہو سکی ہیں اور وہ برسوں تک اس کی تلافی نہ کر سکے گا۔ برطانیہ و امریکہ نے سوویٹ روس کی امداد کا فیصلہ کیا تھا۔ لیکن ابھی تک غالباً اس کو عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکا تاہم سلطنت برطانیہ اور مملکت امریکہ کی اخلاقی ہمدردی روس کے ساتھ ہے اور یہ چیز روسیوں کا حوصلہ بڑھانے میں کامیاب ثابت ہو رہی ہے۔

ہندوستانی سیاسیات میں اس مہینے کسی قدر مدوجزر پیدا ہوا جو ملک کے آئینی مستقبل پر تو اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ تاہم فکر و نظر میں ہنگامہ پیدا کرنے کے لئے کافی ثابت ہو سکتا ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ وائسرائے ہند نے اپنی عاملہ میں توسیع کر دی ہے۔ لیکن چونکہ مسلم لیگ اور کانگرس نے اس رد و بدل سے فائدہ نہیں اٹھایا اس لئے عافیت کیشوں کو فائدہ اٹھانے کا موقع مل گیا۔ نئے کمانڈر انچیف سر آرچی بالڈ ویول نے ڈیفنس کونسل بنائی ہے۔ جس میں مسلمانوں اور خصوصاً پنجابی مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے۔ حالانکہ پنجاب جنگی تگ و دو میں قابل رشک حصہ لے رہا ہے۔ پنجاب کی سیاسیات میں تین اہم واقعات ظہور پذیر ہوئے۔

(۱) پاکستان کی تشریحات کے لئے لائل پور میں علماء کی ایک کانفرنس ہوئی جس میں سر سکندر حیات نے پاکستان کی مذمت کی حالانکہ وہ مسلم لیگ کے ممبر بھی ہیں۔ اس تقریر کا اثر زائل کرنے کے لئے ملک برکت علی نے لاہور میں ایک اور جلسہ منعقد کر کے پاکستان کی حمایت میں اپنا خطبہ پڑھا۔

(۲) کانگرس کی پارلیمانی بازی سے تنگ آکر ڈاکٹر ستیہ پال نے استعفیٰ

مستعد ہیں اور اپنے بیانات میں اسکو ہم نام پر کرنے کو کوشش ہیں۔

۳۔ میاں افتخار الدین نے فرقہ وارانہ اتحاد کے لیئے ایک یونٹی کانفرنس منعقد کیا۔ لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ جو لوگ سب سے بڑے فرقہ پرست ہیں ان سے اتحاد و تعاون کی روح پیدا ہونے کی توقع کیونکر ہو سکتی ہے؟

لاہور ــــــــــــ ۲۹ جولائی ۱۹۴۷ء

اطلاع

جن حضرات کی نمبر خریداری کے ساتھ (س) چھپا ہوتا ہے اُن کے نمبروں میں نئی چٹیں لکھوانے کی سبب سے کچھ رد و بدل ہو گیا ہے لہذا وہ اپنے نئے نمبر چٹ کے اوپر سے نوٹ کر لیں۔ ـ مینجر عالمگیر لاہور

ہندوستان کے ہزاروں انسان

جوانی کو برباد کر بیٹھے

وہ اب پھر نوجوان بن سکتے ہیں

جتنی دیا ہندوستان میں نامردی کی پھیلی ہے اتنی دنیا کے شاید کسی ملک میں ہو اور جتنی لوٹ کہ اشتہار بازوں نے مچا رکھی ہے اور پبلک کی صحت کو برباد کر رکھا ہے ایسی دنیا کے کسی خطہ میں نہیں ہے۔ کیا آپکی آنکھیں ابھی تک نہیں کھلیں جبکہ آپ بھی جھوٹ اور فریب میں پھنس کر اپنا روپیہ اور صحت کھو بیٹھے ہیں اس اندھیر گردی اور عام صحتوں کے برباد ہونے سے متاثر ہو کر آیورویدک اور یونانی فلاسفروں نے ایک وقت میں بیٹھ کر بڑے غور و فکر کے بعد نامردی، جریان، سرعت انزال، احتلام، خمی کجی، لاغری، سستی اور عام جسمانی کمزوری کا صرف سات دن کا علاج منظور کر لیا اور اس علاج سے ہندوستان کے لاکھوں انسانوں کو دوبارہ جوانی مل گئی ہے کی وجہ سے ان کے گھر کی خوشی قائم رہ گئی اور ہزاروں برباد گھر آباد ہو گئے۔ جو لوگ جوانی کے لئے ٹکریں مارتے پھرتے تھے۔ راتوں کی تنہائی میں اپنے کئے پر پچھتا کر آٹھ آٹھ آنسو رویا کرتے تھے۔ آج ان کے گھروں میں جا کر دیکھو وہ اولاد سے کھیلتے نظر آتے ہیں اور ان کی استریاں ان پر سایہ کی طرح نچھاور رہتی ہیں۔

سات دن میں جوانی کس طرح مل سکنی ہے

بڑی حیرت کی بات یہ ہے کہ جوانی کو لوٹانے کا علاج صرف سات دن میں ہو جاتا ہے مگر ان سات دنوں کے اندر واپس جانے کا بہت خطرہ رہتا ہے۔ کیونکہ اس علاج کی پوشیدہ ترکیب کے عمل میں آ جاتی ہے۔ اس لئے صرف انہی لوگوں کو یہ کورس استعمال کرنا چاہیئے جو سات دن تک ضبط سے کام لینے کا اقرار کرینگے۔ بڑے غضب کی طاقت چوتھے دن ہی پیدا ہونے لگتی ہے۔ بس اس طاقت کو سات دن تک روک لینے سے انسان برسوں طاقت سے کھیل سکتا ہے اور اس کی قوت کم نہیں ہو سکتی۔ اس علاج میں دو دوائیاں ہوتی ہیں۔ ایک کھانے کی اور ایک لگانے کی۔ دونوں دوائیوں کے کورس کا نام "ری جوین" ہے۔ کھانے کی دوا کی پہلی خوراک حلق میں اتری اور اس نے تمام اعصاب کو ہوشیار کرنا شروع کر دیا اور کمزوری کو اس طرح بدن سے نکالنا شروع کر دیا جیسے گند دور کر دی۔ لگانے کی دوا بھی اپنے ایک قطرہ کا کمال دکھاتی ہے۔ عضو پر پھیلتے ہی مریض خود حیرت زدہ ہو جاتا ہے کیونکہ بجلی کی طرح لہریں دوڑنے لگتی اور طاقت کا سمندر اُبل پڑتا ہے اس کورس میں عجیب و غریب صفات بند ہیں۔ اگر کوئی انسان بھی ایک دفعہ استعمال کر لے تو جوانی کا پورا سماں دیکھ لے۔

گارنٹی اس بات کی گارنٹی تحریری دی جاتی ہے کہ ہمارے "ری جوین" کورس سے اگر سات دن میں انسان تند رست نہ ہو تو قیمت واپس کی جاتی ہے اور ایک پیسہ رکھنا بُرا سمجھا جاتا ہے۔ پورے کورس کی قیمت پانچ روپے۔ ڈاکخرچ اس کے علاوہ۔ یہ کورس صرف انہی لوگوں کو بھیجا جائیگا جو سات دن تک ضبط سے کام لینے کا اقرار کرینگے۔

مینیجر اکسیری دواخانہ کلاں محل نمبر 106 دہلی

ایک نفیس مزاج مہارانی

نے اپنے صدر اعظم سے کہا کہ دنیا کے ہر چہار جانب قاصد روانہ کرو کہ وہ ہر قسم
کے پھول لائیں کہ میں اپنے لیے بہترین خوشبو منتخب کرسکوں تعمیلِ حکم کیلئے فردوس
شمال کشمیر جنت نظیر سوئزرلینڈ شباب انگیز تسمانیہ کے گلپاش مرغزاروں کی گلچینی کی
گئی۔ جب سب پھول دور دراز سفر کے بعد مہارانی کے حضور میں پیش کئے
گئے تو بیشتر اپنی خوشبو کھو چکے تھے اور باقی اس قدر مرجھائے ہوئے تھے۔ کہ
مہارانی کی حسن شناس نگاہوں کو تکلیف ہوئی۔ مہارانی اس خواہش کے پورا نہ ہونے
سے ملول رہنے لگی کھانا پینا ترک کر دیا۔ مہاراجہ کو فکر دامنگیر ہوئی اور وزرا سے
مشورہ طلب کیا۔ مہتمم توشہ خانہ نے اصغر علی محمد علی سے عطر منگوانے کو کہا۔ رائے
معقول تھی فوراً عمل کیا گیا جب عطر آیا تو مہارانی کا شباب رفتہ ایک بار پھر
اپنی بہاریں ساتھ لئے واپس آگیا

آپ کیوں پریشان ہیں؟

ناامید ہونا گناہِ عظیم ہے

ہمت اور کوشش کریں اور سچے رہبر سے روحانی امداد لیکر پریشانی سے نجات حاصل کریں۔ پس اگر آپ کسی ایسی بیماری میں مبتلا ہیں جس پر دوائی اثر نہیں کرتی۔ حکیم و ڈاکٹر کے علاج سے مایوس ہو چکے ہیں مرض سمجھ میں نہیں آتی۔ یا کسی نے جادو ٹونہ سحر کر کے مرض لگا رکھی ہے یا آپکی اولاد پر کوئی بد اثر ہے جس کی وجہ سے وہ زندہ نہیں رہتی یا ہوتی نہیں یا کسی سے ناچاقی رہتی ہے یا آپ کسی کی صحبت میں بے زار ہیں اس کو بس میں لانے کی ضرورت ہے یا مقدمہ میں پریشانی ہے یا امتحان میں حسب منشا کامیابی چاہتے ہیں یا افسر کی خوشنودی ملازمت میں ترقی بیوپار میں منافع چاہتے ہیں یا میاں بیوی کے درمیان خوشگوار تعلقات پیدا کرنا چاہتے ہیں تو آپ جناب عامل حکیم کریم الدین طبیب روحانی سے مشورہ لیں اور روحانی عملیات کے ذریعہ سے ایک قسم کی مشکل و مصیبت میں نجات حاصل کریں لاکھوں ذی عزت شرفا امراء آزمائش کر چکے ہیں۔ آپ بھی انکی طرح ایک مرتبہ تشریف لا کر آزمائش کریں۔ اگر لاہور آنے سے معذور رہیں تو خط و کتابت جوابی کر کے مشورہ کریں دیکھیے چند صاحبان حکیم صاحب کے علم و عمل کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔

میں اپنے لڑکے مسمی عبداللہ احمد خاں کو اپنے ہمراہ لیکر جناب عامل حکیم کریم الدین طبیب روحانی انارکلی لاہور کی خدمت میں حاضر ہوا اور مسلس کی ... امتحان کی کامیابی کے متعلق آپ سے عملیات روحانی معجزہ تعویذ لیا۔ خدا کے فضل اور عامل صاحب کی امداد عملیات سے لڑکا امتحان میں کامیاب ہوا اور آپ کے کہنے کے مطابق برسر روزگار ہو کر کوئٹہ میں (محکمہ پیشل) باعزت کام کر رہا ہے۔ اس لئے مجھے بھی آپ کے علم و عمل کی تعریف میں چند سطور لکھنا پڑیں۔

(اسر بلند خاں سیکنڈ ماسٹر مڈل سکول رام دیوالی مسلمانان ضلع امرتسر)

یہ ایک معجزہ ہوا ہے

میرے محترم جناب عامل حکیم کریم الدین صاحب انارکلی لاہور۔ السلام علیکم۔ میری ... عرصہ سے بیمار تھی۔ علاج یونانی و ڈاکٹری طریقہ پر کیا گیا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ مریضہ کی ... ٹانگیں جڑ گئی تھیں۔ میں آپ کے دفتر میں آیا اور آپکے حکیم علی شیر صاحب کو حالات بتلائے تب کہیں باہر تشریف لے گئے تھے۔

مایوس ہونا مردوں کا شیوہ نہیں

آپنے پانچ عدد عملیاتی بتیاں عنایت کیں اور طریقہ استعمال بتایا گیا عرض کروں پہلی ہی بتی جلانے سے ٹانگیں سیدھی ہو گئیں۔ یہ ایک معجزہ ہوا ہے جس نے اس علاقہ میں ہر چہار طرف ان عملیاتی بتیوں کا شہرہ کر دیا ہے میں نے تقریباً ۱۵۰۰ روپے مریضہ کی بیماری پر خرچ کئے تھے اور مایوس ہو گیا تھا اخبارات میں آپکی شہرت سنکر آیا تھا۔ واقعی آپکا علاج اعلیٰ ہے۔ مریضہ ہر وقت آپکو دعائیں دیتی ہے لوگ ہم سے آکر دریافت کرتے رہتے ہیں جو کچھ ہم نے دیکھا ہے کہہ دیا کرتے ہیں۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو تحریر فرمائیں اور اگر میرے حالات مشتہر کرنا چاہیں تو اجازت ہے۔

(چوہدری منظور حسین ذیلدار چک نمبر ۳۶ جنوبی ضلع سرگودھا)

علاوہ ازیں جناب ملک محمد نور رسالدار پنشنر آئی او ایم کندیاں ضلع شاہپور جناب خانچند ڈیرہ اسمٰعیل خاں جناب عباد اللہ صاحب ریلوے سٹور کیپر لاہور۔ جناب ترلوک سنگھ شر دینی گوردوارہ پربندھک کمیٹی لاہور۔ جناب مظفر علی خاں صاحب پنشنر جج ہائیکورٹ لاہور۔ جناب کرم چند صاحب جنرل سیکرٹری منیجر بھارت بیمہ کمپنی لاہور۔ جناب آغا جعفر ایس۔ ڈی او ... جناب میاں جگدیش سنگھ صاحب مجسٹریٹ درجہ اول دہلی۔ جناب ملک ... کمشنر ریاست بہاولپور۔ خان محمد خاں ریٹائرڈ سب رجسٹرار ... مجسٹریٹ راولپنڈی۔ جناب فیض الحسن صاحب سپیشل مجسٹریٹ ... ضلع بلند شہر۔ جناب چوہدری عبدالمجید صاحب سب انسپکٹر پولیس لاہور۔ جناب سردار روشن سنگھ صاحب ڈپٹی ڈائرکٹر محکمہ اگریکلچر راولپنڈی۔ جناب ... خانصاحب انسپکٹر پولیس پشاور یہ سب صاحبان تحریر فرماتے ہیں کہ جناب عامل حکیم کریم الدین صاحب علم و عمل میں ماہر ہیں۔ علاوہ ازیں از حد شریف اور ملنسار ہیں۔ اگر آپ ہزارہا اسنادات کا ملاحظہ فرمانا چاہیں تو دفتر میں تشریف لاکر ملاحظہ فرما سکتے ہیں ہر قسم کی زنانہ و مردانہ خفیہ بیماریوں کے علاج عملیات روحانی جڑی بوٹیوں سے کئے جاتے ہیں اور قسمت کے صحیح حالات بتائے جاتے ہیں کہ ... کیا حالت گزر رہی ہے اور آئندہ کیسی رہے گی۔ غرضیکہ ... ہر وقت مل سکتا ہے۔ وقت ملاقات ...

مہتمم حکیم علی شیر دفتر عامل حکیم کریم الدین طبیب روحانی رجسٹرڈ انارکلی ...

میں تو وہی چوڑیاں لونگی!

ایک جوان عورت کی خواہش

وہ اپنے خاوند سے کہہ رہی تھی۔ کہ مجھے تو وہی چوڑیاں منگادو جو دہلی میں ملتی ہیں۔ میں نے بہت سی سہیلیوں کے پاس دہلی کی بنی ہوئی چوڑیاں دیکھی ہیں، بہت ہی خوبصورت اور چمکدار اصلی سونے کی طرح رنگ، روپ کی بنی ہوئی ہیں مجھے بہت ہی پسند ہیں۔ میں تو وہی چوڑیاں لوں گی۔ آخرکار بڑی خوشامد کے بعد اس نے وہ چوڑیاں منگادیں۔

اس کا خاوند حیران رہ گیا

جب ان چوڑیوں کو دیکھا تو اس کو بڑی حیرت ہوئی اس نے صراف کو یہ چوڑیاں دکھائیں تو وہ بھی دیکھ کر بولا کہ یہ تو نقلی سونا ہے اور اس کا بھاؤ پچیس روپے تولہ کا ہے۔ اس نے کسوٹی پر لگایا تو سونے کا کس دیا اور تعجب سے پوچھنے لگا کہ یہ چوڑیاں کہاں سے منگائی ہیں۔ میں بھی خریدوں گا۔ چنانچہ اس صراف نے بہت سے سیٹ منگائے اور ان کو دگنے اور تگنے داموں میں فروخت کیا۔

ناظرین! یہ وہی چوڑیاں ہیں جن کی شہرت تمام ہندوستان میں ہو رہی ہے۔ ایسے کیمیکل گولڈ سے تیار کی گئی ہیں جس کا رنگ قائم رہتا ہے جس کی چمک دمک اور خوبصورتی قائم رہتی ہے جو برسوں استعمال کے بعد بھی خراب نہیں ہوتیں۔ ان چوڑیوں کو دہلی کے مشہور کاریگروں نے تیار کیا ہے اور سوائے ہماری فرم کے اور کسی دوسری جگہ نہیں ملتیں۔ یہ چوڑیاں تحفہ میں دینے اور بیاہ شادی کے موقعہ پر استعمال کے لئے ایک لاجواب چیز ہے منگایئے اور اس نایاب تحفے سے اپنی عورتوں کو خوش کیجئے۔ ایک سیٹ میں آٹھ چوڑیاں ہوتی ہیں ایک سیٹ کی قیمت تین روپے ہے۔ محصول ڈاک آٹھ آنے علاوہ۔ تین سیٹ منگانے پر ایک سیٹ مفت اور محصول ڈاک کی رعایت۔

منگوانے کا پتہ

منیجر گولڈ لک ٹریڈ ایجنسی کلاں محل (اے ایل) دہلی

ایک نفیس مزاج مہارانی

نے اپنے صدر اعظم سے کہا کہ دنیا کے ہر چہار جانب قاصد روانہ کرو کہ وہ ہر قسم کے پھول لائیں کہ میں اپنے لئے بہترین خوشبو منتخب کر سکوں تعمیل حکم کے لئے فردوس مثال کشمیر جنت نظیر سوئزرلینڈ، شباب انگیز تسمانیہ کے گلپاش مرغزاروں کی گلچینی کی گئی جب سب پھول دور دراز سفر کے بعد مہارانی کے حضور میں پیش کئے گئے تو بیشتر اپنی خوشبو کھو چکے تھے اور باقی اس قدر مرجھائے ہوئے تھے کہ مہارانی کی حسن شناس نگاہوں کو تکلیف ہوئی، مہارانی اس خواہش کے پورا نہ ہونے سے ملول رہنے لگی، کھانا پینا ترک کر دیا۔ مہاراجہ کو فکر دامنگیر ہوئی اور وزرا سے مشورہ طلب کیا، مہتمم توشہ خانہ نے اصغر علی محمد علی سے عطر منگوانے کو کہا، رائے معقول تھی فوراً عمل کیا گیا جب عطر آیا تو مہارانی کا شباب رفتہ ایک بار پھر اپنی بہاریں ساتھ لئے واپس آگیا

پتہ

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ

مفت بالکل مفت ــ بالکل مفت





ہمارے دواخانہ نے اپنی تین شہرہ فائدہ دوائیوں کی مشہوری کیلئے ہر شیشی کے خریدار کو ایک قیمتی ہیوٹ رسٹ واچ اور ایک تولہ سونا پیرس نیو گولڈ بالکل مفت دینے کا فیصلہ کیا ہے جلدی کریں اور فائدہ حاصل کریں

بال عمر بھر نہیں اُگتے

ہماری مشہور دوائی اصلی اکسیر حسن رجسٹرڈ کے استعمال
سے ہر جگہ کے بال بغیر کسی تکلیف کے ہمیشہ
کیلئے دور ہو جاتے ہیں اور پھر زندگی بھر دوبارہ
اس جگہ کبھی پیدا نہیں ہوتے۔ جگہ ریشم کی طرح
ملائم نرم اور خوبصورت نکل آتی ہے قیمت فی شیشی ایک روپیہ پندرہ آنے (عہ) محصولڈاک علاوہ تین شیشی کی رعایتی قیمت دوبارہ صرف پانچ روپے اس دوائی کو مشہور کرنے کیلئے ہر شیشی کے ہمراہ ایک عدد قیمتی رسٹ واچ معہ تسمہ اور ایک تولہ سونا پیرس نیو گولڈ بالکل مفت بطور انعام دیا جاتا ہے یہ سونا دیکھنے میں بالکل اصلی سونے کے مانند معلوم ہوتا ہے اور کسوٹی پر اصلی سونے کا رنگ دیتا ہے اس سے ہر قسم کے زیورات تیار ہو سکتے ہیں۔

ضروری نوٹ۔ مال ناپسند ہونے پر قیمت فوراً واپس کر دیجائیگی تین شیشی دوائی کے خریدار کو محصولڈاک معاف اور تین گھڑیاں اور تین تولے سونا بالکل مفت انعام

بال کالا تیل عـــا

اس بال کالا تیل کے استعمال سے بال ہمیشہ کیلئے سیاہ ہو جاتے ہیں اور پھر تمام کالے پیدا ہوتے ہیں بےنظیر سنیاسی تحفہ ہے فائدہ نہ ہونے قیمت واپس ہوگی قیمت فی شیشی صرف ایک روپیہ پندرہ آنے (عہ) محصولڈاک علاوہ تین شیشی کی رعایتی قیمت صرف پانچ روپے اس دوائی کو مشہور کرنے کیلئے ہر شیشی کے ہمراہ ایک عدد قیمتی ہیوٹ رسٹ واچ اور ایک تولہ سونا پیرس نیو گولڈ بالکل مفت بطور انعام دیا جاتا ہے یہ سونا دیکھنے میں بالکل اصلی سونے کے مانند معلوم ہوتا ہے اور کسوٹی پر اصلی سونے کا رنگ دیتا ہے ہر قسم کے زیورات تیار ہو سکتے ہیں۔

ضروری نوٹ۔ مال ناپسند ہونے پر قیمت فوراً واپس کر دیجائیگی تین شیشی کے خریدار کو محصولڈاک معاف اور تین گھڑیاں اور تین تولے سونا بالکل مفت انعام۔

کالے گورے ہو گئے

اگر آپ اپنے چہرہ کا رنگ کالے سے گورا کرنا چاہتے ہیں یا اپنے مرجھائے ہوئے چہرہ پر بدنما کالے داغ کیل پھنسیاں چیچک کے داغ اور چھائیاں دور کرنے کی خواہش رکھتے ہیں تو ہمارا سائنس سے تیار کردہ لندن بیوٹی لوشن (رجسٹرڈ) استعمال کریں جس سے آپکے جسم یا چہرہ کا رنگ شرطیہ طور پر کالے سے گورا ہو جائیگا قیمت فی شیشی صرف ایک روپیہ پندرہ آنہ (عہ) محصولڈاک علاوہ تین شیشی کی رعایتی قیمت صرف پانچ روپے اس دوائی کو مشہور کرنے کیلئے ہر شیشی کے ہمراہ ایک عدد قیمتی ہیوٹ رسٹ واچ معہ تسمہ اور ایک تولہ سونا پیرس نیو گولڈ بالکل مفت بطور انعام دیا جاتا ہے یہ سونا دیکھنے میں بالکل اصلی سونے کا رنگ دیتا ہے اس سے ہر قسم کے زیورات تیار ہو سکتے ہیں ضروری نوٹ:۔ مال ناپسند ہونے پر قیمت فوراً واپس کر دی جائیگی۔ تین شیشی کے خریدار کو محصولڈاک معاف اور تین تولے سونا اور تین گھڑیاں بالکل مفت انعام

ملنے کا پتہ:۔ منیجر لندن کمرشل کمپنی ایچ ۔ پی ۔ ایل پوسٹ بکس ۱۶۵ / ۱۶۳ لاہور شہر

عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی و ادبی معیاری رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

جلد ۳۵ — فہرست مضامین بابت ماہ ستمبر ۱۹۴۱ء — نمبر ۴

ملاحظات

علمی و ادبی مضامین کے اعتبار سے زیرِ نظر اشاعت خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس مرتبہ "تحقیق و تبصرہ" کا صفحہ حضرت نوح ناروی جیسے فاضلِ اجل اور کہنہ مشق شاعر نے مرتب کیا ہے۔ اُمید ہے شاعر حضرات عالمگیر میں نظمیں بھیجنے سے قبل اُن پر فنی نقطۂ نگاہ سے نظرِ ثانی فرمایا کریں گے۔ "حقائق و معارف" میں حضرت مولینا ظفر علی خاں نے بعض تاریخی واقعات ناقدانہ انداز میں پیش کئے ہیں ہمیں مسرت ہے کہ یہ سلسلۂ مضامین حلقۂ ادب میں بنظرِ استحسان دیکھا جا رہا ہے مولینا نور احمد فریدی پہلی مرتبہ محفلِ "عالمگیر" میں شامل ہو رہے ہیں۔ لیکن اندازِ تحریر سے ظاہر ہے کہ آپ ایک بلند پایہ محقق اور سنجیدہ ادیب و مصنف ہیں۔ آپ نے "ڈراما شاہجہان" پر ایک فاضلانہ تنقید کی ہے۔ اُردو میں ایسے مضامین بہت کم سپردِ قلم کئے جاتے ہیں جو خالص علمی اور تاریخی انداز میں لکھے جائیں۔ جناب فریدی کی یہ بے لاگ تنقید اس خلا کو بوجوہِ احسن پُر کرتی ہے۔ اُمید ہے ہم فریدی صاحب کے تاریخی مقالات گاہے گاہے قارئینِ عالمگیر کے پیش کر سکیں گے۔ جناب عزیز گورکھپوری نے آخری تاجدارِ اودھ کی علمی و ادبی خدمات پر قابلِ قدر روشنی ڈالی ہے۔ الحاج مولینا عبد القیوم نے مختلف کتابوں کی چھان بین کے بعد دلچسپ تاریخی واقعات مرتب کئے ہیں۔ اُمید ہے قارئین پسند فرمائیں گے۔ "خطوطِ اقبال"

زیرِ نظر اشاعت

از — ادارہ

افسانے اور ڈرامے بھی سب کے سب جاذبِ توجہ ہیں۔ جناب محمود دہلیاتی اس سے قبل "تاریخ نمبر" میں شاہ محمد تغلق کی داستانِ عشق" سپردِ قلم کر چکے ہیں۔ اس اشاعت میں آپ کا ایک افسانہ "حبلہ کی داستانِ عشق" شائع ہو رہا ہے: "ماں نتا اور وطن" جناب ظفر واسطی کا ڈراما ہے اور زمانۂ جنگ میں اس کا مطالعہ حریت پرور ثابت ہو سکتا ہے۔ "گناہ" میں ایک نیا اخلاقی نکتہ پیش کیا گیا ہے۔ "تا خیبر" "کیا یہ قربانی ہے؟" اور "اعتراف" دلچسپ نفسیاتی افسانے ہیں۔

حصۂ نظم میں حضرت عبرت صدیقی۔ حضرت محمود اسرائیلی۔ حضرت طالب باغپتی۔ حضرت سرورش ملیح آبادی اور حضرت فرحت اسعدی وغیرہ کا تازہ کلام اشاعت پذیر ہو رہا ہے۔ جس کی افادیت کا اندازہ قارئین کو بخوبی ہو سکتا ہے۔

اس سے قبل ہم "عالمگیر" میں لکھ چکے ہیں کہ مسٹر سہراب مودی ایک تاریخی شاہکار "سکندر" سلولائڈ پر منتقل کر رہے ہیں۔ اب یہ اطلاع موصول ہوئی ہے کہ یہ فلم تیار ہو چکا ہے اور عنقریب پردۂ فلم پر پیش کر دیا جائیگا۔ اس فلم پر مسٹر سہراب مودی نے پانی کی طرح روپیہ بہایا ہے اور ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ

اخبار و افکار

حکومتِ کشمیر اور اُردو

حکومتِ کشمیر نے ہندی طرزِ تحریر کو اردو رسم الخط کا درجہ دیکر جس عاقبت نااندیشی اور حقیقت ناشناسی کا ثبوت دیا ہے اس کے نتائج ریاست کو تشویش و اضطراب کی طرف کھینچ رہے ہیں۔ چنانچہ نیشنل کانفرنس نے اس حرکت کے خلاف باقاعدہ جدوجہد شروع کر دی ہے اور اس سلسلہ میں ایک قسم کا ایسا قدم اُٹھایا گیا ہے جس پر تحریک ترکِ موالات کا شبہ ہو سکتا ہے۔ کشمیر اسمبلی سے نیشنل کانفرنس کے ارکان مستعفی ہو چکے ہیں اور حکومتِ کشمیر کو اتنی بھی جرأت نہیں ہوئی کہ ان نشستوں کے لئے ضمنی انتخابات کا حکم صادر کریں گے۔ بلکہ نیشنل کانفرنس کے ارکان کی نشست گاہیں خالی قرار دی جا چکی ہیں اور ان کے استعفے بھی منظور نہیں کئے گئے۔ اس کمزوری سے ثابت ہوتا ہے کہ حکامِ کشمیر نیشنل کانفرنس کے جائز مطالبے کی قوت سے مغلوب ہو چکے ہیں لیکن ان میں اخلاقی جرأت کی کمی ہے اس لئے مطالبے کی تسلیم و تصدیق کا اعلان نہیں کرتے۔ اور اس مغلوبیت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ پونچھ میں ہندی رسم الخط کو داخل ہونے کی اجازت نہیں دی گئی حالانکہ یہ علاقہ بھی ریاستِ کشمیر کے ماتحت ہے۔ یہ حالات مہاراجہ صاحب کو حقیقت کے مطالعہ کی دعوت دیتے ہیں، لہذا مہاراجہ صاحب کا فرض ہے کہ وہ اپنے نوکروں کی غلط کاریوں اور کور فہمیوں کا ازالہ کریں۔ ورنہ ان کا کیا نقصان ہوگا؟ اگر کوئی صدمہ پہنچے گا تو وہ مہاراجہ صاحب کے دائرۂ حکمرانی کے لئے ہوگا۔ چنانچہ سنہ ۱۹۳۱۔۳۲ء کی زلزلہ افگن تحریک بھی اسی قسم کی غیر دانشمندانہ حرکتوں کا نتیجہ تھی، ہمیں اندیشہ ہے کہ خدانخواستہ کہیں وہی صورتِ حال دوبارہ رونما نہ ہو جائے۔ مہاراجہ صاحب کو مداخلت کر کے اُلجھنوں کو دُور کرنا چاہیئے اور ایک سرکاری اعلان کے ذریعے سے حسبِ سابق صرف اُردو ہی کو ریاستی رسم الخط قرار دیا جائے تاکہ زبان کا مسئلہ سیاسی پیچیدگیوں تک نہ پہنچ سکے۔

از۔ ادارہ

القانون المسعودی

ہندوستان کے محکمۂ جائزہ آثارِ قدیمہ نے ایک ایسی کتاب شائع کی ہے جو نایاب ہو چکی تھی اور جس کے اجزا مختلف ذریعوں سے حاصل کر کے مرتب کئے گئے ہیں۔ اس میں ایک ہزار سال پہلے کے ہندوستان کی قدرتی حالت اور تمدنی اور سائنسی ترقی کی کیفیت بیان کی گئی ہے یہ کتاب مشہور مشرقی فاضل البیرونی نے عربی زبان میں لکھی تھی۔ مشہور فاضل اجل البیرونی سلطان محمود غزنوی کے دربار کے مقتدر فضلاء میں سے تھے اور انہیں ایشیا کے مختلف ملکوں کے جغرافیہ کے متعلق اعلیٰ درجہ کی معلومات حاصل کرنے کے وسیع مواقع حاصل تھے چونکہ انہیں بہت سی زبانوں پر عبور حاصل تھا اس لئے انہوں نے ان ملکوں کے باشندوں کی زبانوں، علوم و فنون، ادب و فلسفہ، مذہبیات اور عقائد سے گہری واقفیت حاصل کر لی تھی۔

انہوں نے اپنے مشاہدات کو ایک کتاب کی شکل میں قلم بند کیا تھا جس کا نام "القانون المسعودی" تھا۔ ہندوستان کے محکمۂ جائزہ آثارِ قدیمہ نے اس کتاب کے اس حصہ کا خلاصہ شائع کیا ہے جو زیادہ تر ہندوستان کے قدرتی جغرافیہ اور معدنیات سے تعلق رکھتا ہے

اس کتاب میں چار ابواب ہیں۔ پہلے باب میں مصنف نے زمین کی حالت بیان کی ہے اور ملکوں کی جغرافیائی تقسیم خصوصاً ان کے عرض البلد اور طول البلد کے لحاظ سے کی گئی ہے۔

دوسرے باب میں دنیا کی ابتداء ابتدائی انسانوں اور دنیا کے "برفانی دَور" کے نظریہ سے بحث کی گئی ہے۔ یہ نظریہ سب سے پہلے اسی فاضل اجل نے گیارھویں صدی میں ان ڈھانچوں اور ہڈیوں کو دیکھ کر قائم کیا تھا۔ جو عام طور پر آبی جانوروں کی سمجھی جاتی تھیں اور جو یمن (عرب) اور اس کے نواحی علاقوں کے پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف میں دبی ہوئی پائی گئی تھیں۔ تیسرے باب میں قیمتی پتھروں اور دوسرے درجے کے جواہر اور دھاتوں کا ذکر ہے۔ مثلاً سونا۔ چاندی۔ تانبا۔ لوہا۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ چیزیں کہاں کہاں پائی جاتی اور کس طرح

حاصل کی جاتی ہیں۔

چوتھے اور آخری باب میں نباتات کا ذکر ہے مثلاً بوٹیاں پودے پھل۔ دوائیں، چھالیں وغیرہ اور ان کی خاصیتیں اور اثرات بتائے گئے ہیں۔ نیز اس میں آبی اور زمینی جانوروں کا حال درج کیا گیا ہے اور ان کی خصوصیات اور رہنے کے طریقے بیان کئے گئے ہیں۔

اس کتاب کو زکی ولیدی طوغان ایک ترکی مشرقی فاضل نے مرتب کیا ہے انہوں نے البیرونی کی اس بے بہا کتاب کی تلاش میں دور دراز مقامات کے سفر کئے اور یورپ و ایشیا کے مختلف کتب خانوں وغیرہ سے اس کے اجزا فراہم کر کے کئی سال کی محنت کے بعد اس کی ترتیب درست کی یورپ میں انہیں ناشر ایسا نہ ملا جو اس کتاب کی اشاعت پر آمادگی ظاہر کرتا۔ تب انہوں نے ہندوستان کے محکمۂ جائزہ آثار قدیمہ کے ناظم اعلےٰ کے ساتھ خط و کتابت کی جنہوں نے اس کی اہمیت کو مد نظر رکھتے ہوئے اسے اس کے انگریزی ترجمہ سے پہلے شائع کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

چھوٹا ناگپور اُردو مرکز رانچی

جناب سہیل عظیم آبادی ہندوستان کے ایک کہنہ مشق اور سحر طراز افسانہ نویس ہونے کے علاوہ انجمن ترقی اردو کے ایک سرگرم کارکن بھی ہیں، آپ نے چھوٹا ناگپور میں ایک اردو مرکز قائم کیا ہے جس کا مقصد اشاعت اردو کے ساتھ ساتھ اردو تعلیم بھی ہے جناب سہیل نے ذیل کا مراسلہ برائے اشاعت بھیجا ہے امید ہے قارئین اس مرکز کی امداد کرنے سے دریغ نہ فرمائیں گے۔

اردو زبان ہندوستان کی واحد قومی اور مشترکہ زبان ہے، اہل ہند کے سینکڑوں سال کے میل ملاپ کی سب سے بڑی یادگار ہے یہ وہی زبان ہے جسے ہم ہندوستانیوں کے آبا و اجداد نے بڑی محنت سے بڑھایا اور پھیلایا لیکن اب حالات بدلتے جا رہے ہیں۔ جن ہاتھوں نے یہ باغ لگایا تھا ان میں سے اکثر اب اس کو برباد کرنے پر آمادہ ہیں۔

آپ کو یہ ناگوار حقیقت ضرور معلوم ہوگی کہ آپ کی اس پیاری زبان پر آئے دن مختلف طریقوں سے حملے ہوتے رہتے ہیں اس کے خلاف ایک منظم سازش کام کر رہی ہے ایسی حالت میں اگر آپ اس کی حفاظت اور بچاؤ کے لئے استقلال کے ساتھ کمربستہ نہ ہوئے تو اس کا خطروں میں گھر جانا یقینی ہے ہمیں یقین ہے، کہ آپ کے دل میں اُردو زبان کی محبت ہے آپ سامنے خطروں کو محسوس کر کے بے چین بھی ہو جاتے ہیں اور آپ اس سلسلہ میں اپنے فرائض سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ ہمارا کام صرف آپ کو اس طرف متوجہ کر دینا ہے۔

انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی کی نگرانی میں چھوٹا ناگپور میں ایک اردو مرکز قائم کیا گیا ہے۔ تاکہ وہاں اُردو کی اشاعت کا کام منظم طریقہ پر ہو سکے۔ سر دست مرکز کے ذمہ چھوٹے چھوٹے اُردو مدرسے قائم کرنا اور اردو تعلیم کو عام کرنا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اس بڑے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ہمیں آپ کی ہر طرح کی امداد اور ہمدردیوں کی ضرورت ہے۔ ہمیں اس کا یقین ہے کہ اس جد و جہد میں ہم آپ کی ہمدردیوں سے ہرگز محروم نہیں رہیں گے۔

ہماری صرف اتنی اپیل ہے کہ آپ جلد سے جلد اس طرف توجہ فرمائیں اور اُردو مرکز چھوٹا ناگپور کی جو کچھ اعانت آپ کر سکتے ہوں اس سے دریغ نہ فرمائیں۔"

(سہیل عظیم آبادی، مہتمم چھوٹا ناگپور اُردو مرکز)

(بقیہ تحقیق و تصحیح)

مشتاق احمد مشتاق ص۶۵

شور اٹھا نخل تمنا میں ثمر آیا ہے
آج جا کر کہیں الفت میں ثمر آیا ہے

اس شعر میں قوافی کیا ہیں ؟ اگر ثمر قافیہ ہے تو دونوں طرف ایک ہی قافیہ کا استعمال کیوں کر درست ہوگا؟

ایک ہم دونوں ہوئے فرق رہا کچھ بھی نہیں
ساری دنیا میں بجز ان کے سوا کچھ بھی نہیں

بجز اور سوا کا استعمال اس صورت میں کب صحیح ہو سکتا ہے یا بجز رکھئے یا سوا رکھئے اس کی نثر کیا ہوگی۔ ؟

جلیل شیرکوٹی ص۶۵

رہتا ہے تیرے واسطے بے چین و بے قرار
اک بار پھر جلیل کو اپنا بنا کے دیکھ

سلسلۂ تحقیق و تصحیح میں آپ خود خاطر و مدارات میں "و" کو غلط قرار دیتے ہیں۔ ... سے قرار کے درمیان کا "و" کہاں تک درست ہے بے چین جب اردو ہے تو "و" کی کیا ضرورت تھی یہ غلط ہے ؟

تحقیق و تصحیح

ماہ اگست کے حصّۂ نظم پر ایک نظر

از حضرت نوح ناروی

حضرت نوح ناروی مدظلہ اُردو کے ان مایۂ ناز اساتذہ میں سے ہیں جن کو زبان اور فنِ شاعری پر پوری پوری قدرت حاصل ہے آپنے یہ مراسلہ اشاعت کی غرض سے نہیں بھجوایا تاہم افادۂ عام کے لئے ہدیۂ قارئین ہے ادارۂ عالمگیر اپنی صفائی میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ نامور شعرا اپنے کلام کی صحت و عدم صحت کے خود ہی ذمہ دار ہیں اس کے علاوہ تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ اگر کسی شعر میں ترمیم و اصلاح سے کام لیا جائے تو شاعر صاحب کو ناگوار گزرتا ہے لہذا بہتر یہی سمجھا گیا ہے کہ صرف وہی اشعار حذف کر دیئے جائیں جو ادارہ کی نظر میں معیار سے گرے ہوئے یا قدرے ہلکے ہوں باقی غزل یا نظم کی ذمہ داری خود شعرائے کرام پر رہنے دی جائے۔ (ادارہ)

آپنے عالمگیر میں تحقیق و تصحیح کے لئے ایک صفحہ مخصوص کیا ہے اس سے مجھے بے حد مسرت ہوئی یقین ہے کہ یہ ایک مفید کام آپ کے ہاتھوں سے سرانجام ہوگا اگر یہ اجزا باقاعدہ مرتب کئے جائیں تو موجودہ اور آیندہ زمانے کے لئے ایک خاص چیز ہوگی لیکن اور کسی راہ سے نہیں بلکہ مخلصانہ یہ میں ضرور عرض کروں گا کہ جب عالمگیر ہی میں وہ اشعار درج ہوتے ہیں جن میں خامیاں ہوتی ہیں تو اور رسالوں کا ذکر ہی کیا۔ عالمگیر کے اگست نمبر میں جو شعر درج ہو چکے ہیں ان کی خامیوں کو ملاحظہ فرمائیے۔

نشتر سکندر آبادی ص ۳۹

مدہوشی کے عالم میں کسی مست نظر نے ء خمخانۂ جنت سے انڈیلی ہے گلابی

حروفِ علت صرف اور والفاظ میں دبائے جاتے ہیں مدہوشی اردو نہیں تقطیع میں دی) غالباً صرف مدہوش سے مصرعہ موزوں ہو جاتا ہے۔

ماہر القادری ص ۴۲

اے مرے جوشِ جنوں اب اور کوئی مشغلہ
دامنوں کی دھجیوں سے کب تلک کھیلا کریں

"تلک" بالاتفاق متروک ہے اب فصحا اسے قطعی طور سے نہیں استعمال کرتے۔

آہ پر خفگی مناسب اشک پر طعنے عجب
کاش وہ بے تابی دل کا بھی اندازا کریں

خفگی میں "ف" متحرک ہے ساکن نہیں اور یہاں ساکن کی صورت میں ہے

سب کی آنکھوں سے چھپا کر آؤ سب کچھ دیکھ لیں
چشمِ نرگس بن کے اس دنیا کا نظارا کریں

"اس" زاید اور حشو ہے "اس" کی ضرورت نہ تھی کیا اس دنیا کے علاوہ اور بھی کوئی دنیا ہے؟ نثر یوں ہے۔ دنیا کا نظارہ چشمِ نرگس بن کے کریں "اس" بالکل بے ربط اور بے ضرورت ہے۔

مخمور جالندھری ص ۴۹

بنڈلیاں یوں غوطہ زن تھیں جال کے سیلاب میں
مچھلیوں کا رقص جیسے حلقۂ گرداب میں

سیلاب اور گرداب میں ایطا ہے۔

تھال تھے سستی مٹھائی کے نخالص گھی سے تر
گر رہی تھی مکھیوں کی فوج جن پر ٹوٹ کر

خالص تو خالص یہ نخالص کیا ہے؟

ایک ڈبے میں تھا دیہاتی کے حقہ کا دھواں
پاس دو سکھ ناک پر رکھے ہوئے تھے انگلیاں

ناک بند کرنا اور ناک پر انگلی رکھنا دونوں کے دو معنی الگ الگ ہیں ناک پر انگلی رکھنے سے شاعر کا مفہوم ناک بند کرنے کا نہیں پیدا ہوتا۔ آپ خود ہی ذرا غور فرمائیں۔

اس کی جیسی اور بھی شمعیں تھیں لیکن وہ نہ تھی
اس کی ہم رنگ اور بھی شکلیں تھیں لیکن وہ نہ تھی

شمعیں اور شکلیں یہ دو قوافی ہیں ان میں سے جب "ی" اور "ن" نکال ڈالے جو ترکیبی ہیں تو شمع اور شکل یہ دو لفظ باقی رہے یہ دونوں الفاظ ہم قافیہ نہیں جب ہم قافیہ نہیں تو غلط ہیں۔

(باقی انجار و افکار کے نیچے ملاحظہ فرمائیں)

حقائق و معارف

نکولا منوچی ایک یورپین سیاح نے "سٹوریا ڈو موگور" (افسانۂ مغل) کے عنوان سے ایک کتاب لکھی تھی۔ جسے انگریزی زبان میں شائع ہونے کا شکوک فخر حاصل ہے، خاندانِ مغلیہ کو یورپ کے سامنے بدترین شکل میں جیسا اس کتاب نے پیش کیا ہے اس کی بہت کم مثالیں ہمارے دیکھنے میں آئی ہیں۔ نام تو یہ شاہجہاں اور اورنگ زیب عالمگیر کے عہد کی تاریخ ہے لیکن درحقیقت بے سروپا افسانوں اور جھوٹے سچے قصے کہانیوں کا ایک طومارِ ہزلیات ہے۔ جس میں مغل شہزادیوں کی عفت و عصمت پر حرف گیری کرنے سے بھی مصنف کا بے باک قلم نہیں چوکا۔ کاش ہمارا ہم قلم مغلی حرم سرا کی تصویر منوچی کے آئینہ خانہ میں دیکھنے کے بجائے خود اپنے ملک کے پردۂ تاریخ پر دیکھنے کی کوشش کرتا۔ تاکہ نسوانی حیا کی عفت ریز جھلکی اُسے اس طرح نظر آسکتی۔

شاہجہاں آباد کے وسط میں ایک دلکشا باغ ہے۔ جسے شاہ جہاں نے اپنی چہیتی بیٹی جہاں آرا بیگم کی سیر کے لئے جنت الفردوس کے نمونے پر بنوایا ہے۔ باغ کے گرداگرد ایک بلند دیوار کھنچی ہوئی ہے۔ جس میں جا بجا متعدد حجرے بنے ہوئے ہیں۔ دربارِ شاہجہاں کا ایک شاعر صیدی طہرانی جو اس وقت باغ کے نواح میں چہل قدمی کر رہا ہے۔ دُور سے جہاں آرا بیگم کی سواری کو آتے دیکھ کر ایک حجرے میں چھپ جاتا ہے۔ اور جب بیگم کی سواری کا ہاتھی جس پر وہ نقاب پہنے بیٹھی ہے پاس پہنچتا ہے تو اس جوشِ از خود رفتگی میں جو شعراء پر کسی اچھے مضمون کے سوجھ جانے پر طاری ہوا کرتا ہے۔ فی البدیہہ یہ شعر پڑھتا ہے

بر تیغ برخ افگندہ بردو ناز بباغش
تا نکہت گل بیختہ آید بہ دماغش

یعنی ؎

منہ پہ نقاب ڈال کر اس لئے آئی ہے باغ میں
نکہتِ گل چھنی ہوئی تاکہ بسے دماغ میں

تاریخی جواہر ریزے

از ۔۔۔ مولانا ظفر علی خاں مدظلہ

بیگم ایک غیر محرم اجنبی کے منہ سے یہ شعر سُن کر جس سے تغزل ٹپک رہا ہے بہت بے دماغ ہوتی ہے۔ اور کہتی ہے کہ یہ کون گستاخ شخص ہے اسے پکڑ لاؤ۔ خواجہ سرا یہ حکم سنتے ہی دوڑ پڑتے ہیں اور صیدی کو کشاں کشاں جہاں آرا بیگم کے حضور میں حاضر کرتے ہیں۔ بیگم فرماتی ہیں کہ پھر تو کہنا کیا کہا تھا؟ شاعر بھی عجیب سر پھرے ہوتے ہیں شعر دہرا کر کہتا ہے کہ حقیقت حال تو یہی تھی جو عرض کر دی۔ اب خواہ خطا بخشئے خواہ سزا دیجئے۔ بیگم "الحیاء من الایمان" کی نکتہ شناس تو ہے ہی لیکن ساتھ ہی سخن سنج بھی ہے۔ حکم دیتی ہے کہ اس شعر کا صلہ تو پانچ ہزار روپے دے دیا جائے لیکن اس کی گستاخی کی پاداش میں اسے کان پکڑ کر اسی وقت شہر سے نکال دیا جائے

صیدی چونکہ ایرانی تھا اس لئے اس کی طبیعت میں رنگینی اور شوخی زیادہ تھی۔ شیخ محمد علی اکبر آبادی نے بھی جو ہندو دھرم چھوڑ کر مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ جہاں آرا بیگم کی مدح میں ایک مثنوی لکھی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان ایسی جلیل القدر خاتون کو کس انداز میں مخاطب کرنے کا سبق سکھاتا ہے۔ شیخ محمد علی نے دارا شکوہ کی ملازمت اختیار کر لی تھی اور اس سرکار سے مرید خاں کا خطاب پایا تھا۔ شیخ ممدوح کی مثنوی کا ایک شعر جسے سن کر جہاں آرا بیگم بہت ہی محظوظ ہوئی اور ایک توڑا اس کا صلہ بھی دیا۔ ہمیں نہیں بھولتا۔

بذاتش او صفاتش کردگار است
کہ خود پنہاں ز فیضش آشکار است

جس کے دوسرے لفظوں میں یہ معنی ہوئے کہ

نشاں ہم کو بتاتی ہیں صفاتِ کردگار اس کا
کہ خود پردہ میں ہے لیکن کرم ہے آشکار اس کا

جہاں آرا بیگم کے آنچل کو ایک دفعہ شمع کی لو لگ گئی پھر آ گئے

جل گئے اور تمام جسم پر آبلے پڑ گئے۔ پایہ تخت کے حکمائے حاذق نے علاج کیا لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا۔ آبلوں کی جلن مغز استخوان تک سرایت کر گئی تھی۔ تکلیف کسی طرح کم ہونے میں نہ آتی تھی۔ آخر سورت سے ایک انگریزی طبیب باٹن کو طلب کیا گیا۔ جس کی مسیحائی کا شہرہ شاہ جہاں آباد تک پہنچ چکا تھا۔ ڈاکٹر باٹن کی چارہ گری سے بیگم کو کسی قدر افاقہ ضرور ہوا لیکن صحت کلی نہ ہوئی اور سیلان کا رمدہ کر اٹھنا موقوف نہ ہوا۔

تنم بسوخت دلم سوخت استخوانم سوخت
تمام سوختم و ذوق سوختن باقی است

اس زمانہ میں ایک درویش تھے جن کا نام ہاموں تھا۔ انہوں نے ایک مرہم ایجاد کیا تھا جو تمام قسم کی سوزشوں اور زخموں کے لئے بے حد مفید بتایا جاتا تھا۔ جب جہاں آرا بیگم کو کسی مسلمان اور ہندو طبیب یہاں تک کہ ڈاکٹر باٹن کے علاج سے بھی فائدہ نہ ہوا۔ تو شاہ جہاں نے ہاموں درویش کو دربار میں طلب کیا۔ درویش صاحب مرہم ہاموں ساتھ لیتے آئے اور کچھ ہی روز کے ضماد سے تمام زخم مندمل ہو گئے اور بیسویں دن بیگم نے غسل صحت کیا۔

دریا دل شاہ جہاں نے ڈاکٹر باٹن کو اپنی عادت کے مطابق انعام و اکرام سے مالا مال کرنا چاہا۔ لیکن انگریزوں کی طبیعت میں ان دنوں بھی ایثار نفس ایسا ہی تھا۔ جیسا آج کل ہے وہ اس حقیقت کبریٰ سے پوری طرح باخبر تھے کہ فرد کی زندگی قوم کی زندگی کے ساتھ وابستہ ہے۔ اور قوم کو اگر کوئی نفع پہنچے تو فرد اس سے خود بخود متمتع ہو جاتا ہے۔ ممکن تھا کہ ہاموں درویش کی طرح جسے مرہم کے صلہ میں دربار شاہ جہانی سے اپنے ہم وزن سونا ملا۔ ڈاکٹر باٹن بھی چاندی سونے میں تل جاتا۔ لیکن اس نے اگر کچھ صلہ مانگا تو یہ مانگا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو بنگال میں اپنی تجارتی کوٹھی قائم کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔ چنانچہ اسی لحاظ سے فوراً ہی فرمان صادر ہوا۔ ہاموں درویش کو آج کل کوئی جانتا بھی نہیں کہ کس باغ کی مولی تھے لیکن ڈاکٹر باٹن کا نام شہرت کے آسمان پر آفتاب نصف النہار ہو کر چمک رہا ہے۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

دارا شکوہ کا کلام دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تصوف جس نے فارسی شاعری کو معرفت آموزی کا ایک موثر ذریعہ بنا دیا ہے اس کے اشعار میں عجب شان دل کشائی کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ چنانچہ اس کا یہ ایک شعر ایک ضخیم اور حجیم دیوان کے برابر ہے ؎

ہر خم و پیچے کہ شد از تاب زلف یار شد
دام شد زنجیر شد تسبیح شد زنار شد

ایسے شیوا بیان سخن سرا کو جب تذکروں میں اکبر جہانگیر اور شاہ جہاں کی قدر دانیاں ملی ہوں۔ تو ظاہر ہے کہ کسی اچھے شعر کی قدر اس کی نگاہوں میں کس حد تک ہو گی۔ رضی دانش مشہدی نے جو گروہ شعرا میں صاحب طرز خاص ہے ایک دفعہ اپنا یہ شعر دارا شکوہ کو پڑھ کر سنایا ؎

تاک را سرسبز کن اے ابر نیساں در بہار
قطرہ تا مے تواند شد چرا گوہر شود

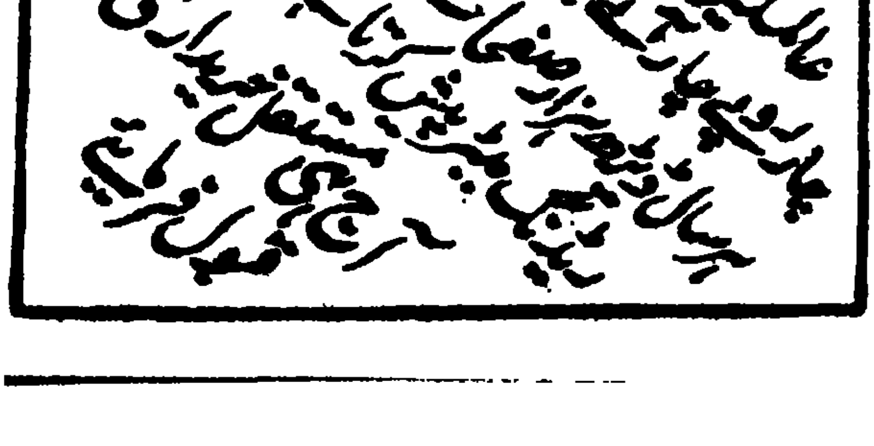
بالفاظ دیگر ؎

اے رگِ ابرِ بہار انگور کو سیراب رکھ
قطرہ بن سکتا ہو جب مے تو کیوں موتی بنے

دارا شکوہ نے رضی دانش کو اس پر ایک لاکھ روپیہ انعام دیا۔

عید اضحیٰ کی تقریب پر ایک دفعہ مراد بخش نے اپنے ہاتھ سے بکرا ذبح کیا۔ قربانی کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ سعید خاں بھی پاس ہی موجود تھا۔ شاہزادہ نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا اس نے برجستہ یہ شعر پڑھا۔

عید قربانست مے خواہم کہ قربانت شوم
ہمچو چشم گوسفند کشتہ حیرانت شوم



تجلّیات

بیٹھے ہوئے ہیں کس لئے آپ حریمِ ذات میں؟

جناب تبارک علی عبرت صدیقی بریلوی

جزو میں ذات جلوہ گر جزو نہاں ہے ذات میں
ذرّہ میں کائنات ہے ذرّہ ہے کائنات میں

رنگ تجلّیات کا بھر کے مشاہدات میں
جلووں کو عام کر دیا عشق نے کائنات میں

جلووں کو عام کیجئے دہر کو جگمگائیے
بیٹھے ہوئے ہیں کس لئے آپ حریمِ ذات میں

گرمیِ آتشِ دروں آگ لگا نہ دے کہیں
شعلۂ غم ہے موجزن خونِ رگِ حیات میں

سوزِ نہاں کی بجلیاں چھائی ہوئی ہیں ہر طرف
گم ہے نگاہِ جستجو اپنی تجلّیات میں

ہے وہ مری نگاہ میں جسکی تلاش تھی مجھے
مٹ کے دلِ حزیں "کچھ اور" بن گیا "کائنات" میں

دل سی لطیف چیز کو کر دیا جس نے پاش پاش
ایسی بھی اک نگاہ تھی حسن کے التفات میں

ایک حجابِ مستقل آپ کی بے حجابیاں
چھائی ہوئی ہیں حیرتیں بزمِ تجلّیات میں

وادیِ دل کی ہر فضا بقعۂ نور بن گئی
جلوے تھے وہ چھپے ہوئے حسن کے التفات میں

جوششِ نیازِ بندگی جلوہ طرازِ ناز ہے
دعوتِ دیدِ عام ہے محفلِ کائنات میں

عبرتِ زار کا بھی دل صورتِ شمع جل بجھا
برق تھی کیا چھپی ہوئی شانِ تجلّیات میں

شاہانِ اودھ کا آخری چراغ

تاریخی مضمون

از جناب عزیز گورکھپوری

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

زمانہ کی نیرنگی مشہور ہے اور یہ قانونِ قدرت ہے کہ عروج کے بعد زوال، ترقی کے بعد انحطاط، دن کے بعد رات، عیش کے بعد غم۔ حیات کے بعد موت۔ شباب کے بعد پیری ضرور آتی ہے۔ اور اپنے دم قدم کے ساتھ ایک لمحہ میں دنیا کے نقشہ کو ردّ و بدل کر دیتی ہے کسی شے کو بھی اپنی ہیئت پر نہیں رہنے دیتی۔ زمانہ کی بساط منتشر ہو جاتی ہے۔ بنا بنایا کھیل بگڑ جاتا ہے۔ بڑے بڑے ملک بوس کاشانوں کو اس طرح ملیا میٹ کرتی ہے کہ صفحۂ ہستی پہ ان کا ایک نشان بھی باقی نہیں رہ جاتا ہے ازل سے یہی ہوتا آیا ہے اور ابدالآباد تک ایسا ہی ہوتا رہیگا

لوگوں کا خیال ہے کہ واجد علی شاہ کا آخری زمانہ نہایت عیش و عشرت کے ساتھ گزرا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاہانِ اودھ کی حکومت و سلطنت صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہوگئی۔

سلطانِ عالم حضرت واجد علی شاہ خاتمِ خاندانِ سلاطین اودھ نے ۱۰ ذیقعدہ ۱۲۳۹ھ کو پہر دن چڑھے اس دنیائے بے ثبات میں قدم رنجہ فرمایا۔ آپ کی تعلیم و تربیت شاہی اتالیق امداد حسین خاں سے ہوئی۔ بچپن ہی سے آپ کی طبیعت موسیقی کی طرف مائل تھی۔

ایک مرتبہ ان کی کسی بیگم سے لڑکا پیدا ہوا۔ شاہی وقت تھا۔ رقص و سرود سے طبیعت کو زیادہ انسیت تھی اس لئے اپنے فرزند کی پیدائش کی تقریب میں تمام شاہی دفاتر بند کروا دیئے اور رقص و سرود کا بازار گرم کرنے کا حکم دیا۔

حضرت امجد علی شاہ خلد آشیاں شرع کے پکے پابند تھے اپنے بیٹے کو بھی اسی رنگ میں دیکھنا چاہتے تھے لیکن انہیں علماء کی صحبت ذرا بھی راس نہ آئی۔ بلکہ عیاشی اور طرب و نشاط کی طرف زیادہ رجحان ہوا۔

آپ اپنے والد ماجد کی وفات کے بعد ۲۶ صفر ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۳ فروری ۱۸۴۷ء کو تخت نشین ہوئے۔ تاریخ جلوس یہ ہے۔ "مبارک مبارک ہو شاہانہ تاج"۔

واجد علی شاہ کی ابتدائی حکومت کا زمانہ اس عنوان سے ہوا کہ سواری کے آگے آگے دو نقرئی صندوقچے چلتے تھے۔ جن میں مستغیث کی عرضیاں ڈالی جاتی تھیں اور ان کی کنجیاں خاص بادشاہ کے پاس رہتی تھیں۔ ان عرضیوں پر اپنے ہاتھ سے احکام تحریر فرماتے۔ اور بادشاہ نے چند پلٹنیں اور سواروں کے رسالے بھرتی کرا کے ان کو وردی اور ہتھیار سے خوب سجا دیا تھا۔ ان رسالوں کے نام بادشاہ نے اپنی منشیانہ طباعی سے رکھا تھا۔ مثلاً بانکا، ترچھا، گھنگھور، اختری اور نادری، بعض اوقات ان رسالوں کے قواعد جا کر اور دھوپ میں کھڑے ہو کر ملاحظہ فرماتے۔ خوش ہو کر انعام و اکرام بھی عطا کرتے۔ اس کے علاوہ ان کے لئے فارسی زبان میں اصطلاحات و کلمات مقرر فرماتے۔ لیکن یہ مذاق زیادہ دن تک قائم نہ رہ سکا۔

ابھی پورے سال بھی نہ گزرا تھا کہ طبیعت اکتا گئی اور وہی پرانا مذاق پھر عود کر آیا۔ ان کی عیش پرستی کی ایک یادگار مشہور عشرت گاہ "قیصر باغ" ہے جس کا بقیہ حصہ اب تک گزشتہ شان و شوکت کی یاد دلاتا ہے۔ اس کی تعمیر ۱۸۴۸ء میں شروع ہوئی۔ اور ۱۸۵۰ء میں ختم ہوئی۔ اس کی وجہ تسمیہ بعض کتابوں میں یہ لکھی ہے کہ شاہانِ اودھ اپنی مہروں میں لفظ "قیصر" لکھا کرتے تھے۔ کیونکہ "قیصر" خطاب شاہ روم کا ہے۔ اور مسلمانوں میں بڑا نامی بادشاہ گزرا ہے اسی واسطے اس کا نام "قیصر باغ" ہو گیا۔

قیصر باغ میں سنگ مرمر کی نہر جو اب تک موجود ہے اس میں نہایت خوشنما بجرے پڑے ہوئے تھے۔ اس کی تعمیر میں کل اسّی لاکھ روپے صرف ہوئے تھے اور اس کے چاروں طرف کی عمارتوں میں جہاں پناہ کی بیگمات اور خواتین رہا کرتی تھیں

قیصر باغ میں اگست کے مہینہ میں جب کہ برسات کا موسم ہوتا تھا ایک جوگیا میلا لگا کرتا تھا۔ سب سے پہلے ۱۳ ذیقعدہ

۱۲۶۹ھ کو میلہ لگا۔ عالمان مجلسوں میں خود بادشاہ جوگیانہ لباس پہن کر شامل ہوتے۔ ان کی شرکت سے میلہ میں لوگ بھی چاند لگ جاتا اور رونق میں ایسا اضافہ ہوتا کہ اندازہ کرنا محال ہے۔ شاہی بھی گیروے رنگ کے کپڑے زیب تن کرتے جس کی وجہ سے ایک پُر لطف منظر معلوم ہوتا تھا۔ سفید پوش لوگوں کے لئے اس میلہ میں شریک ہونے کی اجازت نہ تھی۔ یہ جوگیانہ میلہ دو تین برس تک ہوتا رہا۔ تاریخ میلہ۔

بقیم باغ پھول سلطان عالم ✦ نمود میلہ رنگین و نادر

بئے تاریخ این فرخندہ جلسہ ✦ ندا آمد تماشا پُر افزائے خاطر

اس کے بعد اگر بادشاہ میں کوئی لطیف مذاق باقی تھا تو وہ شاعری تھی۔ لکھنؤ میں اس وقت شعرا کی تعداد اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ اگر تمام ہندوستان کے شعرا جمع کئے جاتے جب بھی لکھنؤ کے شعرا کی تعداد کو نہ پہنچ سکتے تھے۔ میرؔ اور سوداؔ کا زمانہ گزر چکا تھا۔ ناسخؔ و آتشؔ کا دور دورہ تھا اور ان کے ہم عہد رندؔ اور صباؔ بھی تھے۔ جن کے کلام نے روح پھونک دی تھی۔ چونکہ واجد علی شاہ خود شاعر تھے اسی لئے انہوں نے بھی اس میدان میں کافی حصہ لیا لیکن اساتذہ لکھنؤ کے خشک کلامی کے زبردست اثر پر حاوی نہ ہو سکے۔ سلام قطعہ رباعی مثنوی۔ غزل۔ قصیدہ الغرض ہر شاعری میں نمایاں حصہ لیا لیکن افسوس کہ مثنویوں کے سوا اور کسی شاعری کو حق قبولیت حاصل نہ ہوا۔ ان کے کلام میں رعایت لفظی زیادہ ہے اسی واسطے ان کی شاعری میں سوز و گداز کم معلوم ہوتا ہے۔ واجد علی شاہ اپنا تخلص اکثر اخترؔ اور کبھی واجدؔ رکھتے تھے۔ مثلاً۔

دے ملک مرا برائے حسنین
افزوں اس سے بھی فاتح بدر و حنین
شیعہ تیرے ہوں ہم رکاب واجدؔ
صاحب تشریف لائیں دل کو ہو چین،

(از رسالہ ایمان صفحہ ۲۳۹)

لیکن واجد علی شاہ ایک سچے اور بیباک شاعر تھے انہوں نے اپنی خفیہ باتیں بعنوان شباب کے عشق و عاشقی کے واقعات خانگی معاملات اس طرح صاف صاف لفظوں میں نہ صرف چند محرم راز لوگوں کو سنائے بلکہ اس کلام کو زیور طبع پہنا کر دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ آپ کا دربار شاعروں سے بھرا رہتا تھا۔

چنانچہ اسدؔ۔ خلقؔ۔ زکیؔ۔ درخشاںؔ۔ وغیرہ لکھنؤ کا شعر آپ کے دامن میں رہے اور زندگی بسر کی۔

سلطان عالم اخترؔ نے شاعری میں ایسی موزوں طبیعت پائی تھی کہ شاید ایسا موزوں طبع نہ دیکھا ہوگا۔ علامہ عبد الحلیم شررؔ نے "حزن اختری" کے دیباچہ صفحہ ۱۱ میں تحریر فرمایا ہے۔

"میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا کہ اپنے دائرہ دولت سلطان خانے سے ہوا پر سوار ہو کر امام باڑہ سبطین آباد کی مجلس میں شریک ہونے کے لئے روانہ ہوئے اور جو سلام یا مرثیہ وہاں پڑھیں گے انہیں راستہ میں تصنیف کر رہے ہیں۔ دو کاتب ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ ایک کو مرثیہ کے بند تصنیف کر کے لکھوا رہے ہیں اور دوسرے کو سلام کے اشعار۔ مرثیہ لکھنے والا جب تک مرثیہ کا بند بتایا ہوا لکھے سلام لکھنے والے کو سلام کا شعر بتا دیتے ہیں اور دونوں کو اس قدر جلد جلد بتاتے جاتے ہیں کہ ایک کا بھی قلم نہیں رُکنے پایا۔ امام باڑہ دو فرلانگ بھی نہ ہوگا۔ مگر وہاں تک پہنچتے پہنچتے پورا سلام اور مرثیہ کے چھ بند لکھوا دیتے۔ دو مختلف بحروں کا ایک ساتھ طبع آزمائی کرنا جس قدر دشوار امر ہے اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو شعر کہنے کی مشکلوں سے واقف ہیں"۔

سلطان عالم محض شاعر ہی نہ تھے بلکہ مصنف بھی تھے انہوں نے تقریباً چالیس کتابیں لکھی ہیں۔ جن کی تعداد مختصراً لکھی جاتی ہے۔

۶ دیوان۔ شیوۂ فیض۔ فخر مضمون۔ سخن اشرف۔ گلدستہ عاشقاں۔ اختر ملک۔ نظم ناموبر۔ متعدد مثنویاں۔ حزن اختر۔ بنی ناجود۔ دلہن در فن موسیقی۔ قصائد اردو فارسی۔ مباحثہ بین النفس والعقل۔ نصائح اختری۔ عشق نامہ۔ رسالہ ایمان۔ صوت المبارک۔ ہیبت حیدری۔ قصائد المبارک۔ جوہر عروض ارشاد خاقانی در عروض۔ دریائے التعشق۔ وغیرہ وغیرہ۔

اب آپ کی رباعیوں کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:۔

چوبیس طرح بحر ہزج کہتا ہوں ✦ ہر وقت رباعی میں پھنسا رہتا ہوں
کب صوم میں باقی ہیں حواس خمسہ ✦ دنیائے مسدس میں عبث پھنستا ہوں

وہ مور کو چاہیں تو سلیماں کر دیں
ذی عقل کو اک طفل دبستاں کر دیں

مجھ پہ نہیں عنزیزو! واللہ
جس کو چاہیں وہ دم بھر میں سلطاں کر دیں

دلدار موئے۔ شہر لٹا۔ گھر چھوٹا
نانا کا مزار۔ باپ کا در چھوٹا
مکان کی دہلیز، بھائی کا مکان
شبیر ہر اک جگہ سے منظر چھوٹا

مطبوع طبائع ہے کلامِ اختر
پہلا ہے قاف تک بھی نامِ اختر
یہ ملک نہیں مال نہیں جو چھن جائے اختر
اس مال کا حافظ ہے امامِ اختر

(از رسالہ ایمان)

درباروں اور دیگر مقربانِ شاہی کی ناقابلیت اور غفلت سے ملک میں بدنظمی روز بروز بڑھنے لگی۔ یہاں تک کہ محاصل میں بھی کمی واقع ہونے لگی! اور اس پر اسراف کی زیادتی نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ حکامِ انگلشیہ تاک لگائے بیٹھے ہی تھے فوراً ۳۱ جنوری ۱۸۵۶ء کو انتزاعِ سلطنت کا حکم سنا دیا اور ۷ فروری کو ملک اودھ جس کی آمدنی اس وقت دو کروڑ سے کم نہ تھی قابض و متصرف ہو کر پندرہ لاکھ روپیہ سالانہ سلطانِ عالم کے اخراجات کے لئے مقرر کر دیا ——— جب آپ اپنے عزیز وطن لکھنؤ کو وداع کر کے مٹیا برج کلکتہ جانے لگے تو اپنے محلوں اور عزیز و اقارب پر الوداعی نظریں ڈالتے ہوئے یہ شعر فرمایا ؎

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہلِ وطن! ہم تو سفر کرتے ہیں

زمانہ کے مصائب و نوائب سے آزردہ ہو کر اس سے مخاطب ہوتے ہیں اور کہتے ہیں ؎

لگا ٹھوکر نہ پائے ناز سے تو
کبھی تاجِ سرِ ہندوستاں تھے

کلکتہ کی زندگی کو پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

کلکتہ نے نابود کیا خواب۔ خوشی کو
پل بھر مجھے اس شہر میں غفلت نہیں رہتی

کلکتے کے آنسو میں رواں بہا گا رتی ہیں
غربت کو تاسف ہے مری بے وطنی سے

سلطانِ عالم میں شاعری ہی ایسا مذاق تھا جو ان کے پاس آخری عمر تک رہا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

ضعیفی میں بھی لپٹی ہے بلائے شاعری ہم سے
نہ چھوٹے گی کبھی اختر یہ ہم سے مشقِ طفلانہ

چنانچہ اپنی شاعری اور ملک و سلطنت کا موازنہ کرتے ہوئے طنزیہ کہا ہے ؎

یہ ملک نہیں مال نہیں جو چھن جائے اختر
اس مال کا حافظ ہے امامِ اختر

یہ تو "قمر مضمون" کے چند اشعار تھے۔ اب "دیوانِ مبارک" کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

فقیری فخرِ شاہاں ہے یہ قولِ احمد کا ہے اے دل
بڑا ہے تختِ سلطاں سے کہیں پایہ توکل کا

مہینوں سے ہوں میں جدا یار سے
ملے شکل مہجور بیمار سے
دکھا دے مجھے نرگسِ چشمِ یار
کہاں تک کروں وصل کا انتظار

اندھیرا ہوگا۔ ہوئیگا بے نور سارا شہر
اختر اگر تو اپنے وطن سے نکل گیا

"حزنِ اختری" کے اشعار پڑھ کر مٹیا برج کی زندگی کا منظر آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ کیا دردناک تصویر کھینچی ہے لکھتے ہیں ؎

رفیقوں نے چھوڑا اکیلا مجھے
سبھوں نے کوئیں میں ڈھکیلا مجھے
خبر تک نہیں اپنے احوال کی

توقع نہیں کچھ زر و مال کی
عیال اور اطفال لوٹے گئے
جہاں میں مرے لال لوٹے گئے
کوئی مضطرب ہے کوئی نالہ کش
کوئی پیٹتا ہے تو آتا ہے غش

آخری شعر ملاحظہ ہو ؎

نہ کھانے کا اسباب ہے کچھ نصیب
نہ پانی کا ہے ذکر ہے قریب

آپ کے وہ خطوط بھی مطالعہ کے قابل ہیں جو آپ نے کلکتہ سے اپنے اعزہ و احباب کے نام لکھے ہیں۔ اپنی غریب الوطنی۔ آشفتہ حالی و پریشانی کا تذکرہ آپ ایک خط میں یوں کرتے ہیں :۔

"اس وقت خود محل۔ دوسرا محل۔ سلطان جہاں بیگم تیسرا شہنشاہ محل۔ چوتھا امیر محل۔ پانچواں فخر محل معہ شاہزادہ قمر قدر بہادر۔ چھٹا چھتر محل۔ ساتواں امراؤ محل۔ آٹھواں شید المحل۔ یہ آٹھوں محل ساتھ عزت و آبرو کے ہیں چیف کمشنر بہادر کی طرف سے بہت کچھ اعزاز حاصل ہے اور صاحب عصمت ہیں۔ باقی تمام شاہزادیوں کی حالت ناگفتہ بہ۔ خدا دشمن کو بھی نصیب نہ کرے۔ نہ تن پر کپڑا ہے۔ نہ منہ کو روٹی۔ در بدر میں در بدر تباہ پھرتی رہیں۔ خدا جانے کہاں سے کہاں گئیں۔ اگر آپ یہاں کے کمشنر کو خط لکھ دیں تو یہ فلک زدہ فاقہ کش پرورش ہو جائیگی کیونکہ یہ غریب بے قصور و بے گناہ ہیں۔ کیا عجب کہ آپ کی تحریر سے پچاس پچاس روپیہ ماہوار معین ہو جائے۔"

مٹیا برج کلکتہ سے ایک دوسرے خط میں یوں تحریر کرتے ہیں :۔

"یاد رکھو دنیا ناپائدار ہے کسی سے دل نہ لگائیے۔ سو برس بھی اگر کوئی کسی پر فدا رہے وہ دم بھر میں چھوٹ جاتا ہے ؎

رہے سو برس بھی فدا ایک پر
وہ دم میں لیوے نہ اس کی خبر

چونکہ ہماری قسمت میں صدمہ پر صدمے اور رنج پر رنج لکھے ہوئے تھے ایک دن خبردار نے پرچہ دیا کہ آج خجستہ محل بارھویں ذیقعدہ کو مٹیا برج سے نکل گئی۔ وہ پندرہ برس سے میرے پاس تھی اب جعفری بیگم کی خالہ کے ہاں ہے۔ سنا ہے کہ پہلے لکھنؤ جائے گی۔ پھر وہاں سے کربلا جائے گی۔ سو روپیہ ماہوار ملتا تھا۔ میں نے ہرچند منت سماجت کی کچھ پذیرائی نہیں ہوئی غور کا مقام ہے۔ یہ دنیا کی بے وفائی کا نمونہ ہے۔ برے وقت میں کوئی کام نہیں آتا مصیبت میں کوئی صورت نہیں دکھاتا۔"

اسی آخری خط میں قید کی رہائی سے تمنا کرتے ہوئے ڈبڈبائی آنکھوں سے لکھتے ہیں :۔

"اے اللہ! نہ کوئی قصور ہے۔ نہ خونی ہے۔ نہ رہزن ہے۔ نہ ٹھگ ہے۔ نہ ڈاکہ زن ہے۔ اوچکا نہیں ہے۔ گرہ کٹ نہیں قمار باز نہیں۔ جواری نہیں ہے۔ اب رحم کر بحق محمد و علی و فاطمہ حسن و حسین۔ زین العابدین۔ امام باقر جعفر امام رضی موسیٰ۔ کاظم تقی۔ علی نقی۔ حسن عسکری، امام مہدی کی فضل سے مجھ کو قید سے رہائی دے !!!"

مامتا اور وطن

ڈراما

از جناب ظفر واسطی شاہ آبادی

افراد (ماں ۔ بیٹا۔ دو روحیں)

(فرانس کے ایک قصبہ کے ایک مکان میں ماں اور بیٹا باتیں کر رہے ہیں)

بیٹا۔ "امی اب میں آپ کی ایک نہ سنوں گا۔ اب مجھ سے یہ برداشت نہیں ہو سکتا کہ اپنے بھائیوں کی خونیں داستان پڑھوں یا سنوں اور خاموش رہوں"۔

ماں۔ (نرمی سے) "تم مجھے کب تک انگاروں میں دھکیلتے رہوگے"

بیٹا۔ میں اندھی ہوں نہ بہری، میں بھی دیکھتی ہوں اور سنتی ہوں کہ ہمارے ہم وطنوں پر کتنا ظلم و ستم کیا جا رہا ہے"۔

بیٹا۔ "پھر آپ مجھے لڑائی پر کیوں نہیں جانے دیتیں"؟

ماں۔ "میں بھی یہی سوچتی ہوں ——— (درد بھری آواز میں) اے خدا ———"

بیٹا۔ (بات کاٹ کر) "امی آپ اس کا خیال نہ کیجئے کہ میں عمر میں چھوٹا ہوں۔ آپ اس کا بھی خیال نہ کیجئے کہ میں کمزور رہوں اور بیمار رہتا ہوں اور آپ اس کا بھی خیال نہ کیجئے کہ میں آپ کا اکلوتا لڑکا ہوں ——— میری رگ رگ میں نوجوانی کا خون کھول رہا ہے۔ میرے رونگٹے رونگٹے سے انتقام کی آگ بھڑک رہی ہے مجھے جانے دیجئے۔ دشمن روز بروز ہمارے ملک میں بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ (جوش سے) میں ان کی فتح کو شکست میں تبدیل کر دینا چاہتا ہوں"۔

ماں۔ "میرے نادان بیٹے جب دشمن لاکھوں کی فوج سے نہ روکا جا سکا تو تم اکیلے کیا کر لوگے"۔

بیٹا۔ "میں اکیلا نہیں ہوں گا۔ میرے ساتھ خدا ہوگا۔ کیونکہ میں حق کی حمایت میں لڑنے جاؤں گا! اور اس کے علاوہ میں بھی ان لاکھوں ہی میں مل جاؤں گا۔ قطرہ دریا میں مل کر دریا بن جاتا ہے اور دریا سمندر میں مل کر سمندر۔ دراصل سمندر کیا ہے؟ پانی کے بے شمار قطروں کا مجموعہ (لجاجت سے) امی مجھے جانے دیجئے۔ (ذرا جوش سے) میں ضرور جاؤں گا"۔

ماں۔ (نصیحت آمیز لہجہ میں) "تمہیں وطن کا تو اتنا خیال آتا ہے مگر اپنی ماں کا خیال نہیں آتا۔ تمہارے بغیر میرا کیا حال ہو جائیگا نہیں نہیں میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔ (پر جذبات آواز میں) میں تمہیں موت کے منہ میں جانے کی اجازت نہیں دے سکتی"۔

بیٹا۔ "موت کے منہ میں؟ (ہنستا ہے) اگر ہر ایک ماں اپنے لڑکے کو اسی طرح موت کے منہ میں جانے سے روک لے تو وطن کی طرف سے کون لڑنے جائے گا۔ یہ موت زندگی سے اچھی ہے امی!"

ماں۔ (ذرا تنک کر) "زندگی سے اچھی ہے یا بری لیکن میں تمہیں نہیں جانے دوں گی"۔

بیٹا۔ (ذرا جوش میں آکر) "آپ اور اتنی بزدل! مجھے آپ کو امی کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ میری زندگی تو اتنی پیاری ہے آپ کو لیکن ان نوجوانوں کا خیال نہیں آتا جو دن رات آگ۔ بارود اور موت سے کھیل رہے ہیں۔ کیا ان کے مائیں نہیں ہیں۔ یا کیا ان ماؤں کے دلوں میں محبت نہیں ہے"۔

ماں۔ (غمگین آواز میں) "میں اور بزدل! کیا کہہ رہے ہو بیٹا۔ میں نے تمہارے پاپا کو لڑائی پر جانے سے نہیں روکا لڈ جب ان کے مارے جانے کی خبر آئی تو رو ئی بھی نہیں۔ میں خوش تھی کہ میرا عزیز شوہر مادر وطن پر قربان ہو گیا پھر میں نے تمہارے بڑے بھائی کو میدان جنگ میں بھیج دیا۔ اور تمہیں یاد ہوگا۔ کہ اس کی موت کی خبر پر بھی میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے مجھے سرخرو کر دیا۔ میں قوم اور وطن کے

لئے دو قربانیاں دے چکی ہوں اب تم مجھ سے اور کیا چاہتے ہو؟"

بیٹا۔ (خوشامدانہ) "میں چاہتا ہوں کہ آپ میری بھی قربانی دیں۔"

ماں۔ (کمزور اور دبے جذبات آواز میں) "یہ نہیں ہو سکتا۔ بیٹا اب میرے کمزور اور زخمی دل پر اور زیادہ زخم لگانے کی کوشش نہ کرو (اور زیادہ نحیف آواز میں) دیکھو ـــــ مجھے چکر آنے لگا۔"

(گرنے کی آواز آتی ہے)

بیٹا۔ (پریشان ہوکر) "امی! امی!! بے ہوش ہوگئیں؟"

{انہیں اٹھاکر پلنگ پر لٹانے کی آواز}

{گھنٹی بجانے کی آواز}

"خادمہ کہاں مرگئی؟ (پھر خود ہی) آج اس کی چھٹی کا دن ہے!"

{باہر جانے کی آواز}

{ماں کمرے میں اکیلی بے ہوش پڑی ہے۔ لڑکا ڈاکٹر کو بلانے گیا ہے}

{کروٹ بدلنے کی آواز}

ماں (ہلکی آواز میں) "میرے قریب آؤ بیٹا ـــــ میں تمہیں دیکھنے کو ترس گئی۔ (درد سے) اوئی اللہ تمہارے سینہ پہ کتنا گہرا زخم ہے۔ یہاں آؤ لاؤ میں اسے دھوکر مرہم پٹی کردوں۔ تم بولتے کیوں نہیں ـــــ مجھے لوگوں نے غلط بتایا تھا کہ تم ـــــ تم مسیح کے پاس چلے گئے لیکن خدا کا شکر ہے کہ تم زندہ ہو ـــــ اچھا تم میرے پاس نہیں آتے تو میں تمہارے پاس آتی ہوں۔ شاید تم زخم کی وجہ سے چل نہیں سکتے۔ بیٹا!"

آواز۔ (جذبات سے خالی) "آپ مجھے بیٹا کیوں کہتی ہیں۔ آپ کون ہیں؟"

ماں۔ "مجھے نہیں پہچانتے تم؟ میں تمہاری پیاری ماں ہوں بیٹا۔"

آواز۔ "آپ میری ماں نہیں ہوسکتیں۔ میری ماں نے تو بڑے شوق سے مجھے وطن پر قربان ہونے کے لئے بھیجا تھا۔ آپ ان کی کیا ریس کریں گی۔ آپ تو اپنے لڑکے کو چوڑیاں پہنا کر گھر میں بٹھانا چاہتی ہیں۔"

ماں (نرمی سے) "تم مجھ سے اس بات پہ ناراض ہو بیٹا۔ میری مصیبت اور مجبوری بھی تو دیکھو!"

آواز۔ "آپ مجھے بیٹا کہہ کر نہ بلائیے۔ آپ کو اپنے چھوٹے لڑکے سے محبت ہے اسے ہی بیٹا کہئے اور اسی سے محبت کئے جائیے (جوش میں) آپ کی بلا سے میرے سینے میں کتنا گہرا زخم آیا ہے۔ آپ کی بلا سے ہمارے ملک پر کتنی مصیبتیں آرہی ہیں۔ آپ کی بلا سے کہ ہم دائمی غلامی کی مصیبت میں گرفتار ہونے والے ہیں آپ اس سے محبت کئے جائیے۔"

ماں (حیرت اور رنج سے) "یہ کس زبان میں باتیں کر رہے ہو بیٹا میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔"

آواز۔ "اسی زبان میں جو آپ بول رہی ہیں۔ وہ آپ کی سمجھ میں کیوں آئے گا۔ آپ کی سمجھ پر تو ممتا نے قبضہ کر رکھا ہے۔"

ماں۔ "مجھے اپنے ملک سے کیا کم محبت ہے؟"

آواز۔ "اگر ملک سے محبت ہے تو اسے فوراً محاذ پر بھیج دیجئے۔ اور اپنی ممتا خیال نہ کیجئے۔"

ماں۔ "ممتا کا خیال نہ کروں؟ وہ بھی لڑائی پر جانے کے بعد تمہار ہی جیسا ہو جائے گا۔ جاکر واپس آنے کا نام نہ لیگا اور واپس آئے گا۔ تو کہے گا۔ آپ کون ہیں۔ آپ میری ماں نہیں ہوسکتیں ـــــ چلے گئے؟ (بے تاب ہوکر) بیٹا بیٹا آکر مجھے نصیحتیں کرو میں تمہارے چھوٹے بھائی کو لڑائی پر نہیں بھیج رہی ہوں۔ آہ ـــــ"

{دو چار لمحوں کا وقفہ۔ پھر کروٹ لینے کی آواز}

(پھر بولتی ہے) "کون ـــــ ڈارلنگ تم ـــــ تم یہاں کہاں ـــــ کیا باپ بیٹا ایک ساتھ آئے تھے پھر وہ کہاں چلا گیا۔ آؤ۔ تمہارے اس جیسا کوئی گہرا زخم نہیں آیا۔ یہ حکومت کو کیا سوجھی تھی کہ مجھے تم دونوں کی موت کی خبر لکھ بھیجی۔ تم تو زندہ ہو۔ ڈارلنگ تم بولتے کیوں نہیں"

آواز۔ (نفرت کے لہجہ میں) "مجھے ڈارلنگ نہ کہو مجھے تم سے بات کرنے میں عار آتی ہے۔ جس ملک کے لئے میں نے اتنے فخر سے اپنی جان دی تم اسی ملک کے لئے میرے بیٹے کو میری پیروی کرنے سے منع کرتی ہو۔ وطن کی خدمت کرنے سے باز رکھتی ہو۔"

ماں۔ (طنزاً) "تمہارے بیٹے کو گویا وہ میرا بیٹا نہیں۔"

آواز۔ (اسی لہجہ میں) "ہاں میرے بیٹے کہ وہ میرا بھی بیٹا ہے

جو وطن پر قربان ہونے کے لئے اتنا بے تاب ہے۔"

ماں۔ "تمہارے بیٹے کو تو میں نے تمہارے بعد تمہارے پاس بھیج دیا تھا۔ وہ میرا بیٹا ہے اُسے میں اپنے پاس رکھنا چاہتی ہوں۔"

آواز (بلکے سے غصے کے ساتھ) "اپنی امتا کو وطن کی محبت پر ترجیح نہ دو۔ یہ بزدلوں کا کام ہے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اب تمہیں کیا ہو گا۔ تم جو اتنی بڑھ بڑھ کر جب وطن کی باتیں کرتی تھیں۔ تم جو ہمارے جذبات میں جوش اور ہمارے دلوں میں دشمن کی نفرت پیدا کرتی تھیں۔ اب تمہیں کیا ہو گیا؟"

ماں۔ "لیکن تم نے یہ بھی سوچا کہ میں دو قربانیاں دے چکی"

آواز۔ "تم دو قربانیوں کو لئے پھرتی ہو۔ اگر میرے بیس بیٹے ہوتے تو میں بیسوں کے بیسوں کو فرانس پر قربان کر دیتا لیکن اس کی آزادی پر آنچ نہ آنے دیتا۔"

ماں (پر درد آواز میں) "لیکن ڈارلنگ ——"

آواز (بات کاٹ کر طنزاً) "تم اس کی موت سے ڈرتی ہو —— لیکن موت ضرور آنی ہے اور کسی کو کیا خبر کہ کب آ جائے۔ ممکن ہے وہ بازار جائے اور کسی کار کے نیچے آ کر مر جائے یا اسی طرح کی ہزاروں باتیں ہو سکتی ہیں تم اسے لڑائی پہ جانے سے روک سکتی ہو لیکن مرنے سے نہیں روک سکتیں۔"

ماں (اسی درد بھری آواز میں) "کاش تم میری جگہ ہوتے اور میرے جذبات سمجھتے۔"

آواز۔ "ان جذبات کو وطن کی محبت میں تبدیل کر ڈالو اور پھر دیکھو کہ تمہیں لڑکے کی زندگی کا خیال آتا ہے یا نہیں۔"

ماں (جلدی سے) "ڈارلنگ! ڈارلنگ! سنو تو سہی"

(لڑکا ڈاکٹر کو لے آتا ہے تو دیکھتا ہے ماں بندوق لئے دروازے کی شست باندھے کھڑی ہے۔ بال پریشان ہیں آنکھوں سے وحشت برس رہی ہے۔)

بیٹا۔ (گھبرا کر) "امی! امی!! یہ آپ کو کیا ہو گیا (ڈاکٹر سے) ڈاکٹر صاحب آپ ابھی ٹھہریئے مبادا یہ فائر کر دیں۔"

ماں (پرسکون آواز میں) "مجھے کچھ نہیں ہوا۔ تم ڈاکٹر کو لائے ہو۔ انہیں واپس بھیج دو میں بالکل تندرست ہوں۔"

بیٹا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں نے بے کار ضد کر کے آپ کے دماغ کو صدمہ پہنچایا لیکن اب میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ اب میں لڑائی پر نہیں جاؤں گا۔"

ماں (غصے سے دانت پیستے ہوئے) "ارادہ بدل دیا ہے۔ لڑائی پہ نہیں جاؤ گے۔ بزدل نہ بنو۔ یہ بندوق لو اور جا کر فوج میں بھرتی ہو جاؤ۔"

بیٹا۔ "آپ یہاں اکیلی رہ جائیں گی۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی خدمت کروں۔"

ماں۔ "اور میں چاہتی ہوں کہ وطن کی آزادی کے لئے تمہاری قربانی دے دوں۔"

بیٹا۔ "آپ بڑے لڑکے کی قربانی تو دے چکیں۔"

ماں۔ "میں زیادہ باتیں نہیں سننا چاہتی۔"

بیٹا۔ "امی!"

ماں۔ "بیٹا دیر نہ کرو۔ تمہارے باپ اور بھائی کی روحیں بلا رہی تھیں۔ یہ بندوق لو اور جاؤ۔ خدا تمہاری مدد کرے گا۔"

مسکرا کے پی

تھوڑی سی اسکے نام کی پہلے گرا کے پی

از حضرت محمود اسرائیلی

کیا پی جو گھر میں بیٹھ کے تو نے چھپا کے پی
ہم مشربوں کو ساتھ لے انکو ملا کے پی

ساقی کی چشمِ مست سے نظریں بچا کے پی
مہمانیٔ رند شیخ نے پانی بنا کے پی

کوثر سے کھینچ کے آئی ہو زاہد ترے لئے
قبلہ کی سمت بیٹھ کے گھر میں خدا کے پی

دو ایک گھونٹ جام میں پینے سے فائدہ؟
پینا ہی ہو تو خم کو اٹھا منہ لگا کے پی

یہ بزم مے ہے اور ترا امتحان ہے
جو جام تلخ آئے اُسے مُسکرا کے پی

ساقی کے در سے سب کو ملی مے بقدر ظرف
ساغر میں پی کسی نے صبوحی اُٹھا کے پی

میخوار و شیخ رندی و مستی میں ایک ہیں
اِک نے چھپا کے ایک نے ساغر دکھا کے پی

ہوتا ہے کیف بادۂ رنگیں بقدرِ شوق
ساغر کو قدح، قدح کو مینا بنا کے پی

ساقیٔ دلنواز کے قربان جائیے
میخانہ مجھکو سونپ دیا خم اُٹھا کے پی

تو جانتا ہے شیخ کی نیت خراب ہے
تھوڑی سی اسکے نام کی پہلے گرا کے پی

وہ رند لم یزل ہوں کہ بے مے گزر نہیں
میخانے سے نہ آئی تو کوثر سے لا کے پی

ہو گی نہ صرف بادہ سے تکمیلِ کیفِ عشق
محمود دل کے جام میں کچھ حسن ملا کے پی

حبابہ کی داستانِ عشق

تاریخی رومان

از جناب محمود ملیپانوی

مشیّت نے عورت کی فطرت میں ایسے عناصر پنہاں رکھے ہیں کہ جب وہ بروئے کار آتے ہیں، تو اُس کی ہستی مجسم خلاق بن جاتی ہے۔ علیل و مریض قومیں اُس کے فیضِ مسیحائی سے اَوجِ ترقی پر گامزن ہو جاتی ہیں۔ ملکوں کے نقشے بدل جاتے ہیں، ملتوں کی قسمتیں پلٹ جاتی ہیں اور تاریخ میں ایک ایسے باب کا اضافہ ہو جاتا ہے، جسے آنے والی نسلیں ہمیشہ عزت و احترام کے ساتھ مطالعہ کرتی ہیں۔ یہ سب کچھ ہے، مگر عورت کی ذات میں کردگارِ حقیقی نے وہ جوہر چھپا رکھا ہے کہ مرد باوجود سطوت و جبروت کے اُس کے سامنے اپنے تمام ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ دنیا و جہاں کو مطیع کرنے والا خود کسی پیکرِ نسوانیت کا مطیع و فرمانبردار ہو جاتا ہے۔ مغرور و سرکش انسانوں کے سر اپنی دہلیز پر جھکانے والا، عورت کے آستانۂ حسن پر سربسجود ہو جاتا ہے۔ اپنے ہمجنسوں کی قسمتوں کا مالک اپنی قسمت ایک حسینہ کے آئینۂ ناز میں دیکھنے لگتا ہے۔ الغرض مرد عورت کے سحرِ حُسن سے مسحور ہو کر پھر عجز و نیاز کا خلعت پہن لیتا ہے۔ ایسی عورتیں جنہوں نے عظیم المرتبت مردوں کی زندگیوں میں انقلاب پیدا کئے، خال خال ہوئی ہیں۔ انہی عجیب و غریب عورتوں میں سے ایک حبابہ ہے۔ اس ساحرۂ حسن و موسیقی کی داستان خاندانِ بنی اُمیّہ کی تاریخ سے تعلق رکھتی ہے ؎

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیرِ اُمم کیا ہے

شمشیر و سناں اوّل، طاؤس و رباب آخر

حضرت عمرؓ بن عبد العزیز جو خاندانِ امیہ میں سب سے نیک اور بہترین خلیفہ ہو گذرے ہیں۔ اُن کے عہدِ خلافت کے ابتدائی ایام میں ایک یہ دی الاصل خاندان مصر سے آ کر دمشق میں آباد ہوا۔ اسلامی دار السلطنت میں آنے کے ایک سال بعد حبابہ پیدا ہوئی۔ حبابہ کی والدہ ایک مشہور و معروف مغنیہ تھی اور اُسکا باپ مصوّر تھا۔ دمشق آتے ہی وہ مشرف باسلام ہوئے۔ خوش قسمتی سے حبابہ کے والد کو دربارِ خلافت میں ایک معمولی سی آسامی بھی مل گئی۔ اگرچہ یہ لوگ مسلمان ہو چکے تھے، مگر ابھی تک آبائی تمدن کا رنگ نہ بدلا تھا۔ گھر کا ساز و سامان اُسی وضع کا تھا۔ حضرت عمرؓ بن عبد العزیزؒ کے پیشرو اموی خلفاء سب کے سب رنگین مزاج تھے۔ اُن کے عہد میں اسلامی تمدن بھی فنونِ لطیفہ کا اچھا خاصا گہوارہ بن چکا تھا۔ اِس نیک نہاد حکمران نے اپنی سیرت اور اخلاق سے رعایا کو عہدِ راشدین کے سانچے میں ڈھالنے کی سعی کی۔ مگر طبائع چونکہ نئی نئی چیزوں کی خوگر ہو چکی تھیں، اس لئے اگرچہ فنونِ مذکورہ بالا کو مزید ترقی تو نہ ہوئی، مگر ان کے اثرات بدستور قائم رہے۔ حبابہ ایامِ طفلی میں ہی بوجہ تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنی والدہ سے فنِ موسیقی بھی سیکھتی رہی۔ قدرت نے اس کی آواز میں وہ اثر رکھا تھا کہ جہاں چند اشعار مترنم آواز سے پڑھ دیتی، لوگ عش عش کر اُٹھتے اور محفل کی محفل دم بخود ہو جاتی ؎

یہ کوئی چھوٹی سی بجلی تھی کہ جس کو آسماں

کر رہا تھا خرمنِ اسلام کی خاطر جواں

آہستہ آہستہ ان لوگوں کے مراسم شرفاءِ دمشق سے بڑھنے لگے حتیٰ کہ شاہی گھرانوں میں بھی آنا جانا ہو گیا۔ سب سے زیادہ تعلقات خلیفۂ وقت کے چچا اور جانشین یزید بن ولید سے قائم ہوئے۔ یزید فطرتاً رنگین مزاج تھا اور اُسے شعر و موسیقی کا خود شوق تھا۔ عمر بھی زیادہ نہ تھی۔ حبابہ ان دنوں چودہ سال کی تھی اور اکثر والدہ کے ہمراہ یزید کے محل میں آیا کرتی تھی۔ جوانی کا اُبھار، صورت و سیرت کی پاکیزگی، بچپن کی شوخیاں اور ان سب پر طرّہ حسنِ صوت۔ یزید نے اسے دیکھا اور دیکھتے ہی اس کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہو گیا۔ دل ہی دل میں اس نادرِ روزگار مرقعِ حسن پر فریفتہ ہو رہا تھا، مگر فاروقِ ثانی کے عہد میں اُسے یہ جرأت نہ ہو سکی کہ اسے اپنے حرم میں لے آئے۔ پھر بھی جتنی عنایت اُس کے خاندان پر کر سکتا تھا، کرتا رہا۔

اموین حضرت عمرؓ بن عبد العزیز کو اپنی ذاتی وجاہت و حکومت کی راہ میں ایک روڑا سمجھتے تھے۔ اس لئے کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح اُن سے چھٹکارا حاصل کریں۔ آخرکار ان کی ملعون کوششیں بار آور ہوئیں اور اِس فرشتہ سیرت تاجدار کو زہر دیا گیا، جو ان کی وفات کا باعث ہوا۔ خاندانِ امیہ کا خیال تھا کہ ان کی وفات سے وہ پھر پہلے کی طرح آزادی سے اپنے لئے عیش کے سامان فراہم کر سکیں گے۔ مگر یہ کارروائی ان کے زوال کے سلسلہ کی سب سے اہم کڑی تھی۔ ان کی رحلت کے ساتھ ہی پُرانے جھگڑے اور سوئے ہوئے فتنے ازسرِنو بیدار ہو گئے۔ یزید، سلیمان کی وصیت کے مطابق سریر آرائے خلافت ہوا، جہاں اس نے فتنہ و فساد کی بجھی ہوئی چنگاریوں کو سُلگایا، وہاں ساتھ ہی اپنی بساط سے بڑھ کر داد عیش بھی

دی۔ اور اوّلیں فرصت میں حبابہ کو حرم میں داخل کیا اور اس کے ہمراہ اس کی ایک اور رشتہ دار سلّامہ کو بھی شرفِ قبولیت بخشا۔ جنگل خانہ جنگیوں نے زور پکڑا۔ شاہی خاندان کے افراد اپنے لئے جاگیریں اور املاک فراہم کرنے لگے۔ خوارج نے پھر سر اٹھایا۔ یزید بن مہلب نے قید سے بھاگ کر بغاوت کا علم بلند کیا اور عباسیوں نے ایک نئی دارالسلطنت کی طرح ڈال دی۔ یہ سب کچھ ہو رہا تھا، مگر خلیفہ وقت کو کسی بات کی پرواہ نہ تھی۔ اس کے پاس امورِ سلطنت کے لئے وقت ہی نہ تھا۔ اگر کسی وقت اہل خاندان یا اراکینِ خلافت کوئی تشویشناک خبر خلافت پناہ کے کانوں تک پہنچانے میں کامیاب بھی ہو جاتے تو حبابہ اور سلّامہ کا ایک ہی سحر آفریں نغمہ اُسے یزید کے ذہن سے کافور کر دیتا ؎

تجھے کیا دورِ گل ہے یا زمانِ خار ہے ساقی!
تو خود اپنی جگہ اک دولتِ بیدار ہے ساقی

حبابہ اگر چاہتی۔ تو یزید کو ایک قابل ترین حکمران بنا دیتی، مگر اس نے ایک مغنیہ کا دودھ پیا تھا۔ ایک آرٹسٹ کے گھر میں جنم لیا تھا اور ایسے گھرانے میں پرورش پائی تھی۔ جہاں عیش و طرب کے سوا زندگی کا کوئی مفہوم ہی نہ تھا۔ وہ راگ رنگ اور عیش و طرب ہی کو منتہائے حیات جانتی تھی۔ گویا وہ غنا و موسیقی کی دیوی تھی۔ جو اپنے پجاری کو کسی اور فعل کی اجازت نہ دیتی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ جس قدر انسان بڑا ہوتا ہے، اسی قدر اس کی ذمہ داریاں گراں ہوتی ہیں اور جس قدر ذمہ داریاں گراں ہوتی ہیں۔ اسیقدر اُسے مصائب سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور جس قدر مصائب سے دوچار ہونا پڑتا ہے، اُتنا ہی وہ چوکس و ہوشیار ہو جاتا ہے۔ مگر یزید کے معاملہ میں قدرت نے استثناء سے کام لیا۔ وہ اس وقت دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کا مختارِ مطلق تھا اور ایک ایسی ہستی کے بعد سریر آرائے سلطنت ہوا تھا۔ جس کی آنکھیں ہمیشہ اپنی ذمہ داریوں کے احساس سے نم آلود رہتی تھیں۔ اس تاریخی واقعہ سے ظاہر ہے کہ یہاں فطرت کے اپنے تراشیدہ شاہکار اور مسلمہ اصول میں تصادم تھا اور انجام کار "حُبّ جمیل" کی نصِ قرآنی نے فیصلہ شاہکار کے حق میں دیا۔ اور قدرت کو اپنا اصول پسِ پشت ڈالنا پڑا۔

یزید، حبابہ کے زاہد فریب حسن و نغمہ سنجی میں اس قدر مستغرق ہوا کہ رفتہ رفتہ سیاسی امور کے ہمراہ مذہبی امور سے بھی کنارہ کش ہو گیا۔ اب تک جمعہ کی نماز کی امامت خلفاء خود فرمایا کرتے تھے، مگر اسے حبابہ کی مفارقت اس قلیل عرصہ کے لئے بھی گوارا نہ تھی۔ وہ کونین کی نعمتوں کا خلاصہ اس قتالۂ جہاں کے وجود ہی کو تصور کرتا تھا۔

جب حالات زیادہ، بدتر صورت اختیار کرنے لگے، تو ایک روز یزید کے بھائی مسلمہ نے حبابہ کی عدم موجودگی میں یزید سے کہا "تمہیں معلوم ہے کہ تم کس کی مسند پر بیٹھے ہو۔ کس قدر مخلوق کا رزق اور جان و مال تم سے وابستہ ہیں۔ قیامت کے دن خدا و رسول کے سامنے کونسا منہ لیکر جاؤ گے۔ تم ایک ایسے شخص کے بعد تختِ خلافت پر بیٹھے ہو، جو خلقِ خدا کی ضروریات اور حاجات کو اپنی حاجتوں اور ضرورتوں پر مقدم سمجھتا تھا۔ آج تمہاری عیش پرستی سے خلافت اسلامی کا سفینہ ہچکولے کھا رہا ہے۔ رعایا بھوکوں مر رہی ہے۔ امن مفقود ہے اور وقت قریب ہے کہ تمہاری عیش کوشی تمام عالم اسلام کو اور خصوصاً خاندان بنی امیہ کو تباہ و برباد کر دے۔ خدارا ان حسین صورتوں سے اجتناب کرو۔ اور منجدھار میں پھنسی ہوئی کشتی کو سنبھالو۔"

بھائی کے الفاظ چونکہ درد بھرے دل سے نکلے تھے، اس لئے بیکار نہ گئے۔ یزید کو غیرت آئی۔ بھائی کے سامنے قسم کھائی۔ کہ اب حبابہ اور سلّامہ سے تو نگا تک نہیں اور جملہ امورِ خلافت بذاتِ خود سرانجام دونگا۔ مسلمہ اپنا فرض پورا کر کے رخصت ہوا اور یزید اپنے آپ کو سنبھال کر بیٹھ گیا۔ ایک خادم کو بلایا اور حکم دیا کہ حبابہ سے کہہ دو کہ وہ اور سلّامہ بارگاہِ خلافت میں نہیں آ سکتیں۔ خادم نے امیر المومنین کا حکم دونوں کو جا سنایا۔ حبابہ پر ایک بجلی گر پڑی۔ بہتیرے جتن کئے، مگر کوئی کارگر نہ ہوا۔ روئی، گڑگڑائی، دعائیں کیں، مگر شرف باریابی نہ نصیب ہوا۔ اگر وہ کسی عرب گھرانے سے ہوتی، تو شائد اس صدمہ کی برداشت کی تاب نہ لا سکتی، مگر دودھ کا اثر اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ ہمت نہ ہاری کوشش میں لگی رہی۔

یزید دل کو کڑا کر کے انتظام و انصرام سلطنت میں لگ گیا۔ ان چند ایام میں جو امور اس کے حضور پیش ہوئے، ان میں ایک درخواست فاطمہ بنت حسینؓ کی بھی تھی جس میں آپ نے مدینہ کے گورنر کی شکایت کی تھی جو آپ کو جبراً نکاح کے لئے مجبور کرتا تھا۔ آپ کے انکار پر ظالم نے آپ کو اور آپ کے خاندان کو طرح طرح کی دھمکیاں دینی شروع کیں۔ یزید نے فوراً اسی درخواست پر گورنر مذکور کی معزولی کا حکم اپنے ہاتھ سے لکھا اور اس کے لئے عبرتناک سزا تجویز کی۔ مشیت کو شائد اس شخص سے یہی کام لینا تھا۔ جمعہ کا دن قریب تھا۔ حبابہ نے ایک لونڈی سے کہا کہ جب امیر المؤمنین نماز جمعہ کے لئے تشریف لے جانے لگیں، تو مجھے بتانا چنانچہ وہ راستہ میں کھڑی ہو گئی اور جب یزید مسجد کو روانہ ہوا، تو سامنے آ گئی اور نہایت رقت انگیز انداز سے یہ دو شعر پڑھے

؎ الا لا تلمہ الیوم ان یعبلدا
فقد غلب المحزون ان یتجلدا
فما العیش الا ما تلذ وتشتہی
وان لام فیہ ذو الشنان وفندا

(ترجمہ، خبردار آج سے اس کے تجاہل پر ملامت نہ کیجو، کیونکہ غمگین پہ کا"

مختلف سے صبر کرنا غالب آرہا ہے۔ عیش تو صرف وہی ہے جو تجھے لذیذ معلوم ہو اور جس کی تجھے خواہش ہو، اگرچہ کینہ ور اس کے لئے ملامت کرے اور بیوقوف بنائے۔

غم سے حبابہ کے چہرے پر زردی سی چھائی ہوئی تھی اور وہ ہلکا گلابی رنگ کا ملبوس زیبِ تن کئے تھی جس سے عطر و حنا کی خوشبو آرہی تھی۔ رنج کے باعث آواز میں وہ سوز پیدا ہو گیا تھا، جو خلیفۂ وقت کے دل کو چیرتا ہوا اس کی گہرائیوں تک اُتر گیا۔ عشق کی آگ اس طرح بھڑکی کہ والئ دمشق اس کے شعلوں کی تاب نہ لا سکا۔ مسجد کا راستہ بھول گیا اور رُخ کعبہ کی بجائے حبابہ کے صنم خانہ کی جانب پھر گیا۔ نمازِ خدا نمازِ مجازی بن کر رہ گئی۔ بیتاب ہو کر حبابہ سے لپٹ گیا اور نہ معلوم کہ خلوت گاہ تک کیسے پہنچا۔ نمازِ جمعہ کسی اور نے پڑھائی۔ مگر خلیفۂ اسلام آج سے پھر حبابہ کے آستانے پر سجدے کرنے لگا۔

وقت گذرتا گیا اور حبابہ کی گرفت خلیفہ کے دل پر سخت ہوتی گئی۔ شبابِ خدا۔ اللہ کا سایہ حبابہ کے سایہ کا محتاج تھا۔ لیکن الاغاز لا انجام کا آخر وقت آیا کہ مشیت کے جن ہاتھوں نے اس مجموعۂ روزگار حسینہ کو بنایا تھا، ان کو پھر حرکت ہوئی اور اس کی تخریب کا وقت قریب آگیا۔ کہا جاتا ہے کہ سلمیٰ نے جوشش رقابت میں حبابہ کو کوئی ایسا زہر کھلا دیا جس سے آہستہ آہستہ اس کی صحت خراب ہونے لگی۔ یزید اُسے مرض جان کر علاج کرواتا رہا اور تمام شاہی طبیبوں سے استصواب رائے کی۔ جملہ ولایات کے گورنروں کو خط لکھ کر طبیب بلائے، مگر یہ مسلمہ کی گرفت نہ تھی، جو محض زبانی بات چیت تک محدود رہتی۔ یہ یزید اور حبابہ کے خالق کی گرفت تھی، جو بالآخر اس مشہور و معروف حسینہ کو لیکر گئی۔ خلیفہ کو اس کی موت کا اس قدر رنج ہوا کہ متواتر تین دن تک اس کی نعش کو گود میں لئے بیٹھا رہا اور رویا کیا۔ آخر جب اُس دلفریب پیکر سے تعفن کی بُو آنے لگی اور اہلِ خاندان نے لعنت ملامت کی، تب دفنانے کی اجازت دی۔

حبابہ کی وفات کو ابھی ایک عشرہ بھی نہ ہوا تھا کہ اس کے رنج میں یہ عجیب الخلقت خلیفہ بھی یہ کہتا ہوا اس جہان سے عالمِ بالا کی جانب سفر کر گیا۔

ے رونۂ تلخ زیست کو اب حکمِ اختصار
تجھ کو درازئ شبِ ہجراں کا واسطہ

بیتاب فنانی

جناب ابو الضیا حاجی ٹی ایم عزیز اللہ عزیز بنگلوری

آئے حرم و دیر مرے ناز اٹھانے
بخشا یہ شرف بوسۂ نقشِ کفِ پا نے

زخموں کی لطافت کا مزا تو یہی جانے
پھولوں کی کہانی کو سنا بادِ صبا نے

مسرور ہر اک جان ہے ہر قلب ہے خنداں
رکھا کسے محروم ترے تیرِ ادا نے

ہر چند درِ پیرِ مغاں دُور تھا لیکن
پہنچا ہی دیا مجھ کو مری لغزشِ پا نے

مٹ جانے پر بھی عشق و محبت نہیں مٹتے
مجھ کو بھی اک درس دیا میری فنا نے

خاموش نگاہوں کو ذرا چھیڑ تو دینا
خاموش نگاہوں میں ہیں بیتاب فنانے

تاریخی نوادر

دلچسپ واقعات

از الحاج مولانا عبدالقیوم ندوی

اسلامی تاریخ نے اپنی چودہ سو سالہ حیات درخشاں میں جہاں صدہا بلکہ ہزارہا واقعات و حقائق اور ایسے ایسے انمول جواہر دنیا کی بساط پر پیش کئے کہ جس کی مثال نہ اگلوں میں ملی، نہ پچھلوں میں ملنے کی توقع ہے وہیں اس کے دامن میں ہمیں بعض ایسے چمکدار موتی بھی ملتے ہیں کہ جن کو دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی ہیں۔ یہ واقعات مسلمانوں کے شاندار علمی، عملی، ادبی، تہذیبی، تمدنی اور معاشرتی اور اخلاقی بلند اور اعلیٰ درجہ حسن مذاق اور حسن طبع پر دلالت کرتے ہیں۔ نیز ان سے مسلمان خلفاء اور امراء کے عدل و انصاف سخاوت و فیاضی، کریم النفسی اور بے غرضی، بذلہ سنجی اور خوش طبعی پر بھی بدرجہ اتم روشنی پڑتی ہے۔ اگرچہ اس قسم کے واقعات تو بہت ہیں مگر ان میں سے بعض کو یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

حضرت براء بن عازب ایک عظیم الشان صحابی سے روایت ہے کہ یمن کے ایک شخص نے اپنے لڑکے کو کوفہ روانہ کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ چہار دانگ عالم پر اسلامی پھریرا لہرا رہا تھا۔ جناب امیر المومنین سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کا دورِ خلافت تھا۔ آپ کے عدل و انصاف اور قوت فیصلہ نے ایک عالم کو ورطۂ حیرت میں ڈال رکھا تھا۔ عین جب حضرت موصوف مسندِ عدالت پہ رونق افروز تھے اور مقدمات کا فیصلہ ہو رہا تھا وہی لڑکا ایک غلام کے ہمراہ حاضرِ عدالت ہوا۔ غلام کہتا کہ یہ لڑکا میرا ہے اور لڑکا کہتا کہ یہ میرا غلام ہے اسے میرے باپ نے میرے ہمراہ کوفہ بغرض تجارت روانہ کیا ہے۔ ان دونوں نے اپنی اپنی گفتگو کو کچھ اس استدلال اور زورِ بیان سے پیش کیا کہ سارے مجمع پر سناٹا چھا گیا۔ ہر شخص اچنبھے میں پڑ گیا۔ حضرت علیؓ بھی چند لمحات تک خاموش رہے۔ بالآخر دربارِ مرتضوی سے حکم صادر ہوا کہ دیوار میں دو سوراخ بنائے جائیں۔ آپ کے خادمِ خاص حضرت قنبر نے فوراً حکم کی تعمیل کی تب آپ نے فرمایا کہ اے قنبر رسول اللہ صلعم کی تلوار لاؤ! اور مدعی اور مدعا علیہ سے فرمایا کہ ان دونوں سوراخوں میں اپنا اپنا سر ڈالو۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ حضرت نے فرمایا کہ غلام کا سر اس تلوار سے اڑا دیا جائے۔ یہ سنتے ہی غلام نے اپنا سر باہر نکال لیا اور لڑکا بدستور اسی طرح رہا۔ آپ معاملہ کی تہہ تک پہنچ گئے۔ غلام کو جھوٹ کی سزا ملی اور لڑکے کو کوفہ میں پہنچا دیا گیا۔ (طبقات ابن عاصم جلد اول ص ۳۱۱)

عبدالرحیم خان خاناں عہد مغلیہ کے بڑے کریم النفس اور نامور رئیس گزرے ہیں۔ ایک دن آپ چٹھیاں تقسیم کر رہے تھے کہ کسی پیادہ کی چٹھی پر ہزار دام کے بجائے ہزار روپیہ لکھ گئے۔ دیوان نے غلطی کی طرف توجہ دلائی تو فرمایا کہ اب تو قلم سے نکل گیا ہے (تاریخ مغلیہ)

ایک دن نظیری نیشاپوری نے آپ سے ایک لاکھ روپیہ دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ آپ نے فوراً ان کے سامنے لاکھ روپیہ کا ڈھیر لگا دیا۔ نظیری نے شکرانہ خدا ادا کرنا چاہا اتنی سی رقم پہ خدا جیسے کریم کا کیا شکر ادا کرے گا۔ یہ تمام روپیہ تمہارا ہے (تاریخ فرشتہ)

ایک دفعہ آپ دربارِ شاہی سے برہان پور رخصت ہوئے۔ رستے میں پڑاؤ کیا۔ آپ باہر شامیانہ میں کرسی پر بیٹھے تھے کہ ایک فقیر یہ شعر پڑھتے گزرا؂

منعم بکوہ و دشت و بیاباں غریب نیست
ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت

چونکہ آپ کا نام منعم تھا اس لئے ایک لاکھ روپیہ فقیر کو عنایت فرما دیا۔ دوسری منزل پر پھر یہی واقعہ پیش آیا۔ آپ نے اس موقع پر بھی ایک لاکھ روپیہ عنایت کر دیا۔ اسی طرح سات منزلوں پر وہ فقیر آتا گیا، شعر پڑھتا گیا اور روپیہ لیتا گیا۔ جب آٹھویں منزل آئی تو وہ فقیر نہ آیا۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے حوصلہ تھا میں نے تو پہلی منزل ہی سے اس کے لئے ۲۷ لاکھ روپیہ علیحدہ

کر رکھا تھا۔ واضح رہے کہ برہانپور دربار شاہی سے ۲۷ منزل پر تھا۔

ایک بار ایک شاعر نے مندرجہ ذیل قطعہ خان خاناں کے سامنے پیش کیا ہے

اے خان جہاں خان خاناں ۔ دارم صنمے کہ رشک چین است
گر جاں طلبد مضائقہ نیست ۔ زر می طلبد سخن درین است

خان خاناں موصوف نے پوچھا کہ تم کیا چاہتے ہو اس نے ایک لاکھ روپیہ مانگا آپ نے ایک لاکھ کے بجائے سوا لاکھ عنایت فرمایا۔ (تاریخ گلزار بہشت)

حجاج بن یوسف بنی امیہ کے زمانہ کا جبار زبردست اور سنگدل گورنر گزرا ہے اس کے رعب وجلال اور قہر کا یہ عالم تھا کہ بڑے سے بڑا بہادر بھی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔

حجاج بن یوسف کے ظلم سے تنگ آکر جب لوگوں نے بغاوت کی اور غدر کا ہنگامہ برپا ہو گا۔ تو اس کے لشکری باغیوں کی ایک عورت کو اس کے پاس پکڑ لائے۔ حجاج نے غصہ ظاہر کرتے ہوئے کچھ باتیں دریافت کیں مگر عورت عالم سکوت میں نظریں نیچی کئے کھڑی رہی۔ درباریوں میں سے ایک نے کہا اے عورت! تو امیر کے فرمان کا جواب کیوں نہیں دیتی اور آنکھیں اوپر کیوں نہیں اٹھاتی۔ عورت نے جواب دیا جس شخص پر خدا نظر نہیں کرتا مجھے اس کی طرف نظر کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ امیر نے پوچھا۔ مجھ پر خدا کی نظر نہ ہونے کا کیا ثبوت ہے؟ عورت بولی۔ اگر خدا تجھ پر نظر کرتا۔ تو ایسا ظالم نہ بناتا۔ حجاج نے کہا۔ واللہ یہ دلاور عورت سچ کہتی ہے اور انعام دے کر اسے اس کی قوم میں واپس بھیج دیا۔ (مروج الذہب)

ایک نہایت بدصورت اعرابی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا مہمان تھا کھانے کے وقت اس نے بڑے بڑے لقمے کھائے اور بہت سا کھانا کھا گیا۔ امام نے پوچھا کہ تمہارے بال بچے ہیں یا نہیں۔ اعرابی نے کہا۔ دو لڑکیاں۔ آپ نے سوال کیا کہ لڑکیاں کچھ خوبصورت ہیں؟ اس نے کہا۔ کہ صورت میں تو میں ان سے اچھا ہوں۔ مگر کھانے میں وہ مجھ سے زیادہ ہیں امام نے تبسم فرمایا۔ اور دو ہزار دینار اس کی بیوی بچوں کے لئے مرحمت کئے۔ (تاریخ طبری)

اسپین (اندلس) کے علم دوست و معارف پرور حکمران خلیفہ عبدالرحمٰن ثانی کے عہد حکومت میں یحییٰ نامی ایک عالم کو بڑا اقتدار تھا۔ ایک مرتبہ خلیفہ نے رمضان کا روزہ توڑ دیا۔ جب یحییٰ سے دریافت کیا گیا کہ اس کا کفارہ کیا ہوگا۔ یحییٰ نے جواب دیا۔ آپ کو ساٹھ روزے رکھنے پڑیں گے چنانچہ خلیفہ صاحب نے حکم کی تعمیل کی بعض علماء دربار اس فتوے پر معترض ہوئے اور کہا کہ روزہ توڑنے کا کفارہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک لونڈی یا غلام آزاد کرا دیتے۔ یا ساٹھ مساکین کو کھانا کھلا دیتے۔ یحییٰ نے جواب دیا۔ کہ اگر میں یہ فتویٰ دیتا تو امیر ہر روز روزہ توڑتے کیونکہ ایک بادشاہ کے لئے ساٹھ فقیروں کو کھانا کھلانا یا ایک غلام آزاد کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے (تاریخ ابن خلدون)

نواب علی مردان خاں شاہ ایران کی طرف سے قندھار کا صوبہ دار بنا۔ اس نے شاہجہاں شاہ ہند کی خدمت میں درخواست بھیجی۔ کہ فدوی قندھار میں حضور کا عمل دخل کرا کے بندگی میں آنا چاہتا ہے۔ اس شرط پر کہ فدوی کو سب امراء سے اوپر کے درجہ میں کھڑا ہونے کی اجازت ہو۔ شاہ نے درباریوں سے مشورہ لیا۔ انہوں نے بالاتفاق منظور کیا کہ جس امر میں حضور کا فائدہ ہو ہماری عین رضا ہے۔ بادشاہ نے علی مردان خاں کو طلب کیا۔ وہ حاضر ہوا۔ اور دربار میں سب امراء کے پیچھے کھڑا ہو گیا کہ میں نے اپنی فوقیت امراء کے امتحان کی خاطر چاہی تھی کہ دیکھوں کہ وہ دربار کے فوائد پر زیادہ نظر رکھتے ہیں یا اپنے اعزاز کو۔ چنانچہ میں نے سب کو مطیع اور بہی خواہ حضور پایا اور جب تک امراء میں یہ وصف رہے گا سلطنت کو زوال نہ ہوگا اور میں تو کمترین بندگان ہوں (منتخب التواریخ)

جہانگیر بادشاہ کے وقت میں ایک دفعہ شاہ ایران کا سفیر آیا۔ بادشاہ نے اسے ساری فوج دکھائی۔ اس نے راجپوتوں کی فوج کی بڑی تعریف کی۔ بادشاہ نے فرمایا۔ یہ احمقوں کی فوج ہے ان کی آپس میں بڑی دشمنی ہے۔ اگر ان میں اتفاق ہوتا تو ہم بادشاہی کیسے کرتے (تاریخ مغلیہ)

ایک دفعہ شاہ دہلی محمد شاہ بادشاہ پیچوان پینے میں مصروف تھے کہ خان دوراں خاں نے کچھ عرض معروض کی۔ مگر بادشاہ نے کچھ جواب نہ دیا۔ خان مذکور نے جواب دیا کہ پیچوان

میں ایسی کیا خوبی ہے جو حضور نے اس کو اتنا منہ لگایا، بادشاہ نے فرمایا کہ اس میں یہ وصف ہے کہ بغیر بلائے نہیں بولتا۔

امیر الحکم بن ناصر اہل علم کے قدر دان تھے۔ ان کے عہد حکومت میں دار العلوم قرطبہ کے پروفیسر مشہور فقیہ علامہ ابو ابراہیم تھے۔ ایک دن جبکہ وہ پڑھا رہے تھے ایک پیادہ نے آکر پیغام دیا کہ امیر المومنین نے قصر شاہی میں فوراً آپ کو بلایا ہے۔ علامہ نے قاصد سے کہا کہ بادشاہ سے جاکر کہہ دو۔ کہ میں اس وقت حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا درس دے رہا ہوں۔ بعد فراغت حاضر ہو جاؤں گا۔ قاصد سخت گھبرایا لیکن طوعاً و کرہاً امیر المومنین کے پاس جاکر علامہ کا جواب عرض کرنا پڑا۔ تھوڑی دیر میں ہی قاصد علامہ کے پاس آکر کہنے لگا۔ کہ حضرت امیر المومنین آپکے جواب سے بہت خوش ہوئے اور مجھے حکم دیا گیا کہ جب آپ درس و تدریس سے فارغ ہو جائیں تو آپ کو ساتھ لے کر امیر المومنین کی خدمت میں حاضر ہوں۔ امیر المومنین آپ کے منتظر رہیں گے۔ (اخبار الامرار)

نورجہاں بیگم ایک دن باغ کی سیر کر رہی تھی۔ وہاں ایک باغبان سوتا ہوا نظر آیا۔ نورجہاں نے اس کو گولی سے مروا ڈالا۔ اس کی عورت جہانگیر کے پاس فریاد لے گئی۔ بادشاہ نے اس کے ہاتھ میں بندوق دے کر فرمایا کہ نورجہاں نے تیرے خاوند کو مارا ہے اور میں اس کا خاوند ہوں۔ تو مجھے مار ڈال۔ یہ سن کر عورت نے کہا بس میں نے اپنا انصاف پا لیا۔

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ چلے جا رہے تھے۔ راستہ میں ایک مرد کو دیکھا۔ کہ وہ ایک عورت سے باتیں کر رہا تھا۔ آپؓ نے اس کو درہ مارا اس نے کہا یا امیر المومنین یہ تو میری بیوی ہے۔ حضرتؓ نے کہا پھر تو راستہ میں کیوں اس طرح باتیں کرتا ہے مسلمانوں سے اپنی غیبت کرانا چاہتا ہے اس نے کہا ہم دونوں ابھی ابھی مدینہ میں آئے ہیں یہ مشورہ کر رہے ہیں کہ کہاں فروکش ہوں۔ یہ سنتے ہی حضرت نے درہ اسکے ہاتھ میں دیا اور کہا تو بھی مجھے مار لے اس نے یا امیر المومنین میں نے معاف کیا مگر آپ برابر اصرار کرتے رہے کہ تو مجھے مار لے۔ آخر میں اس نے کہا کہ میں نے خدا کیلئے معاف کر دیا اس کے بعد آپ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے پاس گئے! و رہے واقعات بیان کیا انھوں نے کہا یا امیر المومنین آپ کچھ گناہ نہیں آپ متعدد تھے اور اگر آپ جلوہ میں آئے ہیں آپ

ایک حدیث بیان کروں جو میں نے رسول اللہ صلعم سے سنی ہے آپ فرماتے تھے کہ قیامت کے دن ایک منادی آواز دیگا کہ خبردار اس امت میں ابوبکرؓ و عمرؓ کے سوا کوئی اپنا نامہ اعمال پیش نہ کرے۔ (طبقات ابن سعد)

علی ہجویری صوفیا کی جماعت میں بہت بلند مقام رکھتے ہیں آپکے متعلق مرقوم ہے کہ آپ جب حکم اپنے پیر و مرشد کے غزنی سے ہندوستان تشریف لائے تو سب سے پہلے لاہور میں قیام کیا ان دنوں لاہور میں علم کا بہت چرچا تھا اور چونکہ مغل بادشاہوں کی سلطنت تھی اس لئے سارا شہر جنت کا نمونہ بنا ہوا تھا۔ آپ فرماتے ہیں کہ چونکہ اس سرزمین میں دلچسپی زیادہ تھی اس لئے وہیں مقیم ہو گیا اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا کچھ دنوں کے بعد یہ خیال دامنگیر ہوا کہ اس طرح پڑھانے سے دماغ میں تحکم کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں اور انہی جذبات سے سرشار ہو کر فرعون کے دماغ میں خرابی پیدا ہو گئی تھی اس لئے سلسلہ درس بند کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لی اور یہ خیال کچھ اس طرح آپکے دماغ پر چھایا کہ آخری وقت تک آپ کسی کو پڑھانے پر دوبارہ تیار نہ ہوئے۔

یہ واقعہ بھی آپ ہی کی طرف منسوب ہے کہ ایک دفعہ آپ شیخ حسام الدین کی جو لاہور کے مشہور صوفیوں میں سے تھے عیادت کو تشریف لے گئے۔ عیادت کر کے جب واپسی کا وقت قریب آیا۔ تو آپ نے اپنے لئے دعا کی درخواست کی اس پر شیخ نے ذیل کی چند نصیحتیں فرما کر کہا کہ اگر ان چیزوں پر تو نے اچھی طرح عمل کر لیا تو پھر تجھ کو کسی چیز کی حاجت نہ ہوگی۔ وہ باتیں یہ تھیں۔

(۱) کسی کو رنجیدہ نہ کرنا (۲) ہمیشہ اس امر کی کوشش کرتے رہنا کہ تم سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے اور سب خوش رہیں (۳) جہاں تک ہو سکے احسان کرنا احسان کرنے میں غور و فکر کی ضرورت نہیں (۴) کسی کو اپنا دوست نہ سمجھنا خواہ وہ تیرا خون ہی کیوں نہ ہو (۵) اپنے علم کو برباد نہ کرنا خواہ تیری گردن پر چھری ہی کیوں نہ رکھ دی جائے (۶) مال اور اولاد کو فتنہ سمجھنا کیونکہ قرآن مجید میں حق تعالیٰ نے ان کو فتنہ قرار دیا ہے اب یہی دیکھو کہ میں جانکنی کے عالم میں گرفتار ہوں اور کوئی میرے اس آڑے وقت میں کام نہیں آ رہا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد مرحوم بڑے بذلہ سنج اور حاضر جواب شخص تھے۔ ایک مرتبہ علماء میں یہ بحث چلی کہ اجمیر شریف۔ تو لفظ شریف

وفا و یاس

کہیں اصولِ جنوں بھی سکھائے جاتے ہیں؟

از حضرت طالب باغپتی

تمام عالمِ ہستی پہ چھائے جاتے ہیں
کس اہتمام سے پردے اُٹھائے جاتے ہیں

نظر سے دُور ہیں دل میں سمائے جاتے ہیں
کشاں کشاں وہ مرے پاس آئے جاتے ہیں

یہ بیخودی ہے فریبِ خودی ارے توبہ
قدم قدم پہ قدم ڈگمگائے جاتے ہیں

کلی میں پھول میں شبنم میں لالہ زار میں
کہاں کہاں ترے جلوے چرائے جاتے ہیں

گھٹاؤں میں شفقِ شام میں ستاروں میں
وہ مُسکرائیں تو یُوں مُسکرائے جاتے ہیں

وفا و یاس کی یہ کشمکش معاذ اللہ
بھُلا رہا ہُوں اُنہیں یاد آئے جاتے ہیں

اڑا رہے ہیں شبِ ہجر کا مری خاکہ
بہانہ یہ ہے کہ گیسو بنائے جاتے ہیں

یہ کیا ادا ہے؟ کہ مجبورِ زندگی کر کے
ستمگری کے بھی احسان جتائے جاتے ہیں

عبث ہے عشق میں رہبر کی جستجو طالب
کہیں اصولِ جنوں بھی سکھائے جاتے ہیں

گناہ

رومانی افسانہ

از جناب ایم قاسم صاحب فتحپوری منشی کامل

ٹرین پلیٹ فارم سے آ کر لگی۔ مسافر اُترنے چڑھنے لگے۔ خوانچے والوں کی آوازوں اور مسافروں کی باہم گفتگو سے باجہ سا بجنے لگا۔

"دوست میری روح بارِ آلودگی نہ برداشت کر سکے گی"

"تم کیوں گھبرا رہے ہو؟"

"تمہارے الفاظ کان کے پردوں سے آ آ کر اسی طرح ٹکرا رہے ہیں جیسے ساحلِ سمندر کی موجیں" میں افسانہ لکھوں گا۔ کیا تم افسانہ لکھو گے؟ کیا تم واقعی افسانہ لکھو گے؟

سفید پوش گارڈ دفتر سے باہر آیا اور ٹرین سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔ لگا ہی تھیں ساتھ ہی سبز رنگ کا ایک معمولی کپڑا ہاتھ کے ساتھ حرکت کرنے لگا سیٹی ہوئی۔ ٹرین متحرک ہوئی۔

"دوست قلم حکومت سے کہیں زیادہ طاقتور ہوتا ہے"

ارجمند کی حسرت بھری نظریں میری طرف تھیں، پتلیاں لچی ہوئیں، ہونٹ بدستور ہل رہے تھے۔ ٹرین کی موجودہ رفتار سے کہیں زیادہ تیز گاڑی کے پہیوں کے معمولی شور اور انجن کی پھولی پھولی سانسوں سے نکل کر اُسی کے الفاظ میرے کان تک پھر آئے "میرے راز کو پوشیدہ رکھنا" وہ رومال ہلاتا رہا۔ ٹرین آگے بڑھتی گئی۔ میری رُوح کے تار بجنے لگے "پردیسی سے پریت نہ کرنی چاہیئے"

(۲)

"زندگی حرکت کا نام ہے" ــــ

اِس آواز سے میں چونکا تو ضرور ہُوا مگر خیالات پھر اُلجھ کر رہ گئے۔ میں کچھ کرنا چاہتا تھا لیکن کوئی پوشیدہ طاقت سدِّ راہ ہو رہی تھی۔ ایک اُمنگ اُٹھتی دُوسری بیٹھتی جیسے گنگا کی لہریں چڑھتی اُترتی رہتی ہیں۔

"تمہاری چپکی کا مطلب ــــ زندگی حرکت کا نام ہے نا ــــ اچھا ــــ زندگی خموشی کا دُوسرا نام ہے ــــ بے حسی اور زندگی میں کوئی فرق نہیں"

میرے حلق سے اٹکتے ہوئے الفاظ نکلے "تمہارا مطلب کیا ہے؟"

"مطلب ــــ مطلب یہی ہے کہ زندگی خاموشی کا نام ہے نا"

"ہنسی مذاق ــــ ہر وقت لہو و لعب"

"نہیں میں یہ نہیں پوچھتی ــــ ہاں تو میرا مقصد یہ ہے کہ آپ رنجیدہ کیوں ہیں؟ ــــ چائے تیار ہے پی لیجئے"

"تم چلو"

"ہوں میں چلی جاؤں ــ میں تو نہ جاؤں گی ــ تم کو چلنا ہی ہو گا ورنہ ــــ"

"کیا ہو گا؟"

"وہی جو ایک دن ہو چکا ہے ــــ معاہدہ یاد کرو"

مجھے واقعہ یاد آ گیا جس دن بیگم نے سول نافرمانی کی تھی دن ختم ہو گیا تھا اور رات صبح، ان کی پلکتک سے تنگ آ کر نیز خود مجبور ہو کر میں نے بے چون و چرا مطالبہ منظور کر لیا۔ ہاں ہماری جیت کیسی ہوتی یہی کمبخت چائے تھی۔ معاہدہ نامہ پر دستخط ثبت ہوتے تو بیگم شیرنی کی طرح اُٹھیں اور فوراً بولیں۔

"میں کانگریس اور مسلم لیگ سے کم ہی رہی"

میں ہنس دیا ــ بیگم بھی ہنسنے لگیں ــ دُنیا یہ خیال نہ کرے کہ میں "زن مرید ہوں" یہ تو حقوق کا معاملہ تھا۔ غرض بخیال معاہدہ نیز بیگم کی گریہ مسکینی ہمیشہ کے آبحار ستھرے پیالوں کی چمک نے مجھے کرسی سے اُٹھا کر ہی چھوڑا۔

(۳)

ابھی چائے کا پہلا ہی گھونٹ حلق سے اُترا تھا کہ آتشدان کی روانگی کا سماں، منت و سماجت، بھولا پن اور سب کچھ آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ اُس کی زندگی کا بہترین قیمتی افسانہ یاد آ گیا۔ پیالی ہاتھ سے چھوٹ کر طشتری سے ٹکراتی میز کے کنارے کو چھوتی ہوئی فرش پر جا کر چار ٹکڑے ہو گئی۔ بیگم حیران ــ دونوں گھٹنے جل گئے، میں چونک پڑا۔

"خواب دیکھ رہے ہو کیا؟"

میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"آج کھوئے کھوئے سے کیوں ہو؟ کیا بات ہے؟ دفتر میں کسی سے جھڑپ تو نہیں ہو گئی۔ بولو! تم نے چپ کیوں سادھی ہے؟" بیگم کے سوالوں کی بوچھاڑ سے کچھ گھبرا سا گیا بحث کو طول

[illegible] نہیں ہوتا جیب سے چند اوراق نکال کر بیگم کے [illegible] رہے ہیں۔

"[illegible] ہے؟"

"[illegible]" بیگم نے پڑھنا شروع کیا۔

"[illegible] شروع [illegible] میں ایک رات جب چاند نمودار نہ ہوا تھا اندھیرا [illegible] میں پیپل کی بڑی بڑی ٹہنیاں رات کی آنکھوں میں [illegible] تھیں لیمپ کی مدھم روشنی ایسی تھی جیسے [illegible] ایک نازک سا وہ چپائی بڑھی آگے۔ دبلے پتلے خوبصورت نوجوان نے ٹھنڈی سانس لی اس کی سانس فضا کے عالم میں ایسی کھو گئی جیسے "اندھیری رات میں غریب کا پیسہ۔"

آج چھ ماہ بعد ہم دونوں میں ایسی ربط و ضبط کی گفتگو چھڑ رہی تھی گویا ایک پل کے دو ٹکڑے سے ہو گئے تھے" یہ کیوں؟ اسی لئے کہ آنے والی صبح کو وہ رخصت ہونے والا تھا میں نے باتوں باتوں میں پوچھا۔

"شادی کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

نوجوان مہربانہ انداز سے میری طرف دیکھ کر بولا "شادی کرنا اچھا اور شادی کرنا بہت اچھا ہے۔"

چونکہ میں نوجوان کے پورے خاندان سے واقف تھا قدرے توقف کے بعد پھر پوچھا۔

"فی الحال آپ نے کسے منتخب کیا؟"

"تحصیل علم اس کی اجازت ہی نہیں دیتی۔"

"پچھلی باتوں کا نچوڑ "نقطہ پرکار" ہے ـــــ زبان نہ کہے تو کیا ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں ـــــ بھٹکی بھٹکی نگاہیں ـــــ کھوئی کھوئی باتیں راز بتا دیتی ہیں دوست۔"

"اینٹوں کی بھی زبان ہوا کرتی ہے" "قول و قسم بھی کوئی چیز ہے [illegible] نے اپنا منہ کھولا جیسے سیپ قطرے کے لئے کھولتی ہے "دوست میری داستان سننے کے لئے وقت درکار ہے ـــــ میں محبت کرتا ہوں ـــــ میرے خیالات یقین کی حد تک پہنچ چکے [illegible] ـــــ"

"[illegible] بھی سن لینا چاہئے اور سن لو۔"

"کیوں دوست محبت کرنا گناہ تو نہیں۔ میں نے بھی محبت کی وہ محبت نہیں جسے بازاروں پاجامہ پہنایا جا سکے یا جو شاہراہ عام پر [illegible] جا سکے دوست میں نے جسے سو میں انتخاب کیا وہ فطرت کی [illegible] کیا عشق کا دیوتا کیوپڈ" اسے ٹھکرا دیگا؟ نہیں، دوست ـــــ اس کے بول شربت کے گھونٹ اور اس کا مزاج کاغذ کی طرح سادہ ہے۔ چاند نے پیپل کی اوٹ سے سر نکالا معصومہ نے سانس لی

"سنو دوست اب میرا افسانہ شروع ہوتا ہے گذشتہ سال تعطیل کلاں گھر پر گذار رہا تھا حسن اتفاق کہ تپ میں مبتلا ہو گیا ایسے پیچھے پڑا جیسے "شکاری باز کبوتر کا تعاقب کرتا ہے" ہفتے مہینے ہو گئے دوست مجھے پانی پی لینے دو۔"

پانی کے گھونٹ حلق سے اترتے دکھائی دے رہے تھے جیسے پانی حلق میں اٹکتا ہو سرخ چہرہ منٹوں کے لئے بشاش ہو گیا جیسے "ساون کی جھڑی میں سورج" اس نے نرم لہجے میں کہنا شروع کیا "دوست ایک دن گھر پر زنانہ مجلس تھی ریکھ سننے کے بعد، اختتام مجلس پر میرے کمرے میں ـــــ دوست وہ اکیلی چلی آئی تم نے "موت کی حکومت میں زندگی کی آمد بھی دیکھی ہے۔"

معصومہ نے رکتی ہوئی سانس لی پتلیاں چھپائیں اور ہٹالیں۔ چاند پتوں سے جھانک رہا تھا درخت کی سوئی ہوئی ٹہنیاں کبھی کبھی ہوا کے جھونکوں سے چونک کر آنکھ کھول دیتی تھیں۔

ہاں تو وہ آئی اور میرے پائنتیں چادر ہٹاتی ہوئی بیٹھ گئی دوست کس زبان سے کہوں اور ادائے مطلب کے لئے الفاظ کہاں سے لاؤں انداز استفسارانہ کا تھا۔ آنکھوں نے سوال کیا۔ میں نے لاغر بدن کی حرکت سے جواب دیا۔

"بھائی جان کیسی ہے آپ کی طبیعت؟"

میں یوں ہی سوکھ کر خزاں رسیدہ درخت ہو رہا تھا۔ دوست تم نے حکیموں، ڈاکٹروں کے مطب میں ہڈیوں کا ڈھانچہ دیکھا ہے؟ تپ کی وجہ سے مزاج میں چڑچڑاپن سمو گیا تھا میری حقارت آمیز نظریں آدم بیزار نگاہیں گلابی سانچے سے تجاوز کرتی ہوئیں چہرے سے پھسلتی نیلی پتلیوں سے جا کر الٹیں لوٹ جیسے کہہ کر پھر آئیں ـــــ اس معصوم فرشتے نے دوست میں تو اسے فرشتہ ہی کہونگا میری طرف جھکتے ہوئے نبض پر اپنی نازک انگلیاں جما دیں اور ملائم لہجہ میں بولی۔

"بخار بہت تیز ہے بھائی جان" اس نے گھبراتے ہوئے پھر کہا۔

"بھائی جان آپ بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ اُف مہینہ بھر میں یہ حالت ہو گئی کہ آنکھیں پہچان بھی نہیں سکتیں"۔ میں نے مُردہ آواز میں کہا۔

"مہینے سے زیادہ"۔

"[illegible] کس کا ہو سکتا ہے بھائی جان؟"

"موت کا" دوست میری زبان سے بیساختہ نکل گیا مجھے اس کا احساس مارے ڈالتا ہے۔

معصومہ کی آنکھیں [illegible] میں چلی گئیں میں نے غلط فہمی کا ساز توڑ لیا۔ اُس نے جواب دیا۔

"ایسے ہے تمہاری الٹی الٹی یہ باتیں" میرے غم آلود لب مسکرائے۔

"اور تم کو اپنا زمانہ یاد نہیں ہم اور تم [illegible] ہیں۔"

معصومہ شرمندہ ہو گئی جیسے نئی دلہن دولہا سے شرماتی ہے ساری کا گھونگھٹ بناتے ہوئے مسکرائی۔

دوست میری داستان سنتے سنتے تم گھبرا گئے ہو گے اب ختم کیا چاہتا ہوں کچھ اور سن لو — نوجوان نے "ساز شکستہ" پر انگلیاں دے ماریں۔ دوست انسان فرشتوں سے بڑھ کر ہوتے ہیں اور — جو فرشتہ کسی انسان کی خدمت کرے تو اس کی منزلت کا کیا کہنا — فرشتہ میرے پیر دبانے لگا مجھ سے دامن ضبط چھوٹ گیا گھبراتے ہوئے بولا۔

"ایسا اقدام نہ کرو کہ آسمان کو ناگوار ہو۔ تقدیر روٹھ جائے پیاری۔ دوست اس سے پہلے میں نے کبھی یہ الفاظ استعمال نہیں کئے تھے وہ اس وقت کچھ جھینپ سی گئی۔ رات کو ستارے یوں ہی ٹوٹا کرتے ہیں۔ چھوٹی راتیں کہیں لانبی نہ ہو جائیں۔ کمزور رسی کو نہ بٹو اس کے منتشر اجزاء علیحدہ ہی رہنے دو — وہ نہ مانی اور — دوست تمہیں بتاؤں اُف — کس طرح سنو گے دوست جب دل میں پھانس چبھ جاتی ہے اور کوئی اُسے نکالنا چاہتا ہے تو کتنی تکلیف ہوتی ہے میری سانس گھٹی جا رہی تھی" زندگی مستعار" اور "احسان دلربا" سینے پر سانپ پہلے ہی لوٹ چکا تھا۔ آنکھیں جھپک چکی تھیں۔ سارے بدن میں بجلی دوڑ چکی تھی "بجلی پانی میں گر کر نکل جاتی ہے"۔ میں نے ہاتھ پاؤں سکوڑنے شروع کئے — لیکن وہ سر دبانے لگی۔

"شرمندۂ احسان" سامنے والے [illegible] آئینے سے کل ماجرا دیکھ رہا تھا۔ دوست میں ہرگز ہرگز اس سماں کو نظر انداز نہیں کر سکتا تم نے سبزہ زاروں کی لہلہاہٹ دیکھی ہو گی اور دوست تم بسا اوقات صبح کے وقت باغ میں بھی گئے ہو گے تم نے پھولوں کو شبنمی لباس میں ملبوس دیکھا ہو گا — میرا پھول بھی اُس کی آمد بیٹھی جا رہی تھی سانس لینے کے لئے لگا اور پھر گویا ہوا۔

دوست تم نے سالن کو پھر اگر [illegible] کھانا ہی [illegible] اس پر کبھی غور کیا! صرف ایک [illegible] کا [illegible] دوست تم نے اُس نوشہ کے جذبات بھی محسوس کئے [illegible] کو دیکھ کر خوشی سے پھولا نہیں سماتا۔ اُس نے [illegible] رونا شروع کیا۔ اُن [illegible] جو قدرت کی حسین صناعی کے [illegible] میرے بال [illegible] بیشک اُس [illegible] کے لئے — مگر [illegible] اس کی قسمت [illegible]

"تم رو رہی ہو؟" میں نے پھر دریافت کیا۔

"تم رو رہی ہو اور میری طبیعت [illegible]" اُس نے بیٹھی بیٹھی آواز میں جواب دیا۔

"نہیں بھائی جان میں روتی نہیں آپ پریشان نہ ہوں"

"پھر یہ آنسو کیسے؟" وہ ایک سسکی [illegible]

"بولو! تم کیا میری بیماری پر رو رہی ہو؟"

"نہیں!!"

میں نے تکرار کی، وہ آنسو پاک کرتے ہوئے بولی۔

"دریا کا بند ٹوٹ گیا تھا"

مریض کا دل یوں ہی کیا کم ضعیف ہوتا ہے دوست ایسی جواب نے میری زندگی کو [illegible] ارشد اس وقت بھی [illegible] محبت کی [illegible] ادا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے کہا "دوست انسان کو [illegible] اور تم تو منزل عشق کے [illegible] ہمت تمہارے قدم چومے گی [illegible] حمیت تمہاری بلائیں لیتے [illegible] دوست [illegible] ہو گے مجھے معاف [illegible] ضائع کیا اب ذرا دیر اور [illegible]

ارشد نے آنکھیں صاف کیں [illegible] ہوئے بولا۔

"دوست اُس نے بھی [illegible]

"دنیا میں [illegible]"

اُس [illegible]

"[illegible]"
"[illegible] تک بھی یاد نہیں۔"
"یہ گرد و غبار خوار ہے۔"
"[illegible]"
"[illegible] کا پالا ہمارا ہے اور ہم [illegible]۔"
اُس کی آنکھیں بھیگنے لگیں میں نے پیرایہ کلام بدلتے ہوئے کہا۔
"[illegible] ہو؟"
مجھے کوئی جواب نہیں ملا لیکن دوست چہرے سے آثار شوخی نمایاں تھے پلکیں جھکی آنکھیں [illegible] اور ہونٹ سکڑ گئے تھے۔
"[illegible] چراغ سحری کا کیا بھروسہ، ہوا کا جھونکا آیا اور بجھ گیا، بہا [illegible] آرزو [illegible] جانے کب منقطع ہو جائے میری آرزو یہی ہے کہ تم ___" معصومہ نے ٹھنڈی سانس لی۔
چاند مسکرا رہا تھا۔ حسرت کی پتیاں خواب میں بیدار ہو رہی تھیں کسی پرندے کے چیخنے کی آواز آئی جیسے خواب میں بات نکل گیا ہو ___ اُس نے میرے درد آمیز لہجے سے متاثر ہو کر "نامراد زندگی" کے آخری ارمان کو پروان چڑھانے کے لئے سر جھکایا ___ چہرہ اور نرم نرم رخسار [illegible] دوست تم نے چاند اور ستارے کو گلے ملتے نہیں دیکھا دوست مجھ سے پوچھو ___ اُس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں ___ دو جگنا سا [illegible] رخساروں سے ڈھلکیں اور میرے گال سے مس ہو گئیں میں نے یہاں تک انہیں دیکھا شاید وہ گریبان کے کسی تار میں جذب ہو گئیں دوست میرے کھلے ہوئے گریبان کو دیکھ لو۔
بادل کے ٹکڑے نے مسکراتے ہوئے چاند کو چھپا لیا۔ پتیاں چاندنی کے سحر سے مسحور ہو چکی تھیں معصومہ نے چسکی لی میں نے آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ [illegible]
"دوست [illegible] بھی حوصلہ تھا" اُس نے ارشد نے) مایوسانہ انداز سے کہا۔
اور ___ تمہارا بھی یہی حوصلہ تھا۔
[illegible] میرے لگا۔ ہاتھ چہرہ پکڑ کے دوست تم نے پت جھڑ کے بعد بہار کا موسم تو ضرور دیکھا ہو گا" میرا چہرا پھول کی طرح کھلنے لگا مگر ___ دوست لمبے لمبے کالے کالے بال بکھر گئے، [illegible] عجیب دلفریب خوشبو آ رہی تھی۔ میرے جلتے ہوئے چہرے کو [illegible] انگلیوں نے ٹھنڈک بخشی دوست [illegible] [illegible] آنسوؤں نے آنکھیں کھول دیں وہ میرے سینے سے لپٹی ہوئی تھی جیسے کسی خوف سے بندر کا بچہ ماں کے پیٹ سے چمٹ جاتا ہے۔"
"مجھے تم سے محبت ہے۔"
چاند کو بادل کا ٹکڑا گھیرے ہاتھا اور وہ مسکراتا ہوا بھاگا چلا جا رہا تھا معصومہ فرطِ جذبات سے تپتی جا رہی تھی۔ میں نے ارشد سے کہا۔
"تمہارا یہ فقرہ میرے دل پر نشتر کا کام کر رہا ہے" میں ابھی کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ نوجوان بولا۔
"تم ضرور گھبرا گئے ہو گے دوست لیکن کچھ اور ٹھہر جاؤ سنو میں نے اس کا جواب دیا۔
"مجھے بھی۔"
اُس نے کہا "قسم دو۔"
میں بولا "محبت اور قسم۔"
اُس کی پیشانی پر شکن ہو گئی۔ بھویں تن گئیں چہرہ اُترنے لگا۔ جیسے ہانڈی میں اُبال آ رہا ہو۔ "اچھا کیوں" بھلا کیسے دیکھ سکتا تھا مجھ سے نہ رہا گیا۔
"تمہارے سر کی قسم"
وہ کھل گئی جیسے نو خیز کلی کھلتی ہے۔ میں نے دل کی دھڑکن محسوس کی وہ خوشی میں دوڑتا چلا جا رہا تھا کہ تیر دل کی چاپ نے اُس کی حرکت کھوٹی کر دی ___
وہ اُٹھی "دوست تم نے کلی کے چٹخنے کی آواز سنی ہے؟" میں بتاتا ہوں! مجھ سے سنو۔
شبنم خاموش رخصت ہو گئی۔ پھول بے اختیار بول اُٹھا "نہیں۔"
اُمی جان آ گئیں اور وہ سلام کر کے چلی گئی۔
چاند بدستور ہنس رہا تھا۔ پتیاں خاموش تھیں۔ فضا عالم ساکت۔ دُنیا کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو!! معصومہ فرطِ جذبات سے سُرخ پڑ گئی تھی۔
دوست تم کو میں اس کی تصویر دکھاتا ہوں۔ وہ اُٹھ کر کمرہ میں گیا۔ میں نے انگڑائی لی۔ ارشد چند منٹ میں البم لے آیا ___ دوست دیکھو (ایک تصویر کی طرف اشارہ کر کے) حور ہے جنت کی حوروں سے اچھی، اس کے چہرے کو دیکھو کتنی معصومیت ٹپکتی ہے ___ بیشک وہ حور خصائل تھی) ___ لیکن ___ دوست تم نے آج کا خط نہیں پڑھا نوجوان نے جیب سے چاک شدہ لفافہ نکال کر [illegible] اُس کا مضمون یہ تھا۔

"میں نے سنا ہے کہ "محبت میں انسان جو چاہتا ہے وہ نہیں ہوتا" میری دنیا کا خدا کوئی دوسرا ہونے والا ہے ـــــ تم دعا کرو ایسا نہ ہو۔ کیا ایک خدا دوسرے خدا کی بات نہ رکھ لیگا؟"

مرشد نے والہانہ انداز میں کہا! دوست! دوست کیا یہ سچ ہے "محبت میں انسان کی آرزو نہیں پوری ہوتی"۔ بولو دوست کیا یہ سچ ہے میری نگاہیں زمین پر جمی ہوتی تھیں بمشکل تمام اٹھیں حسرت زدہ چہرے پر پڑیں اور پھر پریشان ہو گئیں میرے دل نے بلبلاتے ہوئے کہا "ـــت ایک پیاسہ دوسرے پیاسے کی پیاس کیسے بجھا سکتا ہے"۔

اس کا تمام جسم پسینہ میں تر تھا اس کے الفاظ جذبات بھرے جملے میرے دماغ میں پہلے ہی چبھ چکے تھے۔ اس کا پھوٹ پھوٹ کر رونا، ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھرنا میرا سینہ پھاڑے ڈال رہا تھا۔ میں نے جذبات کے اٹھتے سیلاب کو روکا سر پر ہاتھ رکھ کر تسلی وتشفی دینے لگا۔

چاند نے یہ سماں دیکھ کر قہقہہ لگایا۔ درخت کی پتیاں بھی ہنسنے لگیں۔

"دوست یہ میری [illegible] دکھ بھری زندگی [illegible] تم دوست ہو گئے تو اسے افسانہ بنانے کی کوشش [illegible] میرے دل نے اسی وقت آہستہ سے کہا۔

"اگر ـــــ تمہیں دوست کی تلاش ہے تو اس [illegible] جب تک کہ عنقا سفر سے واپس نہ آجائے۔ [illegible] اپنا سر گریبان میں ڈال لیا۔

"اور سنو دوست میری "بربطِ حیات" کا نام [illegible] اور روح فزا نام ہے "رضیہ"۔

میں بدستور خاموش تھا ـــــ [illegible] بول اٹھا۔

"تم نے گناہ ہی نہیں کیا تم گناہ عظیم کے مرتکب [illegible] تمہاری توبہ قبول نہ ہوگی تم نے ایک دل زخمی کیا ہے"۔

"بیشک میں مورد الزام ہوں ـــــ تھا میرا دوست [illegible] چاند ہنستے ہنستے سفید پڑ گیا۔ درخت کی پتیاں [illegible] نوجوان "رضیہ، رضیہ" کہکر چونک پڑا ـــــ!

غزل

از جناب محمد وفا حسین تسکین بریلوی

وہ ہے درحقیقت فغانِ تمنا
سمجھتے ہیں جس کو بیانِ تمنا

مرا ہر سخن ایک عنوانِ حسرت
مری ہر نظر اک بیانِ تمنا

میں قسمت پہ تیری تجھے چھوڑتا ہوں
خدا حافظ اے کاروانِ تمنا

یہ مجبوریٔ دل کا عالم تو دیکھو
بنایا عدو رازدانِ تمنا

مرا ہر سخن باعثِ بدگمانی
تری ہر نظر پر گمانِ تمنا

نہ ہوں شکوہ سنجِ ستمہائے پیہم
اسی میں ہے تسکین شانِ تمنا

ڈراما شاہجہاں پر ایک نظر

بے لاگ تنقید

از جناب مولوی نور احمد خاں فریدی چشتی ملتانی

ضبط کروں میں کب تک آہ
چل میرے خامہ بسم اللہ

اغیار کا پروپیگنڈا

[illegible] سے سلاطین ہند کے خلاف جھوٹا پروپیگنڈا شروع کر رکھا ہے۔ وہ دانش پرور حضرات پر مخفی نہیں حقیقت ہے کہ اس وقت تک اُردو، ہندی، بنگالی، گجراتی اور مرہٹی زبان میں ہزاروں کتابیں اور لاکھوں مضامین فرزندانِ اسلام کے خلاف شائع ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں اور صرف کتابوں اور مضمونوں ہی سے یہ کام نہیں لیا جا رہا بلکہ سینما کے فلم، تھیٹروں کے ڈرامے، کٹھ پتلی کے تماشے، جلسوں کے اسٹیج، شاعروں کی نظمیں، بھاٹوں کے کبت، عورتوں کے گیت سب ہی یہ فرض ادا کر رہے ہیں اور یہ سب کچھ اس لئے ہو رہا ہے کہ تمام ملک کو مسلمانوں سے نفرت ہو جائے۔ چنانچہ اس کا یہ نتیجہ نکلا ہے۔ کہ غیر قومیں تو بجائے خود رہیں، خود مسلمان بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے۔ اور اب صرف مسلمان قوم میں بھی لاکھوں افراد ایسے موجود ہیں۔ جو شاہ جہاں اور محمد اورنگزیب جیسے بے پناہ سلاطین کو بھی بُرا سمجھنے لگے ہیں جنہیں غیر مسلم دنیا اس لئے اچھا نہیں سمجھتی کہ وہ اپنے بعد عظیم یادگاریں اس کثرت سے کیوں چھوڑ گئے ؎

اپنی قسمت وہ بھی کہتے ہیں بُرا
ہم نے سب سہتے ہوئے جو کر لئے

ایسے حالات میں ضرورت اسی بات کی تھی۔ کہ مسلمان نشۂ غفلت سے بیدار ہوتے۔ سلاطین کی صحیح تاریخیں لکھی جاتیں۔ واعظ اپنے وعظوں میں، خطیب اپنے خطبوں میں، اپنے اپنے موقع پر سلاطین ہند کے محامد و محاسن کو خوبصورت انداز میں پبلک کے سامنے پیش کرتے، جرائد و رسائل ان کی رواداری اور [illegible] پسندی کے مقالے شائع کرتے، اہل قلم حضرات [illegible] کی تصنیف کرتے تاکہ دنیا سلاطین ہند کے اصل خد و خال سے متعارف ہوتی، اور آج کل جو منافرت اور مغائرت [illegible] پیدا ہو چکی ہے اس کا مداوا ہو سکتا۔ اکبری انصاف، [illegible] کی چشم غور کا حلقہ کئے ہیں۔ اس میں ہزار

استقام ہوں۔ مگر یہ خوبی ضرور تھی کہ جب انہیں فلمایا گیا۔ تو ہندوستان کے طول و عرض میں مسلمان بادشاہوں کے اخلاقِ فاضلہ کی دھوم مچ گئی۔ صرف فلم "پکار" ہی کا یہ اثر ہوا ہے کہ جو لوگ کل تک "جہانگیر اعظم" کو محض "مے نوش" خیال کرتے تھے آج اس کے نام پر فرطِ ادب سے آنکھیں نچھاور کرنے لگے ہیں۔

مسٹر خاور کی نامبارک تصنیف

پچھلے دنوں ایم اکرام اللہ صاحب مالک کتب خانہ چشتیہ ملتان نے ازراہِ کرم نوازی "شاہ جہاں" کے عنوان کی ایک کتاب بھیجی۔ میں نے بڑے شوق سے اس کا مطالعہ شروع کیا۔ کیونکہ مصنف کا نام میاں محمد رفیق اس امر کا ذمہ دار تھا۔ کہ یہ ڈراما حضرت "شاہجہاں غازی" کے محامد و محاسن کا آئینہ دار ہوگا۔ مگر افسوس جوں جوں میں اس کو پڑھتا گیا، توں توں میرے کرب اور بے چینی میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور جب میں نے اسے ختم کیا تو کتاب کے اوراق میرے آنسوؤں سے بھیگ چکے تھے، اور غنی کشمیری کا یہ شعر بے اختیار زبان سے ادا ہو رہا تھا ؎

غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

میاں محمد رفیق صاحب نے اپنے ڈراما میں ایسے ایسے کریہ الزامات شاہ جہاں بادشاہ اور اس کی ملکہ پر چسپاں کئے ہیں۔ اور ایسے ایسے نازیبا حملے حضرت محی الدین اورنگزیب پر کئے ہیں کہ آج تک ہندو اور دیگر متعصب غیر مسلم حضرات کو بھی اتنی جرأت نہ ہو سکتی تھی۔ کہیں فقدانِ معلومات کا کرشمہ کارفرما ہے تو کہیں تعصب کی جھلک۔ اگر کہیں عدم احتیاط جلوہ فرما ہے تو کہیں ذہنی گندگی کا انبار نظر آتا ہے۔ اس کے مطالعہ سے میرے دل پر غم و اندوہ کے نئے نقوش کندہ ہو گئے۔ اور میں اپنی طویل بیماری اور عدیم الفرصتی کے باوجود اس کتاب پر تبصرہ کرنے کے لئے آمادہ ہو گیا۔

کتاب کے گذشتہ صفحات کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے۔ کہ میاں محمد رفیق صاحب کتاب کو [illegible] پر غور کرنے کا موقع نہیں ملا ورنہ وہ ضرور تقاضائے [illegible] سے کام لیتے۔

[illegible] سے اخیر تک ملاحظہ فرمائیے مُغل قوم کو ہمیشہ [illegible] سے سمجھا پڑا ہے۔ ہندوؤں میں لاجپت رائے آنجہانی۔ بھائی رائے بنارسی۔ سر جادو ناتھ سرکار۔ رائے چند بھائی بین، رائے بند رکا بن بہادر خان بہادر۔ منشی بادھو رام۔ پنڈت تلک مہاراج۔ لالہ [illegible]۔ جستہ جیتی جی۔ ڈاکٹر بسیّ پی رائے۔ جہتہ آنند کشور۔ رائے کنہیا لال۔ راجہ شیو پرشاد جی اور پنڈت دتسیر شاد فدا جیسے غیر مسلم اہل قلم نے نہایت فیاضی سے سلاطین ہند کے عدل و انصاف کو سراہا ہے۔ الفنسٹن، برنیر اور سر طامس رو نے بھی استقد نفرت سے کام نہیں لیا۔ جتنا خاور صاحب کے اس ڈرامے میں نکالا گیا ہے۔ خاور صاحب نے ڈراما کے دیباچہ میں اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے [illegible] بیانی کا عمداً ارتکاب نہیں کیا۔ بلکہ انہیں آلۂ کار بنایا گیا ہے۔ حقیقت میں اس سیاہ کاری کی تمام تر ذمہ دار بقول انکے ایک "فرشتہ سیرت" اور "مسیحا نفس" ہستی ہے جن کے "افسونِ جمال" سے وہ "شاد کام" ہو رہے ہیں۔ گویا سلاطین ہند پر سوقیانہ حملے ان کی "جمیلہ" نے کئے ہیں۔ اور انہوں نے صرف ان کے افسونِ جمال سے مسحور ہو کر ایسا کرنا گوارا کر لیا ہے۔ ورنہ کہاں میاں محمد رفیق اور کہاں یہ نازیبا حرکت ؎

چرخ کو کب ہے یہ سلیقہ ستمگاری میں
کوئی معشوق ہے اِس پردۂ زنگاری میں

ستم ظریفی ملاحظہ ہو۔ کہ اس ناپاک کوشش کو میاں صاحب "ایک تالیف" تصور کرتے ہیں۔ تاکہ قارئین پر ان کی سچائی اور بے بسی واضح ہو جائے کہ اس غریب نے اپنی طرف سے کچھ ایزاد نہیں کیا۔ جو کچھ انہیں تاریخ کی ورق گردانی سے ملا ہے اُسے کمال دیانتداری کے ساتھ دانش پرور حضرات کی ضیافتِ طبع کے لئے پیش کر دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

"بعض وجوہ کی بنا پر اس تالیف کے متعلق ایک اہم حقیقت کا قصداً اظہار نہیں کیا گیا۔ اس لئے میں خصوصاً ناقدوں کے طور پر یہ بیان کر دینا ضروری خیال کرتا ہوں۔ کہ اگر اس کے بعض حصے قابل اعتراض ہوں تو ان کی ذمہ داری میری بجائے کسی اور شخص پر عائد ہوتی ہے۔" (صفحہ ۳)

آگے چل کر "کسی اور شخص" کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔ جس کا ذکر ہم سطور بالا میں کر چکے ہیں "اس داستانِ محبت کو جامۂ الفاظ سے آراستہ کرنے میں ایک ایسی "مسیحا نفس" اور "فرشتہ سیرت" ہستی میری ممد و معاون رہی ہے جس کا "افسونِ جمال" [illegible] شاد کام ہے۔ [illegible] "جہاں افروز" [illegible] میرے سہانے خیال میں سما کر اس داستانِ مہر و وفا کے ایک ایک [illegible] منعکس ہوتا ہے۔"

خاور صاحب "مذد گناہ" جو یقیناً "بدتر از گناہ" کا مصداق ہے پیش کرنے کے بعد ان کی "محبوبہ" سمجھئے یا "ممد و معاون" سے یوں خطاب کرتے ہیں۔

"شاہ جہاں اور ممتاز محل کے بھیس میں میری روح تمہاری روح سے ہم کلام ہے۔ اور میرے ہونٹ تمہارے حُسن کی تعریف میں زمزمہ پیرا ہیں۔" (صفحہ ۱۲)

اللہ! اللہ! کہاں اُن مقدس نفوس کی پاکیزہ محبت کہاں خاور صاحب کی "ہوسناکی" کہ "دُنیائے محبت" کے [illegible] اپنے اوپر قیاس کر کے جو ناپ شناپ جی میں آیا لکھ ڈالا۔ قالبا "مولائے رُوم" خاور صاحب جیسے "برساتی بر نالوں" کے حق میں کہہ گئے ہیں۔ کہ ؎

کارِ پاکاں را قیاس از خود مگیر
گرچہ باشد در نوشتن شیر و شیر

اور جن "لطیف احساسات اور بہجت آفرین نغموں" سے خاور صاحب نے اپنی "دُنیائے دل" کو آباد کر رکھا ہے سات سمندر دور۔ خاور صاحب جو کچھ بھی سمجھیں وہ مالک و مختار ہیں۔ مگر حضرت غالب اپنی اسی "نیک نظری" کی مرثیہ خوانی کرنے کے بعد جہاں سے گزر گئے۔ کہا کہ ؎

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

سچ یہ ہے۔ کہ اگر خاور صاحب [illegible] اس ڈرامہ میں شاہ جہاں اور ملکہ ممتاز محل کے بھیس میں ایک دوسرے سے ہم کلام ہونا چاہتے ہیں۔ تو ہمیں ان سے شکایت نہیں ہو سکتی کیونکہ اس ڈراما میں نہ "تاریخ" ہے نہ واقعیت [illegible] رُوحانی تڑپ، صرف اور صرف [illegible] خاور صاحب نے یہ ڈراما لکھ کر [illegible] ہو نہیں سکتی۔

اگر کسی [illegible]

فلمی فنکاروں کو تاریخ کے ساتھ ناانصافی پر مبنی اس کے خلاف ضرور پروٹسٹ کیا جانا چاہیئے اگر اس پر بھی وہ باز نہ آئے اور یہ ڈرامہ سٹیج پر پیش کیا گیا تو کل [illegible] مستقبل میں [illegible] لگ سکے گا۔ لیکن ملک کی بدبختی پر کسے شکایت ہو سکے گی۔

ضرورت ہے کہ ذمہ دار احباب اپنی ذمہ داری کا احساس کریں اور وزارت پنجاب کی توجہ اس طرف مبذول کرائیں تاکہ اس ہر پہلے ڈراما کو بحق سرکار ضبط کیا جا سکے۔ تاکہ کسی خاور کو ایسے نامبارک اقدام کی دوبارہ جرأت نہ ہو سکے۔ بقول حکیم شیراز ؎

نکوئی با بداں کردن چناں است
کہ بد کردن بجائے نیک مرداں

اب میں اصل کتاب سے چند اقتباسات تاریخ ہند کی روشنی میں پیش کرتا ہوں تاکہ قارئین عالمگیر مسٹر خاور کی گندہ ذہنی کا اچھی طرح سے اندازہ کر سکیں۔

شاہ جہاں کا کیریکٹر

بوسین نامی ایک پادری شاہ جہانی دربار میں حاضر ہوتا ہے۔ بادشاہ اس کی تعلیم سے متاثر ہو کر عیسائیت کی طرف مائل ہو جاتا ہے، اور اسے اپنے مصاحبوں میں داخل کر لیتا ہے۔ وزیر اعظم مصالح ملکی کے پیش نظر بادشاہ کو اس کی مصاحبت سے منع کرتا ہے۔ جواب بادشاہ کی زبانی سنئے:۔

"عبدالرحمن! ملکہ ان فرنگیوں کو دیکھ کر خوش ہوتی ہے
بس تمہاری تسلی کے لئے اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے۔" (صفحہ ۲۶)

وزیر اعظم بادشاہ کو شاہانہ ذمہ داریوں اور ملکی مصلحتوں کا احساس دلاتا ہے تو بادشاہ اس پر جواب دیتا ہے۔ اس کی مثال کم از کم تاریخ ہند میں تو نہیں ملتی۔ ارشاد ہوتا ہے۔

"بادشاہ اپنی مرضی کے مطابق ہر بات کو ملک کا قانون
قرار دینے کا پورا پورا اختیار رکھتا ہے۔" (صفحہ ۳۶)

تاریخ دان حضرات بخوبی جانتے ہیں۔ کہ مسلمان بادشاہوں نے اس سرزمین میں اپنی مرضی کے مطابق کس حد تک فرمانروائی کی ہے، حقیقت یہ ہے کہ سلاطین ہند عموماً اور سلاطین مغل خصوصاً "امرھم شوریٰ بینھم" پر عامل رہے ہیں، اور کسی موقع پر بھی انہوں نے آپ کو ڈکٹیٹر کے لباس میں پیش نہیں کیا۔ [illegible] اورنگ زیب کے متعلق تصریح فرماتے ہیں،

کہ وہ ملکہ عالیہ کا سوتیلا بیٹا تھا۔ قندھار کی مہم میں شکست کھانے پر علی الاعلان باغی ہو بیٹھا۔ اور جب [illegible] سلطنت میں بالطائف الحیل پیش ہوا تو بادشاہ نے "قتل" کی سزا کا فیصلہ صادر کیا مگر اس کے بعد فوراً ہی بادشاہ اس فیصلے پر متاسف ہوتے اور شہزادے کو خطاب کر کے ملامت سے فرمایا۔

"یہ بادشاہ وقت کا جواب ہے، گو [illegible] الٰہی محبت بادشاہ کی خواہش پر غلبہ پا کر تمہارا قصور معاف کرتی ہے۔" (صفحہ ۲۰)

اتنے بڑے بادشاہ کا حکم صادر فرما کر واپس لینا کس قدر معیوب ہے۔ مغلیہ دور میں ایسی مثال کوئی نہیں ملتی کہ کسی بادشاہ نے حکم صادر کرنے کے بعد واپس لے لیا ہو۔ یا رشتہ داری ان کی معدلت گستری میں حائل ہوئی ہو۔ سلیم اکبر کو کس قدر پیارا تھا۔ بقول مولانا آزاد "اکبر کو سلیم سے پیار نہیں بلکہ عشق تھا"۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی سلیم نے بغاوت کی۔ تو جب تک اس نے معافی نہ مانگی بادشاہ کا غصہ فرو نہ ہوا۔ جہانگیر عادل نے سلطنت کے امور میں کبھی نورجہاں کی پروا نہیں کی۔ اورنگزیب نے اپنے فرزندوں کو بغاوت کے جرم میں جب کبھی قید کر کے گوالیار کے قلعہ میں بھجوایا تو ان کے ساتھ ذرہ بھر بھی نرمی نہ برتی گئی حتیٰ کہ وہ بجائے ٹھنڈے پانی کو بھی ترستے تھے۔ اور انہیں حجام سے ناخن ترشوانے کی اجازت تک نہ تھی۔ خود شاہ جہاں بادشاہ نے ممتاز سے اس قدر تعشق رکھنے کے باوجود سیاسی مصالح کی بنا پر اس کی بہن اور بہنوئی کو عرصہ تک قید میں رکھا اور ان کی جاگیریں ضبط کر لیں۔

ایک موقعہ پر سورت بندر کے گورنر محمد امین کے متعلق رپورٹ پہنچی۔ کہ اس کا سلوک مسافروں سے اچھا نہیں۔ شہنشاہ نے فوراً اس کی جاگیر اور منصب کی ضبطی کا حکم صادر کیا۔ اور گرز بردار متعین ہوا کہ اسے گرفتار کر کے دربار میں پیش کرے۔ جب وہ پیش ہوا اور جرم کی تحقیق ہو گیا تو بادشاہ نے حکم دیا کہ [illegible] اس کے کپڑوں میں سانپ چھوڑ دیا جائے۔ چونکہ سورت کی جاگیر شہزادی جہاں آرا سے متعلق تھی اس لئے جب دربار کے امیروں اور منصبداروں کو محمد امین کے بچاؤ کی کوئی اور صورت نظر نہ آئی تو انہوں نے بصد الحاح بیگم صاحبہ سے سفارشی خط حاصل کر لیا۔ لیکن جونہی یہ عریضہ بادشاہ کے ملاحظہ سے گزرا تو ان کے غیظ و غضب کی انتہا نہ رہی [illegible]

تو حالات میں بھیج دیا۔ اور خود حرم سرا میں تشریف لے آئے اور بیٹی کو بُلا بھیجا گیا۔ کے بعد فرمایا کہ

"تم لوگ عدل سے سلطنت نہیں کرنے دیتے۔ باوجود اس کے بندر سورت تمہاری جاگیر میں ہے۔ تم نے ایسے ظالم ناپاک کی سفارش کی۔ جس نے محض اظہار خیر خواہی کے لئے میری رعیت کو تباہ و برباد کیا ہے۔ کیا تمہیں معلوم نہیں۔ کہ مال گذار رعیت باعثِ آبادی ملک اور موجب افزونیِ خزانہ و لشکر شاہی ہے۔ کیا ایسے ظلم سے رب العالمین کا غضب نازل نہیں ہو سکتا" (امرائے ہنود)

شہزادی صاحبہ کو چونکہ ان حالات کی بالکل خبر نہ تھی۔ بادشاہ سے معافی چاہی اور سفارش سے درگزر کی۔ دوسرے روز دربار میں بادشاہ نے محمد امین کو طلب کرکے پھر وہی حکم صادر فرمایا۔ تمام دربار میں کسی کو بھی اتنی جرأت نہ ہوئی۔ کہ منہ سے ایک لفظ بھی نکال سکے۔ (امرائے ہنود)

یہ ۱۰۵۳ھ کا واقعہ ہے۔ یعنی ملکہ عالیہ ممتاز محل کی وفات کے ۱۴ برس بعد اور بادشاہ کے قلعہ آگرہ میں نظر بند ہونے سے صرف تیس سال پہلے جبکہ لال قلعہ، تاج محل اور قلعہ آگرہ کی سربفلک عمارات پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی تھیں۔ اور اس وقت شہزادی جہاں آرا سے زیادہ عزیز اور کوئی شخصیت نہ تھی۔ جب اس کی سفارش کا یہ عالم تھا۔ تو کاروبار سلطنت میں کسی اور کی مداخلت کس طرح روا رکھی جا سکتی تھی۔ اور جب محمد امین گورنر سورت کی "سخت گیری" کا اس قدر نوٹس لیا گیا۔ اور دارا السلطنت اور سورت کا باہمی بُعد بھی اس سے مانع نہ ہو سکا۔ تو پھر شہنشاہ پر محویت و استغراق کا الزام چسپاں کرنا کیونکر جائز ہو سکتا ہے؟

شاہ جہاں کے عقائد

خاور صاحب نے اپنی تصنیف کے صفحہ ۶۶ پر اورنگ زیب کی زبان سے شاہ جہاں کے عقائد کی جو تصریح کی ہے، وہ حسب ذیل ہے:—

"میرے خبر رساں نے مجھے اطلاع دی ہے کہ جناب قبلہ گاہی اور ان کے رفیقۂ حیات کے عقائد روز بروز نصرانیت کی طرف مائل ہوتے جاتے ہیں"

ایک اور مقام پر خود بادشاہ کی زبان سے ان کے ضعفِ ایمان کا اعتراف کرایا گیا ہے۔ یا در ہی بادشاہ کے مخاطب [illegible] اور شاہ جہاں بادشاہ اپنے عقائد کا اظہار کرتے ہیں:

"ہم ان خداؤں [illegible] ہیں [illegible] تنگ آ چکے ہیں۔ راستے تو [illegible] ہیں [illegible] صحیح راستہ کون سا ہے۔ یہ ایک نہایت [illegible] سوال ہے۔ تم ہمارے سامنے اس موضوع پر دیگر مذاہب کے علماء سے مباحثہ کرو۔ تاکہ ہم ان کی صداقت کے متعلق کسی فیصلہ کن نتیجہ پر پہنچ سکیں۔ ہماری حالت تو اُس مسافر کی سی ہے، جو اپنا راستہ بھول چکا ہو۔ اور گھبرا کر ہر طرف دوڑ دھوپ کرے"

آیئے اب ذرا آپ کو تاریخ ہند کی سیر کرائیں۔ کہ خود شاہ جہاں کے عقائد کے بارہ میں وہ کیا کہتی ہے۔

"شاہ جہاں بادشاہ کے نماز روزہ کبھی قضا نہ ہوتے تھے" (عالمگیر نامہ)

صاحب سیر المتاخرین کا بیان اس سے قدرے مختلف ہے وہ لکھتا ہے کہ پیرانہ سالی میں جب بادشاہ بہت کمزور ہو گئے تھے تو علماء سے فتویٰ حاصل کرکے انہوں نے روزوں کا کفارہ ادا کرنا شروع کر دیا۔ کتاب کے اصل الفاظ یہ ہیں:—

"چوں سنین عمر بادشاہ از شصت تجاوز نمود و بوفتوائے مفتیان شاں افطار صیام ماہ رمضان نمودہ مبلغ شصت ہزار روپیہ فدیہ دادہ، و ہر شب الیالی ماہ رمضان نیازمندان از خوان نوال جاہ و جلال بگونا گوں اطعمہ و انواع اشربہ متمتع می شدند و مقرر شدہ کہ در ہر رمضان ہمی قسم معمول باشند" (سیر المتاخرین صفحہ ۲۸۰)

صحیح یہ ہے۔ کہ بادشاہ نے ضعف پیری کی وجہ سے روزوں کے لئے یہ فتویٰ حاصل کیا تھا۔ مگر نماز آخر دم تک قضا نہیں ہوئی۔ ایک دوسرے مقام پر صاحب سیر المتاخرین نے دو بارہ اس معاملہ پر [illegible] فرماتے ہیں۔

"ساعتے بیش از بامداد بیدار گشتہ بعد [illegible] علوم معقولہ و فوائد [illegible] می بود"

مزاج صوفیانہ پایا تھا۔ فقیروں کی [illegible] رغبت کمال رکھتے تھے [illegible] سے شوق فرماتے [illegible]

ہو جاتی جب ملاقات ایسا ہوتا کہ جو لوگ اس قسم کی بزم میں شریک ہوتے حالت وجد میں بے ہوش ہو جاتے۔ بار ہا اکثر متصوفین نے اسی مجلس میں دوران وجد انتقال کیا۔

"پادشاہ او در فن موسیقی نیز مہارت تمام داشت باستماع آں راغب بختاور خاں خواجہ سرا صاحب تاریخ مراۃ عالم می نگارد کہ بعضے از صوفیا در بزم او در حالت وجد جاں بحق تسلیم کردہ اند" (سیر المتاخرین صفحہ ۲۵۵)

خلو صاحب نے دربار پرتگیز پادریوں کا ذکر کیا ہے اور جہاں تک ان سے ہو سکا ہے۔ انہوں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ کہ ملکہ اور بادشاہ ان سے بیحد اعتقاد رکھتے تھے۔ لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ شاہ جہاں بادشاہ کو فرنگیوں سے ان کے ناروا اعمال کی وجہ سے سخت نفرت تھی۔ ان کی آمد و رفت کا سلسلہ اگرچہ اکبر کے زمانے سے شروع ہوا تھا لیکن انہیں کوٹھیاں بنانے کی اجازت جہانگیر کے زمانہ میں عطا ہوئی۔ یہ بادشاہ بیحد غیر متعصب تھا۔ پرتگیزوں نے اس سے اقرار کیا تھا۔ کہ اگر انہیں ہوگلی میں آباد ہونے کی اجازت دی جائے تو وہ ملک بنگالہ کو قزاقوں سے محفوظ رکھیں گے۔ بادشاہ کو توقع تھی کہ ان سے ہندوستان کی تجارت کو بے انتہا فائدہ ہوگا۔ اس لئے اس وسیع القلب شہنشاہ نے انہیں کھلے دل سے آباد ہونے کی اجازت دیدی۔ مگر تھوڑے سے عرصہ میں پرتگیزوں نے اپنے سیاہ اعمال کے سبب بنگال کی رعایا کا ناک میں دم کر دیا۔ بجائے اس کے کہ قزاقوں کا انسداد کرتے، خود قزاق بن گئے۔ سمندری امن عنقا ہو گیا اپنی کشتیوں کے ذریعے ڈھاکہ تک بڑھ آتے اور رات کی تاریکی میں بیاہ شادی کے موقعوں پر ڈاکہ ڈال مال و اسباب اور رعایا کے افراد کو پکڑ کر ہمراہ لے جاتے۔ انہیں جبراً عیسائی بناتے اور ان کی بیویوں کی عصمتیں پامال کرتے۔ شاہ جہاں بادشاہ کو شہزادگی کے ایام سے ان کی تباہ کاری کا علم تھا جب وہ سریر آرائے سلطنت ہوا۔ تو وہ پرتگیزوں کی اس روز افزوں بداعمالی کو برداشت نہ کر سکا قاسم خاں صوبہ دار بنگال کو ان کی مہم پر مامور کیا اور خدائے لایزال کی مدد سے فتح پائی۔ رعایا کے دس ہزار افراد ان کی قید میں پڑے تڑپ رہے تھے۔ ان کو نکال کر آزاد کیا۔ اور چھوٹے بڑے چار سو اصلی پرتگیز گرفتار کر کے ۱۰ محرم ۱۰۴۲ھ کو بادشاہ کے حضور میں پیش کئے۔ ملکہ ممتاز محل ۱۰۴۰ھ میں وفات پاتی ہے گویا ملکہ کے انتقال کے چند ماہ بعد میں پرتگیزوں کے خلاف یہ مہم شروع کر دی گئی تھی اور جب سیاہ کار جماعت شہنشاہ کے حضور میں حاضر ہوئی۔ تو اس نے سب کو قید کرنے کا حکم دیا۔

البتہ جنہوں نے برضا و رغبت اسلام قبول کر لیا ان کے قصور معاف کر دیئے گئے۔ آگرہ میں جو گرجا تعمیر ہوا تھا۔ وہ بھی شہنشاہ جہانگیر کی عنایت کا نتیجہ تھا۔ خدا معلوم خلو صاحب کو شیخ بہاؤ نے کیا خیال آیا، کہ انہوں نے شاہ جہاں کے خلاف بغیر کسی ثبوت کے بتا دیا ہوا تھا کہ قلعہ تعمیر کر لیا۔

یہ تو پرتگیزوں اور پادریوں کے افسانہ کی حقیقت تھی۔ اب میں ناظرین کرام کو شاہ جہاں کی غیرت ایمانی کے چند واقعہ پیش نظر دیکھنے کی تکلیف دیتا ہوں۔

نواب سعد اللہ خاں کے انتقال کے بعد جب وزارت کا قلمدان علامی افضل خاں کے سپرد ہوا۔ تو انہوں نے دربار میں مشاعرہ کی بنیاد ڈالی۔ بڑے بڑے امراء اور نواب جو شعر و شاعری میں اچھا خاصا ذوق رکھتے تھے فی البدیہہ شعر پڑھ کر دربار کو گرم کرتے۔ خود بادشاہ سلامت بھی اس میں حصہ لے کر شعراء کی حوصلہ افزائی فرماتے۔ ایک دن وہاں چندر بھان نے جو امرائے دربار میں سے تھے، اور برہمن تخلص کرتے تھے، اپنا یہ شعر دربار میں پڑھ کر سنایا ؎

مرا دلے ست بکفر آشنا کہ چندیں بار
بہ مکہ بردم و بازش برہمن آوردم

دین پرور بادشاہ کو شاعر کا یہ خیال پسند نہ آیا اور چہرۂ شاہی پر خفگی آ گئی۔ علامی افضل خاں وزیر اعظم نے موقعہ کی نزاکت کو دیکھ کر فوراً سعدی علیہ الرحمۃ کا یہ شعر پڑھا ؎

خرِ عیسیٰ اگر بہ مکہ رود
چوں بیاید ہنوز خر باشد

بادشاہ سلامت یہ جواب سُنکر بے اختیار ہنس پڑے۔ اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ (امرائے ہنود)

شاہ جہاں کا جذبہ ایمانی

جب گراں قدر دل رپلے کے مصارف سے دس برس میں لال قلعہ بن کر تیار ہوا۔ تو بادشاہ سلامت ہوا دار آبی پر سوار ہو کر لب دریا کے دروازہ سے قلعہ میں داخل ہوئے۔ قلعہ میں ہندوستان کی کل کائنات جمع تھی۔ اور دیوان عام دنیا بھر کے سفراء اور ہندوستان کے امراء و مہاراجگان سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اور قلعہ کے محلات نگار خانہ چین بنے ہوئے تھے۔ جب ہندوستان کا شہنشاہ قلعہ میں داخل ہوا۔ تو توپوں اور شادیانوں سے زمین و آسمان گونج اٹھے۔ شہنائیاں بجنے لگیں۔ نقیبوں نے فرو مسرت سے چنگھاڑنا شروع کیا۔ اور حاضرین کے گھوڑے مست ہو کر ہنہنانے لگے۔ نقیبوں نے آوازیں لگائیں شہنشاہ ملک کے حاکم اور راجوں مہاراجے

معًا تعظیم کو جھک گئے۔ بادشاہ قدرتِ الٰہی کا یہ رنگ دیکھتا آگے بڑھتا چلا گیا۔ جونہی تخت کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے سرفراز کیا۔ خدا معلوم کیا خیال آیا کہ دفعتًا چہرہ شاہی برف کی طرح سفید ہو گیا اور آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرات ٹپک ٹپک گرنے لگے۔ دونوں ہاتھ فاتحہ کے لئے اٹھائے۔ اور ساتھ ہی اہلِ دربار نے ہاتھ اٹھا دیئے۔ مگر ادب سے کوئی شخص جرأت سوال نہ کر سکا۔ فاتحہ کے بعد خود بادشاہ نے فرمایا۔ کہ

"اے بندگانِ با اخلاص! جو خیال اس وقت میرے دل میں گزرا۔ اس کا اظہار تم پر بھی واجب سمجھتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ فرعون نے ایک آبنوس اور ہاتھی دانت کے تخت پر بیٹھ کر دعویٰ خدائی کیا تھا گواہ اور آگاہ رہو کہ جس نخوت اور تکبر سے اس نے وہ دعویٰ کیا تھا اس سے کہیں زیادہ عجز و نیاز کے ساتھ میں عبودیتِ الٰہی کا اقرار کرتا ہوں۔"

یہ کہکر اٹھا اور دوگانہ شکرانے کا بجا لا کر دیر تک پیشانی کو زمینِ نیاز پر ملتا رہا۔ وقت کی تاثیر سے دربار میں بھی سناٹے کا عالم ہو گیا۔ سب کے دل آب ہو گئے، اور سینوں کے دلوں نے دمِ گرم سے اس ایوان میں ایک گونج پیدا کی۔ (قصص ہند از مولانا آزاد)

یہ ہے شاہجہان کا ایمان اور اس کا دلی اعتقاد۔ اس پر اس کی سر بفلک مسجدیں اور اسلامی آرٹ کی دلکش عمارتیں زبانِ حال سے آجتک شہادت دے رہی ہیں۔ اور یہی شاہجہان کی اصلی تصویر ہے۔ اس پر بھی اگر وہ خاور صاحب کی نگاہوں میں لامذہب اور رکمزور کیرکٹر کا نظر آتا ہے تو پھر مجھے لیلائے اخیلیہ کا وہ شعر جو اس نے اپنے محبوب توبہ بن الحمیر کے لئے کہا تھا، خاور صاحب کی خدمت میں عرض کرنا ہو گا ۔

فَنِعْمَ الْفَتیٰ اِنْ کَانَ تَوْبَۃُ فَاجِراً
وَفَوْقَ الْفَتیٰ اِنْ کَانَ لَیْسَ بِفَاجِرٖ

یعنی توبہ اگر اس وصف کے باوجود بھی بدکار تھا تو وہ ایک بہترین انسان تھا اور اگر بدکار نہیں تھا۔ تو وہ ایک مافوق الفطرت انسان تھا۔

شاہجہاں کا شوقِ تعمیر

عہدِ گل را از نظیری مے شنو
عندلیب آشفتہ تر گفتہ است این افسانہ را

خاور صاحب کا خیال ہے۔ کہ حضرت شاہجہان بادشاہ نے غازیانہ کو تاج اور دیگر عمارات کی تعمیر میں لگا دیا تھا۔ جب بادشاہ ہر وقت شوقِ تعمیر کے نشہ میں مست و مدہوش رہتے تھے۔ رعایا کی بہبود کا انہیں احساس تک نہ تھا۔ اس لئے ہندوستان کے لوگ فاقہ کشی کر رہے تھے۔ ہر طرف افلاس و نکبت چھا رہی تھی۔ چنانچہ پہلے اورنگ زیب کی زبان سے اس امر کا اظہار کرتے ہیں شہزادہ محاب تاج محل کی عمارت پر نکتہ چینی کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"بادشاہ اپنے سلطنت کی ساری آمدنی ایک فضول ہی عیم صرف کر دی ہے۔ پورے پانچ سال بیس ہزار کاریگر ہیں اور مزدوروں کی ملازمت اور چالیس لاکھ روپیہ کھینچ!"

دوسرے موقعہ پر جبکہ شہنشاہِ ہند قلعہ آگرہ سے تاج کا نظارہ کر رہا ہوتا ہے جعفر وزیرِ اعظم آگے بڑھ کر رعایا کی تباہی کی مفصل رو تیداد پیش کرتا ہے۔

"حضور اس عظیم الشان روضہ کو ملکہ مرحومہ کی محبت فطرت کا اعلان کرتے ہیں۔ اور خود زندہ انسانوں سے منہ موڑ چکے ہیں۔ حضور کی مفلوک الحال رعایا محصولات سے زیر بار ہو کر اپنے آقا کے سامنے جو اس کی حالت سے بے خبر ہے، فریاد کناں ہے اور پیٹ بھرنے کیلئے روٹی طلب کرتی ہے مگر حضور اسے سنگ و پتھر عطا فرماتے ہیں۔ فرمائیے شاندار محل اور پُرشوکت روضے حضور کی فاقہ مست رعایا کے کس کام آسکتے ہیں۔" (صفحہ ۱۳۶)

جعفر بادشاہ کو متوجہ دیکھکر زیادہ رنگ آمیزی سے قحط کی تصویر کھینچتا ہے۔

"آجکل تو بلا مبالغہ حالت یہ ہے۔ کہ انسان سر بازار اضلاع جان کو ایک پارۂ نان کے عوض فروخت کرتے ہیں۔ مگر انہیں کوئی گاہک نہیں ملتا۔ لوگ کھانے کے عوض اپنے عہدے اور منصب دینے کے لئے تیار ہیں لیکن کوئی شخص انہیں اس قیمت پر بھی قبول نہیں کرتا۔ مردار خوار جانوروں کا گوشت لذائذ میں شمار ہوتا ہے۔ اور قحط نے لوگوں کو یہاں تک مجبور کر رکھا ہے۔ کہ مُردوں کی ہڈیوں کو پیس کر آٹا تیار کرتے ہیں۔ اور اپنے ہمجنسوں کے مُردہ جسم کو ایک لقمۂ تر سمجھتے ہیں۔ باپ کو بیٹے کا گوشت اس کی محبت سے زیادہ عزیز ہے۔ سڑکوں پر لاشوں کے ڈھیر لگے ہیں۔ اور جو بد قسمت لوگ زندہ ہیں وہ مفلوک الحال انسانوں کی طرح دربدر مارے مارے پھرتے ہیں۔ افسوس یہ لوگ زندگی کی مصیبتوں سے تنگ آکر موت کے دامن میں پناہ تلاش کرتے ہیں۔" (صفحہ [illegible])

معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر خاور نے خدا سے کی تھا دس میں کسی تاریخی کتاب کا مطالعہ نہیں کیا، یوں ہی جو کچھ جی میں آیا آناً فاناً لکھتے چلے گئے ہیں ورنہ اپنے مفید مطلب امور کو نظر انداز نہ کرتے۔ کیونکہ:-

(۱) تاج کی تعمیر پر چالیس لاکھ نہیں بلکہ چھ کروڑ روپیہ خرچ ہوا ہے۔ پادشاہ نامہ میں صرف معماروں اور مزدوروں کی اجرت دکھائی گئی ہے جو پچاس لاکھ کے قریب ہوتی ہے۔

(۲) خاور صاحب نے تعمیر کا عرصہ پانچ سال لکھا ہے۔ حالانکہ مؤرخین کا اس امر پر اتفاق ہے۔ کہ ۱۶۳۱ء میں تاج کی تعمیر شروع ہوئی اور ۱۶۴۷ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ اس کے بعد چار سال تک گرد و نواح کی عمارتیں بنتی رہیں۔ اس طرح کل بیس سال تعمیر پر صرف ہوئے۔

(۳) خاور صاحب کا خیال ہے۔ کہ اتنی شاندار عمارت اور دیگر فلک بوس محلات کی تعمیر سے جو صرفہ اٹھا ہوگا۔ اس سے یقیناً خزانہ کا دیوالیہ نکل گیا ہوگا اور قحط رونما ہوا ہوگا۔ اس کے جواب میں "تاریخ آگرہ" کی سطور ذیل پیش کی جاتی ہیں:-

"۱۶۳۱ء میں اس زندہ جاوید یادگار عمارت کی تعمیر جو بنی ماڈل کے بموجب جمنا کے کنارے شروع ہوئی۔ بیس ہزار چابکدست مزدور اور معمار کام پر لگائے گئے تعویذوں اور خطوں کی دیواروں کے لئے جواہرات تراشے جانے لگے، نربدا سے مرمریں پتھر چھکڑوں پر لد کر آنے لگے۔ ایک ایک چھکڑے میں سو سو اور پچاس پچاس بیل جوتے ہوتے ہونگے۔ پہیوں سے ایسی دلفریب اور دلکش آواز نکلتی کہ راجا نل کی رتھ بانی کی یاد تازہ ہو جاتی۔ سنگ تراشوں کی کھٹا کھٹ، معماروں کی دھڑا دھڑ سے ایک عجیب ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ جمنا کے کنارے معماروں اور مزدوروں کا ایک شہر سا بنا ہوا تھا۔ سو سو قدم کے فاصلہ پر خزانوں کے خیمے نصب تھے اور ہر خیمہ میں ایک ہندو خزانچی تین منشی اور دس سپاہی خزانے کی نگرانی پر مامور تھے۔ روپے پیسے اور دوئی چونیوں کا ایک ڈھیر سا لگا ہوا تھا۔ کہ جب بھی معمار مزدور کام سے فارغ ہوں دھیلے پیسے تک ان کی مزدوری ادا ہو جائے۔ بیس سال تک اسی جوش و خروش کے ساتھ تعمیر کا کام جاری رہا۔ سامان کا اکثر حصہ دور دراز کی مسافت سے خراج کے طور پر لایا گیا۔ گویا مہاراجوں نے بھی تاج کی تعمیر سے یہ فائدہ اٹھایا۔ کہ بجائے روپوں کے پتھر دے کر خراج سے چھٹکارا حاصل کیا۔ مزدوری کے لئے تین جاگیروں کی آمدنی وقف کر دی گئی۔ اور خزانہ عامرہ کی ایک پائی بھی اس عمارت پر صرف نہ ہوئی۔ نہ رعایا پر کسی قسم ٹیکس لگایا گیا۔ وقت پر ہر مزدور کو پوری پوری مزدوری ادا ہو جاتی۔ کام کا بیشتر حصہ امانی میں دیا جاتا اور ایک متنفس کو بھی بیگار کے طور پر نہ لگایا گیا۔ پورے چھ کروڑ کے مصارف سے یہ عمارت بن کر تیار ہوئی اور ایک تبرک اثر ساعت میں ملکہ کے جنازہ کو اس کے "عارضی مدفن" سے منتقل کر کے "تاج" کے تہ خانہ میں سپرد خاک کیا گیا۔"

یہ تو "تاج" کی تعمیر کی اجمالی روئیداد ہے لیکن شاہجہان کا ذوق تعمیر محض یہاں تک محدود نہ تھا۔ بلکہ اس نے اپنی قلمرو کے ہر موزوں مقام پر مساجد اور سرائیں تعمیر کروا ڈالی تھیں۔ ایک ہی زمانہ میں آگرہ میں محلات شاہی تعمیر ہو رہے تھے۔ اور دہلی میں شاہجہان آباد۔ لال قلعہ۔ بادشاہی مسجد۔ فتحپوری مسجد۔ زینت النساء مسجد۔ لاہور میں شالامار باغ، قلعہ لاہور کے دیوان خاص و عام۔ اور کشمیر میں جامع مسجد اور دارالعلوم کی نادرۂ روزگار عمارت پایۂ تکمیل کو پہنچ رہی تھی۔ ان تمام عمارات کے مزدور و معمار خالص ہندوستانی تھے۔ امانی پر کام ہوتا تھا۔ اور شام چار بجے ہر مزدور کو اس کی مزدوری کا پیسہ پیسہ مل جاتا تھا! اجناس کی فراوانی تھی۔ رعایا روپوں پیسوں سے کھیل رہی تھی کسی عمارت پر بھی بیگار سے کام نہ لیا گیا۔ اس لئے اس تعمیری سلسلہ میں یہ فائدہ مترتب ہوا۔ کہ ہندوستان کے طول و عرض میں رعایا کے لئے محنت مزدوری کرنا آسان ہو گیا۔ اس عالی دماغ بادشاہ نے نہ صرف رعایا کی پرورش کی ایک مفید صورت پیدا کر لی۔ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اپنے بعد ایسی لاثانی عمارات کا لامتناہی سلسلہ چھوڑ گیا۔ کہ ہندوستان دنیا میں فخر سے سر اٹھانے کے قابل ہو گیا۔

خاور صاحب نے تو ڈراما میں اپنا تمام تر زور یہ دکھانے پر صرف کر دیا ہے کہ ملکہ کی وفات پر بادشاہ ماؤف الدماغ ہو گیا تھا اور اسے "تاج محل" کے سوا کسی امر سے سروکار نہ رہا تھا۔ حالانکہ تاریخ دان حضرات پر خوب روشن ہے کہ شاہجہانی عمارات سب کی سب ملکہ کی وفات کے بعد معرض وجود میں آئیں کیونکہ ملکہ ممتاز محل علیہا الرحمۃ والغفران نے بادشاہ کی شہنشاہی کے صرف دو جلوس دیکھے تھے۔ یعنی ۱۶۲۸ء میں شاہجہان سریر آرائے سلطنت ہوا اور ۱۶۳۰ء میں ملکہ برہان پور کے مقام پر انتقال کر گئی۔ ظاہر ہے کہ

شہزادگی کے ایام میں تو شاہ جہان کچھ کر نہ سکتا تھا۔ اور نہ اس کا ذوقِ تعمیر اس حد کو پہنچا تھا۔ "تاج" کی تعمیر کے بعد ہی بادشاہ کو ایسی پُر تفریح عمارات کے قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا تھا۔ اِس تعمیری سلسلے کے ساتھ ساتھ بادشاہ کو رعایا کے آسودہ ہونے کا جو خیال تھا وہ محبّ امین گورنر سورت کے واقعہ سے ظاہر ہے۔ اسی طرح بادشاہ نے سفرِ کشمیر میں گورنر کشمیر کو بھی اس جرم میں معزول کر دیا تھا کہ اس کے عہد میں رعایا آسودہ نہ تھی۔ جن لوگوں کو سرینگر کی شاہی جامع مسجد میں جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ یہ عالیشان مسجد ایک بلند دیودار درخت کے سالم ستونوں پر قائم ہے۔ اِن شہتیروں کی لمبائی اور موٹائی دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ کس جرِ ثقیل کے ذریعے سے وہاں لائے گئے۔ اس مسجد کے ایک کتبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب شاہ جہان بادشاہ نے سرینگر کا دورہ کیا۔ تو وہاں کی رعایا نے کچھ شکایتیں ان کے حضور میں پیش کیں۔ اس پر ایک فرمان صادر ہوا۔ اور یہ فرمان بجنسہٖ فارسی زبان میں اس پتھر پر کندہ کر دیا گیا۔ جو مسجد کے پھاٹک پر آج بھی نصب ہے۔ اس کتبہ کے منجملہ دیگر احکام کے ایک حکم ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:۔

"ما بدولت کو تحقیقات سے معلوم ہوا ہے۔ کہ زعفران کی پتی چُننے والوں کو اور شال پر سُوئی کا کام بنانے والوں کو بعض اوقات پوری مزدوری نہیں ملتی۔ لوگ اس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ کہ اس قسم کا کام کرنے والوں کی آنکھوں پر کس قدر زور پڑتا ہے۔ اُمید ہے کہ آئندہ ایسی شکایات ما بدولت کے کانوں تک نہ پہنچیں گی۔"

ناظرینِ کرام اس سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس دین پرور اور معدلت کیش شہنشاہ کے حضور [illegible] کس آسانی سے لوگوں کی رسائی ہو جاتی تھی۔ اور شہنشاہ کو اپنی رعایا کے ساتھ کس قدر ہمدردی تھی۔ اور اس کی تحقیقات اور معلومات کی یہ حد تھی کہ وہ جانتا تھا۔ کہ ان مزدوروں اور کاریگروں کو کس قدر مشقت اور محنت برداشت کرنا ہوتی ہے۔ اور اس کا ان کی صحت پر کیا مضر اثر پڑتا ہے؟ پھر اس نے محض کاغذ پر فرمان جاری کرنے پر قناعت کی۔ بلکہ اپنی محبوب رعایا کی تکلیف کے دفعیہ کے لئے اپنا حکم ایک ایسے منظرِ عام پر کندہ کر دیا۔ کہ تا قیامِ قیامت اس کی انصاف پروری اور بیدار مغزی کے ثبوت میں آفتاب بنکر چمکتا رہے گا۔

ملکہ ممتاز محل کے مذہبی خیالات

"بوسیو پادری" سے شہنشاہِ ہند کچھ دیر محوِ اختلاط رہتا ہے۔ پھر مسکرا کر اسے اپنے ہمراہ ملکہ ممتاز محل کے حضور میں لے جاتا ہے۔

"خیر ہم ملکۂ عالم کو زیادہ دیر تمہاری گفتگو سے محروم نہیں رکھنا چاہتے۔ اور تمہیں خود اس کے پاس مشکوئے معلیٰ میں لئے چلتے ہیں۔"

ایک اور مقام پر جبکہ ملکہ مرض الموت میں گرفتار ہوتی ہے۔ اکبر آبادی لونڈی اس کے عقائد کے بارہ میں حسبِ ذیل بیان دیتی ہے:۔

"ممتاز کا دل عیسائیت کی طرف مائل ہے۔ اس لئے جب مُلّا اس کی بیمار پرسی کو آیا تو اس نے اسے اپنے پاس آنے کی اجازت نہ دی۔ اور جب بوسیو (یعنی پادری) اس کی عیادت کے لئے آیا تو اس نے اس کا بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا۔ جاتے وقت بوسیو نے ایک سُولی پر ٹنگے ہوئے نیم برہنہ انسان کی صورت عطا کی جس کی یہ نامراد عیسائی پرستش کرتے ہیں۔"

مُلّا۔ "ملکہ ہمارے پیغمبر کی سخت دشمن ہے۔"

دارا۔ "وہ بادشاہ کی نصف بہتر نہیں بلکہ ایک عیسائی ہے۔"

ہیرا بائی (اورنگ زیب) "تمہاری بدخواہ ممتاز محل خدا کی دشمن۔ نصاریٰ کی بہی خواہ اور دارا کی طرفدار تھی۔"

(صفحہ ۱۱۸)

تاریخ دان حضرات پر خوب روشن ہے۔ کہ عہدِ مغلیہ میں حرم سرائے سُلطانی میں پردے کا کس قدر اہتمام ہوتا تھا۔ برنیئر جو ایک متعصب عیسائی سیاح ہے۔ اس نے کئی بار اس امر کا اعتراف کیا ہے۔ کہ جب شاہی حرم کی سواری نکلتی تھی، تو ہر طرف قلماقنیاں پہرے پر تعینات ہوتی تھیں۔ حدِ نگاہ تک مردوں کو آنے جانے کی اجازت نہ ہوتی تھی۔ ایک دفعہ برنیئر کو طبیب کی حیثیت میں حرمِ سُلطانی کے اندر جانے کا اتفاق ہوا۔ تو آنکھوں پر پٹیاں باندھ دی گئیں۔ شہزادی جہاں آرا اپنی سالگرہ کے جشن کے موقعہ پر دربار کا منظر ملاحظہ فرما رہی تھیں۔ اُٹھتے وقت شمع کی لو کپڑوں سے لگ گئی۔ لباس عطر سے بسا ہوا تو تھا ہی فوراً آگ سے بھڑک اُٹھا۔ [illegible] بدن جل گیا اور ایک دو لونڈیاں بھی بچاتے ہوئے موت کا شکار ہو گئیں۔ مگر حفظِ ناموس نے چیخ نکالنے کی اجازت نہ دی۔ محض اسی لئے کہ

ہماری دربار تک نہ پہنچ سکے۔ تاریخی حقائق ہیں۔ جن سے کوئی مؤرخ انکار نہیں کرسکتا۔ خاور صاحب کی دلیری ملاحظہ ہو۔ کہ وہ پادری بسو کا پُرتپاک خیر مقدم کراتے ہیں۔ اور ملکہ کے مرتبے سے عیسائیت کی حمایت محض اس وجہ سے کراتے ہیں۔ کہ عیسائیوں کے مذہب میں ایک شادی کی اجازت ہے اور ملکہ تعدد ازدواج کو سخت معیوب سمجھتی تھی۔

خاور صاحب کی تاریخ دانی کا یہ عالم ہے۔ کہ وہ اورنگ زیب کو ممتاز کا سوتیلا بیٹا قرار دیتے ہیں۔ اور دارا کے مُنہ سے والد کے حق میں ناسعادت کلمے نکلواتے ہیں۔ حالانکہ شاہجہان کی جملہ اولاد ممتاز کے بطن سے تھی۔ اور جس وقت ملکہ کا اِنتقال ہوا، اُس وقت ملکہ کی حسبِ ذیل اولاد بقیدِ حیات تھی:۔

۱۔ شہزادی جہاں آرا بیگم۔ ۴۔ روشن آرا بیگم۔
۲۔ محمد دارا شکوہ۔ ۵۔ محمد اورنگ زیب۔
۳۔ محمد شاہ شجاع۔ ۶۔ محمد مراد بخش۔
۷۔ گوہر آرا بیگم۔ اس کی پیدائش پر ملکہ کا اِنتقال ہوا۔ اور یہ بھی جانبر نہ ہو سکی۔

خاور صاحب کا بیان ہے۔ کہ ملکہ نے آگرہ میں اِنتقال کیا۔ اور شہزادہ اورنگ زیب کے ایما پر اس کی محبوبہ ہیرا بائی نے ملکہ کا تکیے سے گلا گھونٹ کر خاتمہ کر دیا۔ خاور صاحب کا مطلب سوا اس کے کیا ہو سکتا ہے کہ جس خوش قسمت ملکہ کا نام آج دُنیا میں آفتاب ماہتاب بنکر چمک رہا ہے۔ اس کی موت کو مکروہ انداز میں پیش کیا جائے اور مسلمانوں کے دلوں میں اس کے بارہ میں جو عقیدت کے جذبات موجزن ہیں ان کی بجائے نفرت و استحقار کے خیالات پیدا کئے جائیں۔ ملکہ کی وفات کا واقعہ ہندوستان کے طول و عرض میں اس قدر مشہور ہے۔ کہ مدرسہ کے بچوں سے لیکر عدالتوں اور کچہریوں کے اہلکاروں تک سب اس سے بخوبی آگاہ ہیں۔ مگر چونکہ خاور صاحب نے کمال دلیری سے لوگوں کی آنکھوں میں خاک جھونکنے کی کوشش کی ہے۔ اِس لئے مختصر سا تذکرہ ہم بھی پیش کئے بغیر نہیں رہتے۔ سیر المتاخرین کا مؤلف رقمطراز ہے۔

"نواب ممتاز محل کہ ارجمند بانو بیگم نام یاد داشت،
صبیہ مرضیہ یمین الدولہ آصف جاہ زوجہ پادشاہ بود۔
رحلت نمودہ در باغ زین آباد برہانپور بطور امانت گردید
و بعد چندے شاہ شجاع معہ وزیر خان و ستی خانم نعش را بمستقر الخلافہ
اکبر آباد آوردہ حسب الحکم بر کنارہ دریائے جمنا بخاک سپردہ
مقبرہ رفیعہ بر سرش بنا گذاشتند۔ یکے از ماہرانِ تاریخ رحلت او گفت
جائے ممتاز محل جنت باد" ؎

(سیر المتاخرین ۲۶۰)

ملک عنایت اللہ صاحب ملکۂ عالم کی وفات کا سانحہ ان رقت انگیز الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

"شاہ جہاں برہانپور ملک دکن میں خان جہاں لودھی کی سرکوبی کی غرض سے خیمہ زن تھا۔ کہ ناگہاں ایک دفعہ ممتاز محل علیل ہو گئی۔ آدھی رات کے وقت لڑکی پیدا ہوئی۔ لیکن اس کی تکلیفیں برابر بڑھتی گئیں۔ غش پر غش آنے لگے۔ آخر کار زندگی سے مایوس ہو گئی۔ تب شہزادی جہاں آرا کو جو اس کے پاس بیٹھی تھی اشارہ کیا۔ کہ زنانہ کمرہ کی سمت سے بادشاہ کو بلا لائے۔ اس وقت تین گھڑی رات باقی تھی۔ بادشاہ گھبرا کر فوراً آئے۔ اور سرہانے بیٹھ گئے۔ ممتاز محل نے اپنی آنسوؤں بھری آنکھیں کھول کر نظرِ یاس سے بادشاہ کی طرف دیکھا اور کہا کہ میرے بعد میری اولاد سے غافل نہ ہونا۔ اور میرے بیکس والدین کی بھی خبر گیری کرتے رہنا۔ پھر دوبارہ گہری نگاہ سے اپنے عمر بھر کے رفیق (شاہجہاں) کو دیکھا ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لیں"۔

شاہ جہاں کا دمِ واپسیں

خاور صاحب اپنے ڈراما میں دارا کی شکست کے بعد اورنگزیب کا شاہجہاں کے دربار میں داخلہ کا منظر دکھاتے ہیں۔ اور پھر اورنگ زیب برسرِ دربار شاہجہاں کو قید کر کے جیل میں بھیج دیتا ہے۔ جہاں بادشاہ اپنی زندگی کے آخری دس سال گذار دیتا ہے۔ آخر میں اورنگ زیب پھر قیدی بادشاہ کے پاس پہنچتا ہے۔ شاہ جہاں روضہ تاج محل میں مرنے کی خواہش کرتا ہے۔ جس پر اورنگ زیب خفیہ طور پر رات کو وہاں بھجوا دیتا ہے، اور شاہ جہاں رات کی تاریکی میں ممتاز کی رُوح سے ہمکلام ہوتا ہے۔ اور پھر گر کر مر جاتا ہے۔

تاریخی اعتبار سے خاور صاحب کے اِس بیان کا ایک حرف بھی درست نہیں۔ اورنگ زیب خفیہ سازش کے خوف سے ثمن گڑھ کی لڑائی کے بعد والد سے نہیں مل سکا۔ نظربندی کا عرصہ سات سال کا ہے۔ اور اس کی وفات قلعہ اکبر آباد میں واقع ہوتی ہے۔ عالمگیر نامہ کی عبارت کا ملخص حسبِ ذیل ہے:۔

"بادشاہ کو ۱۲ رجب ۱۰۷۶ھ کو مرض لاحق ہوا کہ پیشاب کا رکنا عارضہ

جس کو مرض الموت کہنا چاہیے لاحق ہوا۔ حکیم مومنا نامی شیرازی نے
جو اس وقت کے شاہی طبیبوں میں ایک مشہور شخص تھا۔ ہر چند
علاج کیا، مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ بلکہ اسہال وغیرہ کئی طرح کے اور
عوارض پیدا ہو کر زندگی سے یاس ہو گئی جب یہ خبر عالمگیر کو
پہنچی۔ تو اپنی آخری زیارت کو دلی سے آگرہ کو روانہ ہوا۔
لیکن ابھی راستے میں ہی تھا کہ ۲۶ رجب شب پنجشنبہ کو
آدھی رات سے پہلے شاہجہان کا طائر روح قفس عنصری سے
پرواز کر گیا۔ شہزادی جہاں آرا، رعد انداز خاں قلعدار اور
بہلول خواجہ سرا کو غسلخانہ (دیوان خاص) میں طلب کر کے
اور ان کی معرفت اس وقت قلعہ کے دروازوں کو کھلوا کر
کھلوا کر غسل و کفن کی تیاری کے لئے سید محمد قنوجی کو جو بڑے
عالم اور درویش مسلک تھے مع مولانا محمد قربان قاضی
دار الخلافہ آگرہ کے قلعہ میں بلوایا۔ چنانچہ آدھی رات کے وقت
جب وہ دونوں حاضر ہوئے تو قضائے روزہ و نماز کے عوض
(اگرچہ اس کی نماز و روزہ کبھی قضا نہ ہوتے تھے) برسم اسقاط
اوّل بہت سا روپیہ خرچ کیا گیا۔ اور بعد ازاں برج مثمن سے
کہ جہاں انتقال کیا تھا، لاش کو اٹھا کر قریب کے ایک مکان میں
غسل و کفن دے کر صندل کے تابوت میں رکھا گیا، اور برج مثمن
کے نیچے کے دروازہ سے جنازہ کو باہر لائے۔ اور ملکہ کے
پہلو میں دفن کیا۔ اورنگ زیب کو خبر پہنچی۔ تو وہ بہت رویا
اور سوگواری کی۔ لباس سفید پہن کر تاج محل پہنچا۔ اور دھوم
دھام سے خیرات کی۔"

ملک کی فارغ البالی

اب عہد مغلیہ کے اس زریں دور کی فارغ البالی کا نقشہ پیش کیا جاتا
ہے۔ اس وقت کپتان ہملٹن کا سفرنامہ میرے پیش نظر ہے۔ یہ فاضل
انگریز اس زمانہ میں بہت سا سوداگری مال و اسباب لیکر مع چند توپوں اور
تھوڑے سے فوجی سپاہیوں کے ولایت سے روانہ ہوا۔ اور افریقہ، عرب
اور ایران کے تمام ساحل پر تجارت کرتا ہوا آخر کار ہندوستان آ پہنچا۔ اور
۲۵ برس کے قریب اس مملکت میں بسر کر ڈالے۔ ساحل ہندوستان پر
کوئی بڑا شہر نہ تھا۔ جہاں یہ مورخ سوداگر نہ گیا ہو۔ خلاصہ یہ کہ اس شخص کا علم
فائق ہے۔ اور اس کے بیانات بادی النظر میں بے غرض اور بے لوث معلوم
ہوتے ہیں۔ اس لئے میں کپتان صاحب موصوف کی اس عینی شہادت کو
پیش کرتے ہوئے فیصلہ ناظرین کرام پر چھوڑتا ہوں۔ کہ خفی خاں صاحب
اس زمانہ میں لوگ ہڈیوں کو پیس کر اس پر گذارہ کرتے تھے۔ شہر کے گلی
کوچوں میں لاشوں کے انبار لگے تھے یا ملک فارغ البال و آسودہ تھا۔

ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہو گی

کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ

"ایسٹ انڈیا کمپنی کو دوبارہ تجارت کرنے کا اجازت نامہ
ایک منشور خسروی عطا ہوا۔ اور جب یہ فرمان شاہی
(مع ان تمام لوازم کے جو ایسے موقعوں پر بطور اعزاز و اکرام
مبذول فرمائے جاتے ہیں) شرف صدور لایا۔ تو اس کے
احترام میں ایک بڑا دربار منعقد کیا گیا۔ اور گورنر سورت نے
کمال ادب و احترام سے اس فرمان (منشور خسروی) کو
پڑھ کر سنایا۔ اور ساتھ ہی کمپنی کے مہتمم اعلیٰ کو ایک عمدہ گھوڑا
اور بیش قیمت اطلس یا زربفت کا خلعت جس پر کارچوبی
سنہری روپہلی گل بوٹے کاڑھے گئے تھے، عطا کئے۔"

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں۔

"اس ملک کی رعایا فرامین کی اس قدر پابندی کرتی ہے
کہ ڈاکہ و قتل کی خبریں بہت کم سنی جاتی ہیں۔ ایک غیر ملک کا
باشندہ اس ملک میں کہیں چلا جائے، کوئی بھی تو نہیں پوچھتا
کہ وہ کہاں جاتا ہے۔ اور کیوں جاتا ہے۔"

(سفرنامہ کپتان ہملٹن جلد اول صفحہ ۲۲۹)

شاہی ٹیکس جن کا خافی خاں صاحب نے بار بار ذکر کیا ہے تجارت پیشہ
حضرات پر صرف اس قدر تھا۔

"مسلمان ۲ فیصدی، عیسائی ۲ تا ۳½ فیصدی
ادا کرتے تھے۔ اور مال جب ساحل پر اترتا تھا۔ اس وقت
کوئی ٹیکس نہ لیا جاتا بلکہ آخر سال، مال کے فروخت ہونے پر
وصول کیا جاتا تھا۔" (جلد اول صفحہ ۱۴۸)

اتنی قلیل شرح کے باوجود چونگیوں کی جو آمدنی تھی اس کا اندازہ سورت اور
احمد آباد کی آمدنیوں سے لگائیے۔ کپتان صاحب لکھتے ہیں کہ

"سورت بندر میں چونگی کی آمد ۲۲ لاکھ روپیہ سالانہ ہے
احمد آباد میں ایک کروڑ ۳ لاکھ روپیہ سالانہ چونگی کی
آمد ہوتی ہے۔"

جب سوداگروں سے اس قدر قلیل ٹیکس وصول کرنے پر بھی حکومت کو
گراں مقدار آمد ہو جاتی تھی۔ تو تجارت پیشہ لوگوں کا کس قدر مال ہوتا ہو گا

اس ملک میں کھپتا ہوگا۔ ملک کی فارغ البالی کا قیاس اس سے اچھی طرح ہو سکتا ہے۔

کپتان ہملٹن نے سورت کے ایک سوداگر عبدالغفور کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

"میں نے دیکھا ہے۔ کہ عبدالغفور سوداگر سورت سال میں تقریباً مال کے بیس جہاز بھر کر بھیجتا ہے۔ اس کے جہاز ۳۰۰ سے ۸۰۰ ٹن تک کے ہیں۔ اور ہر ایک جہاز میں صرف اس کا مال دس ہزار پونڈ اور بعضوں میں پچیس ہزار پونڈ کا تھا۔ اور جب یہ مال باہر روانہ ہو چکتا تب بھی اس سے زیادہ مال اس کے پاس آئندہ کے لئے بچ رہتا۔"

(جلد اوّل صفحہ ۱۴۷-۱۴۸)

اس زمانہ کے اعداد و شمار کے لحاظ سے عبدالغفور کا یہ سرمایہ کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا۔ کپتان صاحب کا نوٹ قابل غور ہے۔ فرماتے ہیں۔

"عبدالغفور کا سرمایہ تجارتی "ایسٹ انڈیا کمپنی" کی کل سرمایہ و تجارت کے برابر ہے۔"

جب "ایسٹ انڈیا کمپنی" کے سرمائے کا مقابلہ سورت کا صرف ایک سوداگر کر سکتا ہے۔ تو ہندوستان کے کل سوداگروں کے سرمائے کی کیا کیفیت ہوگی۔ اسی زمانہ میں گولکنڈہ کے امیر کبیر جملہ "ہیروں" کی تجارت کر رہا تھا۔ ہیرے اس کثرت سے نکل رہے تھے۔ کہ ان کا شمار نہ ہو سکتا تھا۔ بلکہ ہیروں سے بھری ہوئی بوریوں کو گن لیا جاتا تھا۔ ان کانوں کا ٹھیکہ اس نے لے رکھا تھا۔ اور ہزاروں لوگ کام پر لگے ہوئے تھے۔ اگرچہ یہ مشہور سوداگر افواج گولکنڈہ کا سپہ سالار بھی تھا۔ مگر اس نے اپنے خرچ سے ایک بڑا لشکر بمعہ توپ خانہ کے تیار کر رکھا تھا۔ اس کے تموّل کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے۔ کہ جب گولکنڈہ کے سلطان نے اس کی مخالفت پر کمر ہمت چست کی۔ تو اس نے شہزادہ اورنگ زیب کو ذیل کا عریضہ ارسال کیا۔

"بندہ کی خدمات کا لحاظ نہ کرتے ہوئے شاہ گولکنڈہ میرے اور میرے خاندان کی بیخ کنی کے درپے ہو رہا ہے۔ اس لئے میں آپ کی پناہ میں آنا چاہتا ہوں۔ اور اس درخواست کی قبولیت کے شکریہ میں گولکنڈہ کا فتح کرا دینا میرے ذمہ رہیگا۔ اور ساتھ ہی اس مہم کا کل خرچ یہ بندہ ادا کریگا۔ اور اس کے سر ہونے تک پچاس ہزار روپیہ یومیہ ادا کرتا رہوں گا۔"

جو شخص نامعلوم عرصے تک نصف لاکھ روپیہ روزانہ ادا کر سکتا ہے، اس کی سرمایہ داری کا کیا کہنا۔ اگر اب بھی خاور صاحب کے بیان کو لوگ ہڈیاں پیس پیس کر تنور شکم کو بھرتے تھے۔ کوئی آدم زاد صحیح تسلیم کرے۔ تو اس سے خدا سمجھے۔

آیئے۔ اب ذرا اجناس کے نرخ پر طائرانہ نظر ڈالیں۔ کہ جب ہندوستان میں اشرفیوں اور روپوں کی اس طرح سے بارش ہو رہی تھی، اور ہیروں کے شمار کرنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس دور میں کھانے پینے کی ضروری چیزیں کس شرح پر دستیاب ہو جاتی تھیں۔ کپتان ہملٹن نے اپنے سفرنامے میں چند چیزوں کا نرخ لکھا ہے۔ میرے خیال میں ملک کی معاشرتی زندگی کا خاکہ کھینچنے کیلئے اتنا مواد کافی ہے۔ لکھتے ہیں۔

گائے کا گوشت چند کوڑیوں میں نصف سیر مل جاتا تھا۔

(جلد اوّل صفحہ ۱۶۱)

نمک ۳ پیسے میں اٹھائیس من ملتا تھا۔ (" " ۲۵۵)

مچھلی ساڑھے تین آنہ میں ۱۲ سیر مل جاتی تھی۔ (" ۲۷۹)

مکھن ایک آنہ میں نصف سیر ملتا تھا۔

چاول ایک روپے میں سوا سات من آتے تھے۔

ہرن۔ بارہ سنگھے اس کثرت سے پائے جاتے تھے۔ کہ لوگوں کے گھروں میں بلا خوف و خطر آیا جایا کرتے تھے۔

(جلد اوّل صفحہ ۱۲۴ سفرنامہ کپتان ہملٹن)

مندرجہ بالا اعداد و شمار کے ملاحظے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ شاہجہانی دور میں ہندوستان کے لوگ اپنی زیست کے اسباب فراہم کرنے میں اس قدر حیران و پریشان نہ تھے۔ جتنا کہ آج نظر آ رہے ہیں۔

اورنگ زیب کے اخلاق فاضلہ

وہ مجاہد فی سبیل اللہ۔ وہ مرد تیغ زن، جس پر باللیل رہبان وبالنہار فرسان کا مثل صادق آتی ہے۔ جس نے دہلی کے تخت پر بیٹھ کر مٹی کے برتنوں میں کھانا کھا کر زندگی بسر کی جو ٹوپیاں سی اور کلام اللہ لکھ کر قوت لایموت کے لئے کچھ پیدا کرتا تھا۔ وہ متوکل علی اللہ درویش صفت تاجدار جسے دنیا محی الملتہ والدین محمد اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ غازی کے نام سے یاد کرتی ہے۔ خاور صاحب کی نگاہ میں ایک مکار اور بدقماش انسان سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ چنانچہ اپنے ڈراما میں اس کا اپنے باپ کی مدخولہ لونڈی سے عشق کرنا

ظاہر کیا ہے۔ اور دیباچہ میں معذرت خواہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ تاریخوں میں اورنگ زیب کا اپنی ممانی سے عشق کرنا مذکور ہے۔ مگر میں نے جرم کو ہلکا کرنے کے لئے ممانی کی بجائے لونڈی کا ذکر دیا ہے۔ لیکن جہاں تک ہماری تحقیق کا تعلق ہے۔ ہم نے ان دونوں میں سے کسی ایک کا بھی تاریخوں میں ذکر نہیں پڑھا۔ البتہ مولانا محمد حسین صاحب آزاد نے اتنا لکھا ہے کہ :-

"حالت شہزادگی اور عالم نوجوانی میں ایک حرم سے محبت تھی وہ قضائے الٰہی سے مرگئی۔ چنانچہ نہایت رنج ہوا۔ اور جی بہلانے کے لئے دوسرے دن شکار کو سوار ہوا۔ جنگل میں جا کر جب خواص و ملازم ادھر ادھر پھیل گئے۔ تو عاقل خاں نام ایک امیر نے چپکے سے عرض کی۔ کہ اس رنج و ملال میں شکار کی تکلیف نہ فرمائی! آبدیدہ ہو کر یہ شعر پڑھا ؎

نالہا ئے کلبہ احزاں تسلی بخش نیست
در بیاباں می تواں فریاد خاطر خواہ کردن

عاقل خاں نے اسی وقت فی البدیہہ یہ شعر پڑھا ؎

عشق چہ آساں نمود آہ چہ دشوار بود
ہجر چہ دشوار بود یار چہ آساں گرفت

یہ سنکر زار زار آنسو جاری ہو گئے۔ جب دل ٹھہرا تو پوچھا، کہ یہ کس کا شعر ہے۔ اس نے عرض کی، ایسے شخص کا شعر ہے جو حضور کے سامنے اپنے تئیں شاعر نہیں کہہ سکتا۔ شہزادہ مسکرایا اور کئی دفعہ پڑھوایا۔"

اگر ایک "حرم" سے "ممانی" مراد لی جا سکتی ہے۔ تو پھر مجبوری ہے۔

صفحہ ۶۳ پر شہزادہ کی زبان سے اپنی فوج کے ناتربیت یافتہ اور طریق کے نکما اور بودا ہونے کا اظہار کرایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :-

"ہماری فوج نویس ایک غیر تربیت یافتہ ہجوم ہے۔ اور ہمارا طریق جنگ بالکل نکما اور بودا ہے۔ ہمارے سپاہیوں کا نشانہ درست نہیں۔ لیکن ایرانی نشانہ باز ایسا تاک کر نشانہ لگاتے ہیں۔ کہ ان کی کوئی گولی خطا نہیں جاتی۔"

(خاور۔ صفحہ ۶۳)

جن لوگوں نے مغل دور کی سیاسیات کا مطالعہ کیا ہے اُن پر خوب روشن ہے کہ ایرانی افواج کو با لحاظ تنظیم و تربیت کے ہندوستان کے تلوار انداز فوجیوں پر کچھ تفوق حاصل نہ تھا۔ قندھار کی مہم سے دستبردار اس لئے ہونا پڑا۔ کہ مغل افواج میں ایرانی نژاد امرا کی کثرت تھی۔ وہ

دل و جان سے ایرانی تخت و تاج کے ہوا خواہ تھے۔ [illegible] ایران کا نقصان نہ ہونے دیتے تھے۔ شہزادہ محمد [illegible] بلخ اور بخارا کی افواج کے مقابلہ میں اپنی شمشیر خارا شگاف کے جو جوہر دکھائے ہیں، صاحب سیر المتاخرین نے انہیں بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ شہزادہ کی شجاعت اور توکل علی اللہ کے دو حسین منظر جا بجا میرے ذہن میں موجود ہیں۔ میں انہیں پیش کئے بغیر آگے بڑھنا نہیں چاہتا۔

"بخارا اور سمرقند کے معرکہ میں ایک دن جبکہ اوزبکوں نے اپنی کمانوں سے تیروں کا مینہ برسا رکھا تھا بیدار شہزادے نے اپنی فوج کی ہمت بندھانے کیلئے اپنی زرہ اُتار پھینکی، اور ڈھال کھول کر رکھدی اور فرمایا۔ آج ہم اسی طرح سے لڑینگے۔"

ایک اور لڑائی کی کیفیت یہ ہے۔

"جب اوزبکوں نے گھمسان کا رن کر رکھا تھا اور لڑائی کمال شدت کو پہنچ چکی تھی۔ ظہر کی نماز کا وقت آگیا۔ اورنگ زیب نے سواری سے اُتر کر نہایت اطمینان اور کمال بے فکری سے نماز شروع کر دی۔ جیسا کہ اپنے گھر میں ادا ہو رہی ہے۔ عبدالعزیز خاں والئے بلخ نے جب یہ صورت دیکھی۔ تو تڑپ اُٹھا۔ اور کہا "واللہ! ایسے آدمی سے مقابلہ کرنا خدا سے لڑنا ہے۔" اس نے فوراً دست صلح دراز کر کے جنگ بند کر دی۔ بلکہ [illegible] شاہجہاں کے حضور میں اپنی اطاعت کا [illegible]"

مجھے اجازت دیجئے۔ کہ میں یہاں شاہجہاں بادشاہ کے [illegible] سلوک کا بھی بیان کر دوں۔ جو اُس نے بلخ کے باغی امیر سے کیا تھا۔ اورنگ زیب سے پیشتر جب شہزادہ مراد بخش نے [illegible] خاں والئے بلخ کو شکست دیکر بھگا دیا تھا۔ تو اُس کے [illegible] شاہجہاں کے پاس دہلی کو روانہ کر دی گئی تھیں۔ [illegible] نذر محمد خاں کو اندازہ قدر دانی [illegible] دربار میں داخل کیا۔ چھوٹے لڑکے عبدالرحمن [illegible] سپرد کیا۔ اور لڑکیوں کو عصمت [illegible] تکریم کے ساتھ [illegible] سبحان اللہ کیا [illegible] اولاد کو اپنے جگر گوشوں [illegible] نذر محمد خاں نے اپنی [illegible]

بخارا سے نکالے جانے والوں سے متغاص کی معرفت ایک لاکھ روپیہ بھیج دیا۔ عبدالرحمٰن پسر نذر محمد خاں کو تیس ہزار روپیہ مرحمت ہوئے۔ نذر محمد جو اس ملک کا سرپرست بنا رہا تھا۔ اس نے دس ہزار روپے کا سامان مرصع آلات طلائی آلات و قمشہ وغیرہ عطا کئے۔ لڑکیوں کو بیگمات شاہی سے تین لاکھ روپے کے قریب نقدی اور زیورات بخشے گئے۔ جب یہ قافلہ روانہ ہو گیا۔ تو کچھ عرصہ بعد بادشاہ نے ایک لاکھ روپیہ اور ان کو بھجوایا۔ ایک قبضہ شمشیر مرصع و پنجاہ ہزار روپیہ سبحان قلی خاں پسر نذر محمد خاں کو ارسال ہوئے۔ ۱۰۶۰ھ میں نذر محمد خاں کا عریضہ مشتمل بر تشکر پہنچا اس پر ۱ لاکھ روپیہ نقد اور دو لاکھ روپے کی جنس بادشاہ نے خواجہ خاوند محمود کے ہاتھ روانہ کی۔ اور بلخ کی فتح پر شہزادہ مراد بخش نے بارہ لاکھ روپے، مرصع طلائی سامان، اڑھائی ہزار گھوڑے اور تین سو اونٹ جو نذر محمد خاں کے قلعہ میں تھے، قبضہ میں لا کر دہلی روانہ کئے تھے۔ وہ جوں کا توں مع دس ہزار روپیہ عبدالرحمٰن کے لئے ارسال ہوا۔ یہ سب کچھ محض اس لئے ہو رہا تھا۔ کہ چند یوم نذر محمد خاں کے بال بچے شہنشاہ کی آغوش شفقت میں پرورش پا چکے تھے۔ اس لئے بطور والد کے بادشاہ کا فرض تھا۔ کہ ان کی پرورش کرے۔ جب چند دن کی پرورش کرنے پر ان کا اس قدر حق ہو گیا تھا۔ اور لٹنے انعام و اکرام سے مالا مال ہو رہے تھے، تو کیا یہ باور کیا جا سکتا ہے۔ کہ ہندوستان کی رعایا جو شہنشاہ کو اپنی اولاد سے بھی زیادہ عزیز تھی، مُردوں کی ہڈیاں پیس پیس کر گذارہ کرتی! ہو۔ ناظرین کرام کو جب معلوم ہو گا کہ یہ نذر محمد خاں وہی آدمی ہے۔ جس نے جہانگیر بادشاہ کے انتقال پر کابل پر حملہ کیا تھا۔ تو بادشاہ کے اس انعام و اکرام کی قدر و قیمت اور بھی بڑھ جائیگی۔ میں نے انعام و اکرام کے جو اعداد و شمار پیش کئے ہیں وہ برنیئر کے سفرنامے، سیر المتاخرین اور بادشاہ نامہ میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

خافی صاحب اس پر بس نہیں کرتے۔ بلکہ مندر شکنی کی ایک عام تصویر کھینچتے ہیں جو ناواقف حضرات اورنگ زیب بادشاہ پر بالعموم بیان کیا کرتے ہیں۔ اور اپنے مدعا میں خود شہزادہ کی زبان سے بھی ایسا اعتراف کراتے ہیں۔

[illegible] کا قاعدہ مندر توڑ پھوڑ کر خاک میں [illegible] کو جو اس کے گرد منتظر

دیوتاؤں کی پرستش کرتی تھیں۔ اس کی چار دیواری سے باہر نکال دیا۔" (صفحہ ۱۲۰)

اس کے جواب میں ہندو مؤرخین کے اقتباسات کو ملاحظہ فرمائیے۔ بابو رام نرائن صاحب سابق منیجر ریاست رام نگر لکھتے ہیں :۔

"یہ عام طریقہ ہو گیا ہے۔ کہ جہاں کوئی ٹوٹی ہوئی مورت مل جاتی ہے، اس کو لوگ اورنگ زیب کی توڑی ہوئی مورت بنا دیتے ہیں۔ لیکن اصلیت یہ نہیں ہے۔ سوامی شنکر اچاریہ کے زمانہ میں جین اور بدھ مت کے خلاف معرکہ آرائی ہوئی تھی۔ اور اس وقت کی ہزارہا جین و بدھ کی شکستہ مورتیں آجکل لاعلمی سے ہندو مندروں میں استھاپن ہیں جن کو میں نے بچشم خود غور سے دیکھا ہے۔ اور کہا یا جاتا ہے۔ کہ یہ مورتیں اورنگ زیب کی توڑی ہوئی ہیں۔ بقول شخصے کرے مونچھوں والا اور پکڑا جائے داڑھی والا" ؎

قابلِ رحم ہے اس شخص کی رسوائی بھی
پردے پردے میں کمبخت جو رسوا ہو جائے

پنڈت ولسنر پرشاد صاحب فدا بی۔ اے ایک تاریخی مضمون کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ :۔

"یہ باکرامت شہنشاہ محل شاہی کی مسجد میں ساری ساری رات اہل کمال کی صحبت میں گذار دیتا۔ رمضان شریف میں دن کو معاملات مملکت میں مصروف ہوتے ہوئے روزہ دار رہنا۔ اور رات کو چھ چھ بلکہ نو نو گھنٹے خدا رسیدہ بزرگوں کے ساتھ بیٹھ کر قرآن خوانی کرنا اس عقیدتمند بادشاہ کا حصہ تھا۔ عنفوانِ شباب سے لے کر دم واپسیں تک اس نے تمام ممنوعات سے پورا پورا پرہیز رکھا۔ اور اخلاق کا اس سے بڑھ کر معیار اور کیا پاؤ گے۔ کہ موسیقی کا اس قدر ماہر ہونے کے باوجود راگ رنگ کی محفلیں اسے ایک نظر نہ بھاتی تھیں۔ کیا مجال جو چاندی یا سونے کے ظروف میں کوئی کھانا چُن کر لائے۔ سوہا جام سفالین و طشت گلی دل کو مرغوب تھا۔ جو شاہ و گدا میں تمیز نہ ہونے دے۔"

(بحوالہ عالمگیر ہندوؤں کی نظر میں)

یہ ہے خلد مکان عالمگیر کی اصلی تصویر جس نے مسلسل پچاس برس تک ہمیشہ دینداری تک

اپنے شوکت و جلال کا غلغلہ ڈال دیا تھا۔ لیکن افسوس خاور صاحب نے اپنے ڈراما میں جو اورنگ زیب پیش کیا ہے۔ اس کے خد و خال اس حلیہ سے نہیں ملتے ؎

کس کے آغوش نے کھینچا ہے تجھے تنگ کہ آج
تیری تصویر سے ملتی نہیں صورت تیری

کاش! کوئی اہل قلم کافی تحقیق اور نیک نیتی سے حضرت شاہجہاں غازی اور اورنگ زیب بادشاہ کے سنہری کارناموں کو ڈراموں کی صورت میں پیش کرنے کی کوشش کرتا جس میں ان کے اخلاقِ فاضلہ، مذہبی پابندی، مذہبی رواداری، انصاف پروری اور ان کے عہد کی فارغ البالی کے مناظر پردۂ سیمیں پر نگاہوں کے سامنے آجاتے، اور لوگ ان کی اصلی تصویر سے روشناس ہو سکتے۔ بدخواہ اور بدباطن آدم زاد جنہوں نے قلم سے نشتر اور سیاہی سے زہر ہلاہل کا کام لے رکھا ہے۔ ان قابل فخر ہستیوں کے خلاف [illegible] عہد قدیم کا ذرہ ذرہ زبانِ حال سے مسلمانوں کو پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ ؎

آؤ۔ آؤ۔ کبھی ہم تم سے متعلق تھے۔ آج بھی ہمارا [illegible] تمہاری سرگذشت کا ایک روشن باب روشن ہوتا ہے۔ ہم اسی شمع سے زندگی پاتی ہیں۔ تم بھی اپنے ظلمتکدوں کو اس سے روشن کر لو۔ تمہاری زندگی کا ایک ایک واقعہ اسلامی رواداری اور انصاف پروری کا آئینہ دار تھا۔ کاش! اگر تم تدبر و تفکر سے کام لینے کی کوشش کرتے! ؎

نہ سنتے تم جو غیروں کی زبانی
بہت دلچسپ تھی میری کہانی

فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ!

کیا آپ نے عالمگیر بک ڈپو کی پانچ نئی مطبوعات ملاحظہ فرمائیں؟

اب بھی ہوتی ہے

جنون و کیف کی مشعل درخشاں اب بھی ہوتی ہے

از حضرت سروش ملیح آبادی

کسی کی زلف شانوں پر پریشاں اب بھی ہوتی ہے
گھٹا ساون کی گلشن پر خراماں اب بھی ہوتی ہے

نہ جانے بھید کتنے کھل چکے ہیں زندگانی کے
مگر انسانیت کی چشم حیراں اب بھی ہوتی ہے

سنوارا ہے بہت مدت سے دست نوعِ انساں نے
مگر شانوں پہ برہم زلفِ دوراں اب بھی ہوتی ہے

خدا شاہد ہے مجھکو جب تمہاری یاد آتی ہے
عروسِ زندگانی چاک داماں اب بھی ہوتی ہے

بنا ہے دیدۂ حیراں ازل سے عالمِ امکاں
مگر اک جنبش مژگانِ دوراں اب بھی ہوتی ہے

غم و آلام ہستی کی سیہ راتوں کے ایواں میں
جنون و کیف کی مشعل درخشاں اب بھی ہوتی ہے

ہیں اک مدت سے خاکستر ہوں لیکن شب کو اشکوں سے
زمینِ زندگانی شبنمستاں اب بھی ہوتی ہے

مٹائے ہیں جنوں کے نقش کیا کیا ذہنِ انساں نے
مگر عقل و خرد سر در گریباں اب بھی ہوتی ہے

مجھے مدت سے جلتے ہیں لئے ہیں کفر کی راتیں
مگر سینے میں روشن شمعِ عرفاں اب بھی ہوتی ہے

شمیم انگیزیاں گو سانس لیتی ہیں یہاں لیکن
مہک ہستی کے پھولوں کی پریشاں اب بھی ہوتی ہے

سروش اک عمر سے غنچہ شگفتہ دل کا ہے لیکن
جبینِ زیست پر شکنوں کی افشاں اب بھی ہوتی ہے

تاخیر

دلگداز افسانہ

از جناب رشیدی روزانہ علیم

آج پروفیسر آرہند و کرجی بہت مسرور نظر آرہا تھا۔ اور اس کی یہ مسرت بڑی حد تک درست بھی تھی ایک ذہین اسکالر ہوتے ہوئے لکھنؤ کے ایک انگریزی کالج میں پروفیسر کی حیثیت سے آج اس نے طلبہ کے سامنے جو افسانگیز لیکچر دیا تھا وہ بہت کامیاب رہا تھا۔ اس کے نپے تلے جملوں، مدلل حوالوں اور سب سے بڑھکر اس کے دل آویز انداز تقریر نے کمرہ میں ایسا سکوت طاری کر دیا تھا کہ ایک سوئی کے گرنے تک کی آواز صاف سنی جا سکتی تھی۔

طلبہ کو ایک ایسے نوجوان پروفیسر سے اس قدر بسیط اور جامع لیکچر کی توقع نہیں تھی کیونکہ اس سے قبل انہیں کسی نووارد کی ایسی سحرکاری کا تجربہ نہیں ہوا تھا۔

پروفیسر نے شیکسپیئر جیسے اچھوتے تمثیل نگار پر ایک محقق عالم کی طرح روشنی ڈالی تھی اس سے طلبہ میں دلچسپی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی تھی ۔۔۔ فطرتاً طلبہ نے اس خوبصورت پروفیسر کا پرجوش خیر مقدم کیا۔

ہاں پروفیسر واقعی خوبصورت تھا۔ اس کا معتدل قد و قامت بہت جلد اپنی جانب توجہ مبذول کرا لیتا تھا ظاہری شکل و صورت میں علم و ادب کی دولت نے چار چاند لگا دیئے تھے ۔۔۔ اس کی تیز آنکھیں ذہانت و فطانت کی مظہر تھیں اس لئے کوئی تعجب نہیں کہ طلبہ اس کے گرویدہ ہو گئے ۔۔۔

کملا ۔۔۔ بھی پروفیسر کے حسن بیان اور عالمانہ شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ لکھنؤ کے مشہور بیرسٹر مسٹر اجیت چٹرجی کی ناز و نعم میں پلی اکلوتی لڑکی تھی۔ جدید روشنی سے اس کے دل و دماغ اچھی طرح منور تھے۔ وہ اس وقت تھرڈ ایر میں تھی۔ شیلے، کیٹس اور دیگر رومانی شعراء کے کلام میں وہ اکثر کھوئی رہتی تھی لیکن جس دن سے اس نے پروفیسر آرہند و کا لیکچر سنا تھا اس کی قلبی کیفیات کچھ اور ہی ہو گئی تھیں جو شاید اس کی ہم جماعت طالبات سے [illegible] قدر مختلف تھیں۔ وہ لیکچر سن کر دنگ رہ گئی تھی ۔۔۔ جیسے اس کے سامنے کوئی پردہ اٹھ گیا ہو۔ پروفیسر نے شیکسپیئر کی شاعری کے حسن کو جس خوبی سے اپنی تقریر میں ظاہر کیا تھا وہ کملا کے دل میں کھب گیا تھا۔

۔۔۔ جب وہ گھر واپس آئی تو اس کا [illegible] خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا ۔۔۔ محبت کا پہلا نقش [illegible] میں کملا کے دل پر ثبت ہو چکا تھا۔ کملا نے نئی تہذیب میں پرورش پائی تھی ۔۔۔ دوسری لڑکیوں کی طرح اسے محبت کے لطیف تجربے سے سابقہ پڑا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ محبت ایک لڑکی کی ایک مرد سے۔ ایک مرد کی ایک لڑکی سے تفریح ہے۔

۔۔۔ آخر جدید پسند ماحول نے کچھ تو سکھایا تھا۔

۔۔۔ لیکن جب خود اُسے محبت سے واسطہ پڑا تو حالت بدل گئی۔ چہرہ پر ایک رنگ آنے اور ایک رنگ جانے لگا۔ دن گذرتے گئے مگر کملا اپنے سابقہ نظریات کو فراموش نہ کر سکی ۔۔۔ مگر اچانک اس پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی تھی ۔۔۔ بدستور قائم رہی!

اب وہ مغموم رہنے لگی۔ باپ لڑکی کو غمگین دیکھ کر پریشان ہو گئے ۔۔۔ اس کی شوخی اور شگفتگی جاتی رہی تھی ۔۔۔ کملا کی حالت روز بروز کچھ سے کچھ ہوتی گئی۔ مگر باپ کو حالات کی کچھ خبر نہ ہو سکی چند [illegible] سے وہ اپنی لڑکی کی پرورش کر رہا تھا۔ لڑکی کا دکھ اس کا دکھ تھا ۔۔۔ وہ کیوں نہ بے چین ہوتا! کملا کی ماں بچپن ہی میں چل بسی تھی۔ اس وقت سے باپ کی مسرتوں کا مرکز صرف کملا تھی!

پہلے جب کبھی کملا کو کوئی الجھن ہوتی فوراً اس کا اظہار باپ سے کرتی اور وہ اس کی مشکلات کا حل پیش کر دیتا ۔۔۔ مگر اب کے معاملہ ہی دوسرا تھا۔ اس لئے مسٹر چٹرجی کی پریشانی میں اضافہ ہوتا رہا ۔۔۔ مگر وہ بار بار کی جدوجہد کے بعد اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ۔۔۔

کملا نے اپنا بوجھ ہلکا کر دیا ۔۔۔ [illegible]!

باپ نے اس سے کہا: "میری بچی! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں سب ٹھیک ہو جائیگا"

بیرسٹر نے ایک دن نوجوان پروفیسر کو اپنے یہاں کھانے پر مدعو کیا۔ پروفیسر ۔۔۔ کملا [illegible]

کر رہا تھا ——— !

کیف انگیز رات تھی، چاند نیلے آسمان میں چمک رہا تھا۔ سرد تیز ہوا کے جھونکے آ رہے تھے ——— سبز پتوں کی کھڑکھڑاہٹ سے فضا میں موسیقی پیدا ہو رہی تھی سب لوگ جلد ہی کھانے سے فارغ ہو گئے۔ پروفیسر کو کملا کی سحر پروری کا شکار ہونا تھا۔ نقرئی آواز میں موسیقی و شعریت جذبہ جھلکنے لگی تھی ——— سر فلسفی کام کے بہانہ باہر چلا گیا ——— دونوں کے سامنے زندگی کا راستہ صاف و کشادہ تھا۔

ایک لمحہ کے سکوت کے بعد پروفیسر نے کہا "مس چٹرجی مجھے یہ سنکر بڑی خوشی ہوئی کہ آپ کو میرا طریقہ تعلیم بہت مرغوب ہے آپ کا خیال ہے کہ یہ بالکل اچھوتا طریقہ ہے۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ خیر چھوڑیئے، رات کتنی سہانی ہے۔ کیا میں امید کروں کہ آپ کوئی گیت سنا کر رات کی دلکشی میں اضافہ کریں گی ———"

کملا ذرا گھبرا سی گئی۔ اس کے دل کی آواز ——— اس کی آرزو ——— کتنی قریب تھی۔ اس نے پروفیسر کی درخواست کو قبول کر لیا۔

کملا نے ——— "کیف شباب" سے ڈوبی ہوئی رات کے متعلق ——— ٹیگور کا ایک گیت چھیڑ دیا۔ اس کی آواز نے فضا میں سکوت طاری کر دیا تھا ——— پروفیسر "سحر نغمہ" سے بیخود سا ہو گیا ——— اس نے والہانہ انداز میں کہا "آپ کا گیت بھی آپ کی طرح سحر آفرین ہے" کملا شرما گئی اور اس کے رخساروں پر سرخی دوڑ گئی ——— وہ اپنے کانز کو خوب سمجھتی تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ کس طرح ماحول کو سازگار بنایا جا سکتا ہے "آپ نے اظہار رائے میں کس قدر عجلت سے کام لیا ہے" کملا نے ایک لطیف تبسم کے ساتھ کہا۔ پروفیسر کی اس طرح ہمت بڑھی۔ وہ اپنے خاص شاہانہ انداز میں بولا ——— "ہرگز نہیں ——— نہیں۔ ڈارلنگ!" معاً اسے خیال آیا کہ وہ بہت آگے بڑھ گیا ہے۔ اس نے فوراً معذرت کرتے ہوئے کہا۔

"معاف کیجئے گا مس چٹرجی میں نے جو کچھ کہا وہ حقیقت پر مبنی تھا۔ میں نے آج تک ایسا وجد آفرین گیت نہیں سنا آپ کی خوش الحانی نے سونے پہ سہاگہ کا کام کیا۔"

اتنے میں کملا کا باپ اندر داخل ہوا۔ پروفیسر کی تعریف نامکمل رہ گئی۔ اس نے آتے ہی پوچھا۔

"کہئے پروفیسر صاحب! وقت تو اچھی طرح گزر گیا ہو گا"

"جی ہاں آپ کی صاحبزادی کی مہمان نوازی نے کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونے دی۔"

"خوب"

"اچھا اب اجازت دیجئے"

"آپ کی مرضی"

——— جب پروفیسر گھر آیا تو اسے دنیا پہلے سے کچھ کمی محسوس ہونے لگی ——— رونق حیات جا چکی تھی۔ کیوپڈ اپنا کام کر گیا۔ جب دو دل ایک دوسرے کے اس قدر متمنی ہوں تو پھر ان کے "اشتراک" میں کیا چیز حائل ہو سکتی ہے۔

——— چند دن بعد دونوں ازدواجی زندگی کے رشتہ میں منسلک ہو گئے۔ ایسی لڑکی کو اپنی "شریک حیات" بنا کر پروفیسر بیحد خوش تھا۔ وہ اپنے کو ایک نئی طمانیت بخش فضا میں پاتا تھا ——— یہ صرف کملا ہی تھی جس کی بے پایاں محبت نے پروفیسر کی زندگی کو خوشحالی کے راستہ پر گامزن کر دیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو پا کر اپنے کو خوش قسمت سمجھتے تھے۔

کرسمس کا زمانہ تھا۔ شہر لکھنؤ کی رونق گذشتہ میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ کالج بند ہو گیا تھا ——— شادی شدہ جوڑے نے تعطیلات کو سیر و تفریح میں گزارنے کا فیصلہ کیا۔ دونوں خوش خوش چائے کی میز پر بیٹھے "غور و فکر" کر رہے تھے کہ نئے سال کا پہلا دن کس طرح منایا جائے۔ پروفیسر آرو چندرا نے تجویز کیا کہ "رومیو اور جولیٹ" دیکھا جائے۔ جو پانچ ہفتے سے پلازا میں چل رہا تھا۔ لیکن کملا نے "موٹر ٹرپ" کا مشورہ دیا۔ ابھی وہ بحث و تمحیص ہی میں مصروف تھے کہ نوکر نے پروفیسر کو اس کے نام کا ایک خط لا کر دیا۔ کسی نامعلوم شخص کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط تھا۔ پریشانی کے عالم میں مسٹر مکرجی نے جلدی سے لفافہ کھول کر پڑھنا شروع کیا۔ ابھی اس نے آدھا ہی پڑھا تھا کہ اچانک رک گیا۔ وہ اس کی ضعیف ماں کا خط تھا جو گاؤں میں بیمار پڑی تھی۔ وہ شدت غم سے گھبرا گیا۔ آہ! وہ اپنی ماں کے لئے کیسا سنگدل ثابت ہوا ہے ——— وہ ماں جس نے اپنے بیٹے کی خاطر ہر قسم کی قربانی کی۔ اب بستر مرگ پر پڑی تھی ——— فاقہ کشی کے باعث!

——— اور اس کا بیٹا ——— مشہور پروفیسر "سال نو" کی رنگ رلیوں کو منانے کی تیاری کر رہا تھا!

کس قدر افسوسناک حقیقت تھی! کیا کوئی بیٹا اپنی ماں کو اس حالت میں چھوڑ سکتا ہے!!

پروفیسر کی گذشتہ زندگی ——— اس کے سامنے پھر گئی۔

——— وہ بیوہ ماں کا بیٹا تھا۔ اس کا باپ انہیں قسمت کے سہارے چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے دوسری دنیا میں چلا گیا تھا۔ اس کا چچا ایک چالاک وکیل تھا جس نے ان کی رہی سہی دولت بھی ہضم کر لی۔ اس کی ماں کو مجبوراً ماما کی زندگی اختیار کرنا پڑی۔ اور وہ خود ایک نوکر کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔ اس قدر مشکلات کے مصروبات کے باوجود انہیں امید تھی کہ کبھی نہ کبھی ان کے دن بھی پھرینگے! ایک حادثہ نے ان کی زندگی کو بدل دیا ——— ایک دن ماں نے اپنے بیٹے کو گرم زمین پر تڑپتے ہوئے دیکھا۔ اب پانی سر سے گذر چکا تھا۔ ماں اپنے لخت جگر کو ایسی اذیت میں نہیں دیکھ سکتی تھی ——— سڑک پر بھیک مانگنا اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ عزیزوں کے ہاتھوں اتنی ذلت برداشت کرنا پڑے۔ ———

وہ اس دن سے اپنے بیٹے کو لے کر نکل آئی۔ اسے زندگی کا کوئی سہارا نہ تھا ——— زندگی افلاس و نکبت میں جکڑ کر رہ گئی لیکن غریب ماں خفیف سے خفیف شدائد کو برداشت کرتی رہی لیکن تمناؤں کا مرکز صرف اس کا بیٹا تھا۔ وہ روپیہ کمائی اور اپنے بیٹے کی تعلیم پر خرچ کر دیتی ——— آج اسے اس دردناک حقیقت کا احساس ہوا کہ اس نے اپنی ماں کی کوئی خدمت نہیں کی!

مارے ندامت کے پروفیسر کا سر جھک گیا وہ کچھ زیادہ نہ سوچ سکا ——— وہ ایک دم اپنی نشست سے اُٹھ بیٹھا اس کے چہرے سے کرب و اذیت ٹپک رہی تھی۔ کملا اپنے پتی کو اس حالت میں دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ اس نے خیال کیا کہ شاید کسی ہولناک خبر سے اس کے محبوب کا توازن دماغی بگڑ گیا ہے۔ اس نے سمجھانے کی کوشش کی مگر کچھ اثر نہ ہوا۔ پروفیسر نے کملا کو زور سے پکڑ لیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں ——— پروفیسر کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے اس نے کہا "خدا حافظ ——— خدا حافظ" کملا نے اس کو پکڑنے کی کوشش کی، مگر پروفیسر تیزی سے باہر نکل گیا ——— کملا نے اس کی تلاش میں ملازم کو بھیجا لیکن وہ غائب ہو چکا تھا۔

جھٹ پٹا سا ہو رہا تھا کہ پروفیسر نے اپنے گاؤں کی سرزمین پر قدم رکھا۔ دھڑکتے ہوئے دل اور لرزتے ہوئے اعضا کے ساتھ وہ گاؤں کے سنسان راستوں سے ہوتا ہوا جھونپڑی کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا۔ وہ شرم کی وجہ سے اپنے کو گاؤں والوں سے چھپا رہا تھا۔ ایک دو شناسا چہرے ملے بھی مگر وہ اس کو پہچاننے میں ناکام رہے ——— وہ اس قدر بدل گیا تھا! وہ ایک آم کے درخت کے پاس سے گذر کر چوراہے پر آیا۔ یہاں ایک بوڑھی عورت کھڑی تھی۔ اچانک اس کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ عورت سے واقف نہیں تھا۔

اس نے مڑ کر دیکھا تو ایک جھونپڑی کی طرف سے ٹمٹماتے چراغ کی روشنی آ رہی تھی ——— اس کے دماغ میں امید کی ایک لہر دوڑ گئی۔ وہ چپ چاپ جھونپڑی کے دروازے کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا لیکن کھولنے کی ہمت نہ ہوئی۔ چور کی طرح وہ وہاں خاموش کھڑا رہا۔ اتنے میں ایک بڈھا لکڑی ٹیکتا ہوا باہر آیا۔ ہمت کر کے اس نے بڈھے سے ضعیف عورت کے متعلق پوچھا جو اس جھونپڑی میں رہتی تھی۔ بڈھے نے اس کے چہرہ پر ایک نظر ڈالی مگر وہ بھی پہچاننے سے قاصر رہا۔

"ہاں جناب!" اس نے کہا، "بوڑھی عورت بڑی نیک پارسا تھی اس کا ایک لڑکا بھی تھا جس کے متعلق ہم نے سنا تھا کہ اس نے بڑا نام پایا ہے۔ لیکن جناب اس نے اپنی ماں کی ذرا بھی پروا نہیں کی۔ آپ یہ سن کر تعجب کرینگے کہ غریب ماں کو اپنے بیٹے کے لئے فاقے تک کرنا پڑے تھے۔ مگر اسے کیا ملا؟ سوائے ذلت و مصیبت کے اسکے پلے کچھ نہ پڑا۔ غریب عورت کی قسمت پر افسوس ہے ہم اس کے لئے کر ہی کیا سکتے تھے؟ ——— کیا بتائیں صاحب آجکل کیسا بُرا وقت آگیا ہے!"

مجرم بیٹے نے بے چین ہو کر پوچھا "لیکن اب وہ کیسی ہے؟"

"آہ! وہ تو چل بسی۔ مرتے وقت بیچاری کے پاس کوئی بھی نہ تھا"

——— "کیا مر گئی؟" پروفیسر نے گھبرا کر پوچھا "جی ہاں کل اسی وقت۔ بھگوان اس کی روح کو شانتی دے" یہ کہہ کر بڈھا زور سے کھانستا ہوا اپنی راہ چلا گیا۔

پروفیسر بہت شرمندہ و پریشان حسرت آگیں جھونپڑی کے سامنے کھڑا تھا۔

——— "زندگی میں ماں کی قسمت بدلنا چاہتا تھا!"

[illegible]

حضرت نعیمانؓ کی زندہ دلی

سوانح حیات

از جناب محمد مسیح الزمان رحیم آبادی

مورخین جب کسی شخص کی سوانحعمری قلمبند کرنے بیٹھتے ہیں تو اسکی زندگی کا صرف روشن پہلو نمایاں کرتے ہیں اور اس کے کارنامے نمایاں کو جو پبلک لائف کا اہم ترین عنصر ہیں منظر عام پر لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی اس کوشش کا مقصد کچھ تو عوام کو نتیجہ خیز واقعات سے سبق سکھانا ہوتا ہے اور کچھ بحث کی طوالت (جو پرائیویٹ لائف کے تذکرہ کا لازمہ ہے) کو مختصر کرنا ہوتا ہے۔ اسی لئے وہ اپنے ہیرو کی زندگی کے صرف اہم حصے کچھ اس طرح مرتب کرتے ہیں کہ ہم ان کی سوانح کو مطالعہ کرتے وقت اس حقیقت کو فراموش کر جاتے ہیں کہ وہ بھی ہماری طرح چلتے پھرتے انسان تھے جن کے حسیات قلبی ہمارے ہی جیسے تھے جن کی پرائیویٹ لائف ہماری نجی زندگی سے مختلف نہ تھی۔ چونکہ مورخین "محتسب را درون خانہ چہ کار" کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمارے سامنے اکابر کی زندگی کا اصلاحی پہلو پیش کرتے ہیں اس لئے اگر ہم کسی بڑے انسان کی نجی زندگی سے واقفیت حاصل کرنا چاہیں تو تاریخیں اس باب میں بہت قلیل مواد فراہم کرتی ہیں۔ آج ہم میں ہزاروں اشخاص ایسے ہونگے جو باوجود جستجو کے یہ معلوم کرنے میں ناکام رہے ہونگے کہ مسٹر جناح کا اپنی اولاد کے ساتھ کیا برتاؤ ہے یا مسٹر گاندھی کتنے بچوں کے باپ ہیں۔ مولانا آزاد کا اپنے دوستوں کے ساتھ کیسا سلوک ہے؟ حالانکہ ان کی قومی تحریک اور سیاسی زندگی کا لمحہ لمحہ اخبارو کے اوراق میں محفوظ ہے۔ زندگی کے اسی پہلو کے انفقاد نے آج تاریخ کو ایک خشک علمی مضمون بنا دیا ہے۔

جیسا پہلے عرض کیا جا چکا ہے چونکہ زندگی کا صرف ایک ہی رخ تاریخوں میں نمایاں کیا جاتا ہے اس لئے اگر ان واقعات کے ڈھانچہ پر جن کا مواد تاریخ مہیا کرتی ہے ہم اپنے قیاس کی مدد سے کوئی خاکہ تیار کرتے ہیں تو اسمیں بہت سی خامیاں رہ جاتی ہیں جب ہمیں ان خامیوں کا علم ہوتا ہے تو سخت مایوسی ہوتی ہے اور یہ مایوسی نتیجہ ہے ہمارے زاویہ نگاہ کی غلطی کا۔

عہد نبوی کی تاریخ العوام تواریخ کا رنگ یکسر متناظرانہ ہے کیونکہ ان کی تصنیف کے موقع پر غیر مسلموں کی تنقید کو بالخصوص غلط قرار دینا تھا اس لئے ان میں مسلمانوں وہ اصحاب کبارؓ کی بہادری، بسالت، فراست، تدبر کی جرأت عمل، جہاد فی سبیل اللہ، حمیت مذہبی، عشق رسول صلعم اور حب خدا کا پہلو تو نمایاں کیا گیا لیکن ان کے صحیفہ زندگی کے ایک اہم باب کو جس کا تعلق ان کی نجی زندگی سے تھا نظر انداز کر دیا گیا۔

ایک جنگ کے موقع پر قیصر کے سفیر کو مسلمانوں کی حالت کے معائنہ کا موقع ملا واپس آکر اس نے مسلمانوں کی زندگی کو ان دو لفظوں میں ادا کیا۔ باللیل رہبان وبالنہار فرسان (وہ شب کے وقت خدا کے عبادت گذار بنے رہتے ہیں اور دن کو سپاہی) چونکہ سفیر کا یہ مقولہ بھی مورخین کے پیش نظر رہا اس لئے جب ہم عہد نبویؐ کی تواریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہی سمجھنے لگتے ہیں کہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زندگی میں صرف دو کاموں سے واسطہ پڑا یا جنگ یا عبادت اور وہ ان امور میں ایسے مستغرق رہے کہ دوسرے شعبوں کی طرف توجہ مبذول کرنے کی انہیں مہلت ہی نہ ملی۔ ان تاریخوں کا مطالعہ ہم پر یہ اثر ثابت کرتا ہے کہ ہم جاں نثاران آستانہ نبوت کو جذبات جہاد و عبادت کے علاوہ باقی کل ایسے جذبات سے عاری تصور کرتے ہیں جو ہماری زندگی کا لازمہ ہیں۔ کسی صحابی کی سوانحعمری اٹھا کر دیکھئے۔ آپ محسوس کرینگے کہ وہ میدان جنگ میں داد شجاعت دے رہے ہیں اور ابھی جنگ ختم نہیں کی کہ سربسجود ہو گئے اور ابھی دعا سے ہاتھ بھی نہیں اٹھایا کہ تیغ بدست رہوار کے پشت پر بیٹھے ہوتے ہیں۔ یہ نہیں کہ ان اصحاب کیا کے نجی حالات پردہ اخفا میں مستور ہیں۔ کتب رجال ان کے روزمرہ کے سوانحات سے پر اور احادیث ان کے خانگی واقعات سے لبریز ہیں لیکن ان کو ابھی تک منظر عام پر لانے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔

اسلام نے چونکہ لہو ولعب کی سختی سے ممانعت کی سو قیانہ مذاق سے احتراز کی تاکید کی زیادہ ہنسنے سے اجتناب کا حکم صادر فرمایا اس لئے ہم نے تصور کر لیا کہ مجاہدین اسلام زاہد خشک تھے جن کے چہرے سے رعب و جلال تو ٹپکتا تھا جن کی پیشانیاں عبادت و ریاضت کی وجہ سے منور تو تھیں جن کے ہاتھوں میں تلواریں تو چمکتی تھیں لیکن اس خیال کو ہم نے دل میں آنے تک نہ دیا کہ ان کے چہرے پر بتاہلانہ مسکراہٹ بھی کھیلتی تھی اور ان کی خانگی زندگی زندہ دلی و ظرافت سے معمور تھی۔ لیکن حقیقت حال اس کے برخلاف ہے اس مضمون میں اسی حقیقت کو

عُریاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ صحابہ کرام کا دلی جذبہ ظرافت سے عاری نہ تھا۔ بلکہ ان کی ظرافت روایات ابھی تک زندہ ہیں اور تیرہ سو برس بعد بھی ہم سے خلوصِ تحسین وصول کر رہی ہیں۔ ہمیں یہ معلوم کر کے مسرت ہوتی ہے کہ دربارِ رسالت میں جہاں ہر فن کے ارباب کمال کا مجمع تھا ایک ظریف کی نشست خالی نہ تھی۔

میں حضرت نعیمانؓ کے تاریخی حالات لکھ کر مضمون میں خشکی پیدا کرنا نہیں چاہتا اس لئے یہاں ان کے چند واقعات لکھنے پر اکتفا کروں گا جو ان کی حاضر دماغی، زندہ دلی اور سلامت روی پر دال ہیں۔ حضرت نعیمانؓ کے متعلق ضرور عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ آپ بڑے جلیل القدر صحابی ہیں۔ جنگ بدر میں شریک ہو کر جن اصحاب نے "اعملوا ما شئتم قد غفرت لکم" کی بشارت سنی تھی ان میں حضرت نعیمانؓ بھی ایک ہیں۔

۱۔ ایک مرتبہ حضرت نعیمانؓ نے ایک گھڑا شہد ایک بدوی سے اُدھار لیا اور اسے بحضور رسالتمآب صلعم تحفتاً پیش کیا۔ چند دن بعد بدوی آیا اور حضرت نعیمانؓ سے قیمت کا طالب ہوا۔ حضرت نعیمانؓ کے پاس اُس وقت کچھ موجود نہ تھا اس لئے دربارِ رسالت کی طرف اشارہ کر کے اُسے کہا "قیمت وہاں سے ملیگی" بدوی نے دربار میں پہنچ کر شہد کی قیمت طلب کی۔ حضور صلعم سخت متعجب ہوئے اور بدوی سے تفصیل پوچھی، جب معلوم ہوا کہ یہ حضرت نعیمانؓ کا فرستادہ ہے تو خود حضرت کی بھی طلبی ہوئی۔ جب حضرت نعیمانؓ سے حقیقتِ حال دریافت فرمائی تو نہایت سادگی سے بولے "حضورؐ نے جو شہد نوش فرمایا ہے اسی کی قیمت تو مانگ رہا ہے ادا کر دیجئے"۔ حضور صلعم نے فرمایا "واہ! وہ تو تم نے تحفتاً پیش کیا تھا"۔ حضرت نعیمانؓ نے کہا "شہد حضورؐ کو مرغوب ہے۔ یہ بدوی جب شہد بیچنے آیا تو جی چاہا کہ حضورؐ کی خدمت میں پیش کروں اسی لئے لے آیا"۔ حضور صلعم نے متبسم ہو کر قیمت ادا کر دی۔

۲۔ اس قسم کے متعدد واقعات لوگوں کے ذہن نشین تھے کہ اکثر ایک بدوی اونٹ پر حضور اقدس صلعم کی زیارت کو آیا۔ اونٹ باہر باندھ کر ملاقات کو چلا گیا۔ لوگوں نے مذاقاً حضرت نعیمانؓ سے کہا۔ نعیمان اگر اسے ذبح کر ڈالو تو گوشت خوب چلے۔ آقا قیمت تو ادا کر ہی دینگے" مذاق کی بات تھی مفت گذشت ہو گئی۔ لوگوں کو خیال تک نہ تھا کہ حضرت نعیمانؓ اسے سچ ہی کر دکھائیں گے۔ بدوی زیارت سے مشرف ہونے کے بعد باہر آیا اور اونٹ کو نہ پا کر بہت مشوش ہوا اپنے شور و غوغا سے آسمان کو سر پر اٹھا لیا شور و غوغا سنکر حضورؐ بھی باہر نکل آئے۔ دریافت فرمایا کیا واقعہ ہے۔ لوگوں نے حضرت نعیمانؓ پر شبہ ظاہر فرمایا۔ ابھا اونٹ کے عوض حضرت نعیمانؓ کی ... کہیں نہ ملے۔ ایک صحابی کی تلاش ... پتے میں چھپے بیٹھے تھے صحابی ... ڈھیر سے نکالے گئے تو سارے جسم پر پتے چپکے ہوئے تھے۔ گو ہم آقا غصہ میں تھے مگر اس ہیئت کذائی پر حضور صلعم ہنسی ... ذکر کے سامنے پہنچ کر غصہ سے فرمایا "نعیمان! کس کے حکم سے تم نے یہ حرکت کی؟" نہایت معصومیت سے جواب دیا "انہی لوگوں نے کہا تھا جو مجھے پکڑ لائے ہیں"۔ حضور صلعم کو اس حاضر جوابی اور معصومانہ ادا پر اس قدر ہنسی آئی کہ دونوں ہاتھوں سے منہ کو چھپا لیا۔ بدوی کو حسبِ خواہ قیمت ادا کر دی گئی۔

۳۔ وفات سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک سال قبل حضرت ابوبکرؓ بصرے تجارت کی غرض سے گئے۔ حضرت نعیمانؓ اور حضرت سوئیبطؓ بھی ہمراہ تھے۔ شہر کے قریب پڑاؤ ڈالکر تینوں حضرات ٹھہر گئے۔ ایک روز حضرت ابوبکرؓ ان دونوں حضرات کو پڑاؤ پر چھوڑ کر شہر میں تاجروں سے ملاقات کو چلے گئے اسی اثناء میں حضرت نعیمانؓ کو بھوک ستانے لگی۔ حضرت سوئیبطؓ سے کھانا طلب کیا۔ آپ نے کہا "ٹھہرو! ابوبکرؓ کو آنے دو"۔ حضرت نعیمانؓ کب ماننے والے تھے۔ اصرار پیہم کرنے لگے لیکن ادھر سے بھی انکار ہی رہا حضرت نعیمانؓ نے کہا "اچھا ٹھہرو مزہ چکھاتا ہوں"۔ یہ کہہ کر خیمہ سے نکلے اور سیدھے شہر کے دلال کے پاس پہنچکر فرمایا "میرا ایک عربی خوبصورت غلام ہے جو بہت شوخ و شنگ ہے اُسے تمہارے ہاتھوں فروخت کرنا چاہتا ہوں۔ بڑا اچھا آدمی ہے مگر دیکھو اس کے حیلے میں نہ آنا۔ بہت ممکن ہے وہ خود کو آزاد بلکہ ہمارا چچیرا بھائی ہونا ظاہر کرے مگر اُسکی چرب زبانی سے متاثر ہو کر کہیں اس کے خریدنے سے انکار نہ کرنا"۔ دلال نے کہا "نہیں ضرور خریدونگا لیکن اس صورت میں قیمت صرف دس اونٹ دونگا"۔ بالآخر قافلہ سالار دس اونٹ لیکر خیمے کے پاس پہنچا۔ حضرت نعیمانؓ نے دور ہی سے حضرت سوئیبطؓ کی طرف اشارہ کر کے کہہ دیا "یہی میرا غلام ہے"۔ قافلہ سالار آگے بڑھا۔ حضرت سوئیبطؓ سے مخاطب ہو کر بولا چلو ... حضرت سوئیبطؓ کو حیرت و استعجاب کے ساتھ غصہ بھی آیا غصہ سے بولے "میں آزاد ہوں، مجھے کوئی ..." "حضرت نعیمانؓ نے تو پہلے ہی ..."

معصیتِ شباب

میں حسرتیں لیکے بڑھ رہا ہوں وہ مجھ سے آنکھیں چرا رہے ہیں

از جناب فرحت اسعدی شاہجہان پوری

شباب ہیں رنگ و نور بھر کر حجاب میں مسکرا رہے ہیں
بہارِ گلشن جمالِ انجم بڑھا رہے ہیں بسا رہے ہیں

وہ مست آنکھیں وہ مست نظریں اٹھا رہے ہیں ملا رہے ہیں
شرابِ رنگیں برس رہی ہے شرابِ رنگیں لٹا رہے ہیں

مرے تصور کی محفلوں میں وہ بے حجابانہ آ رہے ہیں
شکیب کی پُرسکوت دنیا کو حشر ساماں بنا رہے ہیں

وہ مجھ کو بھولے ہوئے ہیں دل سے مگر مجھے یاد آ رہے ہیں
دبے ہوئے ولولوں میں مل کے وہ اک قیامت اٹھا رہے ہیں

ادا سے آنکھیں دکھا رہے ہیں نظر سے ناوک چلا رہے ہیں
جگر میں ہے اک خلش سی پیدا مزے محبت کے آ رہے ہیں

کبھی کرم ہے کبھی ستم ہے کبھی تغافل کبھی نوازش
ادا ادا سے نظر نظر سے مٹا رہے ہیں بنا رہے ہیں

ادائیں میکش نگاہیں میکش صدائیں میکش فضائیں میکش
لچک لچک کر اٹھا کے ساغر جہاں کو بیخود بنا رہے ہیں

مآلِ تجبیرِ نیازمندی۔ وہ ان کے جلوے وہ ناز و مستی
میں اپنی منزل کا راہرو ہوں وہ اپنی منزل کو جا رہے ہیں

وہ برق پاش ان کا عارضِ تاباں، وہ فرطِ حیرت مری نگاہیں
وہ خود تماشا بنے ہوئے ہیں مجھے تماشا بنا رہے ہیں

خرابِ شوقِ نیاز ہوں میں رہینِ انداز و ناز ہیں وہ
میں انکی دنیا بسا رہا ہوں وہ میری دنیا بسا رہے ہیں

بنے گا میخانہ ہر گلستاں۔ بنے گا ساغر ہر ایک غنچہ
شراب برسے گی آسماں سے، وہ گھر کے بادل جو آ رہے ہیں

یہ دورِ عشق انکی توبہ لطیف جلووں کے جھرمٹوں میں
وہ پردہ رخ سے ہٹا رہے ہیں جہاں کو شیدا بنا رہے ہیں

مری محبت کی ہر ادا پر نثار ہے حسن کا تغافل
میں کھنچ رہا ہوں وہ بڑھ رہے ہیں میں جا رہا ہوں وہ آ رہے ہیں

زمیں ہلی دل ہلا فلک بھی زباں ہی پر دل کے ہونٹ سی لیں
وہ میرے دامن پہ سر جھکا کر لہو کے آنسو بہا رہے ہیں

صلہ وفا کا یہی ہے فرحت یہی ہے آئینِ حسن و الفت
میں حسرتیں لیکے بڑھ رہا ہوں وہ مجھ سے آنکھیں چرا رہے ہیں

کیا یہ قربانی تھی؟

معاشرتی افسانہ

از جناب ایم احمد [illegible]

کھڑکی کھلی ــــ عقیلہ کی نظر شاہد پر پڑی اور دوسرے ہی لمحہ کھڑکی بند ہو گئی ایسا بارہا ہو چکا تھا اور جب عقیلہ اپنے گھر کی کھڑکی کھولتی تو اس کی نظر اکثر شاہد پر پڑتی۔ وہ ہمیشہ سامنے ہی بیٹھا نظر آتا۔

شاہد اور عقیلہ کے مکان میں صرف ایک دیوار حائل تھی ان دونوں کے والدین کے تعلقات بہت خوشگوار تھے اس لئے سہولت کے لئے ایک کھڑکی دونوں مکانوں کے درمیان کھول لی گئی تھی۔ شاہد کے والد انجینیر تھے اور عقیلہ کے یونیورسٹی میں پروفیسر۔ عقیلہ کی دوستی شاہد کی بہن سے تھی اس لئے وہ کم از کم دن میں ایک بار ضرور رفیعہ سے ملنے جاتی۔ شاہد کے گھر میں ایک بہن اور ماں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ لیکن عقیلہ کا خاندان کافی وسیع تھا ــــ شاہد اپنے کمرے میں بیٹھا اسے دیکھا کرتا اور سوچا کرتا ــــ کیا کبھی عقیلہ میری ہو سکے گی؟ عقیلہ کا اس سے کا نا پردہ تھا۔ کیونکہ عقیلہ کی والدہ کو شاہد سے بہت محبت تھی اور وہ اس کے سامنے آتی تھیں بلکہ وہ تو اکثر کہا کرتیں کہ شاہد سے پردہ کرنے کی کیا ضرورت ہے مگر عقیلہ کو ایک حجاب سا تھا۔

شاہد ایف۔ ایس۔ سی میں پڑھتا تھا اور عقیلہ چھٹی جماعت میں۔ دونوں کی عمر میں چار سال کا فرق تھا۔ عقیلہ کی عمر اس وقت تیرہ سال کی تھی۔ وہ زندگی کے اس دور میں تھی جب بچپن کی سادگی میں شباب احساسات کا رنگ پھیرنا شروع کرتا ہے جب اس نے پہلی بار شاہد کو دیکھا تو اس نے اپنے جذبات میں ایک حرکت محسوس کی جسے ایک دوشیزۂ نوخیز کیا سمجھتی۔ مگر زندگی کے مدرسہ میں آدمی خود سبق پڑھ لیتا ہے اور شباب کے نقوش روز بروز گہرے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہ مدارج عقیلہ کے لئے جلد ہی طے ہو گئے! اور وہ اپنے دل میں شاہد کے لئے ایک جذبۂ پرستش محسوس کرنے لگی۔

شاہد عقیلہ سے بات نہ کر سکتا تھا لیکن نظروں ہی نظروں میں دونوں نے سب کچھ کہہ لیا جس کے زبان سے کہنے کے لئے مدت دراز اور مناسب مواقعات بھی کافی نہ ہوتے۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ شاہد کی والدہ مع اس کی بہن کے اپنے ایک عزیز کے گھر سیالکوٹ تشریف لے گئی تھیں کیونکہ شاہد گھر میں اکیلا تھا اس وہ اپنے کمرے میں دوپہر کو لیٹا ناول پڑھ رہا تھا وہ اس وقت ناول کے اس حصہ کو پڑھ رہا تھا جس جگہ ہیرو اور ہیروئن میں فلسفۂ محبت پر بحث ہو رہی تھی۔ یکایک کھڑکی کھلی اور عقیلہ صحن میں سے گذر کر کمرے میں داخل ہوئی لیکن شاہد کو کمرے میں اکیلا لیٹا ہوا دیکھ کر واپس جانے کے لئے مڑی۔

شاہد اس کو مڑتے ہوئے دیکھ کر بولا۔ عقیلہ ایک بات سنو "مجھے جانے دیجئے شاہد بھائی۔" عقیلہ نے کہا اور غائب ہو گئی۔ یہ ان کی پہلی گفتگو تھی۔ اس رات شاہد کو نیند نہ آسکی۔

اس واقعہ کے ایک ہی ہفتہ بعد عقیلہ کے باپ کو ریاست کشمیر میں نوکری مل گئی اور ان کو یونیورسٹی چھوڑنا پڑی۔ جانے کا روز سفر بھی آ گیا۔ شاہد ان لوگوں کو اسٹیشن پہنچانے گیا۔ جب گاڑی نے سیٹی دی تو ان دونوں نے ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں الوداع کہا! اور گاڑی شاہد کی نظروں سے غائب ہو گئی اور عقیلہ کو اپنے ساتھ لے گئی۔

شاہد کو اب علیگڑھ میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس کا دل نہ گھر پر لگتا اور نہ یونیورسٹی میں۔ جب کچھ پڑھنے بیٹھتا تو عقیلہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے آ جاتی! اس چیز نے اس کے دل پر اثر کیا اور اس کو بخار رہنے لگا۔ پہلے تو گھر والوں نے کوئی خاص توجہ نہ دی مگر جب بخار نے ایک مستقل صورت اختیار کر لی تو ان لوگوں کو خیال ہوا اور ڈاکٹروں وغیرہ کو دکھایا گیا۔ مگر شاہد کا جو مرض تھا اسے ڈاکٹر سمجھنے سے قاصر تھے۔

آ [illegible] کوئی فائدہ نہ ہوا ایسی حالت [illegible] دن اسے ایک [illegible] [illegible] ہاتھوں سے [illegible]

دیکھ کر خط عقیلہ کا ہے۔
اس نے لکھا تھا۔
شاہد بھائی ۔۔۔
رفیعہ کے خط سے یہ معلوم ہو کر کہ آپ کو ایک مہینہ سے بخار ہے اور اس میں کوئی افاقہ نہیں سخت فکر و تشویش ہے۔ مگر میں دعا کر رہی ہوں خدا کرے آپ جلد اچھے ہو جائیں۔ جلد اپنی خیریت سے مطلع کیجئے۔ خط سے دعا ہے کہ جلد آپ کو صحت ہو۔ آپ کی جب طبیعت کچھ درست ہو تو کچھ دن کے لئے یہاں تبدیل آب و ہوا کے لئے چلے آئیے۔ یہاں کی آب و ہوا آپ پر اچھا اثر کریگی۔

آپ کی
عقیلہ

شاہد پر اس غیر متوقع خط کا بہت اچھا اثر پڑا۔ جس بخار کو ڈاکٹر ایک مہینہ میں نہ اتار سکے اسے ایک خط نے پانچ منٹ ہی میں اتار دیا۔ اس نے اسی روز عقیلہ کو اس کے خط کا جواب دیا۔ جس میں اس نے خط اور کشمیر کی دعوت کا شکریہ ادا کیا تھا۔ اور ارادہ ظاہر کیا تھا کہ وہ رو بصحت ہونے پر ضرور کشمیر جائے گا۔

شاہد اب دن بہ دن تندرست ہونے لگا اور پندرہ بیس دن کے بعد وہ بالکل تندرست ہو گیا۔ عقیلہ نے یہ خبر سن کر اسے فوراً کشمیر بلایا۔ کچھ عرصہ بعد یونیورسٹی میں تعطیل ہوئی۔ شاہد عقیلہ کے لئے کچھ تحفے لے کر کشمیر روانہ ہوا۔ شاہد راستے بھر اسی سوچ میں رہا کہ کشمیر میں بھی عقیلہ اس سے پردہ کرے گی یا نہیں لیکن جب وہ کشمیر پہنچا تو اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ عقیلہ نے اس سے پردہ نہ کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اول تو عقیلہ کی والدہ ویسے ہی پردہ کی مخالف تھیں اور پھر کشمیر میں تو جا کر اور بھی آزادی ہو گئی تھی۔ عقیلہ کے والد دن بھر تو دفتر میں رہتے اور شام کو وہ اپنے دوستوں کے ساتھ چہل قدمی کو نکل جاتے۔ اس لئے یہ تینوں یعنی عقیلہ اس کی والدہ اور شاہد ساتھ ہی ٹہلنے جاتے۔ ایک روز ان تینوں کا ارادہ پک نک پر جانے کا تھا کہ یکایک عقیلہ کی والدہ کی طبیعت خراب ہو گئی لیکن انھوں نے اصرار کر کے ان دونوں کو بھیج دیا۔

راستے میں یہ لوگ پھل وغیرہ کھاتے گئے اور ایک آبشار کے کنارے پہنچ کر یہ لوگ وہیں بیٹھ گئے۔ اس وقت وہاں کا منظر نہایت ہی خوشگوار معلوم ہو رہا تھا۔ عقیلہ تھکی ہوئی تھی وہ سر کے نیچے ہاتھ رکھ کر آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی کچھ دیر بعد اس نے اپنی سرخ غلافی آنکھوں سے اپنی دراز پلکوں کو اٹھایا اور بولی "شاہد کوئی گانا تو سناؤ۔"

"مجھے گانا نہیں آتا تمہیں کچھ سناؤ نا۔"

مگر عقیلہ کے اصرار پر وہ گانے کو رضامند ہو گیا۔ اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے اس کا سر اٹھا اپنے زانو پر رکھ لیا اور گانا شروع کیا۔

تم ہی نے مجھ کو پریم سکھایا
سوتے ہوئے ہردے کو جگایا

عقیلہ نے شرما کر نظریں نیچی کر لیں اور اٹھ کر بیٹھ گئی لیکن شاہد پر اتنی وارفتگی طاری ہو رہی تھی کہ اس نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا اور اس کے نازک گلابی ہونٹوں پر اپنی مہر محبت ثبت کر دی عقیلہ بھی اس وقت بیتاب ہو رہی تھی اس لئے شاہد کو اس کی محبت کا جواب محبت ہی سے ملا اور کچھ عرصہ کے لئے وہ دونوں مدہوش ہو گئے۔ اب شام ہونے لگی تھی اس لئے وہ واپس ہوئے۔ راستے بھر دونوں خاموش رہے۔ شاہد بہت خوش تھا اور شاید عقیلہ بھی ۔۔۔

کچھ عرصہ بعد یونیورسٹی کی تعطیلات ختم ہو گئیں لہذا شاہد کو بادل ناخواستہ کشمیر سے رخصت ہونا پڑا۔

شاہد بی ایس سی کر کے نائب تحصیلداری کے امتحان میں بیٹھا اور چونکہ ذہین تھا اس لئے اس میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے ذکر ہونے کے بعد والدہ کو شادی کی فکر دامنگیر ہوئی۔ وہ اس کی شادی عقیلہ سے کرنا چاہتی تھیں مگر والد خلاف تھے۔ رفیعہ بھی موافق تھی اس لئے کہ وہ اس کی بہت ہی عزیز دوست تھی۔ ان دونوں نے کہہ سن کر والد کو بھی راضی کر لیا۔ اور اس کا پیغام بھیجا گیا۔ عقیلہ کو ایک پیغام محمود کا بھی آیا ہوا تھا۔ محمود عقیلہ کا چچا زاد بھائی تھا۔ اس کے باپ زمیندار تھے اور بہت معقول جائداد تھی، باپ کے انتقال کے بعد وہ تنہا جائداد کا وارث ہوا۔ اس کو عقیلہ سے محبت تھی اس لئے اس نے اپنا پیغام عقیلہ کو بھیجا۔ عقیلہ کے والدین اس کے خلاف تھے اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ محمود اوباش اور شرابی ہے صرف روپے کی خاطر اپنی لڑکی کی زندگی برباد کرنا نہیں چاہتے تھے ۔۔۔ شاہد کا پیغام منظور ہو گیا اور تاریخیں مقرر ہو گئیں کچھ عرصہ بعد رفیعہ بھابی کو گھر لے آئی۔ اس شادی سے محمود شاہد کا

دشمن ہو گیا اور اس سے بدلہ لینے کی فکر میں رہا۔ حالانکہ اس میں بیچارے شاہد کا کیا قصور تھا۔

شاہد کو نائب تحصیلدار مقرر ہوئے ایک سال ہو گیا تھا اور اس کے افسر اس سے بہت خوش تھے۔ محمود کا زمیندار ہونے کی وجہ سے کافی رسوخ تھا اس نے تحصیلدار کو رشوت دے کر شاہد کو ایک رشوت کے سلسلہ میں پھنسوا دیا۔ شاہد پر اس کا بہت صدمہ ہوا۔ ادھر انجینئر صاحب نے اپنا تمام سرمایہ مقدمہ کی نذر کر دیا۔ مگر بیچارے شاہد کو نہ بچا سکے۔ اسے معطل کر دیا گیا اس کے معطل ہونے کے ایک ہی ماہ بعد اس کے والد کا انتقال ہو گیا۔ شاہد کو اپنے معطل ہونے کا ہی کیا کم صدمہ تھا کہ والد کے انتقال نے اس کے رہے سہے حواس بھی کھو دیئے۔ دنیا اس کی نظروں میں تاریک تھی اسے اب ذریعہ معاش کی تلاش تھی۔ والد کا تمام اثاثہ اس کے مقدمہ میں ختم ہو چکا تھا۔ محمود اپنی کامیابی پر بہت خوش تھا اس نے اسی پر اکتفا نہ کی وہ اس سے بھی سخت بدلہ لینا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ شاہد کو جیل کی سزا ہو جائے تاکہ اس کے رستہ سے کانٹا دور ہو جائے۔

ایک دن وہ شاہد کے پاس گیا اور اس سے بہت ہمدردی ظاہر کی اور باتوں ہی باتوں میں اس سے تذکرہ کیا کہ "میرے ایک دوست بمبئی میں سیٹھ ہیں" انہیں ایک کلرک کی ضرورت ہے میں انہیں تمہارے متعلق لکھوں گا۔ شاہد نے انہیں ایک فرشتہ رحمت سمجھا اور ان کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ ایک ہفتہ بعد محمود آیا اور شاہد سے بولا کہ سیٹھ جی کا خط آ گیا ہے۔ انہیں منظور ہے تم بمبئی چلے جاؤ اس نے سیٹھ جی کا پتہ مع اپنے ایک خط کے اسے دے دیا۔

شاہد عقیلہ کو بھی اپنے ساتھ لے گیا اور رفیعہ اور والدہ کو اپنے ایک عزیز کے گھر چھوڑ گیا۔ بمبئی میں سیٹھ جی نے اسے [illegible] ماہانہ پر نوکر رکھ لیا۔ شاہد نے ایک چھوٹا سا مکان کرایہ پر لے لیا۔ شاہد بہت محنت اور دیانتداری سے کام کرتا۔ سیٹھ جی اس سے بہت خوش تھے۔ دو ہی مہینہ میں اس کی تنخواہ انھوں نے پچاس کر دی۔ اسی دوران میں اس کے ایک بیٹا پیدا ہوا۔ جس کا نام اس نے حامد رکھا۔ سیٹھ جی نے حامد کو دیکھ کر ایک دس روپیہ کا نوٹ اس کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ شاہد نے بہت منع کیا مگر وہ نہ مانے اور بولے کہ میری خوشی اسی میں ہے۔"

شاہد اور عقیلہ اب بہت خوش تھے عقیلہ اپنے حسن انتظام سے پچاس میں ابھی خاصی طرح گذر اوقات کر لیتی [illegible] پر کچھ بچا کر شاہد کی والدہ کو بھیجتی تھی۔ وہ شاہد سے [illegible] کوئی اچھی جگہ تلاش کر و اب تمہیں تجربہ ہو گیا ہے [illegible] مگر شاہد پچاس تو سیٹھ جی کے اخلاق و محبت سے [illegible] کہ اس کا دل وہاں سے جانے کو نہ چاہتا ایک دن اخبار میں [illegible] کی نوکری کے واسطے اشتہار چھپا عقیلہ نے زبردستی درخواست بھجوا دی کئی دن بعد شاہد کو اطلاع ملی کہ اس کو [illegible] پر نوکر رکھ لیا گیا ہے۔ شاہد سیٹھ جی کے پاس گیا اور ان سے [illegible] کہا۔ سیٹھ جی اس کی دیانتداری سے اتنے خوش تھے کہ انہوں نے اس کی تنخواہ ساٹھ کر دی اور اس سے کہا کہ وہ ان کو نہ چھوڑے اب تو شاہد کے دل میں سیٹھ جی کی عزت اور بھی بڑھ گئی اور اس نے اس بات کا تہیہ کر لیا کہ اب کسی حالت میں وہ سیٹھ جی کو چھوڑ کر [illegible]

محمود مستقل اس فکر میں تھا کہ کسی طرح شاہد کو کسی مقدمہ میں پھنسوا دے تاکہ اسے قید کی سزا ہو جائے اس نے سیٹھ جی سے اس کا ذکر کیا کہ اس نے صرف اس لئے شاہد کو ان کے یہاں نوکر رکھوایا تھا۔ مگر سیٹھ جی نے اس سے صاف کہہ دیا کہ "مجھے آپ کی ہر خوشی منظور ہے مگر یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا اس جیسا نیکدل۔ ایماندار آدمی ملنا بہت مشکل ہے [illegible] میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ سب کاروبار اسی کے ہاتھ میں [illegible]"

محمود یہ سن کر کف افسوس ملنے لگا کہ بیکار اس نے شاہد کو نوکر رکھوایا اس سے تو نہ رکھواتا تو اچھا تھا اس نے سیٹھ جی کو کچھ روپیہ دینا چاہا کہ شاید اس سے وہ مان جائیں مگر سیٹھ جی نے صاف انکار کر دیا وہ سیٹھ جی سے لڑ کر چلا گیا۔

شاہد کو سیٹھ جی کے ہاں ایک سال ہو چکا تھا تمام روپیہ وغیرہ کا انتظام اسی کے ہاتھ میں تھا۔ ایک دن عقیلہ سیٹھ جی کی [illegible] سے ملنے گئی ہوئی تھی سیٹھ جی کسی کام سے اندر گئے وہاں ان کی نظر عقیلہ پر پڑی۔ دل مسوس کر رہ گئے پہلی ہی نظر میں اس کے گمان ہو گئے۔ وہی سیٹھ جی جو شاہد کی لیاقت اور دیانتداری سے بے انتہا خوش تھے۔ عقیلہ کو دیکھتے ہی ان کی نیت خراب ہو گئی اور وہ اسی فکر میں رہنے لگے کہ کوئی ایسا داؤ شاہد پر ڈالا جائے جس سے کہ عقیلہ ان کے قبضہ میں آ جائے لیکن کوئی ترکیب ان کی سمجھ میں نہ آتی تھی اس لئے کہ وہ پردہ نشین تھی۔

ایک دن سیٹھ جی نے شاہد کو کسی [illegible]

باہر دو دن کے لئے بھیجا۔ اس کے جانے کے اگلے دن وہ اس کے مکان پر پہنچے۔ عقیلہ نے جب سنا کہ سیٹھ جی آئے ہیں تو اسے بہت تعجب ہوا۔ اور کسی فوری خیال سے وہ کانپ گئی۔ اس نے دریافت کیا کہ کیا بات ہے۔ سیٹھ جی نے کہلوایا کہ میں تم سے کچھ باتیں شاہد کے متعلق کرنا چاہتا ہوں۔ وہ پردے کے پیچھے کھڑی ہوئی۔ سیٹھ جی نے ہاتھ بڑھا کر اسے کھینچ لیا۔ عقیلہ نے سیٹھ جی کے منہ پر اس زور سے تھپڑ مارا کہ ان کا سارا نشہ ہرن ہو گیا۔ اس نے کہا کہ "فوراً میرے گھر سے نکل جاؤ ورنہ ابھی شور مچاتی ہوں۔" سیٹھ جی کچھ اپنی عزت کا خیال کر کے چلے گئے۔ اور کہہ گئے کہ "سمجھ لوں گا۔" عقیلہ نے شاہد کی واپسی پر اس سے اس کا کچھ ذکر نہ کیا۔

اس واقعہ کے ایک ہفتہ بعد جب شاہد صبح کو دکان پر گیا تو اس نے وہاں سیٹھ جی کو مع پولیس کے بیٹھے ہوئے دیکھا۔ وہ سخت پریشان ہوا کہ معاملہ کیا ہے۔ سیٹھ جی اسے دیکھتے ہی انسپکٹر سے بولے "صاحب یہ شخص ہے جس نے میرا پانچ ہزار روپیہ غبن کر لیا ہے۔" شاہد بولا۔ "سیٹھ جی یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" سیٹھ جی بولے "جیل جا کر سب حقیقت کھل جائے گی۔" پولیس اسے پکڑ کر تھانے لے گئی۔

عقیلہ اس خبر کو سنتے ہی بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ ہوش آنے پر وہ سب کچھ سمجھ گئی۔ اب سیٹھ جی نے اس کے پاس پیغامات بھیجے کہ اگر اپنے شوہر کو آزاد کرانا چاہتی ہو۔ تو میرے پاس آ جاؤ۔ وہ سخت کشمکش و پیچ میں تھی کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ شاہد کو جیل میں پڑے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ دسمبر کا مہینہ تھا۔ سخت سردی پڑ رہی تھی۔ آخر کار اس نے اپنی سب سے قیمتی چیز اپنے شوہر پر قربان کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ رات کو سیٹھ جی کے گھر پہنچی سیٹھ جی اسے دیکھتے ہی ہنس دیئے اور اس کی آؤ بھگت کی۔ جب وہ وہاں سے لوٹی تو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری تھا اور اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اس نے اپنے شوہر کے لئے وہ کچھ کیا تھا جس کا تصور بھی ہندوستانی معاشرت برداشت نہیں کر سکتی۔ کیا یہ قربانی تھی ؟ ؟

عالمگیر کی مستقل خریداری قبول فرمایئے

فن تطریب اور مسلمان

فن تطریب ایک ایسا فن ہے جس کے متعلق ابن خلدون مغربی لکھتا ہے کہ اس فن کی عروس تکمیل کی آغوش سے وہی قومیں ہمکنار ہو سکتی ہیں جو فکر معاش کی قیود سے مطلقاً آزاد خانگی و غیر خانگی افکار سے سبکدوش ہو کر ہر وقت ہمہ تن کو ہر مقصود کی تحصیل میں ہمہ تن مشغول رہیں۔

بایں وجہ ابتداً اہل عرب کو اس فن میں کوئی امتیازی خصوصیات حاصل نہ ہوئیں۔ صرف شعر گوئی پر انحصار رہا جس میں اجزائے متناسبہ کو باہم اس طرح ملانا پڑتا ہے کہ حروف۔ حرکات۔ سکنات۔ وصل۔ فصل کا پورا پورا لحاظ کرنا واجب و لازم ہوتا ہے اس کا ہر جز اپنے معنی کے افادہ میں دوسرے کے ملانے کا محتاج نہیں رہتا جسے بیت یا شعر کہتے ہیں۔ چونکہ اجزا علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں اور اپنے معنی اچھے بتاتے ہیں مختصر طور سے مطلب ادا ہو جاتا ہے۔ مقاطع و مبادی اس کے باہم متناسب ہوتے ہیں طبیعت اس کو خاطر خواہ پسند کرتی ہے دل بے اختیار اس کی جانب متوجہ ہو جاتا ہے اسی وجہ سے دلوں پر نظم کا اثر بہ نسبت نثر کے زیادہ ہوتا ہے۔

انہی تخیلات کے زیر اثر عربوں نے شاعری کا مذاق پیدا کیا جس کو انتہائی توجہ سے معراج کمال تک پہنچا دیا اس کے ذریعہ سے اپنی طبیعتوں کو لطیف معانی و اسلوب عجیب پیدا کرنے پر قادر کر دیا اپنی حکمتیں واقعات اور اخبار و شرف کا دیوان بنایا۔ مگر کوئی تانہ فنی اس کو منور کرنے کے لئے ایجاد نہ کی۔ حالانکہ فن تطریب کے اصول شاعری کے اصول کے مقابلہ میں ایسے ہیں جیسے سمندر میں سے ایک کوزہ۔ کیونکہ جیسا تناسب اجزا کا بلحاظ متحرک و ساکن شعر میں ہے بعینہ ویسا ہی مگر اس سے کم موسیقی میں ہے۔ موسیقی شعر ہی کی سرزمین کا ایک ہرا بھرا، سرسبز اور پھلا شجر ہے۔

بعض مورخین نے زمانۂ جاہلیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ اس زمانہ میں بھی ایک قسم کا لحن تھا جس کو اہل موسیقی سناد اور نصب العرب کہتے تھے۔ یہ حدی خوانی سے بھی زیادہ لطیف و پر اثر

موسیقی

از جناب منشی حافظ محمد حسن صدیقی

کہ خود زمانہ میں اونٹوں کو دوڑانے کے لئے کچھ حدی خوانی شروع ہوئی۔ نوجوان لڑکے تنہائی میں بیٹھ کر اپنے شعروں کو منہ سے لے کر پڑھنے لگے اس میں کچھ خوشگوئی اور ترنم پیدا ہو گیا۔

شعر کو خوش آوازی کے ساتھ پڑھنے کو غنا کہتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ گانے کے وقت نغموں میں مناسبت لہجہ بھی پیدا کرتے تھے جو فن موسیقی کا خاص گُر ہے۔

اکثر اشعار جن کو غنا اور ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے بحر خفیف میں ہوتے تھے۔ کیونکہ ایسے اشعار رقص میں دف اور ستار پر بہت اچھے رواں ہوتے ہیں اور گلے میں بھی ہلکے معلوم ہوتے ہیں۔

شیخ ناصیف یازجی نے لکھا ہے کہ دو میراسنیں جن کو جرادتان کہتے تھے عرب میں گانے کی موجد تھیں۔

میدانی نے مجمع الامثال میں اور قاضی بیضاوی نے تفسیر سورۂ اعراف میں لکھا ہے کہ ان میں سے ایک کا نام وردہ اور دوسری کا جرادہ تھا۔ تغلیباً دونوں کو جرادتان کہا گیا (جیسے شمس و قمر کو شمسین یا قمرین کہتے ہیں)

یہ دونوں عبداللہ بن جدعان کی میراسنیں تھیں۔

مگر جب نیّر اسلام کمال آب و تاب سے معمورۂ عالم کو منور کر چکا اور مشاہیر ممالک پر عربوں کا قبضہ ہو گیا تو ان میں کثرت سے حاشیہ نشین پیدا ہو گئے۔ پھر تو روم و ایران سے باکمال گویوں کی آمد کثرت سے حجاز میں ہوئی۔ یہ اپنی خوش الحانی اور خوش آوازی کے باعث عربوں کے احباب بن گئے۔ عود۔ بربط۔ طنبورہ۔ ستار وغیرہ بجنے لگے اس رنگین ماحول سے متاثر ہو کر عربوں کو بھی شوق پیدا ہوا اور وہ بھی اپنے اشعار کو فن موسیقی کی لہروں پر رواں کرنے لگے۔

نشیط فارسی۔ طویس۔ سائب۔ خاثر۔ معبد۔ مالک۔ ابن سریج وغیرہ نے اس فن کو کما حقہ حاصل کیا جس کی وجہ سے مشاہیر عرب میں ان لوگوں کا شمار ہونے لگا۔ غرض کہ اسی طرح اس فن لطیف کو ترقی ہوتی رہی۔

فن موسیقی کے بعد رقص کے بھی اسباب باقاعدہ فراہم ہونے

کے ساتھ ہی ساتھ اکثر آلات بھی ایجاد کئے عجیب و غریب لباس بنائے گئے اسی ڈھنگ اور طرز کے اشعار لکھے گئے اس فن میں بھی کافی ترقی کی اور یہاں تک توجہ دی کہ اس کی صنف ہی ایک علیحدہ رنگ سے قائم ہو گئی۔

بنی عباس کے زمانہ میں۔ ابراہیم مہدی، ابراہیم موصلی، اسحٰق بن ابراہیم موصلی، حماد بن اسحٰق بن ابراہیم موصلی کی وجہ سے یہ فن اپنے کمال کو پہنچ گیا اور یہیں سے مغربی ممالک میں پھیلا۔

علامہ ابوالصلت بن عبدالعزیز سنہ ۴۶۰ھ کے قریب شہر دانیہ جو اندلس کے مشرقی اضلاع اور مشہور و معروف شہر اشبیلیہ کے قریب پیدا ہوئے۔ سواد وطن ہی میں نشو و نما پائی۔ قاضی ابوالولید وقشی کی شاگردی اختیار کی۔ بہت ہی قلیل عرصہ میں طب ریاضی ہندسہ ادب شاعری میں کمال حاصل کر لیا ان کے مورخ کہتے ہیں کہ طب میں جو درجہ ان کو حاصل ہوا۔ اطبائے اندلس میں سے بہت کم کو نصیب ہوا تھا ریاضی اور ہندسہ میں فرید عصر شمار کئے جاتے اور شاعری کے اعتبار سے وہ مقبولیت حاصل تھی۔ کہ شعرائے اندلس میں سے بہت کم ایسے باکمال گزرے ہیں جو ان کے ہم پایہ بتائے جا سکیں۔ ان جملہ علوم و فنون کے علاوہ علم موسیقی میں بھی ایسی مہارت اور واقفیت پیدا کی تھی کہ عرب کے تمام مغربی گویوں کے نام اس طرح لوگوں کے صفحہ دل سے حرف ضعیف کی طرح محو ہو چکے تھے جس طرح معشوق کی ملاقات کے وقت فرقتوں کی مصائب تخیلات کی دنیا سے زائل ہو جاتے ہیں۔ علم ہی نہیں بلکہ عملی طور پر اس فن کے بہت بڑے اور مستند استاد تھے۔ سرود جیسا انھوں نے بجایا بعد میں کوئی نہیں بجا سکا تھا۔ افریقہ کی تمام مروجہ بحریں انہی کی قائم کی ہوئی تھیں۔ یہاں تک کہ علامہ مقری جو اس نامی گرامی فیلسوف یعنی عرب کے پانچسو برس کے بعد ہوئے ہیں اپنی کتاب نفح الطیب میں لکھتے ہیں کہ بلاد افریقہ میں آج تک جتنی دھنیں مروج اور مقبول ہیں سب ابوالصلت کی قائم کی ہوئی ہیں۔

ہندوستان میں بعض مورخین نے تانسین کو گویوں کا پیغمبر لکھا ہے جس کا اصل نام ثانا سینا یا ٹونٹا سانٹا تھا۔ یہ اٹالیہ کا باشندہ تھا۔ مگر اس بارے میں اکثر مورخین کا باہم اختلاف ہے کچھ مورخین اس کا ہندوستان میں پیدا ہونا ثابت کرتے ہیں۔

بہرحال جلال الدین شیرازی کے بیان سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی پرورش و تعلیم کا زمانہ کشمیر میں گذرا۔ بہر حال یہ تو تسلیم شدہ امر ہے کہ وہ اطالین نژاد تھا اس کے یہاں کئی پشتوں سے گانے بجانے کا سلسلہ چلا آتا تھا۔ تانسین مجالس میں بہت فخر کے ساتھ بیان کرتا تھا۔ کہ وہ حضرت داؤد کی اولاد میں سے ہے جن کو خصوصیت کے ساتھ خداداد موسیقی کی دولت عطا ہوئی تھی۔

۱۵۶۶ء میں تانسین کشمیر سے لاہور آیا اس وقت وہ بہت بے سروسامانی کی حالت میں تھا۔ لاہور میں چند ماہ قیام کیا۔ مگر کوئی صورت کامیابی کی پیدا نہ ہوئی پھر لاہور سے دہلی آیا اس وقت اس کی عمر کچھ اوپر اٹھارہ سال کی تھی۔ یہاں آکر ملا سلامت کے دست حق پرست پر مسلمان ہوا اور اب یہیں سے اس کو عروج ہونا شروع ہوا۔ رفتہ رفتہ اس کی شہرت دہلی سے نکل کر آگرہ تک پہنچی۔ ملا سلامت کے انتقال کے بعد دہلی سے دل اچاٹ ہو گیا۔ آگرہ آیا۔ جہاں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا کچھ روز قیام کرنے کے بعد بنگالہ پہنچا۔ یہاں داؤد خاں حکومت کرتا تھا۔ جو اول درجہ کا عیش پرست تھا۔ تانسین کی یہاں خوب آؤ بھگت ہوئی۔ کچھ عرصہ کے بعد اکبر نے بنگالہ پر حملہ کر دیا۔ داؤد خاں ادھر ادھر بھاگا پھرا۔ کئی مقامات پر تانسین داؤد خاں کے ساتھ رہا لیکن جب اس نے سوائے گردش کے کچھ نہ دیکھا تو پھر آگرہ کا رخ کیا۔ یہاں آکر دربار اکبری میں باریابی حاصل کی جو اس وقت پورے اوج پر تھا اور کاملین فن کا مرکز بنا ہوا تھا۔ یہاں پہنچ کر اس نے سکون کا سانس لینے کے بعد تانسین نے حکیم فارابی کے ایجاد کئے ہوئے باجوں کو کام میں لانا شروع کیا جو اس زمانہ میں بالکل ہی معدوم ہونے کے برابر ہو چکے تھے اسی لئے بعض لوگ ان باجوں کو تانسین کی ایجاد کہنے لگے تھے۔

تان سین کے چار لڑکے تھے جن میں سے سوائے ایک لڑکے کے جس کا نام حشمت تھا۔ سب لڑکے پڑھ لکھ کر مولوی بن گئے تھے حشمت نے فن موسیقی کی تانسین کے بعد کافی خدمت کی۔ تانسین نے ۱۵۹۵ء میں بمقام آگرہ انتقال کیا اور وہیں مدفون ہوا۔

لیکن غدر ۱۸۵۷ء میں جہاں اور بہت سی قابل قدر یادگار اشیاء صفحہ عالم سے فرنگیوں کے دامن میں روپوش ہو گئیں وہاں تانسین کی قبر بھی اکھاڑ پھینک دی گئی۔ بعض مورخین کہتے ہیں کہ تانسین کا انتقال کشمیر میں ہوا لیکن گوالیار میں تانسین کی قبر اب بھی بتائی جاتی ہے اس پر ایک املی کا درخت سایہ فگن ہے جس کے پتے آواز کھلنے اور خوش گلوئی حاصل کرنے کے لئے

اعتراف

افسانہ

از جناب حافظ عبدالوکیل عزیزی

"تم نے میری دُکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔ میرے بربط دل کے ٹوٹے ہوئے تاروں میں ایک درد ناک جھنکار پیدا کر دی۔ آہ! دوست گذری ہوئی باتیں نہ پوچھو تو بہتر ہے"

رمیش میرا ہم وطن ہونے کے علاوہ کالج کا ساتھی بھی تھا اور ہم چار سال تک ایک ساتھ کالج کے ہوسٹل کے ایک ہی کمرے میں رہے تھے۔ پانچ سال بعد ایک ہفتہ ہوا کہ میں جاپان سے کلکتہ واپس آیا تھا اور آج اپنے وطن بہار شریف جا رہا تھا۔ اتفاق سے جس کمپارٹمنٹ میں میں تھا، اسی میں رمیش بھی آیا۔۔۔ رمیش حیدرآباد کی اسٹیٹ پیپلز کانفرنس کی صدارت کر کے کلکتہ آیا تھا اور وہ بھی اپنے وطن واپس جا رہا تھا۔۔۔ اس اتفاقیہ ملاقات سے ہم دونوں نہایت خوش ہوئے اور ایک دوسرے کی خیریت دریافت کر کے گھنٹوں ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ رمیش نے مجھ سے جاپان کے سیاسی و تعلیمی حالات دریافت کئے تھے۔ میں نے ہندوستانی سیاست کے متعلق اُس سے استفسار کئے۔ غرض اسی طرح کی گفتگو کے درمیان میں نے رمیش سے اس کے نجی حالات دریافت کئے اور جب اس کی شادی کی بابت استفسار کیا، تو وہ گھبرا سا گیا۔ اس کے چہرہ کا رنگ متغیر ہو گیا۔ اس نے ایک نہایت گہری اور ٹھنڈی سانس لی جس سے اس کی آنکھوں میں آنسو کے قطرات چھلکنے لگے اور مندرجہ بالا جواب دے کر کسی خیال میں کھو گیا۔ رمیش کا یہ تعجب اور اطمینان شکن جواب سُن کر میں نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا:۔

"رمیش بات کیا ہے کچھ مجھ سے بھی تو کہو؟"

میرا یہ جملہ سُن کر یکایک وہ اپنے خیال سے اس طرح چونک پڑا، جیسے کسی نے گہری نیند میں اُسے جھنجھوڑ دیا ہو اور وہ آنسو پونچھتا ہوا بولا:۔

"کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ تم اس واقعہ کے سنانے کی مجھے تکلیف نہ دو؟"

"بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ میں تمہارا دوست ہو کر تمہاری افسردگی اور پژمردگی کی وجہ بھی دریافت نہ کروں۔ رمیش میں تمہارا دوست ہوں اور نہایت ہی گہرا دوست، کالج لائف میں تو تم نے مجھ سے کبھی کچھ راز نہ رکھا تھا، بلکہ ہر معاملے میں مجھ سے مشورہ کرتے تھے۔ آخر یہ کونسی بات ہے جو تم مجھے بتانا نہیں چاہتے۔ کیا میں اس لائق نہیں کہ مجھ پر اعتماد کیا جائے؟ کیا مجھ پر تمہیں بھروسہ نہیں ہے"

میں نے ظاہری رنج و ملال کر اپوسانہ لہجہ میں کہا۔

"تم بُرا مان گئے۔ رنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر مجھے تم پر بھروسہ ہوگا تو کس پر ہوگا۔ بات یہ ہے کہ ع

سازِ دل ٹوٹ چکا تارِ محبت ہے خموش!

اس لئے میں تمہیں اپنی داستانِ غم سنا کر اپنے زخموں پر نمک چھڑکنا نہیں چاہتا تھا میری روح کو اذیت ہوگی، لیکن تم اصرار کر رہے ہو تو سنو" رمیش نے کہنا شروع کیا "چار سال کا عرصہ ہو رہا ہے کہ میں نے اپنے گاؤں میں سوت کتوانے کھدر بنوانے کا انتظام کیا ہے۔ اب تو بہار شریف میں کھدر بننے کا ایک کارخانہ قائم کر دیا ہے اور اس وقت دونوں جگہوں پر تقریباً ایک ہزار افراد کام کر رہے ہیں، لیکن ابتدا میں صرف استھاوان ہی میں قائم کیا تھا۔ جہاں دو تین سو افراد کام کرتے تھے۔ اس کام میں صرف عورتوں ہی کو میں لگاتا ہوں اور خاص کر ان عورتوں کو جو واقعی امداد کی مستحق ہوتی ہیں۔ جو سماج کی ٹھکرائی ہوئی، بیوہ، مصیبت زدہ اور نانِ شبینہ کو محتاج ہوتی ہیں، جنہیں کوئی دوسرا کام گزر اوقات کو نہیں ملتا ہے۔ غرض میری انتہائی کوشش یہی رہتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ غریب اور تنگدست عورتوں ہی کو ملازم رکھا جائے۔ ان کے معاوضہ کی صورت یہ ہے کہ روزانہ آٹھ آنے انہیں خرچ کے لئے دیئے جاتے ہیں اور سال کے آخر میں جب سال بھر کا حساب ہوتا ہے، تو اخراجات منہا کر کے منافع کو سب پر برابر تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح ہر مزدور کو ایک معقول رقم۔۔۔ آٹھ آنے یومیہ کے علاوہ۔۔۔ سالانہ یکمشت مل جاتی ہے۔ جو کام کرنے والیاں دُور دراز کے گاؤں سے آئی ہوئی ہیں۔ ان کے لئے ایک قیام گاہ بنا دی ہے جس میں تقریباً پچاس صاف ستھرے اور ہوادار کمرے ہیں۔ اسی سے ملحق ایک رمیش گرلز اینڈ بوائز مڈل اسکول ہے جس میں دن کو گاؤں کے لڑکے لڑکیاں تعلیم حاصل کرتے ہیں اور رات کو ان مقیم عورتوں کے پڑھانے کا انتظام ہے اور ان کی تعلیم کے لئے دو عورتیں مقرر ہیں جو انہیں ہندوستانی زبان میں ابتدائی تعلیم دیتی ہیں۔ بہرکیف! ایک روز میں اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک سولہ سترہ سالہ قبول صورت لڑکی میرے سامنے آئی۔ جب میں نے اس کے آنے کا مقصد دریافت کیا، تو وہ نہایت افسردگی سے بولی:۔

"میں نے سُنا ہے کہ سرکار کے یہاں غریب (غریب: محتاج عورتوں) کو کام دیا جاتا ہے۔ اسی لئے میں آئی ہوں کہ اگر ہو سکے، تو مجھے بھی کسی کام پر لگا دیا جائے کہ

"تمہارا گھر کہاں ہے؟" میں نے دریافت کیا

"راجگیر" اس لڑکی نے جواب دیا

"تمہارے باپ، ماں یا پتی ہیں؟"

"باپ نہیں ہے۔ سنتی ہوں کہ جب میں سات برس کی تھی، تو میرے پتی سورگ باشی ہو گئے۔ اب صرف ماں اور ایک چھ برس کی بہن ہے۔ ہم بڑی گریب ہیں۔ دانہ دانہ کو محتاج ہیں۔ کبھی کبھی دن کھائے بغیر (بغیر) گجر (گذر) جاتا ہے۔ آپ ہم پر ترس کھائیں اور ہمارے لئے کام کا انتجام (انتظام) کر دیں۔ ایشور آپکو اس کا بدلہ دیں گے۔" اس کے رخسار آنسو سے بھیگ گئے۔

"تمہارے باپ کیا کام کرتے تھے؟" میں نے پوچھا

"میرا باپ جب زندہ تھا، تو کھیتی باڑی کر کے اور دودھ دہی بیچ کر ہم لوگوں کو پالتا پوستا تھا" لڑکی نے کہنا شروع کیا "ان دنوں میرا باپ کھاتا پیتا آدمی تھا۔ اس کے پاس چند بگھے کھیت، دو بھینسیں، دو بیل ایک گائے اور چند بکریاں تھیں جن کے جریعہ (ذریعہ) وہ ہم لوگوں کے کھانے پینے کا انتجام کرتا تھا اور چین و اطمینان کی زندگی گذر رہی تھی۔ اس وقت میرا سن دس سال کا تھا اور میری بہن تین مہینے کی، کھیت کے بارے کسی بات پر جمیندار (زمیندار) سے جھگڑا ہو گیا اور جمیندار نے میرے باپ پر نالش کر دی۔ چونکہ میرا باپ اپنے کو بکسور (بے قصور) سمجھتا تھا۔ اسلئے اس نے مکدمہ (مقدمہ) کی پیروی کا انتجام کیا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ عدالت میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا اور ہوا بھی یہی کہ مکدمہ میرے باپ ہی نے جیتا، لیکن مکدمہ میں جتنی پونجی تھی، سب کھرچ (خرچ) ہو گئی اور وہ کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گیا جس کے صدمے سے وہ ایسا بیمار پڑا کہ پھر نہ اٹھ سکا۔ باپ کے مرنے کے بعد میری ماں گاؤں والوں کا جانتا (چکی) پیس کر اور اسی طرح کے دوسرے کاموں سے چند پیسے کما لیتی تھی میں بھی گاؤں والوں کے کام کر کے کچھ حاصل کر لیتی تھی جس سے ہم لوگوں کے کھانے پینے کا سہارا ہو جاتا تھا لیکن ادھر کچھ دنوں سے گاؤں میں کام بالکل نہیں ہے، جس کی وجہ سے ہم لوگ بہت ہی دکھ اٹھا رہے ہیں۔ اگر آپ کرپا کر کے ہمیں کام دے دیجئے، تو بھگوان آپ کا بھلا کریں گے"

غرض لڑکی کی ان باتوں کو سن کر میں نے اسے کام پر لگا دیا اور وہ نہایت تندہی سے کام کرنے لگی۔ ساتھ ہی ساتھ رات کو بڑی محنت اور دل لگا کر پڑھا بھی کرتی چونکہ وہ فطری طور پر ذہین اور سمجھدار واقع ہوئی تھی، اس لئے بہت جلد وہ ہندوستانی زبان میں پڑھنا لکھنا سیکھ گئی اور انگریزی اور ہندی کی کتابوں کا سبق لینے لگی، لیکن ایک بات اس لڑکی میں دوسری تمام کام کرنیوالی عورتوں سے بالکل مختلف میں نے دیکھی۔ یعنی وہ ہر وقت خاموش رہتی اور سب سے الگ تھلگ اپنے کام میں مصروف نظر آتی اور کسی سے بھی ضروری باتوں کے سوا ایک لفظ تک نہ بولتی۔ کام کرنے والیوں میں بہت سی ایسی نوجوان لڑکیاں تھیں جو دن بھر ہنسی مذاق اور ٹھٹھا مخول کر کے اپنے خشک کام میں دلچسپی کا رنگین پیدا کیا کرتی تھیں لیکن وہ ان لوگوں کی باتوں میں بالکل حصہ نہ لیتی اور خاموش کے ساتھ اپنے کام میں لگی رہتی جب میں معائنہ کے لئے آتا، تو اکثر کام کرنے والی لڑکیاں خواہ مخواہ مجھ سے بولنے کی کوشش کرتیں اور جس کسی کی بات کا میں جواب دیتا تو وہ خوشی و مسرت کے جذبات سے بیخود ہو جاتی اور ایک طرح کا فخر محسوس کرتی اور اپنی ہم چشموں میں میرے جواب کو جذبۂ پندار کے ساتھ دہرایا کرتی جس کی وجہ یہ تھی کہ کام کرنے والی تمام عورتیں ایک دیوتا کی طرح میری عزت کرتی تھیں اور مجھ سے اپنے مخلص بھائی اور عزیز بیٹے کی طرح سچا پریم کرتی تھیں، لیکن پاربتی مجھ سے خود کبھی نہ بولتی اور جب میں اس سے چھیڑ کر کچھ دریافت کرتا، تو وہ ایک تلخ اور افسردہ مسکراہٹ کے ساتھ نہایت ہی مختصر جواب "ہاں" "نہیں" "جی" وغیرہ دے دیا کرتی اور اس کے چہرہ کے بدلتے ہوئے رنگ سے یہ پتہ چلتا کہ مجھ سے بولنے میں اُسے کوئی اندرونی تکلیف ہو رہی ہے۔ اس کی اس تکلیف دہ خاموشی اور خلوت نشینی سے میں بیحد متاثر ہوا۔ اور سب سے زیادہ اسکی مدہوش جوانی اور ملکوتی حسن نے مجھ پر اثر کیا۔ میرے جنسی جذبات میں تحریک ہوئی۔ پہلے تو میں نے بہت ہی صبر و تحمل سے کام لیا اور اس کے خیال کو دل و دماغ سے نکال ڈالنے کی انتہائی کوشش کی لیکن مجھے ناکامی ہوئی کیونکہ میں جس قدر اُسے بھلا دینا چاہتا تھا، اس سے زیادہ وہ میرے قلب میں سمائی جاتی تھی اور اسکا حسن و شباب سے دمکتا ہوا چہرہ ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے ناچا کرتا۔ آخر کار جب میں نے محسوس کیا کہ میں اس کی جدائی برداشت نہیں کر سکتا، تو ایک روز اُس کے کمرے میں گیا، لیکن اُسے دیکھتے ہی میں ایسا مرعوب ہوا کہ حرف مدعا زبان پر نہ لا سکا، مگر پھر ہمت کر کے تمہید کے طور پر اس کی خاموشی اور کم گوئی کی وجہ دریافت کی لیکن اس کا اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے اس کی دلدہی و دلجوئی میں بہت سے فقرات کہے اور اس کی ہمدردی کا وعدہ کیا، لیکن اسپر بھی وہ خاموش رہی۔ مجبوراً ڈرتے ڈرتے میں نے اُسے شادی کا پیغام دیا۔ جسے سنتے ہی وہ حیرت زدہ ہو کر تعجب خیز نظروں سے میرا منہ تکنے لگی اور جب میں نے اس کی رضامندی کے متعلق استفسار کیا، تو وہ ایسے خوفناک طور پر ہنسی کہ معلوم ہوتا تھا کوئی مُردہ ہنس رہا ہے۔ یکایک اُس نے کہا:-

"بابو جی! آج آپ مجھ سے دل لگی کرنے آئے ہیں؟"

"نہیں پاربتی میں دل لگی نہیں کرتا۔ میں سچ مچ تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں"

یکایک وہ کسی گہرے خیال میں گم ہو گئی، اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا اور اسکی صورت ایسی معلوم ہونے لگی، جیسے وہ سخت درد و کرب کی تکلیف میں

جنوری ۱۹۳۴ء کی بات

جب میں باپ نہیں تھا

ایک ناسمجھ ہندوستانی کی سبق آموز آپ بیتی

میری شادی کو گیارہ سال ہو چکے ہیں۔ لیکن بہت عرصہ تک . . . میں یہ احساس نہیں کر سکا کہ شادی شدہ لوگ کیونکر خوش رہ سکتے ہیں۔ شادی کیوں ہوتی ہے۔ اور پھر اس کے بعد کیا ہوتا ہے۔ میرے دوست جب اپنی بیوی کے قصے مجھے سنایا کرتے تھے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نے میرے دل کو مسل کر سینے سے باہر نکال دیا ہے۔ اور اس کی جگہ انگیٹھی میں آگ بھر کر رکھ دی ہے بہت دن کے بعد میرے ایک خاص دوست کو میری خفیہ بیماری کا پتہ چل گیا۔ اس نے پوچھا "کیا تمہیں جریان کی بیماری ہے" میں نے کہا، نہیں! لیکن پھر اس نے کہا، "کیا پیشاب سے پہلے اور اس کے بعد کوئی رطوبت خارج ہوتی ہے۔ میں نے کہا ہاں۔ پھر اس نے خاص بات پوچھی۔ میں نے کہا میں یہ بات جانتا تو ضرور ہوں کہ ایسا ہوتا ہے لیکن آج تک . . . .

میرا یہ جواب سنکر وہ چونک اٹھا۔ اور تعجب سے کہا کہ تم نے مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی۔ اگر اسی زمانے میں بتا دیتے، جب تمہاری شادی ہوئی تھی کہ تم جریان کے مریض ہو تو میں تمہیں صرف پندرہ دن میں تندرست کر دیتا چنانچہ میرے دوست نے اسی وقت "**زنانہ دواخانہ**" کو خط لکھ کر "جوہر اعظم" دوا کی ایک شیشی تین روپے آٹھ آنے کو منگائی اور مجھے استعمال کے لئے دی۔ میں نے ترکیب کے مطابق اس دوا کا استعمال شروع کر دیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب میں نے دیکھا کہ دوا شروع کرنے کے ساتویں یا شاید آٹھویں دن پیشاب کے وقت وہ سفید رطوبت خارج ہونی بند ہو گئی۔ اور مجھے اپنے اندر ایک خاص بات محسوس ہوئی دوا ابھی پوری ختم نہ ہوئی تھی کہ ایک روز . . . . بیوی

جنوری ۱۹۳۶ء کی بات } اپنے دوست کی مہربانی کی بدولت اب میں اس جوانی کی ہری بھری دنیا میں ایک ایسے خوش و خرم نوجوان کی طرح ہوں جیسے کہ مجھ جیسی عمر کے انسان کو ہونا چاہیئے میری بیوی ایک بچے کی ماں ہے۔ اور وہ جب اپنے بچے کو کھلاتی ہے اور بچہ ہمک ہمک کر ماں کی طرف دوڑتا ہے۔ اور ماں کے سر کے بال نوچتا ہے تو مجھے یہ بات یاد آتی ہے کہ اس **بچے کے باپ کا نام "جوہر اعظم" ہے**۔ کیونکہ "جوہر اعظم" دوا سے ہی میری جریان کی بیماری دور ہوئی اور میری خفیہ طاقت پھر مجھے مل گئی۔ کاش جریان کے تمام مریضوں کو معلوم ہو جائے کہ اس دنیا میں جریان کی اگر کوئی بھرپور دوا ہو سکتی ہے تو وہ جوہر اعظم ہے۔ ایک شیشی کی قیمت صرف تین روپے آٹھ آنے ہے۔ اس دوا پر عام فائدہ کے خیال سے محصول ڈاک معاف ہے۔

پس ناظرین میں سے جو لوگ میری طرح جریان کی بیماری میں مبتلا ہوں۔ اور پیشاب سے پہلے یا بعد میں قوت مردمی پانی کی طرح بہہ جاتی ہو یا رات کو سوتے میں ناپاکی ہو جاتی ہو یا بعض وقت . . . . شرمندگی ہوتی ہو تو انہیں چاہیئے کہ

مینجر زنانہ دواخانہ نمبر ۳۴ بی دہلی کو خط لکھ کر جوہر اعظم دوا کی شیشی بذریعہ وی۔ پی پارسل منگا لیں۔ صرف ایک ہی شیشی تندرست بنا دے گی۔

"جوہر اعظم" وہی مشہور دوا ہے جسے ۱۹۲۰ء میں آل انڈیا کا مرڈ سوسائٹی نے کافی تجربہ کر کے عام اعلان کے ذریعہ پبلک کو مطلع کیا تھا کہ "جوہر اعظم" دوا جریان کے مریض کو یقیناً تندرست کرتی ہے اور تمام ملک سے پرزور اپیل کی تھی کہ جریان کے مریضوں کو اس دوا سے فوراً فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ کیونکہ آل انڈیا کامرڈ سوسائٹی نے جوہر اعظم کا بہت کافی تجربہ کرایا ہے۔ اور ہر جگہ ہر مریض کو اس دوا نے تندرست کر دیا۔ چنانچہ ۱۹۲۵ء سے آج تک انجمن مذکور کی ہدایت کے مطابق اس دوا پر محصول ڈاک معاف ہے۔ اور کسی خریدار سے محصول پارسل نہیں لیا جاتا۔ صرف دوا کی قیمت لی جاتی ہے۔

ٹیلی فون نمبر ۶۲۶۸

تار کا پتہ ۔۔ "زنانہ دواخانہ" دہلی

پیشاب کے بعد...... پیپ

اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ چھ سال کی ریسرچ اور تلاش کے بعد سوزاک کے مرض کو ختم کرنے کے لئے جو دوا "کلوزول" کے نام سے تیار کر کے ملک کے سامنے پیش کی ہے۔ وہ سوزاک کے مرض کا نہایت معقول اور کامیاب علاج ہے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اس دوا نے ہزارہا سوزاک کے مریضوں کو تندرست کر دیا۔ صرف ایک شیشی "کلوزول" ایک مریض کے لئے کافی ہوجاتی ہے۔

متعدد پرانے اور نئے مریضوں پر تجربہ کرنے سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ کلوزول کا استعمال شروع کرنے کے ٹھیک تیسرے دن مریض خود بول اٹھتا ہے کہ دوا "کلوزول" نے اس نے نمایاں فائدہ حاصل کرنا شروع کر دیا ہے۔ پوری شیشی میں ایک مہینہ کی دوا ہوتی ہے جسے استعمال کرنے کے بعد مریض پوری طرح سوزاک سے نجات پا جاتا ہے ملک میں ہماری یہ شاندار خدمت بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھی جارہی ہے۔ کیونکہ بد قسمتی سے اس ملک میں سوزاک کا مرض وبا کی طرح پھیل گیا تھا مگر اس بروقت امداد نے مریضوں کے لئے آب حیات کا کام کیا ہے۔ لہذا اس اعلان کے ذریعہ سوزاک کے تمام مریضوں کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ اگر انہیں سوزاک کی تکلیف ہے۔ خواہ کتنے ہی عرصے سے ہے۔ انہیں چاہیئے کہ

مینیجر زنانہ دواخانہ ۱ے۔بی ۲۴۳ دہلی کے پتہ پر خط لکھ کر دوا "کلوزول" کی ایک شیشی بذریعہ وی۔پی پارسل منگالیں اور استعمال شروع کر دیں۔ ٹھیک تیسرے دن وہ خود دیکھ لیں گے کہ سوزاک کا اصلی علاج "کلوزول" ہی ہے۔ جس کی ایک شیشی کی قیمت دو روپے نو آنے ہے۔ پارسل پر سات آنے محصول ڈاک خرچ ہوگا۔ امید ہے کہ ہندوستان اس بہترین ایجاد سے فائدہ حاصل کریگا۔

عورت کا سینہ

عورت کی شروع جوانی میں ہی اگر اس کا سینہ یعنی پستان ڈھیلے اور نرم ہو کر نیچے کو گرے ہوئے معلوم ہوں تو یہ بہت بدصورتی کہلاتی ہے ایسی عورت میں شباب کی کشش ختم ہوجاتی ہے یہ خرابی عورت کے سینہ میں اس وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب وہ ہر سال بچوں کو دودھ پلانے پر مجبور ہوجائے یا کسی بیماری یا بداحتیاطی کے باعث بھی عورت کا سینہ (یعنی پستان) ڈھیلے ہو کر بدنما معلوم ہونے لگتے ہیں اور وہ عین جوانی میں ہی شباب کی کشش ختم کر بیٹھتی ہے

ایسی عورت پھر نوجوان لڑکی نظر آسکتی ہے سائنس کی جدید کرشمہ سازی کی بدولت ایک ایسی بیش بہا دوا تیار ہوئی ہے جس کے استعمال سے عورت کے ڈھیلے اور نرم اور نیچے کو گرے ہوئے پستان دوبارہ گول اور سخت ہو کر عورت کو از سر نو جوان لڑکی کے روپ میں پیش کرنے لگتے ہیں اور اس پر شباب کی رنگینیاں پھر اپنی بہار پھیلا دیتی ہیں یہ لگانے کی دوا ہے۔ اور اس کا نام "برسٹین" ہے۔ یہ وہی دوا ہے جس کی بدولت اب تک سینکڑوں عورتیں اپنے سینہ میں دوبارہ شباب کا رنگ بھر چکی ہیں۔ اور اب وہ کافی عمر کے باوجود نوخیز لڑکیاں نظر آتی ہیں۔ اس دوا کا سب سے زبردست ثبوت یہ ہے کہ اس کے ہر روز کا استعمال عورت کو ثابت کرتا رہتا ہے کہ کتنی جلدی اسکے سینہ میں دوبارہ ابھار اور سختی پیدا ہو رہی ہے۔ جن عورتوں کو ضرورت ہو وہ

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ ۱ے۔بی ۲۴۳ دہلی کے پتہ پر خط لکھ کر ایک شیشی "برسٹین" بذریعہ وی۔پی پارسل منگالیں۔ ایک شیشی ایک عورت کو پوری طرح جوان لڑکی بنادیگی اور اس کے سینہ کی یہ سب خرابیاں دور ہو کر مستقل ابھار اور سختی پیدا کر دے گی۔ ایک شیشی "برسٹین" کی قیمت چار روپے چودہ آنے ہے۔ پارسل پر صرف سات آنے محصول لگے گا۔

نوٹ:۔ اگر کوئی بچہ عورت کی گود میں ہے۔ تب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ دوا بچہ کے دودھ پر کوئی اثر نہیں ڈالتی۔ بچہ نہایت اطمینان کے ساتھ دودھ پیتا رہیگا۔ کیونکہ دوا کسی حال میں نقصان نہیں کرتی۔

بیٹا ہو۔ اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے جس سے بے چین ہو کر میں بولا۔

"ارے! پاربتی تم رو رہی ہو؟"

میرے اس جملہ پر وہ اپنے خیال سے چونکی اور آنچل سے آنسو پونچھتی ہوئی بولی:-

"بابو جی! میں ایک غریب بیوہ مصیبت زدہ بھکارن اور نیچ ذات گوالا کی لڑکی ہوں۔ میں اپنے کو اس لائق نہیں پاتی کہ آپ کے چرنوں میں بھی رہ سکوں۔"

میں نے اسے سمجھایا کہ امیری غریبی، ذات پات اور شرافت و رذالت کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ سب سماج کے جاہل ٹھیکیداروں کا بنایا ہوا بیہودہ ڈھکوسلا ہے۔ میں ان باتوں کو نہیں مانتا۔ میرے نزدیک ہر انسان انسان ہونے کے لحاظ سے برابر ہے۔ میں تمہیں اپنے متعلق سوچنے کا موقع دیتا ہوں، مجھے امید ہے کہ جب تم میری باتوں پر تنہائی میں اطمینان کے ساتھ غور کرو گی، تو میری سچائی تم پر واضح ہو جائے گی اور مجھے مایوس کن جواب نہ دو گی۔

ایک مہینہ بعد میں اس سے پھر ملا، لیکن اب بھی اس نے وہی جواب دیا جو پہلے دیا تھا۔ ساتھ ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جب میں نے اس سے رونے کا سبب دریافت کیا تو وہ آنسو پونچھتی ہوئی بولی:-

"بابو جی! میں ابھاگن ہوں، پاپن ہوں، میں اس لائق نہیں کہ آپ مجھے اپنی سیوا کے لئے چنیں۔ دنیا میں آپکو بہت سی لڑکیاں ملیں گی۔ آپ انہی میں سے کسی ایک کو اپنی دھرم پتنی بنا لیں۔ میرے لئے اپنا جیون برباد نہ کریں۔"

میں اس کی ان باتوں کا مطلب بالکل نہ سمجھ سکا اور اسے پھر سمجھا کر کہا کہ دو مہینہ بعد ٹھیک ہولی کے روز میں تمہارے پاس آخری بار تمہارا جواب سننے آؤں گا۔ اس عرصہ میں تم خوب اچھی طرح اس پر غور کر لو، کیونکہ اب کی بار جب میں آؤں گا، تو اپنے جواب میں تمہیں "ہاں" کی بجائے "نہیں" نہ کہنا چاہیئے۔

دو ماہ بعد جب میں اس سے ملا اور اس کی مرضی دریافت کی تو اس نے گھونگھٹ کر کے رضامندی کے طور پر اپنا سر جھکا لیا۔ میں نے ان دو فرحاں اس کے یہاں سے واپس آیا اور اسی دن اس سے بیاہ کر لیا۔

سہاگ کی رات جب میں اپنے کمرے میں پہنچا، تو پاربتی مسہری پر سرخ لباس پہنے بیٹھی ایسی معلوم ہو رہی تھی، جیسے کوئی اپسرا ہو۔ میں پر اشتیاق و پرارمان نظریں اس پر ڈالے ہوئے آگے بڑھا کہ دروازہ کے پاس قالین میں میرا پاؤں الجھ گیا اور میں گر پڑا۔ جب اٹھنے لگا، تو میرے قریب ہی ایک لکھا ہوا کاغذ پڑا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر پڑھنا شروع کیا۔ اس کا مضمون قریب قریب یہی تھا۔

"شکش بابو! آپ نے میرے ساتھ جو سلوک کیا ہے اور جس بے لوثی و بے غرضی سے میری امداد کی ہے۔ اس کا بوجھ زندگی بھر میرے سر سے اتر نہیں سکتا۔ آپ اسے سچ مانیں کہ جب پہلے روز آپ نے مجھے شادی کا پیغام دیا اور میں نے انکار کر دیا، تو اس کی صرف یہی وجہ تھی کہ میں سچ مچ اپنے آپ کو آپ کے لائق نہیں سمجھتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ آپ کی مہربانی و ہمدردی نے میرے دل میں آپ کے لئے کافی جگہ پیدا کر دی ہے، لیکن پھر بھی مجھے یہ منظور نہ تھا کہ آپ ایک دیوتا ہو کر میرے جیسی ایک گنہگار لڑکی کو اپنی دھرم پتنی بنائیں، لیکن جب دوسری بار پھر آپ نے مجھے اس بات پر غور کرنے کو مجبور کیا، تو میں سمجھ گئی کہ آپ کو مجھ سے پریم ہو چلا ہے۔ کیونکہ اس طرح کی خواہش کا اظہار آپ جیسے انسان اس وقت تک نہیں کر سکتے تھے، جب تک کسی لامعلوم سبب سے اس کے اظہار پر مجبور نہ ہوں۔ میں ایک ہفتہ سے شب بیداری کر کے آپ کی درخواست پر غور کر رہی ہوں۔ میں چاہتی تھی کہ آپ سے شادی کا وعدہ کر کے آپکو دھوکا دیکر اپنی تباہی و بربادی کا بدلہ ــ جس کا ذمہ دار آپ ہی کی صنف کا ایک فرد ہے ــ آپ سے لوں۔ لیکن میرا دل اس کے لئے تیار نہیں ہوا۔ اور ضمیر نے مجھے ملامت کی کہ ایک محسن کو دھوکا اور دغا دینا دنیا کا سب سے بڑا پاپ ہے۔ غرض انتہائی تکلیف دہ روحانی و دماغی کشمکش و اذیت کے بعد میں نے تہیہ کر لیا کہ اپنی تباہی و بربادی کی داستان سے آپکو آگاہ کر دوں۔ آج دوسرا مہینہ ختم ہو رہا ہے اور کل صبح آپ میرے پاس میرا جواب سننے کے لئے آئیں گے۔ اس وقت رات کے بارہ بجے ہیں۔ چونکہ آپ مثبت جواب کے طلبگار ہیں۔ اس لئے میں یہ حالات لکھ رہی ہوں، اسے ختم کرنے کے بعد اس لکھے ہوئے کاغذ کو میں آپ کے کمرے کے کواڑ کی درز سے پھینک دوں گی۔ اگر اس واقعہ کو پڑھنے کے بعد بھی کل صبح آپ میرا جواب سننے کے لئے میرے پاس آئے، تو میں سمجھوں گی کہ آپ انسان نہیں، بلکہ دیوتا ہیں۔ اچھا اب اپنی کہانی شروع کرتی ہوں:-

دوسرے سال کی بات ہے، گاؤں کے گماشتہ کے ساتھ زمیندار کے بیٹے پرکاش بابو بھی میرے گاؤں آئے ہوئے تھے۔ زمینداری کچہری کے سامنے والے کنوئیں سے گاؤں کی تمام عورتیں پانی بھرا کرتی تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی کنوئیں پر پہلی دفعہ پرکاش بابو نے کسی روز مجھے دیکھا، کیونکہ صبح و شام میں بھی اسی کنوئیں سے پانی لایا کرتی تھی۔ ایک روز گاؤں کا گماشتہ میری ماں کے پاس آیا اور بولا کہ "زمیندار صاحب کی حویلی میں ٹہل کے لئے ایک لڑکی کی ضرورت ہے۔ تم غریب عورت ہو اور بوڑھی بھی ہو چکی ہو، اس لئے تم سے کوٹنا پیسنا بھی اچھی طرح نہیں ہو گا۔ کیوں نہیں پاربتی کو وہاں نوکر رکھا دیتی ہو، وہ اب سیانی ہو چکی ہے اور چھوٹی سی عمر میں ودھوا ہو گئی ہے اس لئے زندگی بھی اسے تمہارے ہی گھر میں گذارنا ہو گی، اگر اسے کام پر لگا دو گی تو

دو چار روپے مہینے میں مل جائینگے جس سے تم لوگ بھی آرام سے کھاؤ پیو گی، اور وہ بھی یقین سے وہاں رہیگی۔ مجھے تو تلاش کرنے سے بہت سی عورتیں ملازمت کیلئے مل جائینگی لیکن چونکہ تم غریب ہو اس لئے تمہارے اور پاربتی کے بھلے کیلئے ایک رائے دے رہا ہوں۔ تم اسپر غور کر کے کل مجھے جواب دو۔ تاکہ اگر تم انکار کر دو، تو میں کوئی دوسرا بندوبست کر سکوں" گماشتہ کی یہ رائے میری ماں کو پسند آئی، لیکن پھر بھی اس نے گاؤں کے دو ایک آدمیوں سے مشورہ کر لینا مناسب سمجھا اور اتفاق سے سب نے گماشتہ کی رائے کی تائید کی اور مجھے زمیندار کے محل میں پہنچا دیا گیا۔

جوں جوں زمیندار کے یہاں دن گذرتے جاتے تھے، میں سب کی نظروں میں عزیز ہوتی جاتی تھی اور زمیندار کے بیٹے تو خاص طور پر مجھ پر مہربان تھے اگرچہ ان کی ماں کا سلوک بھی میرے ساتھ نہایت بہتر تھا اور اپنی ساری نوکرانیوں کی بہ نسبت میرے ساتھ وہ زیادہ مہربانی سے پیش آتی تھیں، لیکن پرکاش بابو کا برتاؤ ان سے بھی بڑھکر تھا اور روپے پیسے سے برابر میری مدد کرتے رہتے تھے جس سے میری ماں اور بہن کو کافی سے زیادہ آرام و راحت میسّر آگیا تھا اور میں بھی یہاں ایک حد تک بہت ہی خوش و مطمئن تھی، کیونکہ پرکاش بابو کا التفات بت نئے میرے ساتھ بڑھتا رہا۔ وہ نہایت دریا دلی کے ساتھ میری امداد کرتے رہے اور میں انجام سے بیخبر ان کے احسانات کو ان کی رحم دلی و سخاوت اور غربا پروری پر محمول کرتی رہی۔

ساون کا مہینہ تھا، چار دن سے موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ ہوا نہایت سرد چل رہی تھی جس کی وجہ سے موسم خنک ہو چلا تھا۔ میں اپنی کوٹھڑی میں بے خبر سوئی ہوئی تھی اور شاید کواڑ کی زنجیر لگانا بھول گئی تھی، تقریباً بارہ کا عمل ہوگا۔ کہ میں نے محسوس کیا، میرے پہلو میں کوئی سو رہا ہے اور دھیرے دھیرے مجھے اپنے سینہ سے چپٹا رہا ہے۔ یکایک میری آنکھ کھل گئی —— یہ پرکاش بابو تھے —— میں نے چیخنا چاہا، لیکن انہوں نے میرے منہ پر اپنا ایک ہاتھ رکھ دیا اور دوسرے ہاتھ سے خنجر دکھا کر کہا، اگر چیخو گی، تو یہ خنجر گھونپ دونگا۔ میں نے انکی بڑی منت و سماجت کی اور ہاتھ جوڑ کر کہا کہ میری کوٹھڑی سے چلے جائیں، لیکن انہوں نے میری ایک نہ سنی اور اپنی ضد پر قائم رہے۔

اس واقعہ کے بعد سے مجھ میں زبردست تبدیلی ہوگئی۔ اور میں گھر کے تمام لوگوں سے کھینچی کھینچی رہنے لگی۔ پرکاش کی طرف سے میرے دل میں نفرت و حقارت کا دریا ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ اگرچہ پرکاش کا اب بھی میرے ساتھ وہی ہمدردانہ برتاؤ تھا اور میں جہاں کہیں اُسے تنہا مل جاتی، وہ مجھ سے معافی چاہتا اور اس واقعہ کو بھلا دینے کو کہتا، لیکن اب اسکی صورت دیکھتے ہی میری آنکھوں سے غصہ و انتقام کی چنگاریاں نکلنے لگتیں اور اسکی شکل پر نفرت و حقارت بھری نظر ڈال کر اُس کی طرف سے منہ پھیر لیتی۔

اس واقعہ کے چند ماہ بعد میں نے محسوس کیا کہ میں ماں بننے والی ہوں۔ دھڑکا تو ایک ہی مہینہ بعد ہوا تھا لیکن میں نے اُسے اہمیت نہ دیکر نظر انداز کر دیا تھا، لیکن اب مجھے جب اسکا اچھی طرح یقین ہو گیا تو ایک رات میں پرکاش کے کمرے میں گئی اور اسے صورت حال سے آگاہ کر کے شادی کی درخواست کی، پہلے تو یہ سنکر وہ گھبرا گیا اور پھر یہ کہکر شادی سے انکار کر دیا کہ "میں ماتا پتا کی موجودگی میں انکی مرضی کے بغیر بیاہ نہیں کرسکتا، کیونکہ ایسی حالت میں میں اور میرا خاندان برادری اور سماج کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہینگے"

میں نے اسے بہت سمجھایا کہ کم سے کم تم مجھ سے خفیہ طور پر ہی شادی کر لو اور اپنے ماں باپ کو بھی اسکی خبر نہ ہونے دو، کبھی مناسب موقع دیکھ کر انہیں آگاہ کر دیا جائیگا۔ اس وقت وہ کچھ نہ بولیں گے۔ رہی برادری اور سماج، تو تم دھن وان ہو تمہیں برادری اور سماج ٹیڑھی نظروں سے بھی نہیں دیکھ سکتی، البتہ اگر مجھ سے شادی نہ کی، تو میں تباہ و برباد ہو جاؤنگی، کیونکہ اولاً تو میں ایک بیوہ ہوں، دوسرے غریب۔ اس لئے تمہیں ایشور کا واسطہ دیتی ہوں کہ مجھے برباد ہونے سے بچا لو اور مجھے جیتے جی نرک میں نہ دھکیلو۔

میرے ہزار سمجھانے اور بجھانے پر بھی وہ زمیندار کا بچہ برادری اور سماج کے خوف سے اپنی "نہیں" پر اڑا رہا۔ مایوس ہو کر میں اس کے کمرے سے چلی آئی۔ تھوڑے ہی دنوں بعد راز افشا ہو گیا۔ پرکاش کی ماں نے مجھ سے میرے تباہ کرنیوالے کا نام دریافت کیا۔ پہلے تو میں نے نام بتانے سے انکار کر دیا، لیکن جب نہایت ہی شفقت و مہربانی کے ساتھ انہوں نے بہت زیادہ اصرار کیا تو میں یہ سمجھ کر کہ ممکن ہے اپنے صاحبزادہ کی کرتوت کی بنا پر میرے ساتھ ہمدردی کا برتاؤ کریں اور مجھے قانوناً و مذہباً اپنی بہو بنا لیں۔ کیونکہ آخر وہ بھی تو عورت ہی تھیں —— میں نے نام بتا دیا، لیکن وائے بدقسمتی کہ پرکاش کا نام سنتے ہی غصہ میں آگ بگولہ ہو گئیں اور میرے دونوں گالوں پر دو تھپڑ اس زور سے مارے کہ میں تلملا گئی، پھر یہ کہکر "پاپن، آوارہ، بدچلن لڑکی میرے نیک اور معصوم کنوارے بیٹے پر الزام لگاتی ہے، نکل جا چڑیل ابھی میرے گھر سے" ایک لات مار کر دھکیل دیا۔

مجبوراً میں زمیندار کے مکان سے نکل آئی۔ دروازہ پر پرکاش سے ملاقات ہوئی۔ میں نے ایک آخری بار اس کا دامن پکڑ کر اس سے امداد کی طالب ہوئی، لیکن اُس نے بھی اپنی ماں کی طرح مجھے ٹھوکر مار دی اور میں اپنے گاؤں ماں کے پاس چلی آئی۔

آپ کو شاید یاد ہو رمیش بابو! کہ جس روز میں آپ کے یہاں کام مانگنے آئی تھی، تو میں نے یہ کہا تھا کہ ہمارے گاؤں میں آجکل کام نہیں ہے۔ جس

باقی صفحہ ۷۷



یہ عورت لیکوریا کی بیمار تھی

لیکوریا (سیلان الرحم) کی بیماری کا ہولناک نتیجہ

جب عورت لیکوریا کے مرض میں مبتلا ہو جاتی ہے تو اس کے خفیہ جسم سے ہر وقت یا کبھی کبھی سفید پانی (لیسدار سفید رطوبت) خارج ہونے لگتی ہے۔ یہ مرض عورت کی جوانی کے لئے زہر ہے اور اس کا فوراً علاج کرانا ضروری ہے۔ ورنہ رفتہ رفتہ عورت کی جوانی ختم ہو جاتی ہے۔ وہ سفید پانی دراصل جوانی کا جوہر ہوتا ہے پس اگر کسی عورت کے خفیہ جسم سے سفید رطوبت وقت بے وقت خارج ہوتی ہو اور وہ ہر وقت جسم میں ایک تکلیف اور بے چینی محسوس کرتی ہو تو اسے چاہیئے کہ سب کام چھوڑ کر اس کا فوراً علاج کرے۔ اس کی ترکیب یہ ہے کہ

مسٹری ڈاکٹر زنانہ دواخانہ ۔ بی ۳۲ ۔ دہلی

خط لکھ کر ایک شیشی دوا ... منگا لے۔ اس دوا کا استعمال شروع کرنے کے ... ہی دن اگر سفید رطوبت نکلنی بند ہو جائے تو بیمار ... پوری شیشی استعمال کرنے سے ... عورت کا اندرونی جسم (رحم) بالکل تندرست ہو جاتا ہے۔ سفید رطوبت کا اخراج ... بند ہو جاتا ہے اور عورت کے اندر پھر جوانی اور جوانی کی امنگ محسوس ... ہوتی ہے۔ ... یہ دوا ... عورتوں کو ... ایک شیشی دوا ... روپے ... محصول ... ہے۔

۱۹۲۱ء ... نمبر

نگارندہ	مضمون	صفحہ
جناب اصغر علی سکندرآبادی	بیل یا گدھا	۱۵
جناب عبدالقیوم ندوی	... کی مہمان نوازی	۱۶
جناب امجد علی ...	... کی ...	۱۷

منظومات

نگارندہ	مضمون	صفحہ
حضرت نثار اٹاوی	چاند تارے	۱۸
حضرت شورش لکھنوی	جو ہر وفا	۱۹
حضرت دل شاہجہانپوری	اقتباسات	۲۰
جناب ضیا جالندھری	قطعات	۲۱
حضرت غالب ...	حسرت	۲۲
حضرت ...	درد دل	۲۳
جناب ...	گلشن میں	۲۴
حضرت مخمور جالندھری	شادی	۲۵
جناب درد لکھنوی	نوائے درد	۲۶
جناب عزیز احمد	ٹیگور	۲۷
جناب اختر ...	غزل	۲۸
جناب شجاعت خاں ...	کیف و رنگ	۲۹

مضمون نگار	صفحہ
[illegible]	۱۰
[illegible]	۱۱
... اختر ...	۱۳
[illegible]	۱۴
...	۱۵

ادبی مضامین

مضمون نگار	صفحہ
جناب میرزا ...	۱۷
جناب سید رشید احمد ...	۲۰
جناب ...	۴۰
...	۵۵
جناب ... احمد خاں	۶۷
... احمد خاں	۷۹

ڈرامے

مضمون نگار	صفحہ
... لکھنوی	۳۲
...	۳۳
... واسطی	۳۴

ملاحظات

بین الاقوامی حالات روز بروز مخدوش ہو رہے ہیں جنگ کا خونخوار دیوتا مشرق کے پھاٹک پر تنہ بہادرت کھڑا ہے اور اگر نازیوں کا سیلاب استمبر کریمیا و قفقاز کی متاع آزادی بہالے جانے پر قادر ہو گیا تو یورپی جمہوریتوں کی طرح مشرقی اقوام کی ناؤ بھی آتش و خون کے سمندر میں ہچکولے لینے لگ جائیگی۔ ظاہر ہے کہ یہ تشویش انگیز صورت حال تجارتی اور کاروباری دنیا کے لئے مفید ثابت نہیں ہو سکتی کاغذ کی "مہنگائی" اور نایابی نے تو پہلے ہی رسائل و جرائد پر سکرات کا عالم طاری کر رکھا ہے لیکن اگر جنگ کا دائرہ اسی رفتار سے وسیع ہوتا گیا اور حکومت نے کاغذ کے نرخوں کا انضباط دیکھا تو ظاہر ہے کہ حالات بہت زیادہ اضطراب انگیز ہو جائینگے۔

تاہم ہمارے نزدیک علم و ادب کی خدمت کا فریضہ اس درجہ اہم ہے کہ ان حالات میں بھی ہم **عالمگیر کے خاص نمبر ۱۹۴۲ء** کا اعلان کر رہے ہیں اور قارئین کو یقین دلاتے ہیں کہ یہ اشاعت خصوصی اپنی تمام تر روایتی خصوصیات کے ساتھ ماہ دسمبر کے اوائل میں مطلع شہود پر جلوہ گر ہوگی۔ خاص نمبر کی وسعت حسب معمول **تین سو صفحات** تک ہوگی مضامین نظم و نثر کے اعتبار سے اس کا پایہ کس درجہ بلند اور وقیع ہوگا؟ اس کا جواب اس فہرست مندرجات سے مل سکیگا جو آئندہ اشاعت میں ہدیہ قارئین کی جائیگی۔

اہل قلم حضرات سے درخواست ہے کہ وہ اپنے اپنے جواہر افکار ۲۵ اکتوبر ۱۹۴۱ء تک دفتر میں ضرور بھیج دیں تاکہ کتابت و طباعت کا انتظام اطمینان سے ہو سکے صرف ایسے علمی و ادبی مضامین درج کئے جائینگے جو خاص تحقیق و تدقیق کے بعد سپرد قلم کئے جائیں۔ افسانے اور ڈرامے بھی طرز جدید کے حامل اور عہد حاضر کی رفتار ادب کے مطابق ترقی یافتہ ہونے چاہئیں۔

[illegible]

از ادارہ

زیر نظر اشاعت میں بوعلی سینا (مترجمہ میرزا صابر تھانوی) ہند چینی (حافظ حیدر رشید احمد) بلوچی تاریخ (مولانا شیدائی) علمی و ادبی لحاظ سے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ جناب صائب فتحپوری نے غلط بیانیوں پر مختصر سا تبصرہ کیا ہے جو حضرت عالمگیر اورنگ زیب کے متعلق دشمن مورخ پھیلا چکے ہیں۔ جناب نور احمد خان کے لطائف العرب بھی خوب ہیں "علی ہجویری" میں آپ نے ایک اہم تاریخی غلطی کی طرف توجہ دلائی ہے۔

افسانے سب کے سب ترقی یافتہ ادب کے پاکیزہ نمونے ہیں۔ تراجم میں "بخیل کا گدھا" اور "خوابوں کی دنیا" خاص طور پر جاذب توجہ ہیں سید شمیم العزمی نے "گناہگار تارے" کے زیر عنوان عشق و ہوس کا افسانوی پیرایہ میں موازنہ کیا ہے۔ آپ کی تحریر میں ولآویزی موجود ہے کچھ عرصہ کی مشق کے بعد آپ کا شمار یقیناً افسانہ نگاروں کی صف اول میں ہوگا۔ "برابر کی چوٹ" جناب عزو اسلمی کا ایک نفسیاتی شاہکار ہے جس میں آپ نے اصلاح معاشرت کے اصول کو بھی مدنظر رکھا ہے "شکست" قدیم جناب شوکت علی لکھنوی کا افسانہ ہے اور طرز جدید کا حامل ہے امید ہے یہ تمام افسانے قارئین سے خراج تحسین حاصل کریں گے۔

منظومات کے متعلق کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے۔ اس مرتبہ ہم حضرت نثار اٹاوی کی ایک معجز نما غزل پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں اس بحر میں حشو و زوائد سے بچنا اور تخیل کی انتہائی بلندیوں [illegible] کرنا حضرت نثار ہی کا حصہ تھا اس کے علاوہ حضرت [illegible] ثاقب پانی پتی اور حضرت آدم [illegible]

اہل قلم حضرات

عالمگیر کے خاص نمبر ۱۹۴۲ء کے لئے مضامین نظم و نثر ۲۵ اکتوبر ۱۹۴۱ء تک دفتر میں بھجوا دیں تاکہ کتابت و طباعت اطمینان سے ہو سکے۔

(مدیر عالمگیر لاہور)

اخبار و افکار

از:- ادارہ

تین صدمے

ادب کے گلستاں کے پھول جن پر بہارِ ہندوستاں تھی نازاں ؎
انھی کو تاکا اجل کے گلچیں نے چن کے انتخاب کر کے

گزشتہ مہینے ہوائے اجل کے کچھ ایسے بیدرد جھونکے آئے کہ بزم ادب و شعر کی تین لمعہ فشاں شمعیں ٹمٹما کر خاموش ہو گئیں فانی عالمِ باقی کو سدھار گئے۔ میرزا عظیم بیگ چغتائی نے جان جاں آفریں کے سپرد کر دی۔ ٹیگور کا چراغ زندگی اپنی آخری روشنی پھیلانے کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گل ہو گیا۔

مولوی شوکت علی خاں فانی بدایونی بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی اپنے تڑپا دینے والے کلام کی بدولت اردو شاعری کے لئے باعث نازش و افتخار تھے۔ مرحوم حزن، نالہ، فریاد، آہ و فغاں اور گریہ و اشک کی کیفیتوں کو شعر کے قالب میں کچھ اس طریقے سے ڈھالتے تھے کہ دل تو سب کچھ سمجھ لیتا تھا لیکن زبان ان کے وجدانی تاثرات کے اظہار سے قاصر تھی۔ وہ دور حاضر کے میر تھے اور ان کے کلام میں جس قدر سوز و گداز تھا وہ میر کے سوا کہیں نہیں ملتا لیکن قدرناشناس زمانے نے مرحوم کی صلاحیتوں کا خوشگوار خیر مقدم نہیں کیا۔ ان کی تمنائے شگفتگی کس مپرسی کی کالی رات میں کھلی اور صبح راحت کے طلوع سے پہلے ہی مرجھا گئی اور شاید وہ بھی میر تقی کی طرح اپنے دل میں یہ حسرت لیکر گئے ہوں کہ ؎

کوئی خواہاں نہیں ہے اپنا میر
گویا اک جنس نارواہیں ہم!

تاہم اپنی غزلوں کا جو خزانہ چھوڑ گئے ہیں وہ ان کی معنوی امارت پر ایک زندۂ جاوید شہادت ہے۔ لہذا جب تک اردو شاعری زندہ ہے فانی کا باقی ہے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

میرزا عظیم بیگ چغتائی دور حاضر کے ترقی یافتہ اور باکمال مزاح نگار تھے۔ انھوں نے اس ناقابل اعتنا فن کو بھی اپنی قابلیت کے زور سے آسمان تک پہنچا دیا۔ ان کے ایک ایک لفظ میں سیکڑوں قہقہوں کی روحیں پوشیدہ تھیں وہ ان مزاح نگاروں میں سے نہیں تھے جو فحاشی اور سوقیانہ الفاظ ہی کو منشائے ظرافت سمجھتے ہیں بلکہ وہ ظرافت کو متانت و لطافت اور شریفانہ انداز کے قالب میں کچھ اس طرح ڈھالتے تھے کہ گونج پیدا کرنے والے قہقہے پر بھی ہلکی سی مسکراہٹ کا گمان ہوتا تھا۔ اگرچہ وہ آخر عمر میں خدام اردو کی بے اعتنائی سے مایوس ہو گئے تھے اور یہی مایوسی انھیں ہندی کی طرف لے گئی تھی تاہم انھوں نے اردو کی جو شاندار خدمات انجام دیں وہ ہمیشہ تشکر آمیز نظروں سے دیکھی جائینگی۔

ٹیگور کے متعلق کچھ لکھنا، دوپہر کے سورج کو ٹمٹماتا ہوا چراغ دکھانے کے مرادف ہے۔ انہوں نے قدیم ہندو تصوف کو نغمہ و ادب کے حسین فلسفیانہ لباس میں پیش کیا اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ ٹیگور صرف شاعر ہی نہیں تھے بلکہ اعلیٰ درجہ کے ماہر تعلیم، جلیل القدر معلم اخلاق مشہور مصلح معاشرت اور مخلص ترین محب وطن بھی تھے۔ اس لئے ان کی شخصیت میں تمام قابل فخر خوبیاں جمع تھیں چنانچہ انھوں نے مرتے مرتے بھی مس رتھ بورن کی ہندوستان دشمنی کا وہ دندان شکن جواب دیا ہے کہ ہندوستان سے یورپ تک تہلکہ مچ گیا۔ ٹیگور نہ صرف اپنی ذات کے لئے باعث فخر تھے بلکہ ہندوستان ان کی ذات پر ہمیشہ فخر کرتا رہے گا۔ چنانچہ آپ سب سے پہلے ہندوستانی ہیں جنھیں نوبل پرائز کا مستحق سمجھا گیا۔ اس لحاظ سے ٹیگور نے سب سے پہلی مرتبہ بین الاقوامی طور پر ہندوستان کی ادبی قابلیت کا اعتراف کرایا۔ وطن پرستی کا یہ عالم تھا کہ جب جنرل ڈائر نے جلیانوالہ باغ میں نہتے پنجابیوں پر گولیاں چلائیں تو ٹیگور نے اس واقعہ سے متاثر ہو کر سر کا خطاب پائے استحقار سے ٹھکرا دیا۔ تحریک ترک موالات میں غالباً ٹیگور سب سے پہلے ہندوستانی تھے جنھوں نے خطاب واپس کیا۔ اگرچہ ان کی شاعری تعلیمی و پیغامی حیثیت سے

[illegible] بلکہ بیرونی [illegible] کی کوشش کی ہے لیکن آپ نے ہندوستان کے قدیم تصوف کو جس خوبی کے ساتھ زندہ کیا وہ آپ ہی کا حصہ تھا اور اس احسان کے باعث ہندوستان کی گردن احترام ہمیشہ جھکی رہے گی۔

لاہور ریڈیو اسٹیشن کی اُردو دشمنی

آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن لاہور کے دیہاتی پروگرام میں ایک مکالمہ سنایا جاتا ہے جس میں رام داس اور فتح دین سائل ہیں اور لقمان مجیب۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ رام داس اور فتح دین پنجابی میں سوال کرتے تھے اور لقمان اُردو میں جواب دیا کرتا تھا۔ اب کچھ عرصے سے لقمان صاحب بھی پنجابی ہی بولنے لگے ہیں۔ خدا جانے اس تبدیلی کا باعث کیا ہے؟ حالانکہ تعلیمی ضرورتوں کا تقاضا یہ تھا کہ اس طریق سے اہل دیہات کو اُردو بول چال سے آشنا کرنے کی کوشش کی جائے اور یہ قاعدہ بالکل درسی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ دیہات کے سکولوں میں طلبہ پنجابی میں بات چیت کرتے ہیں اور مدرس انہیں اُردو میں سبق دیتا ہے۔ اس لحاظ سے لقمان کی اُردو دانی حد درجہ مفید تھی۔ مگر حکومت پنجاب پروپیگنڈے کے طور پر تو دھڑلے سے کہہ دیا کرتی ہے کہ پنجاب کا ذریعہ تعلیم اُردو ہے لیکن وہ عملاً اُردو پر پنجابی کو سوار کرنا چاہتی ہے۔ دیہاتی پروگرام چونکہ حکومت پنجاب کے ماتحت ہے اس لئے ہماری حکومت کی یہ حرکت نہ صرف اس کے دعاوی کو رسوا کرتی ہے بلکہ یہ ایک مجرمانہ حرکت ہے جو مقاصد تعلیم کے بھی خلاف ہے لہٰذا اس غلطی کا ازالہ ہونا چاہئے۔ اگر گرمی کے موسم میں سکھوں کا کوئی گورمکھی اخبار لقمان کی اُردو بول چال پر اعتراض کرتا ہے تو اس موسمی پیداوار کو صحیفۂ آسمانی سمجھ لینا کسی آئینی حکومت کے شایان شان نہیں۔

دیسی کاغذ کی گرانی

اخباری کاغذ کے متعلق جو مشکلات پیدا ہو رہی ہیں اُن سے قارئین اچھی طرح واقف ہونگے لیکن اب دیسی کاغذ بھی کمیابی کی حد تک پہنچ چکا ہے۔ "عالمگیر" چونکہ اسی کاغذ پر شایع ہوتا ہے اس لئے ہمیں جن مصائب کا سامنا ہو رہا ہے ان کا اظہار بہت زیادہ [illegible] نہ ہوگا۔ لیکن حکومت کا تغافل بے حسی کی حد تک پہنچ چکا ہے اس نے کاغذ فروشوں کو مکمل آزادی دے رکھی ہے۔ چنانچہ [illegible] وہ لکھتا ہے:

"اخباری کاغذ کے متعلق تو یہ حالات [illegible] پہلے جزیرۂ سکنڈے نیویا سے آتا تھا اور اب کینیڈا سے منگوایا جا رہا ہے اس لئے یہ کاغذ کمیابی کی حد تک پہنچ چکا ہے لیکن دیسی کاغذ کی مہنگائی کے لئے کون سی وجہ جواز پیدا کی جا سکتی ہے؟ یہ کاغذ تو ہندوستانی پیداوار سے ہندوستان ہی میں بنایا جاتا ہے لیکن اس کے نرخ میں بھی کئی گنا اضافہ کیا جا رہا ہے۔ اس ناقابل برداشت مہنگے پن کے باوجود کاغذ کی مقدار ضرورت کے مطابق مہیا نہیں کی جاتی۔ لاہور کے تاجران کتب بارہا چلا چکے ہیں مگر ان کی آواز کا جواب بے پروائی کی ہنسی سے دیا جاتا ہے نہ حکومت پنجاب اپنے اثر و رسوخ سے کام لیتی ہے نہ حکومت ہند ہی ادائے فرض پر آمادہ ہوتی ہے۔ حالانکہ ہندوستان کے کاغذی کارخانوں کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہو چکا ہے لیکن جس قدر کارخانوں کے وسائل و ذرائع میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اسی قدر مارکیٹ کا دامن کاغذ سے خالی دکھایا جا رہا ہے۔ آخر یہ عجیب و غریب صورت حال کیوں پیدا ہو رہی ہے؟ اس کے جواب میں بتایا جاتا ہے کہ کاغذ فروشوں نے کمیابی و نایابی کی فضا پیدا کرنے کے لئے اپنے ذخیرے رشتہ داروں اور دوسرے قابل اعتماد دوستوں کے نام منتقل کر رکھے ہیں۔ تاکہ کاغذ بھی آنے والے دور گراں فروشی کے لئے محفوظ رہے اور رجسٹروں کی مد سے حکومت کو بھی مطمئن کیا جا سکے۔ اگر یہ اطلاع صحیح ہے تو حکومت کا فرض ہے کہ نہ صرف محاسبہ کرے بلکہ محاسبے کا سلسلہ ان لوگوں تک بھی وسیع کرے جن کے نام کاغذی ذخیرے پراسرار طور پر منتقل کئے جا چکے ہیں۔ اگر اس بارے میں حسب معمول غفلت سے کام لیا گیا تو ملک کی علمی و تعلیمی زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ کیونکہ جب کتابی کاغذ ہی میسر نہ آ سکا تو کتابیں کیونکر شائع ہو سکیں گی؟"

نمبر خریداری

ہر قسم کی خط و کتابت کے وقت نمبر خریداری جو [illegible] پر چھپا ہوتا ہے ضرور تحریر فرمائیے۔ ورنہ [illegible] معاف۔

مینیجر عالمگیر [illegible]

حقائق و معرفت

علامہ جمال الدین افغانی کا ایک خطبہ

از مولانا اظہر امرتسری

حضرت علامہ سید جمال الدین افغانی نور اللہ مرقدہٗ جب قاہرہ میں دوسری بار جاکر مقیم ہوئے۔ تو ایک دن آپ کے بعض جلیل القدر شاگردوں نے آپ سے مقاصد تعلیم" کے مسئلہ پر روشنی ڈالنے کی استدعا کی سید صاحب نے فرمایا:۔

"تعلیم کا مقصد بظاہر یہی سمجھا جاتا ہے۔ کہ طالبان علم کے دماغ حقائق و معارف سے روشن ہو جائیں اور اس روشنی میں وہ دنیا کے علمی خزانوں کی تلاش کر سکیں جو جہالت کی سیاہی میں چھپے ہوئے ہیں۔ مجھے بھی اس امر سے اتفاق ہے لیکن عالم کے فرائض اس سے بھی زیادہ وسیع اور ہمہ گیر ہیں جن کے پیش نظر رکھتے ہوئے قطعاً ندامت محسوس نہیں ہوتی۔ کہ جو شخص دولت علم سے مالا مال ہے۔ اس کی سرگرمیاں صرف جاذب توجہ الفاظ تک ہی محدود نہ ہونی چاہئیں۔ بلکہ اس کو دولت علم میں سے ساری قوم کو اس کی اجتماعی ضروریات کے مطابق بطور زکوٰۃ حصہ دینا چاہیئے۔ مثال کے طور پر غور فرمایئے کہ ایک قوم سیاسی زبوں حالی کے باعث وطنی ترقی کی خواہشمند ہے لیکن علماء اس کو منطق و ادب کی اصطلاحات یاد کراتے ہیں اور اپنے فرض کی فراغت محسوس کرتے ہیں، تو یہ کوشش قوم کی ضروریات کے پیش نظر بیت کی بالیں پر نغمۂ عشرت چھیڑنے کے مرادف ہوگی۔ قوم تو چاہتی ہے عملی ترقی لیکن علما چاہتے ہیں ذہنی فلاح۔ یہ تضاد یا علما کو جہالت کا علمبردار بنا دیگا یا قوم ہی معنوی خودکشی پر مجبور ہو جائیگی۔

حقیقی علم و حکمت جاننے والا خدا ہے جو تعلیم ارشادات ربانی سے متعلق نہیں وہ علم سر گمراہی ہے۔ خدا کی حکمت جو ہم تک پہنچی ہے اسکا سرچشمہ قرآن مجید ہے۔ قرآن نے جہاں ہمارے سامنے انسانیت، تنویر اخلاق، اصلاح اعمال، ورکرت عبادت کے سینکڑوں معارف و اسباق پیش کئے ہیں۔ وہاں یہ بھی بتا دیا ہے کہ ایماندار گروہ پر جہاد فرض ہے۔

اسی طرح قرآن حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات حسنہ پر غور کیجئے آپ رب علم ہدایت کے معلم اکمل اور شریعت حقہ کے مبلغ اکبر تھے لیکن آپکی تبلیغی سرگرمیاں جس جہاد تک تلاش میں ڈھلی ہوئی تھیں آپکی مجاہدانہ جدوجہد بدر و حنین اور احد کے بے شمار واقعات سے روز روشن کی طرح ظاہر ہے۔ اگر علماء کا منصب صرف تبلیغ اور وعظ و نصیحت ہی شامل ہوتی تو معلم قرآن [illegible] کی شہادت گوارا نہ فرماتے۔

اللہ کریم کا سب سے بڑا انعام جو عمل صالح کرنیوالوں کو مل سکتا ہے وہ خلافت ہے۔ اگر مذہب کو سیاسیات کے ساتھ روح و جسم کا تعلق نہ ہوتا تو خدا بیغمرانی مذہب کے مقدس طبقہ کیلئے یہ سیاسی نظام تجویز نہ کرتا۔ قرآن ہی سکھاتا ہے کہ مسلمان اپنے آپ کو دنیا میں حکومت کرنے کے قابل بنائیں تو انہیں عقبےٰ میں جنت مل سکتی ہے اب جو قوم حکومت کی حقیقی نعمت سے محروم ہے وہ جنت کی مستحق نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ جنت تو نیک اعمال ایمانداروں کیلئے ہے۔ اور جو قوم عمل صالح اور ایمان کی دولت سے مالا مال ہے۔ خدا اس کو حکومت سے محروم نہیں کرتا۔ جو قوم اپنے آپ کو ایماندار سمجھتی ہو وہ اپنے مومن ہونے کی کوئی ایسی سند پیش کرے جو اسلامی قوانین کے مطابق قابل تسلیم ہو۔ عمل صالح عبارت ہے ان سرگرمیوں سے جو قوم کو حکومت کی راہ پر چلا سکتی ہیں وہ شخص صالح ہے جو ذاتی اغراض قومی فوائد پر قربان کرنے میں اپنی سب سے بڑی خدمت سمجھتا ہے۔ خدا کسی قوم کے ساتھ محض توحید و رسالت کے انکار پر بے انصافی نہیں کرتا۔ جس طرح سورج کہ اس چیز کو روشن کر دیتا ہے جو اس کے سامنے آجائے۔ اسی طرح خدا بھی اس قوم پر اپنی رحمت کے دروازے کھول دیتا ہے جو اس کی ہدایات پر عمل کرنے لگے۔ اس اصول کے پیش نظر یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ کہ غیر مسلم قومیں حکومت و خود مختاری سے سرفراز کیوں ہیں؟ حالانکہ وہ خداوند کریم کی توحید اور حضور علیہ السلام کی رسالت کا اقرار تک نہیں کرتیں اس سوال کا بہترین جواب حضور علیہ السلام نے اپنی زبان الہام ترجمان سے دے دیا ہے۔ کہ تم میں سے اچھا وہی ہے جس سے لوگوں کو فائدہ پہنچے۔" اس حقیقت کی روشنی میں یہ حقیقت خود بخود کھل جاتی ہے کہ قرآن نے جس چیز کو عمل صالح بتایا ہے وہ قوم کی بہتری اور خیر اندیشی کا جذبہ ہے۔ نصاریٰ اگر قوم کی بہتری کیلئے بڑی سے بڑی قربانی کرنے سے دریغ نہیں کرتے تو وہ اصول خداوندی کے مطابق حکومت کے ان مومن کہلانے والوں سے زیادہ مستحق ہیں جو اپنے ذاتی فوائد کیلئے قوم کے حقیقی مفاد و مقاصد سے بغاوت کر رہے ہیں مختصر یہ کہ تعلیم اگر انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی نہیں ہو سکتی تو اس کا وجود و عدم برابر ہے۔" اس بصیرت افروز خطبہ کے مطالعہ کے بعد ہر ذی بصیرت کو یہی کہنا پڑیگا کہ

اگر اب بھی ہو تقلید جمال الدین افغانی ÷ تو ہوسکتی ہے دور اقوام مشرق کی پریشانی

تحقیق و تصحیح

ستمبر ۱۹۴۱ء کے "عالمگیر" میں حضرت نوح ناروی نے چند شاعروں کے کلام کی غلطیاں بتائی ہیں۔ ایسے مضامین کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ نوآموز اور کم استعداد شاعروں کی اصلاح میں ان کا نام ظاہر کرنا مناسب نہیں۔ نوجوان شاعر اپنے شوق اور جوش طبیعت سے شعر کہتے ہیں، ان کو صحت کلام اور استادی کا دعویٰ نہیں ہوتا لیکن طبیعتوں میں فرق ہوتا ہے۔ کوئی اس کو گوارہ کرے گا، کوئی برا مانیگا۔ نقاد کا مقصود اصلاح اور افادۂ عام ہوتا ہے۔ بغیر نام لئے بھی جس کی غلطی ہوگی وہ متنبہ ہوجائے گا۔ اس لئے نوجوان شاعروں کے ساتھ بھی وہی معاملہ کرنا چاہئے جو بچوں کے ساتھ اصلاح اخلاق کے لئے کیا جاتا ہے کہ دوسروں پر ڈھال کر یا عام مثال دیکر ان کو نصیحت کرتے ہیں۔ ہاں اساتذہ کے سہو و مسامحت کو نام لے کر بتایا جاسکتا ہے اس لئے کہ ان کی غلطی مستند مانی جاسکتی ہے اور ان کی پیروی سے گمراہی کا احتمال ہے۔

حضرت نوح نے جو غلطیاں نکالی ہیں وہ بالکل درست ہیں لیکن ان میں نوعیت کا اختلاف ہے مثلاً سیلاب اور گرداب ، شمعیں اور شکلیں قافئے نہیں ہوسکتے۔ لیکن یہ غلطی فن سے تعلق رکھتی ہے بغیر بتائے عام آدمیوں کو معلوم نہیں ہوسکتی۔ برخلاف "ونخاص" کے کہ اس کا غلط ہونا معمولی پڑھے لکھے کی سمجھ میں آجانا چاہئے اسی طرح بحر اور سوا کا ایک جملے میں آنا۔ تیسری قسم کی غلطی "بے چین و بے قرار" کی ترکیب ہے۔ یہ بھی اصول زبان و ادب سے متعلق ہے کہ اردو الفاظ کو فارسی ترکیب میں لانا جائز نہیں لیکن ناواقف آدمی کو اس کا علم بھی نہیں ہوسکتا۔ ایک شعر میں ردیف سے پہلے قافئے کا بالکل نہ ہونا البتہ بہت عجیب ہے۔

اس کے بعد تین غلطیاں ماہر القادری صاحب کی ہیں۔ میں نے ماہر صاحب کو کبھی نہیں دیکھا صرف ان کی نظمیں دیکھی ہیں۔ وہ بہت مشاق اور خوش فکر شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی غلطیاں البتہ قابل توجہ ہیں اور وہ بالکل الگ نوعیتوں کی ہیں۔ ممکن ہے وہ

ردِّ تعریض

از مولانا الحاج پروفیسر حامد حسن قادری

خود نوح صاحب کے اعتراضات کا جواب دیں لیکن میں بھی عرض کرتا ہوں ماہر صاحب کے اس مصرع میں۔ ع

"چشم نرگس بن کے اس دنیا کا نظارہ کریں"

نوح صاحب نے (اس) کو "زائد و حشو" فرمایا ہے۔ مجھے اس وقت اگست کا عالمگیر نہ ملا کہ نظم میں موقع کو دیکھ کر رائے دے سکوں۔ بہر حال میرے نزدیک یہ ضرور نہیں کہ اس دنیا کے علاوہ اور بھی کوئی دنیا ہو، اسی وقت (اس دنیا) کہا جائے۔ "اس" کا لفظ اور معنوں کے لئے بھی آتا ہے۔ اور سچ پوچھئے تو گو اس دنیا کے علاوہ اور دنیا نہ ہو لیکن اس عالم کے علاوہ اور عالم تو ضرور ہیں۔ شاعر نے عالم کی جگہ دنیا لکھ دیا۔ اگر "عالم" کی صورت میں نوح صاحب کا اعتراض اٹھ جائے تو پھر اس کی جگہ دنیا کے لفظ میں بھی کوئی اہم اعتراض نہ رہا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ حضرت داغ دہلوی کے ان اشعار میں "اس" کا لفظ دیکھئے۔

ابر رحمت ہے اُدھر دیدۂ پرنم ہے اِدھر
مشکل اس نامۂ اعمال کا دھونا کیا ہے (مہتاب داغ)

"اس" کی ضرورت نہیں، کہہ سکتے ہیں "نامۂ اعمال کا دھونا کیا مشکل ہے"۔ دوسرا شعر ملاحظہ ہو ے

میں نے پائی ہے جو اس تیغ ادا میں لذت
سامنے خضر و مسیحا کو بٹھالوں تو کہوں، (آفتاب داغ)

"میں نے تیغ ادا میں جو لذت پائی ہے" کافی تھا۔ مرزا داغ کے اور شعر بھی میرے پیش نظر ہیں میرے نزدیک "اس" کا لفظ یہاں بھی درست ہے وہاں بھی،

ماہر القادری صاحب پر حضرت نوح کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ انھوں نے (کب تلک) لکھا ہے۔ جبکہ (تلک) بالاتفاق متروک ہے میں خود اس لفظ کو نہ بولتا ہوں نہ لکھتا ہوں لیکن اس کے ترک و اختیار پر اصول و مصلحت کے لحاظ سے طویل بحث ہوسکتی ہے اور وہ عالمگیر کے صفحۂ تحقیق سے بڑھ جائیگی صرف [illegible] کرتا ہوں [illegible]

قدیم کی جن ترکیبات پر بحث ہو کر دیکھنا ہے ان میں تلک کا لفظ بھی ہے۔ (۲) قدیم اور موجودہ اہل زبان اور فصحا کا استعمال بھول جاتی ہے (۳) تلک کا لفظ اگر صرف نظم میں لکھا جائے اور بولا نہ جائے تو میرے نزدیک مناسب نہیں یہ محض شاعر کی ذلیل ہے (۴) اگر بولا بھی جائے تو اس کی "غرابت" فصحا اور اہل زبان کے جلسوں اور صحبتوں میں شدت کے ساتھ محسوس ہوگی اور ان کی نظر میں پایۂ اعتبار کم ہو جائے گا۔ (۵) خواص کی زبان عوام کی زبان سے جن لفظوں کے سبب سے ممتاز ہے ان میں "تلک" بھی شامل ہے۔

تیسرا اعتراض "خنگی" پر ہے۔ ماہر القادری صاحب کا مصرع ہے ؏

"آہ پر خنگی مناسب اشک پر طعنے بجا"

نوح صاحب کا یہ اعتراض درست ہے کہ خنگی میں "ن" متحرک ہے اور یہاں سکون کی صورت میں ہے لیکن اس غلطی کی شان سب سے الگ ہے اس میں شک نہیں کہ فصحا و اساتذہ نے خنگی بسکونِ "ن" نظم نہیں کیا، اور میں خود بڑی حد تک قدامت پسند اور اتباع اساتذہ و اہل زبان کا مؤید اور عامل ہوں لیکن اس لفظ پر ایک ادبی و لسانی بحث ہو سکتی ہے پہلے اس بات کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ "خنگی" کی جمع "خنگیاں" اور "خنگیوں" بھی مستعمل ہے اور اس کو نظم کرنے کی ضرورت ہو سکتی ہے

اس کے بعد یہ غور کرنا چاہیے کہ قدما نے بعض عربی و فارسی الفاظ کا تلفظ صرف اس مجبوری سے بدلا ہے کہ بغیر بدلے ان کا نظم میں آنا دشوار تھا۔ مثلاً جمعہ کہ یہ لفظ عربی میں بضمتین جُمُعَہ ہے یہ تلفظ ایسا ہے کہ صرف عربی بحروں میں سما سکتا ہے رباعی کی بحر کے سوا اور بحروں میں مشکل سے اس کی گنجائش نکلتی ہے اور بولنے میں کثیر الاستعمال اور کارآمد ہے نظم میں کم آتا ہے لیکن آجاتا ہے اس لئے اساتذہ نے میم کو ساکن کر دیا۔ مثلاً ؏

جمعہ بمکتب آورد طفل گریزپائے را

آتش لکھنوی کا شعر ہے ؎

طفلی میں شادی متوحش رہی ہے سے مجھ
چھٹی نہ ملی ہفتہ کو بھی جمعہ کے غم سے

مولوی محسن کاکوروی فرماتے ہیں نعت شریف کا شعر ہے ؎

جمعہ کو سعید کرنے والا ہر ہفتے میں عید کرنے والا

جمعہ پر قیاس کرکے "خنگی" کو بھی اسی کے وزن پر نظم کر دیا جائے تو جائز رکھنا چاہیئے۔ اس کی جمع کی صورتیں "خنگیاں" اور "خنگیوں" تو شاید اردو کی کسی بحر میں آ ہی نہ سکیں۔

چاند تارے

خدا کے لئے روک لے اس ہنسی کو کہیں جی نہ اٹھیں محبت کے مارے

از حضرت نثار اٹاوی

قمارِ محبت کا حاصل نہ پوچھو کبھی ہم تھے اُنکے کبھی وہ ہمارے
غرض زندگی میں بہت داؤں کھیلے کئی بار جیتے کئی بار ہارے

یہ لب ہائے رنگیں کی معجز نمائی تبسم کے یہ رُخ پُر نظارے
خدا کیلئے روک لے اس ہنسی کو کہیں جی نہ اٹھیں محبت کے مارے

کبھی آندھیاں ہیں کبھی شورِ طوفاں مگر کشتیِ دل خدا کے سہارے
بقا کے سمندر میں دامن بچائی چلی جا رہی ہے کنارے کنارے

شبِ وصل وہ گفتگو نامسلسل جبیں پر عرق شرم آلود نظریں
جفائے گذشتہ کی یاد آرہی ہے گڑے جا رہے ہیں ندامت کے مارے

فضائے محبت میں چاروں طرف سے سیاہی سی دُنی چلی آرہی ہے
قیامت ہے اس حُسن کی برہمی بھی جو گیسو بنائے نہ زلفیں سنوارے

اُلٹ دے نقابِ تجلّیٔ کثرت دکھا دے فروغِ تماشائے وحدت
تری تابشوں کی قسم کھا رہے ہیں سرِ آسماں جھلملاتے ستارے

عجب چیز ہے ناخدا کی خدائی ابھی تک کسی کی سمجھ میں نہ آئی
کسی پر کرم ہے کسی پر ستم ہے کسی کو ڈبوئے کسی کو اُبھارے

مٹا جا مری خستہ حالی مٹا جا، دکھا جا مجھے روئے زیبا دکھا جا
نظر آ تو آ جا، کہ فرقت میں تیری بہت عمر کاٹی بہت دن گذارے

یہ پُر نور راتوں کا دلچسپ منظر نکل آئیے آج خلوت سے باہر
فلک اپنی جھولی سنبھالے کھڑا ہے نچھاور کئے جائینگے چاند تارے

کسی سے محبت کا اظہار کرکے دلِ زار اک کشمکش میں پڑا ہے
سمجھ میں نہ آیا جواب اُنکا اب تک زباں پر خموشی نظر سے اشارے

نثار اپنی اُلفت کی توہین کیوں ہو اگر حُسن کو کچھ غرور آگیا ہے
اسے جو ہو منظور جلوہ دکھانا سرِ طور آکر ہمیں خود پکارے

بو علی سینا

فدائے طب کی داستانِ حیات

مترجمہ جناب مرزا صابر ٹھیالوی

شیخ الرئیس ابو علی الحسین بن عبداللہ بخارا کے ایک قصبے خرتین میں پیدا ہوا۔ ۳۷۰ھ میں اس کی پیدائش کے وقت زہرہ و شمس و قمر درجہ شرف میں تھے۔ پانچ سال کے بعد اس کے والد نے اسے بخارا کے مکتب میں بٹھایا۔ دس سال کی عمر میں شیخ الرئیس نے عربی ادب میں کافی حد تک مہارت پیدا کر لی۔ اس کا باپ لمحات فرصت "اخوان الصفا" نامی کتاب کے مطالعہ میں بسر کرتا تھا اور اسے بھی اسماعیلی فرقہ میں شمولیت کی دعوت دیا کرتا تھا لیکن اس نے بغیر تحقیق حق دعوت کو قبول کرنا پسند نہ کیا عربی ادب سیکھنے کے بعد محمود کنجڑے سے علم حساب، ہندسہ، جبر و مقابلہ سیکھنے کے لئے حاضر ہوا۔ اسی زمانے میں حکیم عبداللہ بابلی بخارا میں وارد ہوا شیخ کے والد نے اسے نہایت پر تکلف دعوت دی۔ اور اسی دعوت کے سلسلے میں بیٹے کو تعلیم کے لئے اس کے سپرد کیا۔ شیخ نے اس سے منطق، فلسفہ، اقلیدس، مساحت، حکمت کی کتابیں پڑھیں لیکن شومئی قسمت سے اُستاد ان علوم کی باریکیاں اچھی طرح ذہن نشین نہ کر سکا۔ شیخ نے ذاتی کاوش اور مطالعہ کی مدد سے کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد روزگار کی تلاش میں کسی اور جگہ چل دیا۔ لیکن جہاں گیا برابر مطالعہ میں مشغول رہا۔ کثرت مطالعہ اور اللہ کے فضل و کرم کے شریک حال ہونے سے خود بخود علوم کے دروازے کھلتے گئے۔ اس کے بعد طب کی طرف توجہ کی اور تھوڑے ہی عرصہ میں کافی شہرت حاصل کر لی۔ حتیٰ کہ بڑے بڑے حکیم اور فاضل اس سے استفادہ کرنے کو باعث فخر خیال کرتے تھے۔ طب کی تحصیل سے فارغ ہو کر ذاتی مطب کھول کر بسر اوقات کرنے لگا اور تھوڑے ہی عرصے میں غیر فانی شہرت پیدا کر لی۔

اسی دوران میں اسماعیل فقیہہ سے علم فقہ کا استفادہ کیا۔ اور کثرتِ مطالعہ نے یہاں تک استعداد بہم پہنچائی۔ کہ وہ اپنے زمانے کا ایک ممتاز فقیہہ شمار ہونے لگا۔ کثرتِ مطالعہ کے سبب وہ رات کو تھوڑی دیر کے لئے نام سو یا کرتا تھا کسی مسئلہ کے سمجھنے میں کوئی دقت پیش آتی تو وضو کر کے جامع مسجد جاتا اور دو رکعت نفل پڑھ کر نہایت خشوع و خضوع سے دعا مانگا کرتا تھا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ خواب میں مسئلہ کو سمجھا دیتا۔ وہ رات کو چراغ جلا کر پڑھنے لکھنے میں مشغول ہو جاتا جب نیند کا غلبہ ہوتا یا کمزوری محسوس ہوتی تو ایک پیالہ پانی کا پی لیا کرتا تا کہ نیند نہ ستائے اور پھر بدستور مطالعہ میں مصروف ہو جاتا کبھی کبھی وہیں بیٹھے بٹھائے نیند آ جاتی اور خواب میں انہی پیچیدہ مسائل کی گتھیاں از خود سلجھی ہوئی دکھائی دیتیں۔

اٹھارہ برس کی عمر میں اس نے جملہ علوم و فنون میں مہارت تامہ پیدا کر لینے کے بعد علم مابعد الطبیعات کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اتفاق سے چند کتابیں اس علم و فن کی ہاتھ آ گئیں۔ اور اس نے چند مرتبہ پڑھ کر انہیں طوطے کی طرح رٹ لیا اس نے لاکھ کوشش کی لیکن مطلب سمجھ میں نہ آیا۔ کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلتے دیکھ کر دل برداشتہ سا ہو کر ہاتھ کھینچ لیا اسی دوران میں اتفاق سے ایک کتب فروش کی دکان کے پاس سے گزرا۔ اُس کی دکان پر ایک پرانی کتاب اس فن کی نظر آئی۔ کتب فروش نے جو اس کے رجحانِ طبع سے کما حقہٗ واقف تھا اسے کتاب کی خریداری پر آمادہ کیا۔ لیکن شیخ نے اس فن کو ناقابل ادراک سمجھ کر انکار کر دیا۔ آخر کتب فروش کے بیحد اصرار پر کتاب سستے داموں خرید لی۔ گھر آ کر دیکھی تو یہ ابو نصر معلم ثانی کی لکھی ہوئی شرح تھی۔ اس نے اس شرح کی مدد سے پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل مابعد الطبیعات کو چشم زدن میں سمجھ لیا۔ اس فن میں دسترس پا کر خدا کا لاکھ لاکھ شکر بجا لایا۔ اور ایک گرانقدر رقم بطور خیرات مساکین و فقرا پر تقسیم کی۔ انہی دنوں امیر نوح بن منصور سامانی سخت بیمار ہو گیا۔ اچھے اچھے حکیم اور اطبا علاج کرنے کے بعد اُلٹا کر دستبردار ہو گئے۔ امیر نے ہر طرف سے مایوس ہو کر شیخ کو علاج معالجہ کیلئے بلایا۔ شیخ نے دل لگا کر اس کا علاج کیا اور وہ اس کے دست شفا بخش اور اعجاز مسیحائی کے طفیل تھوڑے سے عرصے بعد بدستور سابق تندرست نظر آنے لگا۔ اس کے صلے میں اس نے شیخ کو اپنے پاس ملازم رکھ لیا۔ اس کا کتب خانہ جو عجائبات دنیا میں شمار ہوتا تھا شیخ کے چارج میں آیا اور اس نے خوب دل کھول کر ابو نصر فارابی اور حکمائے یونان کی تصنیفات کا مطالعہ کیا اور ہر علم و فن کی کتابوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اتفاق کی بات کہ چند دن بعد کتب خانہ میں آگ لگ گئی اور لاکھوں روپوں کا علمی ذخیرہ آن واحد میں جل کر راکھ ہو گیا۔ حاسدوں نے یہ کہہ کر امیر کو بھڑکایا کہ

اس نے عمداً اپنی ناموری کے لئے یہ کام کیا ہے۔ تاکہ بعد میں از سر نو تصنیف و تالیف کا کام سرانجام دے کر مسائل میں حسب منشا ترمیم کا اضافہ کر سکے۔ تاہم شیخ اس نقصان عظیم کی تلافی میں مشغول ہو گیا۔

۳۹۲ھ میں اچانک بعض ایسے واقعات پیش آئے کہ تعلقات برقرار نہ رہ سکے اور مالی ضروریات نے شیخ کو بخارا چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ اسی سال والد کا انتقال ہو گیا۔ بعد اس کے کفن دفن سے فارغ ہو کر وہ خوارزم شاہ کے پاس پہنچ گیا۔ اس سے پہلے اکثر علماء و فضلاء ابو سہیل مسیحی، ابو ریحان بیرونی، ابو الخیر وغیرہ اس کے دربار میں موجود تھے۔ خوارزم شاہ نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور ایک گرانبہا رقم بطور وظیفہ مقرر کر کے فکر معاش سے بے نیاز کر دیا۔

یہاں رہتے کچھ عرصہ گزرا تھا کہ سلطان محمود نے قاصد بھیج کر خواہش ظاہر کی۔ کہ اپنے دربار کے علماء کو یہاں بھیج دے۔ امیر نے سلطان کے ارادے سے کسی نہ کسی طرح مطلع ہو کر اہل علم و فضل کو جمع کر کے کہا کہ تم میں سے جو بخوشی جانا چاہے جا سکتا ہے۔ میری طرف سے اجازت ہے اور جو سلطان محمود کے پاس جانا پسند نہ کرتا ہو اُسے اختیار ہے کہ راہِ فرار اختیار کرے۔ کیونکہ اُس کا قاصد عنقریب ہی پہنچنے والا ہے۔ شیخ اور ابو سہیل مسیحی یہ خبر وحشت اثر پا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان کے بھاگنے کے دوسرے دن بعد قاصد سلطانی پہنچ گیا۔ امیر نے عذر ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ کہ ابو سہیل و بو علی سینا تو کئی دن ہوئے خراسان چلے گئے ہیں۔ لیکن ابو ریحان و ابو الخیر موجود ہیں۔ اگر ان کو ہمراہ لیجانا چاہو تو لیجا سکتے ہو۔ قاصد ان کو ہمراہ لیکر غزنی پہنچا۔ تو سلطان نے کفِ افسوس ملتے ہوئے کہا۔ کہ میرا مقصد تو اس سے صرف بو علی کی حاضری تھی۔ اس کے بعد ہر ایک حاکم کے نام ایک حکم نامہ جاری کیا۔ جس میں لکھا تھا۔ کہ بو علی کو جہاں پاؤ زندہ گرفتار کر کے میرے پاس حاضر کرو جو شخص اسے گرفتار کر کے دربار میں حاضر کریگا۔ اُسے منہ مانگا انعام دیا جائیگا۔ ابو سہیل اور شیخ یہ خبر پا کر سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے اور کافی عرصہ تک راہ گم کرنے کے سبب بیابان اور لق و دق صحرا میں مارے مارے پھرتے رہے۔ ابو سہیل مسیحی نے اسی جنگل میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ اور شیخ تن بہ تقدیر ہزار گونہ مصائب جھیلتا ہوا جرجان پہنچ کر علاج معالجہ کے کام میں مشغول ہو گیا اور تھوڑے عرصہ میں خداداد ذہانت کے طفیل عالمگیر شہرت حاصل کر لی۔

اُن دنوں والی جرجان قابوس ابن وشمگیر کا بھانجا صاحب فراش [illegible] بو علی کی شہرت سنکر والی جرجان نے اُسے [illegible] بلایا۔ شیخ نے اس کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہی تاڑ لیا کہ [illegible] اس نے والی جرجان سے التماس کی۔ کہ جرجان کے تمام محلوں کے نام ایک کاغذ پر لکھ کر بلند آواز سے پڑھے جائیں۔ جس کے بعد وہ جوان عاشق کی نبض پر ہاتھ رکھا اور ایک آدمی نے بلند آواز سے محلوں کے نام پکارنے شروع کر دیئے۔ جب اس محلہ کا نمبر آیا جس میں اس کی زہرہ جبین معشوقہ کی بود و باش تھی تو اس کی نبض نے اچھل کر حرکت کرتے ہوئے شیخ کے دعویٰ کی تائید کی۔ شیخ نے دوبارہ اس محلہ کے مرد اور عورتوں کے نام لے کر پکارنے کا حکم دیا۔ جس کی فوراً تعمیل کی گئی آخر خدا خدا کر کے اس گھر کا نمبر آیا۔ اس گھر کے آدمیوں کے نام پکارتے ہی نبض کی رفتار میں غیر معمولی تیزی پیدا ہو گئی اور جب خاص طور پر اس کی معشوقہ کا نام پکارا گیا تو نبض نے اچھل کر اپنے مافی الضمیر سے آگاہ کر دیا۔ شیخ الرئیس نے علامات پر قابو پا کر والی جرجان کو اس واقعہ کی اطلاع دی اور صاف صاف کہدیا کہ اس کا علاج معشوقہ کے وصال کے سوا کوئی نہیں۔ والی جرجان شیخ الرئیس کی ذاتی تشخیص اور خداداد ذہانت دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ سلطان محمود کے بھیجے ہوئے حُلیہ کو نکال کر دیکھا تو شیخ کو اس کے مطابق پایا۔ اس نے شیخ کی بیحد تعظیم و تکریم کی لیکن خدا کی قدرت کہ اسے یہاں بھی اطمینان کا سانس نصیب نہ ہوا۔

چند دنوں بعد ملک میں بغاوت پھیل گئی اور والی جرجان نہایت بیدردی سے تہ تیغ ہوا۔ شیخ بصد مشکل جان بچا کر دستان پہنچا۔ دستان میں ابو محمد شیرازی نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور ایک شاندار مکان بنا کر شیخ کو بڑی عزت کے ساتھ اس میں ٹھہرایا۔

وجود مردم دانا مثال زر طلا است
کہ ہر کجا برود قدر و قیمتش مانند

شیخ نے اپنی مشہور و معروف کتاب اوسط اسی زمانہ قیام میں لکھی۔ اس کے علاوہ الحاصل والمحصول، اخلاق و عروض وغیرہ کے علاوہ بھی چند کتابیں تصنیف کیں۔ جن کا ذکر طویل ہونے کے علاوہ خارج از موضوع ہے۔

یہاں سے وہ رے گیا۔ رے کا حاکم [illegible] دربار میں باریاب ہونے پر شیخ کی [illegible] مجد الدولہ مالیخولیا میں مبتلا ہو گیا [illegible]

... کیا۔ وہ بہت جلد تندرست ہوگیا۔ یہاں سے قزوین اور قزوین سے ہمدان پہنچا۔

جن دنوں وہ ہمدان پہنچا۔ ان دنوں شمس الدولہ مرض قولنج میں مبتلا تھا شیخ کے علاج سے جلد ہی شفایاب ہو کر کاروبار سلطنت میں لگ گیا۔ اور اس صحت یابی کی خوشی میں اس نے شیخ کو اپنا وزیر بنالیا۔ لیکن فوج کے افسر اس بات پر اس سے ناراض ہوگئے۔ انہوں نے قتل عمد کے ارادے سے شیخ کے مکان پر حملہ کیا۔ اور تمام مال و اسباب کو تباہ کر کے گھر کو نذر آتش کر دیا۔ شیخ تن بہ تقدیر بھاگ کھڑا ہوا۔ اور بڑی مشکل سے جان بچائی۔ شمس الدولہ پر دوبارہ مرض کا حملہ ہوا۔ اور اس نے شیخ کو تلاش کر کے حاضر کرنے کا حکم دیا۔ وہ جلد ہی شفایاب ہوگیا اور بدستور سابق شیخ کو منصب وزارت پر مامور کیا۔ کاروبار دنیاوی کے سبب دل کو لکھنے پڑھنے کا کام نہیں ہو سکتا تھا۔ البتہ رات کو مطالعہ کا کافی وقت مل جاتا تھا اس نے اسی وقت کو غنیمت جان کر مطالعہ شروع کر دیا۔ شمس الدولہ کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا تاج الدولہ تخت و تاج کا مالک ہوا۔ اس نے شیخ کو بدستور وزارت کا عہدہ تفویض کرنا چاہا لیکن اس نے انکار کر دیا۔

اس اثنا میں علاؤ الدولہ نے جو تاج الدولہ کا خالہ زاد بھائی تھا اصفہان سے ایک قاصد شیخ کی طلبی کے لئے بھیجا۔ شیخ نے اس کے پاس جانے سے انکار کر دیا۔ اور سرائے ابو غالب عطار میں چھپ چھپا کر زندگی بسر کرنی شروع کر دی۔ اس عرصہ میں اس نے "کتاب الشفا" تصنیف کی۔ تاج الدولہ نے شیخ کو گرفتار کر کے ایک قلعہ میں نظر بند کر دیا۔ شیخ کو چار مہینے تک قید و بند کے مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔ اس عالم تنہائی میں اس نے حی بن یقظان، منطق الطیر اور اس کے علاوہ چند حکمت و فلسفہ کی کتابیں تصنیف کیں۔ علاؤ الدولہ نے ہمدان پر چڑھائی کی اور فتح حاصل کرنے کے بعد واپسی پر اس قلعہ کے پاس سے گزرا۔ جس میں شیخ قید و بند کی حالت میں زندگی کے دن بسر کر رہا تھا۔ اس نے اسے رہا کر کے ایک بیش قیمت خلعت عطا کر کے اپنی مصاحبت میں لے لیا۔ اور اپنے ہمراہ اصفہان لے گیا۔ اصفہان میں شیخ کا استقبال نہایت دھوم دھام سے ہوا۔ ایک عالیشان محل رہنے سہنے کے لئے اور نوکر چاکر خدمت کے لئے مل گئے۔ شیخ نے یہاں چند اور کتابیں تصنیف کیں اور علاؤ الدولہ کے ایما سے ایک رصدگاہ بنوانی شروع کر دی۔ لیکن سوء اتفاقات زمانہ سے پایہ تکمیل تک نہ پہنچی۔ علاؤ الدولہ کے دربار میں ابو منصور نامی عالم نے

شیخ کو طنزاً کہا کہ آپ حکمت کے فن میں تو ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ لیکن علم لغت میں نابلد محض معلوم ہوتے ہیں۔ شیخ نے اس طنز سے متاثر ہو کر لغت کا مطالعہ شروع کر دیا۔ اور تھوڑے عرصے میں کافی مہارت بہم پہنچا کر چند رسائل چھپے پرانے کاغذات پر تصنیف کئے اور ابو منصور کو دکھائے۔ ابو منصور نے ان رسائل کو دیکھ کر شیخ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ معافی مانگی اور اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے اس کے ہر فن مولا ہونے کا اقرار کیا۔

شیخ الرئیس کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک رسالہ شیراز کے ہاتھ آگیا۔ انہوں نے اس پر حاشیے چڑھا کر شیخ کا خاکہ اڑایا۔ اور وہ رسالہ ابو القاسم کرمانی کو دیکر جواب کے لئے شیخ کے پاس بھیجا۔ وہ چلچلاتی دھوپ میں قطع منازل کرنے کے بعد غروب آفتاب کے وقت اصفہان پہنچ کر شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور رسالہ اس کے حوالہ کیا۔ شیخ نے عشا کی نماز سے فارغ ہو کر چراغ جلایا اور جواب تحریر کرنے میں مشغول ہوگیا اور سو صفحے جواب لکھ کر سو گیا۔ صبح کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد جواب ابو القاسم کے حوالے کیا اور اپنی عدیم الفرصتی کا رونا روتے ہوئے کہا۔ کہ میں سرکاری کام کے ہجوم کے سبب مفصل جواب قلمبند کرنے سے معذور ہوں۔ امید ہے کہ تم مجھے معذور تصور کر کے اسی پر اکتفا کرلو گے۔ ابو القاسم اور اس کے ساتھی روایتیں بیان کی جاتی ہیں۔ جو خارج از موضوع ہونے کی بنا پر ترک کی جاتی ہیں۔

دبستان مذاہب میں لکھا ہے۔ کہ معراج نبوی کے متعلق بے شمار حکما نے تاویلیں کیں مگر سب سے عمدہ تاویل وہ ہے جو بو علی سینا نے کی ہے یعنی جبریل کے آنے سے یہ مراد ہے۔ کہ قوت روح قدسی بصورت امر پہنچی اور براق سے عقل فعال مراد ہے۔ جو سب قدسی قوتوں پر غالب ہے۔ چونکہ سفر میں تاکید کب سے ہوا کرتی ہے اور یہ سفر معنوی تھا اس لئے براق استعمال کیا گیا۔ پھر براق کے متعلق مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ وہ گدھے سے بڑا اور گھوڑے سے چھوٹا تھا مطلب اس کا یہ ہے کہ عقل فعال عقل انسانی سے برتر اور عقل اول سے بر تر ہے۔ چہرہ آدمی کا تھا سے مراد یہ ہے کہ تربیت انسانی پر مائل اور مشفق تھا۔ ہاتھ پاؤں دراز ہونے کا مطلب یہ ہے۔ کہ فائدہ اس کا ہر جگہ پہنچا ہے اور اس کی سوار ہونے کے وقت سرکشی اور جبریل کے مدد دینے سے یہ مطلب ہے کہ حضرت نے جب عالم جسمانی میں عقل فعال سے ملنا چاہا تو اس نے قبول کیا یہاں تک کہ جہل اور عوائق جسمانی سے مجرد ہو کر بتائید قوت روح عقلی

...تعالیٰ کے فیض اور فائدہ کو حاصل کیا۔ اور وہ جو فرمایا کہ کہ کے بیابان سے گزر رہے تھے پیچھے سے کسی نے آواز دی کہ شہر و جبول نے کہا کہ چلتے جائیے اور بات نہ کیجئے۔ مقصود یہ کہ قوت واہمہ پیچھے پیچھے چلی آ رہی تھی۔ جب مطالعہ اعضا و جوارح سے فارغ ہو گئے اور تامل حواس ابھی نہ کیا تھا کہ قوت وہم نے آواز دی۔ کہ آگے نہ بڑھو۔ وجہ یہ کہ واہمہ متصرف ہے وہ ہر وقت اپنا کام کرنا چاہتا ہے اور عقلی ترقی میں مانع ہوتا ہے۔ انسان کے لئے لازم ہے کہ اس کے قول پر عمل نہ کرے۔ بیت المقدس میں رسیدگی پر مؤذن نے اذان کہی۔ حضرت نے جماعت انبیا و اولیا کو دیکھا کہ داہنے بائیں کھڑے ہیں۔ مطلب یہ کہ مطالعہ اور تامل حیوانی و طبعی سے فارغ ہونے کے بعد دماغ کی نوبت پہنچی، مؤذن سے مراد قوت ذاکرہ ہے امامت سے تفکر، ملائکہ سے دماغی قوتیں، سلام کرنا احاطہ ہے تمام عقلی قوتوں پر۔ فلک سے مراد قمر اور اسمٰعیل سے جرم قمر اور اس جماعت ملائکہ سے وہ چیزیں ہیں جن پر قمر دلیل ہے۔ اسی طرح فلک دوم وغیرہ علیٰ ہذا القیاس۔

ایک دفعہ علاء الدولہ نے ابو سہیل پر فوج کشی کی۔ شیخ الرئیس بھی ہمرکاب تھا۔ اس سفر میں اس پر قولنج کے پے در پے شدید حملے ہوئے۔ اور ان مسلسل حملوں کی وجہ سے اس کی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی۔ اس نے اپنے خدام کو دو دانگ تخم کرفس حقنہ کی ادویہ کے ساتھ ملانے کو کہا انہوں نے غلطی سے یا عمداً پانچ درم تخم کرفس ملا دیئے اس سے تکلیف بڑھ گئی۔ جس کے ازالہ کے لئے شیخ نے روزانہ معجون مثرودیطوس کا استعمال شروع کر دیا

لیکن چوں آمد اجل اُن تدبیر سود

اس کی تکلیف دن بدن بڑھتی گئی۔ اصفہان پہنچ کر علاج ... کے بعد چند دن کے لئے آرام ہو گیا۔ پھر علاء الدولہ کے ہمراہ ہمدان کو چل دیا۔ راستے کی تکلیف سے دوچار ہو کر پھر مرض کا حملہ ہوا لیکن یہ حملہ موت کا پیش خیمہ تھا۔ شیخ نے اپنے گناہوں سے توبہ کی۔ اور اپنی تمام دولت غربا و مساکین کو تقسیم کر دی اور ۳ رمضان ۴۲۷ھ کو جمعہ کے دن داعی اجل کو لبیک کہا۔

شیخ کی تصنیفات بیشمار ہیں۔ فلسفہ و طب کے علاوہ بھی اکثر علوم و فنون پر اس نے کتابیں لکھیں۔ ان میں سے ہر ایک کتاب ایک غیر فانی شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ شیخ کی تصنیفات کو یورپ والوں نے قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ چنانچہ یورپ کی کئی زبانوں میں ان کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں جن کے کئی نسخے مصر کے خدیوی کتب خانہ اور یورپ کے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔

زندہ است نام بوعلی سینا فدائے طب
گرچہ بسے گزشت کہ او در جہاں نماند

آں حکیمے کہ بوعلی سینا است — درہمہ علم واقف و بینا است
سالِ مولود او دلِ بینا — گفت قایل ابوعلی سینا
سالِ نقلش خرد عیان و نہفت — رحمۃ الواحد العزیز بگفت

جوہرِ وفا

وہ اشک پونچھتے جاتے ہیں رو رہا ہوں میں

سید محمد عسکری طباطبائی سروش لکھنوی

فریبِ کثرتِ جلوہ سے آشنا ہوں میں
تری قسم تجھے تنہا ہی دیکھتا ہوں میں

مجھے نہ چھیڑ دکھے دل کا ماجرا ہوں میں
تمام قصۂ ناکامیٔ وفا ہوں میں

متاعِ عام نہیں جنسِ بے بہا ہوں میں
یہ لکھنے والے پہ لکھ "جوہرِ وفا" ہوں میں

رسائیاں مری محدود ہیں مرے دل تک
لبِ آشنا نہیں وہ آہِ نارسا ہوں میں

کہاں یہ دیکھیے لے جائے عشق کی عظمت
ابھی تو دورِ وفا سے گذر رہا ہوں میں

رُخِ حزیں سے نمایاں ہے خستگی دل کی
شکستِ رنگِ تمنا کا آئینا ہوں میں

نہ کوئی راہ ہے میری نہ کوئی منزل ہے
فضا میں کھوئی ہوئی دُور کی صدا ہوں میں

قدم پہ سر کو جھکائے ہے عشرتِ کونین
کسی کی یاد میں آنسو بہا رہا ہوں میں

بہارِ گل کہ شفق کا ہو منظرِ رنگیں
ترا ہی نقشِ تبسم ہے جانتا ہوں میں

وہ رازِ فاش ہوں جس پہ نظر نہیں پڑتی
جنوں کا بھیس ہے اور عشق برملا ہوں میں

خدا کرے کہ یہ لمحے ابد سے مل جائیں
وہ اشک پونچھتے جاتے ہیں رو رہا ہوں میں

جو تیر بن کے کلیجے کے پار ہوتی ہے
شکستِ ساز کی وہ آخری صدا ہوں میں

سروش یوں بھی غریب الوطن نہ ہو کوئی
ذرا جو چھاؤں ملی ہے تو سو گیا ہوں میں

شکستِ توبہ

افسانہ

از جناب شوکت صدیقی لکھنوی

سامنے میز پر ایک تصویر رکھی ہوئی تھی۔ کھڑکی کی راہ سے سہ پہر کی دھوپ کے سنہری عکس اُبھر اُبھر کر اس پر مچل رہے تھے۔ نشاط ہاتھوں پر جسم کا سہارا لئے اسے بوجھل آنکھوں سے کچھ اس طرح تک رہا تھا، گویا کوئی سہانا خواب دیکھ رہا ہو۔ اُس کی خاموش نگاہیں نقوش کی پنہائیوں میں اُلجھ کر رہ گئی تھیں۔ نزہت نے اسے دیکھا اور ایک قلیل عرصہ تک دروازہ سے لگی برابر اُسی پر نظریں جذب کئے رہی پھر وہ دبے قدموں آگے بڑھی۔ مگر درمیان میں پڑی ہوئی کرسی سے دوپٹہ کا دامن کچھ اس طرح اُلجھا کہ وہ شور کرتی ہوئی فرش پر آ رہی — نشاط چونک پڑا پلٹ کر نزہت کو دیکھا اور تصویر کو میز پوش کے نیچے سرکاتے ہوئے بولا:-

”آ گئیں تم؟“

”کیا نہ آتی“ وہ اپنی سیاہ غزالیں آنکھوں کو گھماتے ہوئے بولی اور نزدیک آ کر جھپٹ سے میز پوش کے نیچے سے تصویر نکال دُور جا کھڑی ہوئی۔ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے اُسے دیکھتا کا دیکھتا ہی رہ گیا۔ نزہت نے تصویر کو پلٹ کر دیکھا اور ایک ثانیہ کے لئے چہرہ پر تحیر زا اثرات ہویدا ہوئے۔ پھر وہ کھلکھلا کے ہنس پڑی — در و دیوار سے فرشتوں کے سے میٹھے میٹھے نغمے ٹکرا کر جھنکار گئے۔ وہ بھی کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔

”کیوں جناب“ وہ ہنسی پر بمشکل قابو پاتے ہوئے کہنے لگی۔ ”یہ مجھے آج ہی علم ہوا کہ آپ کو اس فن میں نہ صرف دخل ہے بلکہ ملکہ حاصل ہے۔“

نشاط کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ وہ خاموشی سے سر جھکائے میز کے کناروں پر ناخن سے لکیریں کھینچنے لگا۔ نزہت نے پھر کہا ”جس دن یہ صندوق سے غائب ہوئی تھی اُسی روز میں نے بھانپ لیا کہ ہو نہ ہو یہ آپ ہی کی حرکت ہوگی۔ وہ تو کہو خیر یہ ہوئی کہ ادھر تم نئے نئے آئے تھے کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑی۔ ورنہ اسی روز سب جان جاتے کہ آپ کس قدر ذات شریف ہیں۔“

انتہائی ندامت سے اب اس کا چہرہ بالکل پھیکا پڑ گیا تھا۔ زرد زرد روشنی میں اس کی پیشانی پر بالوں کی جڑوں کے پاس تھرتھراتے ہوئے پسینہ کے ننھے ننھے قطرے جھلک رہے تھے۔ نچلا ہونٹ اُس نے دانتوں سے دبا لیا تھا گویا وہ اس وقت انتہائی اذیت محسوس کر رہا ہو۔ نزہت نے سوچا کہ اب زیادہ پریشان کرنے سے کوئی ناخوشگوار صورت نہ پیدا ہو جائے۔ اس لئے وہ آہستہ آہستہ کرسی کی پشت پر گئی اور اُس کے دونوں شانوں پر اپنے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:-

”بس رو دیئے ابھی یہ دعویٰ ہے۔“

”خوب دل کھول کر کہہ لو“ اُس نے پیشانی پر سے پسینہ صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”مگر اپنی دفعہ تسو سے بہانے نہ بیٹھ جانا۔“

”تم خود ہی فیصلہ کر لو کہ تسوے میں بہا رہی ہوں یا تم“ وہ ذرا مسکرا کر کہنے لگی۔ ”خیر آگ لگاؤ اُس کو بات بڑھانے سے بڑھتی ہے۔ آؤ آج اس بات کا معاہدہ ہو جائے کہ کوئی ایک دوسرے کو نہ ستائے۔“

”منظور ہے“ اُس نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ ”لاؤ اب تو تصویر دے دو۔“

”کیا کرو گے لے کے اس نگوڑی کو دھرا ہی کیا ہے اس میں؟“

”بتاؤں“ وہ کسی قدر کھل کر بولا۔ اب اس کے ہونٹوں پر ایک خفیف سا تبسم اُبھرتا نظر آ رہا تھا۔ ”اچھا ذرا ادھر طرف دیکھو! اس میں ایک چاند سا پیارا مکھڑا ہے وہ جھومتی ہوئی مست انکھڑیاں ——“

وہ جلدی سے بات کاٹ کر بولی۔ ”دیکھو پھر تم نے چھیڑ خانی شروع کی؟“ اس کی پلکیں لچک کر آنکھوں سے

کے نیچے مبہم سے سائے بکھیرنے لگیں۔ نکھرے رخساروں پر ہلکی ہلکی سرخیاں رینگیں اور چہرہ کو شفق رنگ بنا دیا۔ لیکن وہ کہتا ہی گیا:-

"اوہ! اوہ! حضرت!!! اوسے اودسے رس بھرے لب جن کے نیچے ایک چھوٹی سی نکیلی ٹھوڑی بھی ہے کچھ اور بتاؤں؟"

"خوب جی بھر کے:" وہ کھسیانی ہو کر بولی اور ساتھ ہی جھنجھلا کر تصویر کے کئی ٹکڑے کر کے نشاط کے سامنے پھینک دئیے۔ نشاط نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھتے ہوئے محسوس کیا کہ دل ایک بار زور سے پسلیوں کی سلاخوں سے ٹکرا کر سینہ کے کسی عمیق گوشہ میں ڈوب گیا۔

"یہ تم نے کیا کیا نزہت" وہ مری ہوئی آواز سے بولا۔ "خطا میری تھی اس غریب نے کیا بگاڑا تھا۔ یہ تو میری تنہائیوں کی رفیق تھی۔"

"دوسری کھنچوا کر دے دوں گی۔"

وہ چپ ہو گیا لیکن اب بھی اس کا اترا ہوا چہرہ مرجھایا ہوا تھا اور آنکھوں میں شبنم کی سی نم آلود چمک تیر رہی تھی خود نزہت بھی اپنے اس فعل پر بہت متاسف ہوئی اس نے ندامت مٹانے کے لئے پھیکی ہنسی ہنس کر کہا:-

"اچھا آؤ نیچے چلیں! میرٹھ سے پھوپھی جان آئی ہوئی ہیں۔ تم نے تو باتوں میں ایسا پھنسایا کہ کہنا ہی بھول گئی کہ وہ تم کو یاد کر رہی ہیں۔"

نشاط نے لاکھ کہا کہ وہ ابھی آتا ہے لیکن اس نے ایک نہ سنی۔ آخر چلنے پر مجبور کر ہی لیا۔ رستے میں اس نے پوچھا "کیوں نزہت پھوپھی جان کے ہمراہ کون کون آیا ہے؟"

"پھوپھا جان اور مجیب! خیر وہ تو شام ہی کی گاڑی سے واپس میرٹھ چلے جائیں گے۔ مجیب کا البتہ قیام ہوگا۔"

نشاط نے آگے کچھ نہ دریافت کیا اور خاموشی سے چلنے لگا۔ دونوں سیڑھیاں طے کرتے ہوئے نیچے آئے سامنے دالان میں تخت پر گاؤ تکیے کا سہارا لیئے پھوپھی جان بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ پاس ہی مجیب بھی بیٹھی تھی۔ اسے دیکھتے ہی وہ سمٹ سمٹا کر منہ موڑ کر ایک طرف ہو گئی۔ وہ سلام کر کے تخت پر بیٹھ گیا۔ پھوپھی جان دعائیں دیکر

کچھ عرصہ خاموش رہیں۔ پھر اپنی گفتگو کا سلسلہ چھیڑ دیا۔ وہ اس وقت غالباً حالات حاضرہ پر رائے زنی کرنے میں مصروف تھیں بات تھی کہ ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ سب خاموش بیٹھے ان کا بیان سن رہے تھے۔ ایک نشاط ہی تھا جو ان ترانیوں سے اکتا کر اٹھنے کا بہانا تلاش کر رہا تھا۔ کئی بار وہ کسمسایا، مگر اظہار مدعا سے قبل ہی پھوپھی جان روئے سخن تبدیل کر دیتیں اور وہ جھنجھلا کر چپ ہو جاتا۔

دن کی نبضیں اب سست پڑ چکی تھیں۔ دھندلی دھندلی پرچھائیاں سی فضا میں منڈلانے لگیں تھیں۔ شام کے اترتے ہوئے سائے صحن پر سے پھسلتے ہوئے گونگی دیواروں کی بلندیوں پر رینگنے لگے تھے۔ دن بھر کا سونلایا ہوا ننھا آفتاب کالی کلوٹی مہتابی کی اوٹ سے جھانک رہا تھا۔ نشاط نے دیکھا کہ شام بھی ہو گئی اور پھوپھی جان پیچھا چھوڑتی نظر نہیں آتیں تو اس نے آداب مجلس کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ایک دولت کی آمد کا بہانا تراشا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ چلتے چلتے انہوں نے روک کر دیکھا۔ پھر کہا:-

"دیکھو بھول نا مت۔ کل آنا ضرور۔"

"بہت بہتر" کہہ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا اور تیز تیز قدموں سے باہر چلا گیا۔

دوسرے روز شام کو حسب وعدہ وہ پھوپھی جان کے پاس گیا۔ ان کی آنکھوں میں پانی اتر آیا تھا۔ اس لئے وہ بغرض علاج "مکینزی ہاسپٹل" کے ایک کمرہ میں مقیم تھیں جب وہ وہاں پہنچا تو پھوپھی جان مصلا پر بیٹھی وظیفہ میں محو تھیں وہ انہی کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ ادھر کھڑکی کے پاس پلنگ پر مجیب بیٹھی سویٹر بن رہی تھی۔ شام کی نارنجی شعاعوں نے اس کے چہرہ کو لالہ گوں بنا دیا تھا۔ نشاط نے اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس نے مجیب کو آج سے قبل بھی کئی سال ادھر دیکھا تھا لیکن اسے سان وگمان بھی نہ تھا کہ سیانی ہو کر وہ اسقدر دیدہ زیب نظر آئے گی حسن جیسے اس کی رگ رگ سے ابلا پڑتا تھا۔ اس کی آنکھیں جو ہمیشہ دکھنے کے باعث سب کو کریہہ نظر آتی تھیں۔ اب وہ کس قدر دلکش ہو گئی تھیں۔ اس جھیل کی طرح صاف اور روشن جو کسی اونچی پہاڑی کے دامن میں دنیا سے الگ

حسنگ جنگلی درختوں کے گھنے سائے تلے ہر وقت جھلملایا کرتی ہو، اودے اودے لبوں سے جوانی کا شہد ٹپک رہا تھا ان پہ ایک ہلکی سی چمک مچل رہی تھی گویا بلوریں ساغروں میں شراب سُرخ چھلک رہی ہو۔ ہوا سے بالوں کی ایک لٹ بکھر کر پیشانی پہ اٹھلانے لگی تھی۔ اسے درست کرتے ہوئے مجیب نے اُسے دیکھا۔ ساتھ ہی نشاط نے اپنی رگوں میں ایک چبھن سی کھٹکتی ہوئی محسوس کی۔ پھر اس نے نگاہیں جھکا لیں اور نشاط کی تشنہ نگاہوں کی بے باکیوں سے بے نیاز اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ کچھ عرصہ تک وہ خاموش بیٹھا اُسے تکتا رہا پھر ہمت کر کے سوال کر ہی بیٹھا:۔

"کیوں مجیب! تمہاری یہاں طبیعت تو بہت گھبراتی ہو گی؟"

"جی، وہ نگاہیں بدستور جھکائے ہوئے بولی" پھر کیا کیا جائے۔"

"مطالعہ سے اگر تمہیں ذوق ہو تو کچھ کتابیں لاؤں۔ کچھ نہ کچھ طبیعت بہل سی جائے گی۔" اسے ہمت ہوئی۔

"مجھے تو کل ہی خیال آیا تھا لیکن پھر آپ سے کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑی۔"

"خوب" اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ نزہت خاموش ہو کر پھر اپنی انگلیاں چلانے لگی۔ نشاط نے زیادہ بولنا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے اپنی نگاہیں پھر اُس کے چہرہ سے ہم آغوش کر دیں۔

پھوپھی جان نے مراقبہ سے فراغت پا کر پھر اپنی بے معنی گفتگو شروع کر دی۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بوڑھے ہو کر لوگ باتونی زیادہ ہو جاتے ہیں۔ نہ معلوم یہ قدرت کی کون سی ستم ظریفی ہے۔ پیرانہ سالی سے غریبوں کا دل و دماغ یونہی کمزور ہو جاتا ہے۔ اس پر مستزاد یہ بے سرو پا باتیں جوان کو مطلق کھو کھلا کر دیتی ہیں۔ کل کی طرح آج بھی، پھوپھی جان کی گفتگو میں اُس کے لئے کوئی ندرت نہ تھی لیکن آج وہ طبیعت میں کل کی سی اُلجھن نہیں محسوس کر رہا تھا۔ نہ ہی اس کا دل وہاں سے اُٹھنے کو چاہتا تھا ۔۔۔ البتہ وہ نگاہیں پھیر پھیر کر مجیب کو بار بار ضرور دیکھتا جب بھی وہ اُسے دیکھتا اُس کی نگاہوں میں پیپلوں کے سے حیات آفریں سنہرے سنہرے خواب لہرانے لگتے۔ آخر جب رات زیادہ آنے لگی تو وہ مجبوراً وہاں سے اُٹھا مگر دوسرے روز آنے کا تمنا خیز ارماں دل کی گہرائیوں میں سمیٹے ہوئے ۔۔۔!

اب وہ ہر شام بلا ناغہ ہسپتال جاتا تشنہ نگاہوں کو مجیب کی جلوہ پاشیوں سے سیراب کرنے۔ مگر جتنا زیادہ وہ اُسے دیکھتا اُس کی آرزوؤں میں آگ سی لگتی جاتی۔ مجیب بھی اب اُس سے بہت حد تک مانوس ہو گئی تھی۔ اب اس میں وہ اگلی سی حیا پرور بیگانہ وشی نام کو نہ تھی۔ اب وہ اُس کے سامنے جھجکتی ہوئی، جسم چراتی ہوئی، ہکی بکی نگاہیں ڈالتی نہیں آتی۔ دونوں ایک دوسرے سے بالکل بیباکی سے ملتے تھے، وہ اُسے روز نئی نئی کتابیں لا کر دیتا، وہ انہیں بڑے شوق سے پڑھا کرتی۔ لیکن مجیب سے مل کر اُس نے نزہت کو بالکل فراموش کر دیا تھا۔ وہی نزہت جس کی خاطر وہ والدین کو چھوڑ کے خالہ کے یہاں پڑا تھا۔ جس کے لئے نہ جانے اس نے کتنی ہی راتیں آنکھوں میں کاٹ دی تھیں جسے دیکھ کر وہ کبھی خود کو فردوسی فضاؤں میں سانس لیتا ہوا محسوس کرتا تھا۔ مگر اب وہ سب کچھ بھول کر صرف مجیب کے لئے وقف ہو کر رہ گیا تھا۔

ابھی دن زیادہ نہیں چڑھا تھا۔ نشاط کسی ضرورت سے نزہت کے کمرہ میں گیا وہ پلنگ پر لیٹی کچھ سوچ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ عمداً نہ بولی۔ اُس کا خیال تھا کہ آج وہ کئی روز بعد آیا ہے۔ اس لئے خود ہی بولے گا۔ جب وہ اسے مخاطب کرے گا وہ نہ بولے گی۔ جب وہ بہت منائے گا تب وہ کہے گی کہ میں ایسے بے پرواؤں سے نہیں بولتی۔ پھر وہ اپنی مجبوریوں کا عذر کرے گا تب وہ آئندہ ایسا نہ کرنے کا وعدہ کرائے گی۔ وہ بڑی بڑی ہی خواب دیکھ رہی تھی، مگر جب وہ اس سے بولے بغیر کمرہ سے باہر چلا گیا تو اُس کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ خواب ادھورے ہی رہ گئے۔ پھر اس نے غور کیا کہ آج یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ بلکہ ادھر کچھ عرصہ سے وہ اس سے کچھ کھنچا کھنچا سا رہتا ہے۔ بات بھی منہ بھر کے نہیں کرتا۔ گھر میں بھی وہ کم نظر آتا تھا۔ اس کے دل کی گہرائیوں سے ایک

نفرت انگیز لہجہ کا اٹھا اور رگوں میں چنگاریاں بن کر تلملانے لگا۔ اس نے بھی طے کر لیا کہ اینٹ کا جواب پتھر سے ہوگا۔

کئی دن گزر گئے نزہت نشاط سے مطلق نہ بولی۔ نہ کوئی التفات ہی برتا۔ اس کے سابقہ رویہ میں بھی کوئی فرق نہ آیا۔ وہ اسی طرح اپنی تساہل کیشی پہ قائم رہا۔ وقت یوں ہی گزرنے لگا۔ جلد ہی نزہت کو اپنی اس کمزوری کا احساس ہونے لگا کہ زبان تو اس کے قبضہ قدرت میں ہے مگر آنکھوں کو قابو میں رکھنا اس کے بس کی بات نہیں جب بھی وہ اُس کی آواز سنتی نگاہیں خود بخود اسی کی جانب بلند ہو جاتیں۔ ایک بار دیکھ کر بار بار دیکھنے کی تمنا دل میں انگڑائیاں لینے لگتی۔ پھر گزرتے ہوئے دنوں کی یاد اُس کے تمام عزائم کو توڑ مروڑ کر رکھ دیتی۔

آخر ایک شام کو جب وہ کوٹھے پر سے خادم کو کچھ فہمائش کرتا ہوا آرہا تھا۔ نزہت نے نیچے صحن سے اس کی آواز سنی اور بلا غور کئے زینے پر چڑھنے لگی۔ سیڑھیوں پر دونوں ملے۔ ایک لمحہ تک وہ ایک دوسرے کو خاموش نظروں سے تکتے رہے۔ نزہت کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا جیسے اندھیری رات کے سناٹے میں بوڑھے گجر کی دھیمی دھیمی آواز فضا کی لہروں میں گونج رہی ہو۔ پھر وہ خود ہی بولی:۔

"واللہ اس قدر بھی ناراضی اچھی نہیں۔ مجھے تو کوئی بھی ایسی بات نظر نہیں آتی جو کشیدگی کا باعث ہو۔"

"نہیں نزہت! بھلا میں اور تم سے ناراض۔ توبہ کرو۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ لیکن اس کی مسکراہٹ میں وہ اگلی سی بیساختگی اور جوش نام کو نہ تھا۔

"تو پھر نمائش آج لے چلو گے۔"

"بھئی آج تو ذرا مشکل ہے۔ پھر کسی دن۔"

"لیکن وہ تو صرف آج کے دن کیلئے ہے۔"

نشاط نے اپنی شیروانی کے بالائی بٹن درست کرتے ہوئے کہا۔ "کوشش کروں گا۔" وہ چلنے کے لئے قدم بڑھانے لگا۔ نزہت کو محسوس ہوا جیسے اس کا دل دھڑکتے دھڑکتے حلق میں آکر پھنس گیا ہے وہ کچھ بول نہ سکی۔ اس کے بھولے چہرہ پہ ایک ماتمی اداسی چھا گئی جیسے آسمان کی نیلگوں وسعتوں میں مسکراتے ہوئے مہتاب کے طلائی جسم کے نزدیک ایک ننھا سا ہلکا پھلکا بادل کا ٹکڑا اچھلتا ہوا آکر ٹھہر جائے۔ اسے افسردہ دیکھ کر نشاط نے کہا "اچھا دل نہ چھوٹا کرو۔ لے چلوں گا۔ بس اب تو ہنس دو۔" اس نے اس کی نرم نرم ٹھوڑی پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا۔ وہ بدستور خاموش رہی۔ اس نے اس کے رخساروں پر ہلکے سے ہاتھ مارتے ہوئے پھر کہا:۔

"بس ابھی آیا تم تیار رہو۔"

"آنا ضرور، ورنہ مجھے بہت رنج ہوگا۔"

"ضرور ضرور!" کہتا ہوا وہ نیچے چلا گیا۔ نزہت مسکراتی ہوئی خوش خوش تیار ہونے کے لئے اوپر چلی گئی۔ اس وقت اس کے کانوں میں آبشاروں کے سے سریلے نغمے بج رہے تھے۔ اور روح ستاروں کی جگمگاتی ہوئی دنیا میں آوارہ خرام۔

نشاط وہاں سے سیدھا ہسپتال گیا۔ مجیب چائے بنا رہی تھی۔ سامنے مسہری پہ پھوپھی جان لیٹی تھیں۔ ان کی آنکھوں پہ پٹی چڑھی ہوئی تھی۔ مجیب نے اسے دیکھ کر پوچھا:۔

"چائے پیو گے نشاط بھائی؟"

"ضرور! میں تو سوچ کر ہی آیا تھا کہ آج تمہارے ہی ہاتھ کی بنی ہوئی چائے پیوں گا۔"

مجیب نے پیالی تیار کر کے دی۔ نشاط نے پیالی لیتے ہوئے دریافت کیا۔ "پھوپھی جان کی طبیعت اب کیسی ہے!"

"بہت بہتر! پٹی جلد ہی کھلنے والی ہے۔"

جب نشاط چائے پی چکا تو اس نے پوچھا۔ "پان کھائیے گا۔"

"پان" اس نے کسی قدر حیرت زدہ ہو کر کہا۔ "کھانا کھا کر تو کبھی کبھار کھا ہی لیتا ہوں۔ لیکن چائے پی کر تو میں نے کبھی پان نہیں کھایا۔"

"خیر آج ہمارے کہنے سے بدپرہیزی کر لیجئے۔" اس نے ہونٹوں کو ذرا سکوڑتے ہوئے کہا۔ جن پہ مسکراہٹیں ابھرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ وہ انکار نہ کر سکا۔ اسے مجیب

کی خاطر منظور تھی۔ مجیب نے پان لا کر دیا۔ مگر کھاتے ہی بولا:

"یہ کیسا کھٹا میٹھا پان ہے۔"

"کھٹے کی ایک ہی۔" وہ شوخی سے آنکھیں گھماتے ہوئے کہنے لگی۔ "کیا آج ہی کھایا ہے۔ ساتھ والے کمرہ میں وہ جو نئی بیگم آئی ہیں۔ انہوں نے خاص طور سے بطور تحفہ یہ پان دئے تھے۔ جبھی تو میں نے آپ کو اتنا مجبور بھی کیا۔"

حالانکہ وہ محسوس کر رہا تھا کہ زبان کسیلی ہو کر تالو سے لگتے ہوئے تکلیف سی محسوس کر رہی ہے۔ لیکن اس نے بات بنانے کی غرض سے کہا۔ "جب ہی تو میں نے کہا تھا یہ یہاں کا پان نہیں ہے۔"

وہ پان چبانے لگا۔ مجیب بولی۔ "ذرا منہ تو دیکھو کسقدر رچا ہے۔ بالکل بیر بہوٹی ہو رہا ہے۔" پھر جلدی سے اس نے میز پر رکھا ہوا دستی آئینہ اٹھا کر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ نشاط نے جلدی سے منہ دیکھا اور حیرت زدہ رہ گیا۔ اس کے دانت اور زبان سب بالکل سیاہ نظر آ رہے تھے۔ مجیب اپنی ہنسی نہ روک سکی۔ اب وہ سب کچھ سمجھ گیا تھا۔ اس نے جلدی سے کہا:۔

"تم نے مجھے مسی کھلائی ہے۔ تمہارے منہ پر سیاہی نہ ملوں تو بات کیا۔"

مجیب چھلانگ مار کر دروازہ سے باہر جا پہنچی۔ نشاط اس کے پیچھے لپکا وہ دوسرے کمرے میں چلی جاتی مگر باہر کسی اور کے قدموں کی آہٹ سن کر ٹھٹک کر ہکا بکا ہو کے اس کا منہ تکنے لگی۔ اس بھولے خرگوش کی طرح جو سبزہ کے سینہ پر چوکڑی بھرتے بھرتے چال بھول کر سہم کے رہ جائے۔ نشاط نے لپک کر اسے پکڑ لیا۔

"اب تمہیں کون سی سزا دی جائے۔" اس نے پوچھا۔

"جو تمہارے دل میں آئے اب تو تم نے پکڑ ہی لیا ہے۔"

نشاط نے ایک بار غور سے مجیب کا چہرہ دیکھا۔ کھڑکی سے روشنی کے دھندلے دھندلے عکس نکل نکل کر اس کے چہرے پر بکھر رہے تھے۔ سردی سے اس کے نیلے نیلے ہونٹ آہستہ آہستہ کپکپا رہے تھے۔ مگر ہرنی کی سی بڑی بڑی آنکھوں سے اب بھی شوخیاں جھانک رہی تھیں

"تمہیں تو بس دبا دبا کے ادھ مرا کر دے۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا اور ساتھ ہی اسے اپنے بازوؤں کی گرفت میں جکڑ لیا۔ مجیب نے خفیف سی سسکی لے کر اسے دیکھا۔ اس نے ایک بار اسے زور سے بھینچ لیا۔ پسلیاں منہ بند کلیوں کی طرح ہولے ہولے کڑکڑا ائیں۔ "چھوڑ دو بھی" وہ بولیں اور اپنا سر اس کے سینہ سے لگا دیا۔ نشاط نے اپنے بیتاب لب آگے بڑھا دئے۔

جب وہ گھر پلٹا تو رات اچھی خاصی آ گئی تھی۔ سنسان سڑکوں پر بجلی کے قمقموں کے پھیکے پھیکے دائرے پھیلے ہوئے تھے۔ کہر کے نیلگوں دھندلکوں میں لپٹی ہوئی کائنات ایک گہری نیند سو رہی تھی۔ سردی سے ٹھٹھرتی ہوئی ہوا درختوں کی پتیوں سے الجھ الجھ کر آہ و بکا کر رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں کو سردی سے محفوظ رکھنے کے لئے جیبوں میں ٹھونس لیا اور تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔ رستہ ہی میں اسے اپنا وعدہ یاد آیا جو شام کو اس نے نزہت سے کیا تھا۔ نزہت کی مرجھائی ہوئی شکل اس کی نظروں میں پھرنے لگی۔ اسے اپنی بے پروائی پر بڑا افسوس ہوا۔ وہ تمام راہ اسی واقعہ کے متعلق سوچتا رہا۔

گھر پہنچ کر پہلا کام اس نے یہ کیا کہ سیدھا نزہت کے کمرہ میں گیا۔ وہ اس وقت تک پلنگ پر کروٹ لئے ہوئے جاگ رہی تھی۔ لیمپ کی دھیمی دھیمی روشنی میں سفید چادر پر پھٹی ہوئی تصویر کے ٹکڑے پڑے تھے۔ نشاط نے نزدیک جا کر کہا:۔

"کیا سوچ رہی ہو؟"

"یہی کہ اب یہ تصویر کے ٹکڑے کیا جڑ بھی سکتے ہیں۔"

"کیا کرو گی ان کو جوڑ کر۔ جب تم موجود ہو تو اس کی کیا ضرورت ہے؟"

"کاش ایسا ممکن ہوتا۔ تصویر پھاڑ کر میں نے خود اپنی روح کو نوچ لیا۔" وہ آہستہ سے بولی اور آنکھوں سے کسی سیلابی ندی کی طرح آنسو چھوٹ پڑے۔ نشاط نے دل ہی دل میں کہا کہ اس کے حق میں یہی بہتر ہوا کہ وہ ابھی تک اسی مغالطہ میں مبتلا ہے کہ میں نے تصویر پھاڑ

ڈالنے کی وجہ سے اس سے ناراض ہوں۔ اس نے زینت کے آنسو پونچھ کر کہا :-

"اچھا دیکھو اب کوئی ایسی حرکت نہ ہو۔"

"تم اب ناراض تو نہیں ہو۔"

"بالکل نہیں! اچھا اُٹھو مجھے کھانا تو لا دو۔ میں نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا۔"

زینت دوشالہ اوڑھ کر متبسم چہرہ لئے ہوئے باہر چلی گئی۔ نشاط نے بھی اسی وقت طے کر لیا کہ وہ اب کبھی محبوب کے پاس نہ جائے گا۔

دوسرے دن اس کے وقت کا بیشتر حصہ زینت ہی کے پاس گزرا۔ وہ بھی کہ خوشی کے مارے ہنسے دیتی تھی۔ نشاط خود بھی محسوس کر رہا تھا جیسے راہ بھٹک کر عرصہ تک اِدھر اُدھر ٹکریں کھانے کے بعد اس نے اپنی منزل کو پا لیا۔

اسی روز شام کو اتفاق سے اسے ایک عزیز کے ہاں ایک بہت ضروری کام سے جانا تھا اور جب تانگہ ہسپتال والی سڑک پر آیا تو اس نے تانگے والے کو ہدایت کی کہ وہ اس سڑک کو خوب تیزی سے تانگہ دوڑا کر عبور کر جائے۔ مگر جب تانگہ ہسپتال کے پھاٹک کے پاس آیا تو اس نے تانگہ والے سے کہا :-

"تانگہ ہسپتال میں لے چلو۔"

تانگے والے نے حیرت سے اس کو پلٹ کر دیکھا اور تانگہ پھاٹک میں داخل کر دیا۔ نشاط کا دل بالکل ساکن تھا ——!!

قطعات!

انتظار

وہ تنہا، مہیب راتوں میں
دل سے رستی ہیں ہر گھڑی آہیں
نیند سے آشنا نہیں شاید
میری پُر شوق منتظر راہیں

نغمے

گا رہی ہے نغمۂ بہار سے
سرو پہ ایک خوش نوا قمری
اور میں یہ خیال کرتا ہوں
سوز غم ہے یہ نغمہ سنجی کا؟

آرزو

عمر رسیدہ ہے آرزو میری
چھائی ہے یاس کی گھٹا ہر سو
پھر بھی رخشاں ہے یوں شعاع امید
جیسے تاریک رات میں جگنو

ناامیدی

دل ہے مایوسیوں کے نرغے میں
گلستان خیال ویراں ہے!
ٹمٹماتا سا آس چراغ نصیب
صرصر یاس سے پریشاں ہے

ارشید ضیا جالندھری

ہند چینی

ہند چینی پرجاپان کے قبضہ سے دنیا کی سیاست میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔ اور اگر جاپانی اقدام کی یہی رفتار رہی تو مشرق بعید امریکہ و برطانیہ، جزائر شرق الہند، ہندوستان، آسٹریلیا اور نیوزیلینڈ کے لئے ایک نئے فتنے کا آغاز ہوگا۔ فرانس نے جس بیچارگی اور عاجزی سے جاپان کو اپنا ملک حوالے کیا ہے وہ سقوط فرانس کے تلخ ترین نتائج میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ جرمنی و اٹلی سے نیازمندانہ تعلقات رکھنے کا خمیازہ بھگتنا پڑ رہا ہے۔ اسی واقعہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مارشل پیتاں کی ذلت آمیز پالیسی کا نتیجہ ہوگا کہ فرانس کی تمام نوآبادیات اور مقبوضات ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے اور اسی کے تمام اہم علاقے چھن جائیں گے۔ عام لوگوں کو شاید یہ حقیقت بہت کم معلوم ہوگی کہ ہند چینی جاپان کے لئے سیاسی، فوجی اور اقتصادی نقطہ نظر سے کس قدر اہمیت رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس پر قبضہ کرنے کے بعد اس کی دیرینہ خواہشات پوری ہوگئی ہیں اور وہ پہلے سے زیادہ طاقتور ہو گیا ہے۔ چنانچہ ذیل میں مختصر طور پر ہند چینی کے حالات و کوائف اسی مقصد کے لئے بیان کئے جا رہے ہیں کہ اس کی اہمیت کو واضح کیا جائے۔

آبادی اور رقبہ فرانسیسی ہند چینی کی آبادی دو کروڑ چالیس لاکھ ہے اور ۱۸۸۵ء سے جبکہ چین یہاں اپنے شاہی حقوق سے دستبردار ہو گیا تھا۔ یہ فرانس کے قبضہ میں ہے۔ اس کا رقبہ دو لاکھ اکیاسی ہزار مربع میل ہے اور رقبہ کے لحاظ سے یہ علاقہ فرانس سے ۷۰ ہزار مربع میل بڑا ہے۔ یہ علاقہ ان چھ جداگانہ ریاستوں پر مشتمل ہے۔

(۱) کوچین چینی۔

(۲) انام۔

سیاسی و معاشی حالات

از جناب حافظ سید رشید احمد ارشد

(۳) کمبوڈیا۔

(۴) لاؤز۔

(۵) ٹونکین

(۶) کوانگچو

انام اور کمبوڈیا اپنے بادشاہوں کے ماتحت برائے نام آزاد سلطنتیں ہیں مگر فرانسیسی ریذیڈنٹ کی نگرانی میں ہیں تمام علاقوں کا مرکز ہی پایۂ تخت ہنوئی ہے جو علاقہ ٹونکین میں واقع ہے۔

یورپین آبادی بیالیس ۴۲ ہزار اشخاص پر مشتمل ہے جو عام طور پر فرانسیسی ہیں۔ دیسی باشندے منگولین نسل سے ہیں اور عام طور پر بودھ مذہب کے پیرو ہیں۔ ان کی کوئی متحدہ زبان نہیں ہے بلکہ مختلف مقامی زبانیں رائج ہیں۔

برآمد کی اہم اشیاء میں چاول، ربڑ، مچھلی، کوئلہ، جست، مویشی، چمڑہ، غلہ اور ٹین شامل ہیں۔ درآمد کی اہم اشیا یہ ہیں:۔

روئی ریشمی تار اور تاگے، دھات کی چیزیں اور موٹر کار

ہند چینی کی اہمیت ہند چینی مشرق اور مشرق بعید کو ملانے کا بڑا راستہ ہے بحر چین جاپان اور چین کی شاہراہ ہے اور یہ ملک اس کی کنجی ہے۔ شنگھائی اور ہانگ کانگ جیسی اہم بندرگاہوں کا دروازہ بھی یہی ہے۔ نیز یہ ملک سیام کا پڑوسی ہے جو برما کے لئے حد اوسط کا کام دیتا ہے۔ جاپان کی موجودہ خبروں سے سیام کو جو خطرات لاحق ہوگئے ہیں وہ سیام ہی کے لئے خطرہ نہیں ہے بلکہ رنگون، برما، سنگاپور اور جنوبی چین کیلئے بھی خطرے کا موجب اور اس ملک پر قبضہ کرنے کے بعد جاپان اس پوزیشن میں ہو گیا ہے کہ چین کے باقی ماندہ علاقے پر بھی نہایت آسانی کے ساتھ بمباری کر سکے۔

اس کی سیاسی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کا جنوبی گوشہ سنگاپور سے صرف پانچ سو میل کے فاصلہ پر ہے اور ڈچ بورنیو سے چھ سو میل دور ہے۔ یہاں کی جاپانی فوجیں برطانوی سلطنت خصوصاً آسٹریلیا کے ذرائع آمد و رفت اور ہندوستان اور برما کے لئے ہر وقت موجب خطرہ ہیں اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے جزائر فلپائن بھی جاپانی بمباروں کی زد میں آ جاتے ہیں پھر جزائر شرق الہند بھی اس کی زد سے محفوظ نہیں ہیں۔

سیاسی اہمیت کو تو اخباروں میں بہت زیادہ واضح کیا گیا ہے لیکن یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ہند چینی پر قبضہ کرنے کے بعد جاپان کو اقتصادی فوائد بہت زیادہ حاصل ہوئے ہیں اور یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ ہند چینی پر مسلط ہونے کے بعد جاپان کو وہ چیزیں مل گئی ہیں جو اس کے ملک میں نہیں تھیں۔ مثلاً جاپان میں نازک قسم کی لکڑی کے علاوہ جسے وہ عمدہ قسم کی لکڑی کی مصنوعات میں استعمال کرتا ہے، عام قسم کی لکڑی کا ذخیرہ موجود نہیں ہے۔ نیز شاہ بلوط اور شیشم جیسی سخت قسم کی لکڑی کا جاپانی جزائر میں نام و نشان تک نہیں ہے۔ مگر اس قسم کے زرخیز جنگلات ہند چینی میں بکثرت موجود ہیں۔ بلکہ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہئے کہ یورپ کے منطقہ معتدلہ اور منطقہ حارہ کے جنگلات یہاں پائے جاتے ہیں۔ یہاں کی زمین زرخیز اور آب و ہوا مفید اور صحت بخش ہے۔ یہاں ربڑ اس قدر نکلتا ہے جس قدر ملایا سے برآمد ہوتا ہے۔ چائے، قہوہ کوکو بھی بے حد پیدا ہوتا ہے نیز ہر قسم کے میوے اور پھل بھی یہاں بافراط ہیں۔ حیوانات کے لحاظ سے بھی یہ ملک قدرت کی فیاضی سے مالا مال ہے۔ چنانچہ جنگلی اور پالتو دونوں قسم کے جانور پائے جاتے ہیں۔ اور دریاؤں سے عمدہ قسم کی مچھلیاں بھی برآمد ہوتی ہیں۔

چاول یہاں کی خاص پیداوار ہے اور برآمد بھی بہت زیادہ ہوتا ہے۔ یہاں اگر کسی چیز کی کمی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ یہاں انگور کی بیل پروان نہیں چڑھتی چنانچہ انگور کی کاشت کرانے والے فرانسیسی ماہرین نے اس کے لئے بہت کوشش کی مگر تسلی بخش نتائج برآمد نہیں کر سکے۔

پھل اور اناج نیز حیوانات کی اسقدر افراط و فراوانی کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ جاپان کو اپنی نو آبادی بنا دینے کے لئے نہایت آسانی سے ایک وسیع اور زرخیز ملک مل گیا ہے جو نہایت آسانی سے اس کی بڑھتی ہوئی زائد آبادی کی پرورش کر سکے گا۔ جاپانی جزائر میں آبادی اسقدر بڑھ گئی ہے کہ وہاں اوسط اندازہ کے مطابق ہر مربع میل میں ساڑھے تین سو آدمی رہتے ہیں۔ مگر فرانسیسی ہند چینی میں ایک مربع میل میں اوسطاً سات آدمی رہتے ہیں گو ہند چینی کا رقبہ جاپان سے کم نہیں ہے مگر آبادی کے لحاظ سے اس کا چالیسواں حصہ بھی نہیں ہے۔

فرانسیسیوں کا تسلط

ہند چینی پر قدیم زمانے سے مختلف قبائل اور قومیں حملہ کرتی چلی آئی ہیں اور ان حملوں کے دوران میں یہاں متعدد مختلف قومیں آباد ہو گئی ہیں تو اب یہ پتہ چلانا مشکل ہو گیا ہے کہ یہاں کے اصلی باشندے کون ہیں۔ تاہم موجودہ آبادی پر ایک نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں کی آبادی کا ¾ حصہ انامی قوم پر مشتمل ہے۔ جو اس ملک میں ممتاز حیثیت رکھتی ہے اور عجیب و غریب شکل و شباہت کی مالک ہے۔ اس کے اکثر افراد کا قد ٹھگنا، لمبوترا چہرہ گول سر اور ناک چھوٹی ہوتی ہے۔ مرد و عورت دونوں ساٹن کا لباس پہنتے ہیں۔ ان میں دانتوں کو وارنش سے سیاہ کرنے کی عجیب و غریب عادت رائج ہے۔ یہ لوگ مغرور مگر محنتی ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ پکے جوئے باز بھی ہیں اور روزانہ ہونے والے معمولی واقعات پر شرطیں لگاتے رہتے ہیں۔

اس ملک سے فرانس کا ڈیڑھ سو برس سے تعلق رہا ہے پہلے پہل ایک فرانسیسی پادری اور مورخ نے یہاں کے لوگوں پر اپنا اثر و رسوخ اسقدر قائم کر لیا تھا کہ اس نے اس وقت کے کوچین چائنا کے بادشاہ کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ شاہ فرانس لوئی شانز دہم کو اس ملک میں وسیع اختیارات عطا کرے۔ چنانچہ اس وقت سے فرانس

نے یہاں کے معاملے کو بالکل پس پشت ڈال دیا۔ تاہم اہلِ فرانس کی دلچسپی اس ملک سے بدستور قائم رہی اور موقع پاکر انیسویں صدی کے آغاز میں اہلِ فرانس نے دوبارہ یہاں کے بادشاہ پر ڈورے ڈالنے شروع کئے۔ اس ملک کی رعایا اور بادشاہ حکومت چین کے تسلط سے اسقدر تنگ آ گئے تھے کہ بادشاہ نے چین کی غلامی پر اہلِ فرانس کی پشت پناہی کو ترجیح دی اور اس طریقے سے فرانس کا سیاسی اقتدار اس ملک میں قائم ہو گیا۔

فرانس کے اس سیاسی اقتدار کو ہند چینی کے باشندے کسی حد تک برداشت کرتے رہے مگر جب فرانس اور سپین کے عیسائی مبلغوں اور مشنریوں نے یہاں آکر دیسی باشندوں کو عیسائی بنانا شروع کیا تو ان کے مذہبی جذبات بھڑک اٹھے اور انہوں نے پچاس سے زیادہ مشنری پادریوں کو جو وہاں بھیجے گئے تھے۔ پانچ سال کی مدت میں قتل کر دیا۔ ان لوگوں نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انہوں نے ایسے کئی ہزار دیسی باشندوں کو بھی قتل کر دیا جنہوں نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے فرانس نے ہسپانیہ کی امداد سے یہ فیصلہ کیا کہ دہشت انگیزی کے اس دور کا مسلح طاقت سے خاتمہ کیا جائے۔ چنانچہ ایک بڑی فوج ہند چینی میں بھیجی گئی۔ مگر ہند چینی کے باشندوں نے بہادری کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا۔ ان لوگوں نے اہلِ فرانس کے مقابلے میں چین کی مدد بھی حاصل کر لی تھی۔ اس وجہ سے یہ لڑائی کافی عرصہ تک جاری رہی۔ یہاں تک کہ آخر کار ۱۸۸۴ء میں فرانسیسی سپاہیوں نے چینیوں کو فوچو اور سونٹے کے مقام پر شکست دی۔ اس کے بعد فرانس اور ہند چینی کے درمیان چند معاہدات ہوئے جن کی رو سے اس ملک میں فرانس کا حق ملکیت تسلیم کر لیا گیا۔

دستوری حکومت

ہند چینی پر مکمل قبضہ کر لینے کے بعد فرانس نے اس ملک کو نئے قسم کے دستور کے مطابق منظم کرنا شروع کیا مگر اس میں کئی دقتیں پیش آئیں۔ کیونکہ یہاں مختلف قسم کی قومیں آباد تھیں اور ان کے ضابطہ و قوانین بھی مختلف قسم کے تھے۔ بہرحال یہاں دستوری حکومت کے مختلف تجربے کئے گئے۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۷ء میں ایک آخری دستورِ حکومت تیار کیا گیا۔ جس کے مطابق حکومت کی ایک نئی کونسل بنائی گئی جس میں پینتیس ۳۵ فرانسیسی ممبر اور ۲۵ دیسی باشندوں کے نمائندے شامل تھے۔ مسٹر پاسکیئر کو گورنر جنرل بنایا گیا جن کی امداد کے لئے ایک سیکرٹری جنرل بھی مقرر کیا گیا۔ یہاں کے گورنر جنرل کو بھی وسیع اختیارات حاصل ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ شاہ باؤڈائی کو بھی جو ۲۳ سال کے ہیں، فرانس نے شہنشاہ تسلیم کر رکھا ہے شہنشاہ موصوف کو حکومت فرانس کی طرف سے پیرس میں تعلیم دلائی گئی تھی۔

دنیا کے بدلتے ہوئے حالات کا اثر یہاں بھی محسوس ہو رہا ہے اور آزادی و قومیت کے نعرے بھی بلند ہو رہے ہیں۔ یہاں کے قلیوں اور مزدوروں کو بھی اپنی پست حالت کا احساس ہو رہا ہے اور وہ اپنے آپ کو منظم کر رہے ہیں۔ مگر ہندوستان کی تحریکات کی طرح یہاں کی تحریکات کی رفتار بھی بہت سست ہے۔ تاہم یہاں کے باشندے ملکی بچاؤ میں زیادہ سے زیادہ حصہ لینے کی کوشش کر رہے ہیں اور حکومت فرانس نے بھی دیسی باشندوں کی پچاس ہزار آدمیوں کی ایک فوج تیار کر دی ہے۔ اور گولہ بارود وغیرہ کے کارخانے بھی قائم ہو رہے ہیں۔ مگر اب یہ سب چیزیں جاپان کے استعماری مقاصد کے لئے استعمال ہوں گی۔

ہند چینی کی خواتین

یہاں کی عورتیں بہت مستعد اور محنتی ہیں۔ انہوں نے بھاری کاموں کو انجام دینے سے مردوں کو بے نیاز کر رکھا ہے۔ وہ اپنے کندھوں پر بانسوں سے ٹوکریاں باندھ کر تمام سامان آسانی سے اٹھا کر لے جاتی ہیں اور وہ سامان جو گدھوں یا چھکڑوں پر لاد کر لیجایا جاتا ہے یہ اپنے کندھوں پر اٹھا کر لیجاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس ملک میں باربردار گدھے اور چھکڑے نظر نہیں آتے کھیتی باڑی کا کام بھی عورتیں کرتی ہیں۔ مرد گھروں میں رہ کر امورِ خانہ داری انجام دیتے ہیں اور کپڑے سینے

ہیں۔ اس لحاظ سے یہ وہ ملک ہے جہاں مرد عورتوں کے کام کرتے ہیں اور عورتیں مردوں کی محنت و مشقت کا کام سرانجام دیتی ہیں۔

پُراسرار ملک

یہ ملک اسقدر اہمیت رکھنے کے باوجود ابھی تک غیر ملکیوں کے لئے پُراسرار بنا ہوا ہے۔ حکومت فرانس اپنی نوآبادیات و مقبوضات کے انتظام میں اسقدر رازداری سے کام لیتی ہے کہ اجنبی سیاحوں اور اخباری نامہ نگاروں کو پوری طرح سیاحت کرنے کا موقع نہیں دیا جاتا — خاص کر ہند چینی کا ملک تو سیاحوں کے لئے ایک معمّا ہوا ہے کیونکہ انہیں یہاں آنے پر کافی سہولتیں بہم نہیں پہنچائی جاتیں۔ یہاں تک کہ اگر کوئی فرانسیسی بھی معقول سرمایہ کے بغیر یہاں آباد ہونا چاہے تو اس کی بھی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی —— غیر ملکی سیاحوں کو یہ کہہ کر ٹال دیا جاتا ہے کہ یہاں کی مکمل سیاحت ناقابل عمل ہے۔ کیونکہ یہاں سفر اور آمد و رفت کی سہولتیں زیادہ نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں کوئی دلچسپ اور قابل دید منظر بھی نہیں۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ملک بہت دلچسپ ہے یہاں سیر و سیاحت میں بیشک کئی دقتیں پیش آتی ہیں۔ لیکن اگر کوئی ان مشکلات پر قابو پالے اور یہاں کے موجودہ باشندوں کا صحیح مطالعہ کرنے کا عزم بالجزم کرے تو اسے بے شمار دلچسپیاں نظر آئیں گی۔ یہ ملک قدرت کے ہر قسم کے رنگین نظاروں سے مالا مال ہے اور مشرقی ممالک میں اس ملک سے بہتر قدرتی نظارے مشکل سے دکھائی دیں گے۔ نیز یہاں کی عجیب و غریب شکل و صورت کے باشندے اور ان کی عجیب و غریب عادات، طرز معاشرت، رسم و رواج اور توہمات اس ملک کے سیاحوں کی معلومات میں دلچسپ اضافہ کریں گے۔ مغربی سیاحوں کے لئے یہاں سال کی گرمی کے نو مہینے برداشت کرنے ذرا دشوار معلوم ہوں گے۔ مگر جو تفریح اور معلومات حاصل ہوں گی وہ ان تکالیف کو بھلا دیں گی۔

اعتبارات

سنو کہ رودادِ یاس و حسرت نئی زباں میں سنا رہا ہوں

اعتبار الملک حضرت دل شاہجہانپوری

مآلِ حرماں پہ ہیں نگاہیں قلق میں بھی مسکرا رہا ہوں
وہ میں کہ ہنگامِ جوشِ گریہ تمام عالم پہ چھا رہا ہوں

قدم قدم پر بہارِ تازہ نشاطِ تازہ حیاتِ تازہ
رہِ محبت کی لغزشوں میں سکونِ خاطر بھی پا رہا ہوں

ٹپک رہے ہیں جو اشکِ حسرت انہی میں ہے خونِ دل بھی شامل
مرقعِ عشق کو انہیں سے کچھ اور رنگیں بنا رہا ہوں

فلک سے ٹکرا کے میرے نالے فضائے عالم میں گونجتے ہیں
جو کہہ رہا ہوں وہ سن رہا ہوں جو سن چکا ہوں سنا رہا ہوں

مری تمنا وہ دائرہ ہے نہ جس کا اول نہ جس کا آخر
کہ جن حدوں سے گزر چکا تھا انہی حدوں میں پھر آ رہا ہوں

جو نا شناسِ وفا ہیں اب تک وہ کاش ادھر التفات کرتے
قلق کی دھن میں فغاں کی لے میں نئے نئے گیت گا رہا ہوں

سمجھ چکا ہوں ہے رازِ ہستی رہِ نشیب و فرازِ ہستی
جہاں کی ہر شے میں تھا تغیر ابھی وہیں سے میں آ رہا ہوں

یہ کون جانے یہ کون سمجھے نظر میں ہے کون سی تجلی
کہ آج ہر انجمن کی شمعیں جلا رہا ہوں بجھا رہا ہوں

مری نظر شرحِ داستاں ہے مری خموشی بھی اک بیاں ہے
سنو کہ رودادِ یاس و حسرت نئی زباں میں سنا رہا ہوں

بہار میرے لئے یہی ہے قفس میں کھینچی شبیہِ گلشن
پٹک کے سر تیلیوں سے پیہم نئے نئے گل کھلا رہا ہوں

کہاں؟ کچھ اسکی خبر نہیں ہے۔ کدھر؟ اس کا نشاں نہیں ہے
نفس نفس سے ہے یہ نمایاں کہ میں بہت دور جا رہا ہوں

نگاہ میں ہے نشانِ منزل خیال میں ہے جنوں کا حاصل
تمام عالم میں گھوم پھر کر اب ایک مرکز پہ آ رہا ہوں

کہاں وہ رنگینیٔ تبسم کہاں وہ رعنائیٔ تکلم
جو دن ہیں خواب و خیال اے دل انہی پہ آنسو بہا رہا ہوں

گُناہگار تارے

دلگداز افسانہ

از جناب سید شمیم غزمی

صندلیں بازو۔ گول پنڈلیاں۔ غزالی آنکھیں۔ بھرے بھرے رخساروں پر چھلکتا ہوا گلابی گلابی خون۔ رگ رگ میں شوخی۔

مشرق سے ایک بڑا سا تارہ ٹوٹ کر مغربی افق میں چھپ گیا اور پھر یکا یک شہاب ثاقب کی جھڑی سی لگ گئی۔ قطار در قطار چھوٹے بڑے تارے شراروں کی مانند آسمان کی وسیع آغوش میں رقص کرنے لگے۔ ننھی تارہ تالی بجاتی نکل کے بھاگی۔

"آہا اماں دیکھو کتنے سارے تارے ہیں"

پھر آسمان صاف ہو گیا۔ جھلملاتے ہوئے متبسم انجم اپنی اپنی جگہ خاموش ہو گئے۔ تارہ پھر اندر چلی گئی۔

"اماں یہ تارے بھاگ کیوں رہے تھے؟" ماں نے بیٹی کے معصومانہ انداز سوال پر اُس کا مُنہ چوم لیا۔

"بیٹی یہ گناہگار تارے ہیں۔ اللہ میاں انہیں مارنے دوڑتے ہیں تو یہ بھاگتے ہیں"

"گناہگار تارے" معصوم تارہ سہم کے رہ گئی۔ "اماں!" اور اُس نے ماں کے آنچل میں مُنہ چھپا لیا۔

کیسی حسین دُنیا تھی۔ سر سبز پہاڑ۔ سر سے پیر تک سبز پیڑوں اور رنگا رنگ حسین پہاڑی پھولوں سے لدا ہوا جس کی ہری گود میں بھورے بھورے رنگ کے چھوٹے چھوٹے جادے کوہستانی رگوں کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ دامنِ کوہ میں ایک حسین پہاڑی ندی زمردیں فرش پر مچل رہی تھی۔ دُور سے اُس کا تنگ پاٹ روشنی کی ایک باریک لکیر نظر آتا تھا جھلملاتا ہوا۔ بڑا پیارا۔ بڑا دلفریب! پہاڑ کے باوقار جمود اور خموشی میں اس کی دلکش راگنیاں ماحول کی رُوح تھیں۔

ندی سے چند سو فٹ کی بلندی پر خوبصورت، سدا بہار، پہاڑی کے درختوں کے جھنڈ میں جنگل کے محافظ کی جھونپڑی تھی۔ جس کے در و دیوار اور چھت سب کے سب حسین سفید اور گلابی ننھے ننھے پھولوں والی بیلوں سے ڈھنپے ہوئے تھے۔

پہاڑی لوگوں کا مختصر سا خاندان، باپ، ماں اور تارہ۔ دُنیا اور دُنیا کی شورشوں اور اس کے مکر و فریب سے بہت دُور قدرت کی حقیقی رنگینیوں میں فطری زندگی۔

چھوٹی سی تارہ۔ چھریرہ مضبوط جسم چُست و چالاک بدن گداز

دسمبر اور جنوری کے کڑکڑاتے جاڑے میں منچلے شکاریوں کے جھنڈ کے جھنڈ ندی کنارے اپنے چھوٹے چھوٹے خیمے ڈال دیتے۔ ننھے ننھے ڈونگے چاندی جیسی خاموش شفاف ندی کی گود میں گھومنے لگتے۔ موت کی سی مستقل خاموشی میں یہ چند مہینے زندگی کے خوشگوار لمحے تھے۔

ننھی تارہ بچپن سے ہر سال ان شکاریوں کو آتے جاتے دیکھتی اور جب یہ آتے تو نہ جانے اُسے کیوں اتنی خوشی ہوتی تھی۔ وہ سارا سارا دن ندی کے کنارے اِدھر سے اُدھر دوڑتی پھرتی۔ جہاں کوئی مرغابی پانی میں گری جھٹ ساڑی چڑھا کے پانی میں گھس جاتی تھی۔ برف جیسا سرد پانی۔ قیامت کی سردی۔ تند زہریلی ہوائیں سب دیکھتے رہ جاتے مگر تارہ ہنستی ہوئی زخمی مرغابیوں میں سے کسی کی ٹانگ اور کسی کے بازو پکڑے لاتی اور شکاریوں کے آگے ڈال کر پھر بھاگ جاتی تھی۔

مُدت گذر گئی۔ وقت کی صاعقہ رَوی نے دیکھتے ہی دیکھتے لہلہاتے ہوئے نونہال کی طفلانہ رگوں میں شباب کا خُون دوڑا دیا۔ پگلی سی جنگلی تارہ آن کی آن میں زندگی کے سب سے حسین دَور میں پہنچ گئی۔ اب وہ ایک الہڑ کوہستانی دوشیزہ تھی۔ شکاریوں کے پیچھے پیچھے دوڑنے والی اور نیم یخ بستہ ندی میں گھُس کے زخمی مُرغابیاں نکال لانے والی شوخ تارہ کو ماضی نے چھین لیا۔

اُس کی بے محابا کھلکھلاہٹ اور طفلانہ حرکتیں ماضی کی بھُولی ہوئی کہانیاں بن گئیں۔ وقت نے خود تارہ میں تبدیلی کا احساس پیدا کر دیا۔ اُس کی آنکھوں میں شرارت آمیز طفلانہ بیقراری کی بجائے اب معصوم سنجیدگی آگئی تھی لیکن اب بھی فطرت کی اس فردوسی خوابگاہ میں وہ بالکل تنہا اور اتنی ہی آزاد تھی جتنی پہلے۔

شکاری آتے۔ ڈونگے چلتے اور قیں قیں کرتی ہوئی، بازو شکستہ، خوں غلطیدہ، مُرغابیاں ندی کی گود میں چکرا

چکرا کے گرتیں اور خاموش ہو جاتیں۔

تارہ اب یہ سب کچھ ایک خوبصورت سی پگڈنڈی پر کھڑی ہو کر درختوں کے سہارے کھڑی دیکھتی یا کسی پہاڑی چٹان پر پیر لٹکا کے بیٹھ جاتی اور گھنٹوں بے رحم انسان کی بربریت کا یہ خونچکاں منظر خاموش نظروں سے دیکھا کرتی۔

حسین پھولوں کا دلربا موسم، زمردیں وادیوں میں پھولوں کی شہزادیاں، موسم گل کے دلکش نغمے گانے لگیں۔ ہرے بھرے پہاڑ کا دامن مختلف النوع پھولوں سے بھر گیا۔ جیسے کسی سبز پوش عروس کی گود بھری گئی ہو!

ندی کے خاموش راگ، ملاح کے لڑکوں کے خوش نوا گانوں اور بنسری کی سامعہ نواز صداؤں کے ہم آہنگ ہو کے ایک نئی زندگی کے آغاز کا پتہ دینے لگے۔

شکاری آنا شروع ہو گئے۔

تارہ نے اپنی ساڑھی ٹھیک کی۔ چمکتا ہوا پیتل کا گگرا اٹھایا اور ہرنی جیسی مست سبک رفتار سے چلنے سے خطرناک پہاڑی راستے پر کمال بے خوفی سے نیچے اترنے لگی۔ بالکل ندی کنارے چوڑی چٹان کے نیچے پھولوں کے ایک کنج میں وہ ٹھیر گئی۔ ندی کے شفاف سینے پر دوڑتے ہوئے ڈونگے نکل جائیں تو وہ پانی بھر لے۔

مرغابیاں اڑیں اور ایک جوڑا علیحدہ ہٹا ان کے قریب پرواز کرنے لگا۔ تارہ دلچسپی سے انہیں دیکھنے لگی۔ گولی چلنے کی آواز آئی اور ایک پھڑ پھڑاتی ہوئی مرغابی ندی میں گر گئی۔ دوسری بےچینی سے اس کی طرف جھپٹی۔ پھر ایک اور گولی چلی اور اس کا بازو بھی لٹک گیا۔

نجانے کیوں؟ تارہ کی دراز حسین انگلیاں گگرے سے کھیلتے کھیلتے رک گئیں۔ ندی میں گرتے ہی زخمی پرندے گردن اٹھا کے ایک دوسرے کی طرف دوڑے۔ شاید گلے ملنے! تارہ نے دیکھا۔ سامنے سے ایک مضبوط سڈول جسم کا سانولا سا پہاڑی لڑکا پانی میں کودا۔ وہ بےچین ہو گئی۔ گگرا رکھ۔ ساڑی چڑھا دیوانہ وار ندی میں گھس گئی۔ نمعلوم بچپن میں وہ اسی ندی سے کتنی زخمی مرغابیاں خود اپنے ہاتھوں سے پکڑ پکڑ شکاریوں کے حوالے کر چکی تھی۔ لیکن آج اس جوڑے کی بیتابانہ محبت نے اسکے دل میں رحم کے بے پناہ جذبات بیدار کر دیئے۔ اس نے جھپٹ کے جوڑے کو پکڑ لیا اور تیز تیز ہاتھ مارتی کنارے آ گئی۔ لڑکے نے دیکھا اور چیختا ہوا اس کی طرف بڑھا۔

"ارے او لڑکی۔ انہیں کہاں لئے جاتی ہے؟ یہ تو ہمارے صاحب نے ماری ہیں"

بھیگی ہوئی ساڑی بھرے بھرے طاؤسی جسم پر چمٹ کے رہ گئی۔ پیارا پیارا پیازی رنگ اور اس کے نیچے دوڑتی ہوئی سبز سبز رگیں سب جھلکنے لگیں۔ ساڑی نچوڑنے بھی نہ پائی تھی کہ لڑکا آدھمکا۔

تارہ نے گھبرا کے زخمی پرندوں کو اپنے گداز سینے سے چمٹا لیا۔ ایک کے بازو اور دوسرے کی گردن سے گرم گرم خون کے موٹے موٹے قطرے ٹپک کے تمام ساڑی پر نالیوں کی صورت میں دوڑنے لگے۔ تارہ سینے سے پیروں تک خون میں نہا گئی۔

"لاؤ مرغابیاں" لڑکا پاس آ گیا۔

تارہ شرم کے مارے بھاگ کے ایک کنج میں چھپ گئی۔ اور وہ اجاڑ پہاڑی ادھر بھی لپکا۔

"ارے کہیں بھلے مانسوں میں بھی رہا ہے" اب کی تارہ نے ڈانٹ بتائی "کہاں بڑھا چلا آتا ہے" وہ ٹھٹک گیا۔

"مرغابیاں؟"

بڑی بڑی غزالی آنکھیں۔ پاک اور معصوم۔ دو تین بار جلدی جلدی پلکیں جھپکا کے تارہ اپنی جھونپڑی کی طرف بھاگ گئی۔

"مرغابیاں!" بیچارا نوجوان ملاح اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ وہ حیرت سے اس معصوم آنکھوں والی رحم کی دیوی کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

"کتنی تُند ہے پھر کتنی دیالو" کوہستان کی ملکہ غریب پہاڑی نوجوان کے پرسکون جذبات میں ایک تلاطم اٹھا کے چلی گئی۔

مرغابیوں کو لینے کے لئے بڑھا ہوا ہاتھ، بڑھا کا بڑھا رہ گیا۔

دوسری صبح کچھ خنکی زیادہ تھی اس لئے بہت سے شکاری ابھی خیموں ہی میں تھے۔ تارہ اپنا گگرا لئے سنبھلتی سنبھلتی ندی کے کنارے جا پہنچی۔ دور کوئی نغمہ نواز بنسری پر محبت کا کوئی گیت گا رہا تھا۔ بڑا دلکش راگ تھا۔ پھر یکایک آواز رک گئی۔ تارہ نے پانی بھرتے بھرتے سر اٹھا کے دیکھا۔ بڑے سرو الا پہاڑی جوان خالی ناؤ کو تیزی سے کھیتا ہوا اس کی طرف آ رہا تھا۔ سفینہ پاس آ گیا کل والا ملاح کا لونڈا تھا۔ تارہ اسے دیکھ کے ہنسنے لگی وہ آگے بڑھ

"یہ بنسری کون بجا رہا تھا؟" تارہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا

"تم؟"

"ہاں!" تارہ کو ہنستے دیکھ کے اس کی بھی کھیسیں نکل آئیں۔

"پھر رُک کیوں گئے؟"

"تمہیں آتا دیکھ کے" آہوئے صحرائی کی طرح وحشت زدہ پہاڑیے نے جلدی جلدی دو تین بار آنکھیں جھپکا کے اس کی طرف دیکھا۔

"بڑی اچھی بنسی بجاتے ہو" تارہ بولی۔

اپنی تعریف سُن کے غریب چھوکرے کی باچھیں پھیل کے کانوں تک پہنچ گئیں "ہاں"

اس "ہاں" پر تارہ کھلکھلا پڑی۔ پھر بہت جلد دونوں بے تکلف ہو گئے۔

دونوں معصوم۔ دونوں جنگل کے خاموش باسی ایسی وادی میں پلے ہوئے بھولے بھالے دل جہاں جھوٹی تہذیب کے جھوٹے تکلف اور تصنع کی ہوا بھی نہیں پہنچی، نہ وہ یہ سوچ سکتے تھے نہ انہیں سوچنے کی ضرورت کہ ایسی بے تکلفی سے اُن کا باتیں کرنا کوئی اور معنی بھی پیدا کر سکتا ہے۔

تارہ سبھی ملاحوں اور ادھر سے گذرنے والے پہاڑی لکڑہاروں سے اتنی ہی بے تکلفی اور خوشدلی سے باتیں کر سکتی تھی جتنی اس اُبھرتے نوجوان سے۔ ہاں اگر اسے کچھ حجاب آتا تھا کچھ اجنبیت سی محسوس ہوتی تھی تو وہ صرف شہر سے آئے ہوئے اِن شکاریوں سے اور وہ بھی عمر کی اس منزل میں قدم رکھنے کے بعد۔

نمعلوم ان شہریوں کے دیکھنے کا انداز کیسا بُرا ہوتا ہے کہ بیچاری تارہ ان کی نگاہوں کو دیکھتے ہی خود بخود شرما سی جاتی تھی۔ نجانے وہ اس طرح گھور گھور کے اُسے کیوں دیکھتے ہیں؟

شہریوں کی نظروں کا انوکھا پن غریب تارہ کیلئے ہمیشہ معمہ رہا۔

یہ معلوم کرنے میں دیر نہ لگی کہ پہاڑی نوجوان دارجیلنگ کا رہنے والا ہے۔ گرمیوں میں وہ اور اس کا باپ رکھشا کھینچتے ہیں۔ خوب کمائی ہوتی ہے۔ صاحب لوگوں اور کبھی کبھی میم صاحبوں سے انعام بھی جھپٹ لیتے ہیں۔ "دھرم گڑھی" میں ایک خوبصورت سا چوبی مکان ہے۔ جہاں دو چار گائیں ہیں چھوٹی کو شیلا اور ماں انکی دیکھ بھال کرتی ہیں۔ گھی مکھن بناتی ہیں۔ سردیوں میں باپ "رام گڑھی" چلا جاتا ہے اور یہ کلکتہ اور آس پاس کے شہروں سے آئے ہوئے صاحب لوگوں کو ندی میں شکار کھلانے اپنا چھوٹا سا ڈونگا لیکے چلا آتا ہے۔

تارہ نے بہت دلچسپی سے سب باتیں سنیں۔ دارجیلنگ دیکھنے کا اسے بھی بچپن سے بہت شوق تھا اکثر مزدور پیشہ اور لکڑہارے جو ادھر آنکلتے تھے اُن سے اس نے بہت تعریف سُنی تھی۔ لیکن اُس کے باپ کو کبھی فرصت ہی نہ ہوتی۔ وہ اس جنگل میں اکیلا ہی محافظ تھا اس سے کبھی چھٹی بھی نہ مل سکتی تھی۔ جب سے آنکھ کھولی اسی پہاڑی پر یہ چھوٹا سا لکڑی کا گھروندا دیکھا اور بس۔

تارہ چلنے لگی۔ پھر یکایک اُس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"اوہو! میں تمہارا نام تو پوچھنا ہی بھول گئی۔ کبھی دارجیلنگ آنا ہوا تو بھلا تمہیں کیسے ڈھونڈھونگی۔ وہاں تو نجانے کتنے رکھشا والے ہونگے؟" پھر خوشی کے مارے اس کے دہانے پھیل گئے۔

"ارے وہاں تو ان گنت رکھشا والے ہیں۔ پر میرا نام یاد رکھنا۔ بڑے بازار میں جس کسی سے تارہ سنگھ کو پوچھو گی سب بتا دیں گے"۔

تارہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا نام بتایا تم نے؟"

"تارہ سنگھ!"

"ارے تارہ تو میرا نام بھی ہے"۔

"سچ!" تارہ سنگھ کے مُنہ سے بے اختیار نکل گیا۔

پھر تارہ کچھ سوچ کر بولی "چلو یہ تو بڑا اچھا ہوا۔ اب ہمیں ایک دُوسرے کا نام یاد رکھنے میں دقت نہ ہوگی"۔ دونوں خودبخود اس اتفاقیہ عجوبہ پر ہنسنے لگے۔

تارہ نے گگرا اُٹھایا اور ساڑی درست کرکے اپنے کولہے پر رکھ لیا۔ تارہ سنگھ نیچے کھڑا دیر تک اُس کے ننھے ننھے کنول جیسے پیروں کو تکتا رہا جو اس خوبصورت سے جادۂ کوہستانی پر بے شمار حسین نقوش چھوڑتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔

جاڑے کی سہانی رُت بیت گئی۔ گرمی آئی پھر جاڑا پھر گرمی۔ سال کروٹیں بدلتا رہا۔ تارہ اور تارہ سنگھ کی معصوم ملاقاتیں بڑھتی رہیں۔ بھولی تارہ دارجیلنگ دیکھنے کی کتنی مشتاق تھی! تنہائی کے نجانے کتنے طویل لمحے انہی حسین تصورات میں کٹ جاتے تھے وہ دارجیلنگ جائے گی۔

دُور دراز دارجیلنگ کی برف پوش بلند چوٹیوں سے برف پگھلنے لگی۔ ناگن ندی پانی کی جوش فراوانی سے بل کھانے لگی۔ چھوٹی چھوٹی کئی خوبصورت کشتیاں جو کاغذ کے پھولوں اور سگریٹ کے خالی ڈبوں کی رُوپہلی پنیاں چپکا چپکا کے سجائی

گئی تھیں سیلابی ندی کا پُشت کو چُھلتی آ کے ٹھہر گئیں۔ چند ہنس کچھ چھوٹے بڑے پہاڑ سی آ کے تارہ کو مانگ لے گئے۔ ننھی سی پہاڑی جھونپڑی میں تارہ کی پیدائش کے بعد پہلی بار ایک چھوٹی سی تقریب ہوئی۔

تارہ اور تارہ سنگھ کی منگنی ہو گئی۔

اب تارہ کبھی نہ کبھی ضرور دارجیلنگ جائیگی۔ وہ دل ہی دل میں من مانے منصوبے باندھ رہی تھی۔ بڑی خوش بڑی مگن۔

وہ تارہ سنگھ سے اور بھی قریب ہو گئی تھی اُس اُجڈ سے پہاڑی چھوکرے سے جس کی زندگی کا ہر ہر لمحہ خوش آئند مستقبل کی خیالی تعمیر میں گذر رہا تھا۔

"کیسا بھاگوان ہے کہ اُسے ایسی سُندر سی دیوی مل رہی ہے"۔ تارہ اُس کے تخیل میں گررانی (ملکۂ کوہستان) کے رُوپ میں بس چکی تھی۔

اس مرتبہ برفباری کی شدّت کے سبب دارجیلنگ کی شرقی شاہراہ بالکل مسدُود ہو گئی۔ میدان سے آنیوالے سیاحوں اور شکاریوں کے لئے ندی تک پہنچنے کا صرف یہی نزدیک کا ایک راستہ تھا۔ اِس لئے شکاریوں نے دوسری ندیوں اور جھیلوں کا رُخ کر لیا۔ تارہ بھی یہ جانتی تھی۔ غریب دل مسوس کے رہ گئی۔ سال کا لمحہ لمحہ گِن کے وہ اس دلفریب موسم کی آمد کا انتظار کرتی رہتی تھی۔ مگر اب کیا کرے؟ حسین پھولوں سے لدی ہوئی وادیاں جھومتے ہوئے قد آور اشجار سبھی پر ایک خاموش اُداسی تھی۔ البتہ مُرغابیاں تھیں کہ ٹوٹی پڑتی تھیں۔ آس پاس کی جھیلوں اور ندیوں کے یخ بستہ ہو جانیکے سبب ابکی یہ بھی بڑی کثرت سے آئی تھیں۔

آخر جنوری بھی آدھا گذر گیا۔ تارہ کا دل نا امیدی کے صدمے سے مُرجھا کے رہ گیا۔ کہ یکا یک ایک صبح مُرغابیوں کا شور سُنائی دیا پھر بندوق کی آواز۔ تارہ دیوانہ وار دوڑتی ہوئی باہر نکل آئی۔ ایک چھوٹا سا سُبک ڈونگا پر پھیلائے راج ہنس کی مانند ندی کے سینے پر لوٹ رہا تھا۔ اور صرف ایک ننھا سا اسفید خیمہ کنارے پر ایستادہ تھا۔ تارہ خوشی کے مارے دیوانی ہو گئی۔ تارہ سنگھ آ گیا۔ یہ اسی کا ڈونگا تھا اور یہ خیمہ کمار راجہ دلیش پور کا۔

سارا دن تو مالک کے ساتھ پھرا کیا۔ پھر دن ڈھلتے تارہ سنگھ اپنے ہونیوالے ساس سُسر کو سلام کرنے آیا۔ تھوڑی دیر ٹھہر کے چلا گیا۔

ساری رات تارہ خوشی کے مارے سوئی نہیں۔ صبح سُورج نکلتے ہی نکلتے وہ گنگراتے ندی پر جا پہنچی۔ راجہ جی بندوق لئے ڈونگی میں بیٹھے تھے۔ تارہ سنگھ کھیتے رہا تھا۔

تارہ کی لمبی لمبی انگلیوں کی نرم نرم ضرب سے گگرا ابھی "مزمار" بنا ہوا تھا۔ وہ متبسم نظروں سے ڈونگے کی طرف تکتی رہی۔ ڈونگا نزدیک آ گیا۔

تارہ نے دیکھا کہ راجہ جی بُری طرح اُسے گھُور رہے ہیں۔ نجانے کیوں؟ وہ خود بخود عرق عرق ہو گئی۔ پھر جلدی سے پانی بھر تیز تیز قدموں سے لوٹ آئی۔

راجہ جی نے مُسکرا کے تارہ سنگھ کو دیکھا "یہی چھوکری تیری تارہ ہے؟"

تارہ سنگھ نے شرماتے ہوئے انداز سے سر ہلا دیا۔

"بڑی سُندر ہے!" راجہ جی کچھ سوچنے لگے۔ اور تارہ سنگھ اپنی دیوی کی تعریف سُن کے کھِل اُٹھا۔

"کبھی تم اسے اپنے ڈونگے کی سیر نہیں کراتے؟" تارہ سنگھ کو جیسے کوئی بھُولی بات یاد آ گئی "ہاں سرکار ابکی گھماؤں گا"

"ہاں ضرور گھماؤ بلکہ اپنے خیمہ میں اس کی دعوت بھی کرو!" راجہ جی نے فیاضانہ انداز سے کہا۔

تارہ سنگھ کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ وہ راجہ صاحب کی اِس قدر فراخ حوصلگی اور مہربانی کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ "بڑے دیالو ہیں سرکار۔ بالکل دیوتا!"

ڈونگا آہستہ آہستہ بہتا کنارے آ لگا!

ننھے ننھے بیشمار مہ پارے آسمان کی گود میں بیٹھے مسکرا رہے تھے۔ ہلکی ہلکی سرد ہوا پہاڑی پھُولوں کی بھینی بھینی خوشبو سے لدی ہوئی تھی۔ تارہ نے جھونپڑی سے نکل کے دیکھا۔ تارہ سنگھ کا ڈونگا ندی کی حسین موجوں میں کھیل رہا تھا۔ سہانا سماں چاندنی رات۔ تارہ نے دُزدیدہ نگاہوں سے جھونپڑی کو دیکھا پھر ایک شوخ ہرنی کی طرح دوڑتی نیچے اُتر گئی۔

تارہ سنگھ کے دہانے پھیل کے کانوں تک پہنچ گئے وہ چلا اُٹھا۔

"تارہ آج تمہیں ندی کی سیر کراؤں گا!"

شوخ تارہ مسکراتی ہوئی نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔

"اور جو ڈبو دیا تو؟"

"میں ڈوبنے دونگا؟" وہ بولا۔ "تمہیں بچانے کی خاطر تو جان تک دیدونگا تارہ!" اُس کا سینہ تن گیا۔

"چلو ایسے لفظ مُنہ سے نہ نکالو" تارہ اُس کے بھرے ہوئے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

تارہ سنگھ کا سینہ اور چوڑھ گیا۔ "کچھ جھوٹ تھوڑی کہتا ہوں"

تارہ اُس کا سہارا لیکے ڈگمگاتے ہوئے ڈونگے میں اُتر گئی۔

"اچھا اب آؤ پھر رات زیادہ ہو جائے گی۔"

چپوؤں کے مضراب نے سوتی ہوئی موجوں کے خاموش تاروں کو چھیڑ دیا۔ ہزاروں ننھی ننھی لہریں مچلنے لگیں۔ راگنیاں اُبل پڑیں دلکش و سحر زا۔

دونوں خاموش تھے۔ تارہ سنگھ بڑے جوش سے ناؤ کھے رہا تھا۔ اور تارہ؟ وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ شاید دارجیلنگ کی دلچسپ سیر کے متعلق۔ پھر یکایک وہ مسکرا دی۔

"کیوں جی تم ہمیں اپنے رکھشا میں بھی سیر کراؤ گے؟"

تارہ سنگھ جیسے چونک پڑا۔ "ارے تمہیں؟" وہ بولا۔ "تمہیں تو تارہ لاٹ صاحب کی بھی سواری چھوڑ کے سیر کراؤنگا۔ جب تم آؤگی تو دیکھ لینا کہ کیسا گھماتا ہوں۔ ایک ایک چیز دکھاؤں گا۔ ایک ایک بازار، ایک ایک جگہ۔"

تارہ پھر چُپ ہو گئی اس کے تخیل نے اُسے دوبارہ دارجیلنگ کی فردوسی پہاڑیوں میں پہنچا دیا جس کی آغوش میں وہ زندگی کا سب سے حسین دَور گذارنے کے خواب دیکھ رہی تھی۔ سُہانے اور دلچسپ خواب۔

درخشندہ انجم نے ایک جھرجھری لی۔ نجانے کیوں پھر یکایک آسمان پر ان گنت چنگاریاں ناچنے لگیں۔ تارہ نے سہم کے گود میں مُنہ چھپا لیا۔ تارہ سنگھ نے گھبرا کر اسے دیکھا۔

منتشر شہاب ثاقب چند ہی لمحوں میں مشرق کی اُفقی پہاڑیوں اور سربلند کالے کالے درختوں کے پیچھے غائب ہو گئے۔

"ارے تم ڈر گئیں تارہ" اس نے حیرت سے پوچھا۔

تارہ کی آنکھیں ابھی تک خوفزدہ سی تھیں۔

"یہ کتنا ہمکتا تارے تھے" تارہ سنگھ کی پُر استعجاب نظریں اُس کے پریدہ رنگ چہرے کو تکنے لگیں۔

مضطرب موجیں کروٹیں بدلتے بدلتے سو گئیں۔ ڈونگا کنارے آلگا۔ تارا سنگھ نے سہارا دیکے تارہ کو کنارے اُتار دیا۔ تارہ نے ڈری ڈری نظروں سے چاروں طرف دیکھا چھوٹا سا سفید خیمہ۔ خاموش رات۔ خوابیدہ ندی۔ خنک ہوا۔ اُسے پھریری آگئی۔

"مجھے تو بڑا ڈر سا لگ رہا ہے" تارہ سنگھ ہنس پڑا۔ "ہے نا آخر بچی!"

خیمہ میں ننھی سی مشعل جھلملا رہی تھی۔ باہر راجہ جی کھڑے تاروں کی طرف تک رہے تھے۔ تارہ نے انہیں دیکھا اور شرما کے ٹھٹک گئی۔

"آؤ نا تارہ" تارہ سنگھ نے محبت بھرے انداز میں اُس کا ہاتھ پکڑ کے کہا۔ "یہ تو ہمارے سرکار ہیں۔ بڑے نیک، بڑے مہربان، کوئی دیوتا بھی ایسا کیا ہو گا۔"

راجہ جی آگے بڑھ آئے۔

"تارہ سنگھ تارہ کو خیمہ میں لیجاؤ یہاں ٹھنڈ میں کہاں کھڑے ہو؟"

تارہ سنگھ کو یوں معلوم ہوا جیسے کسی نے اُسے زمین سے اُٹھا کر ساتویں آسمان پر بٹھا دیا ہو۔

"بجاتی ہے سرکار" اُس نے جھُکتے ہوئے مُنہ کو سکوڑتے ہوئے کہا پھر تارہ کے شانے پر ہلکی سی تھپکی دیتے ہوئے اُسے اندر پہنچا دیا۔

تارہ شرمائی شرمائی ایک کونے میں کھڑی ہو گئی۔ راجہ جی ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔

"اب ان کی کچھ خاطر بھی کرو گے یا ویسے ہی خالی خولی لوٹا دو گے؟"

تارہ سنگھ نے کچھ احسانمندانہ اور کچھ شرمائی ہوئی نظروں سے اُنہیں دیکھا اور سر جھکا دیا۔

"چائے تو کم از کم ضرور چاہیئے" راجہ صاحب بولے "بس باہر آگ سُلگا لو۔ لیکن بھئی ذرا خیمہ سے دُور۔ کہیں سب دھواں اندر ہی نہ بھر آئے۔"

عزت افزائی کے احساس سے تارہ سنگھ کا دل ہاتھ بھر بڑھ گیا۔

"مجال ہے سرکار" اور وہ مستعدی سے کیتلی لئے باہر چلا گیا۔

تارہ نے گھبرا کے اُس کی طرف دیکھا اور پھر سہم کے چاروں طرف خیمے میں۔ پھیکی پھیکی روشنی میں تارہ سنگھ کی دُور سے ایک جھلک دکھائی دی۔ خیمے سے بہت دُور درختوں کے جھنڈ میں وہ سیلی سیلی لکڑیاں جمع کئے سُلگانے میں منہمک تھا۔

تنہائی اور سکوتِ نیم شبی۔ کونے میں ٹمٹماتا ہوا لو یا ٹمٹماتے

ٹمٹماتے بجھ گیا۔ جیسے کوئی شکستہ دل ہمیشہ کیلئے قنوطیت کی عمیق گہرائیوں میں سو گیا ہو۔

معصیت کی فریب کاریاں مسکرانے لگیں۔ اہرمنی استبداد ہر چیز پر چھا گیا۔ اور تھوڑی دیر کے لئے ایسا معلوم ہوا کہ سسکتی ہوا ساکت ہو گئی۔ فطرت کے حلقوم شاید کسی آہنی پنجہ کی زبردست گرفت میں پھنس کے رہ گئے۔ لیکن پھر جلد ہی نیم مذبوح کائنات کی پھڑکتی ہوئی رگوں میں زندگی کا خون دوڑنے لگا۔

سانس نہیں بلکہ فطرت کے انقباضِ تنفس پر فریاد کناں جھٹکا!! کسی خوفناک راندہ اژدر کی پھنکار سے بھی کہیں زیادہ خوفناک

و آتشبار۔ ہوا پھر چلنے لگی پہلے سے بھی زیادہ تند و تیز۔

تن آور کالے کالے مہیب درختوں کے نیچے چھپ چھپ کے معصوم تارہ تیزی سے ندی کی طرف بڑھی چلی جا رہی تھی مسلی ہوئی ساڑی کے ایک کونے سے آنسوؤں کی نہ تھمنے والی جھڑی کو روکنے کی ناکام سعی کرتی ہوئی۔

ایک جھٹکا اور پھر فوراً ہی ڈونگا خاموش ندی کی گود میں بیچین نظر آنے لگا۔

آگ سلگ چکی تھی۔ تارہ سنگھ نے منہ موڑ کے دیکھا۔ ندی کے اس پار تارہ ڈونگے سے اتر رہی تھی۔ ہاں تارہ! تاروں کی ہلکی ہلکی روشنی میں تارہ سنگھ اپنی رانی کی صورت پہچان ہی گیا۔

"اچھا۔ مجھے دق کرنے کے لئے تارہ ڈونگا لے گئی"۔ تارہ سنگھ کے نزدیک یہ صرف تارہ کا ایک پُر لطف مذاق تھا۔

"اونہہ! میں تیر کے اسے لے آؤنگا"۔ وہ اس مذاق پر تارہ سے خفا نہیں تھا۔ البتہ ملال تھا تو تارہ کے بغیر کچھ کھائے پیئے چلے جانے کا۔

ساری رات وہ اپنی متاعِ دوشیزگی کی اس سفاکانہ لوٹ پر خون کے آنسو بہاتی رہی۔

نہ معلوم قدرت کو کیا منظور ہے؟ خوشیوں کا دلفریب مندر جس میں نہ جانے اس نے اپنی کتنی بیچین آرزوؤں اور پُر شباب ارمانوں کی حسین مورتیاں بنائی تھیں اور ان کی پوجا کر رہی تھی آج سب کے سب اسے گرتے نظر آنے لگے۔ اف بے رحم دنیا!!

پو پھٹی۔ کوٹھڑی کے بیرونی دریچے سے تارہ کی نگاہیں خود بخود بھٹک کے واپس آ گئیں۔ ہلکے ہلکے سحر کے دھندلکے میں ندی اپنی مسافت طے کر رہی تھی۔ ہر طرف سکوت او جمود طاری تھا۔ چھوٹا خیمہ اور ننھا ڈونگا دونوں اپنے مالکوں کے ساتھ جا چکے تھے۔ شاید پو پھٹنے سے بہت پہلے۔

گرما کی دلفریب سہانی صبح۔ خوش اور مگن جوان اور بوڑھے۔ بھڑکیلے لباس۔

چند سجی سجائی کشتیاں پھر ندی کنارے آ کے ٹھیر گئیں۔

سب خوش تھے۔ ہاں صرف تارہ!! وہ آج ان پانچ مہینوں میں سب سے زیادہ روئی۔ اتنا زیادہ جس سے زیادہ رونا ناممکن۔ اس کی آنکھیں سوج گئیں۔ کتنی کتنی دیر تک وہ تنہا اپنی کوٹھڑی میں بے ہوش پڑی رہی۔ لیکن ماں! وہ خود اپنے بیاہ میں اتنا روئی تھی کہ اس کے لئے تارہ کی دردناک ہچکیاں اور پیہم اشک کچھ زیادہ قابلِ التفات نہیں تھے۔

"سب لڑکیاں وداع کے وقت روتی ہیں"۔

بیاہ کے کام کاج میں رات ہو گئی۔ اب کل صبح تارہ رخصت ہو جائیگی، اپنے اس چھوٹے سے پیارے گھروندے سے نکل کر وہ دارجیلنگ کی پُر فضا وادیوں میں رہے گی۔ "دھرم گڑھی" کے خوبصورت سے چوبی مکان کی رانی بن کے۔

رات اور بیت گئی۔ سارے تارے آسمان پر جھلملانے لگے۔

ہوا کا ایک خنک جھونکا پھولوں کے نرم نرم جسموں میں گدگدی کرتا گزر گیا۔ نیم بیہوش تارہ نے بڑی مشکل سے اپنا سر اوپر اٹھایا۔ بجھی بجھی سی آنکھیں۔ پیلا چہرہ۔ یاس انگیز نظریں کوٹھڑی کے گوشے گوشے میں گھوم آئیں۔

یہ وہ جگہ ہے جہاں اس نے جنم لیا۔ پلی۔ بڑھی۔ جوان ہوئی۔ یہی وہ خوابگاہ ہے جہاں تارہ نے اپنے مستقبل کے بڑے بڑے خوشگوار خواب دیکھے۔ جہاں اس کے تخیل نے مضطرب آرزوؤں اور جوان ارمانوں کے بڑے بڑے رفیع اور عظیم الشان قصر تعمیر کئے۔ اور پھر جہاں کی مستقل خاموشی نے ہزار ہا غم انگیز سسکیوں کو چھپایا۔ جس کی سنگلاخ زمین نے اشکوں کے بے پناہ سیلاب جذب کر لئے اور جہاں کی تاریکی نے اس سرمایہ دارانہ بربریت اور درندانہ شقاوت کی پردہ داری کی جس کے لرزہ خیز اور وحشیانہ گناہ کے ناپاک بیج، جبر و استبداد کے ہاتھوں سے برد [illegible] معصومیت اور بے بسی کی مجبور آغوش میں بکھیر دیئے گئے [illegible] معصیت کا وہ

"فانۂ روئیدہ" سربلند نونہال تھا۔ تہِ خاک اصل گستر پیدہ۔

کمزور ٹانگیں۔ لڑکھڑاتے قدم۔ نقاہت کا پیکر بکھری ہوئی لٹیں۔ شمیم بیزِ نکہت بار "تارکِ پُرافشاں" میں سیندھ کی موٹی سی لکیر۔ گیسوئے پُرافشاں کے چھلکے ہوئے تارے متبسم و خنداں۔ جھلملتی ہوئی لال ساڑی جس کا آنچل نصف شانوں پر نصف زمین پر کشاں کشاں۔

تارہ بڑی دردناک نظروں سے اپنے عزیز مولد کو الوداع کہتی چلی گئی۔ کتنی حسرت تھی اُس کی نگاہوں میں، کتنا اضطراب، کتنی بے کسی!

بلندی کی طرف جانیوالے شکستہ سے خطرناک جادۂ کوہستانی پر وہ عجیب مجنونانہ انہماک سے دوڑتی چلی جارہی تھی اپنی پوری قوت سے۔ انجم کی چشمک زنی جارہی تھی۔ تارہ سنگھ کا دل کتنا بیچین تھا۔ وہ اپنی چھوٹی سی جھولداری سے نکل کے آسمان کی طرف تکنے لگا۔ شاید اپنی تارہ کو تاروں کی اس بھری محفل میں ڈھونڈ رہا تھا۔

"ارے تارہ۔ تارہ او تارہ" یکایک وہ دیوانوں کی طرح جھاڑیاں پھلانگتا۔ پتھروں میں اٹکتا، کانٹوں اور پودوں سے اُلجھتا دوڑا۔ سامنے کی پہاڑی پر تارہ سب سے خطرناک راستے پر بھاگی جارہی تھی، آبشار والی گھاٹی کی طرف۔ اُف! نتیجہ کے خیال سے تارہ سنگھ کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

"ارے تارہ او تارہ پگلی ہوئی ہے کیا؟ کہاں جارہی ہے؟"

لیکن تارہ قسمت کی پکار سن رہی تھی۔ اُس کے کان دُنیا کی ہر صدا کے لئے بہرے ہوچکے تھے۔ تارہ سنگھ پاس پہنچ گیا۔ لیکن اُف تارہ موت کی بھیانک وادی کے خوفناک دہانے سے کتنا قریب تھی تارہ سنگھ لرز گیا۔ وہ لپکا کہ ساری کائنات خیرہ ہوگئی آسمان اور فضا میں بیشمار شہاب ثاقب رقص کرنے لگے۔ چھوٹے بڑے لاتعداد دونوں سہم کے ٹھٹک گئے۔ زندگی میں پہلی بار تارے ٹوٹتے دیکھ کے تارہ سنگھ کا دل دہل گیا۔

"اُف گناہگار تارے!"

تارہ تیورا کے گری۔ وادی کی آغوش وا ہوگئی۔ پہاڑ کی بیٹی پہاڑی ماں کی گود میں چلی گئی۔ دلہن وادی پر جھومتے ہوئے ایک خاردار مضبوط پودے نے اپنے ہاتھ پھیلا دیئے پھول سا جسم کانٹوں کے تشنہ لبوں میں خون کے چند قطرے ٹپکاتا وادی کی اندھیری گود میں گم ہوگیا۔

تارہ سنگھ نے گھبرا کے ہاتھ بڑھا دیئے۔ ٹوٹے ہوئے تاروں کا ڈونگا برس پڑا۔ صلابت انجم سے وادی کی انتہائی گہرائیاں بھی منور ہوگئیں۔ تارہ سنگھ ہاتھ پھیلائے اپنی رانی کا دامن پکڑنے دوڑا! اور مادرِ کوہستان نے دُولھا کو بھی اپنی آغوش میں کھینچ لیا۔

ہزاروں فٹ کی عمیق وادی میں کوہستانی عروس اور اُس کے کوہستانی محبوب نوشہ کی زندگی کی سب سے بیچین خواہش پوری ہوگئی۔

حجلۂ گور میں سامان عروسی ہوگا
نعش آرام سے سوئے گی سہاگن بنکر

ہوا کے جھونکوں سے کانٹوں میں اُلجھی ہوئی ساڑی کی دھجیاں اُڑ اُڑ کے ہوا کو معطر و معنبر کرنے لگیں۔ سہاگ کا جوڑا تارہ کے جسم کا ساتھ نہ دے سکا! دُنیا کو دکھانے کے لئے کہ وہ حرماں نصیب تارہ کا لباس عروسی ہے اور دُنیا سمجھ جاتے کہ یہی وادی دو معصوم تاروں کا گل پوش مزار ہے۔

(طبعزاد)



بلوچی تاریخ

عظیم الشان بلوچ قوم کا ادبی سرمایہ جتنا فارسی زبان اور مغربی زبان میں موجود ہے۔ اس سے بلوچ قوم بے خبر ہے۔ اسی طرح اُن کے تاریخی سرمایہ سے بڑی حد تک دنیا بے خبر ہے۔ اس قسم کی خامیوں کے لئے بلوچ قوم ذمہ دار ہے۔ بلوچ قوم میں زیادہ تر ایسے نوجوان ہیں جو کالجوں اور یونیورسٹیوں کے پروردہ ہیں۔ اسی طرح نوابوں اور امیروں کی تعداد بھی کافی ہے۔ مگر قوم کی علمی زندگی کا دائرہ فقط انہی تک محدود ہے۔ بیسویں صدی کا دور تحقیق و ترقی کا زمانہ ہے۔ مگر قوم کی غفلت کا جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔

مصر میں فرعون کی لاش دستیاب ہوگئی، بابل، نینوا، ٹیکسلا اور موہنجودڑو میں تاریخی آثار مل گئے — مگر افسوس کہ ایک زندہ بلوچ قوم کی تاریخ کے اوراق پریشاں نہ مل سکے۔ حقیقت میں اس قوم نے اپنی تاریخ پر نظر ثانی نہیں کی۔ ورنہ یہ معاملہ اتنا دشوار نہ تھا۔

بلوچ قوم کی تعداد سرسری طور پر نصف کروڑ کے برابر ہے اور یہ تعداد عراقیوں، فلسطینیوں اور البانیہ والوں سے زیادہ ہے مگر ان کے پاس کافی علمی سرمایہ نہیں علی الخصوص علم تاریخ کے باب میں ان کا دائرۂ علم وسیع نہیں ہے ان کے آسمانِ فضیلت پر جو مورخین آفتاب و ماہتاب بن کر چمک رہے ہیں وہ دو ہندو صاحب ہیں۔ رائے بہادر ہتو رام اور لالہ جمعیت رائے۔ اوّل الذکر "بلوچی نامہ" کے مصنف ہیں اور پچھلے صاحب کی کاوش سے "بلوچستان پراونشل گزیٹیر" تیار ہوا۔

ایک بلوچی مُلّا صاحب اخوند محمد صدیق نے بھی "بلوچی نامہ" تیار کیا۔ ان کتابوں کی تصنیف ۱۸۸۰ء میں ہوئی۔ بیسویں صدی کے آغاز تک بلوچی قوم نے کوئی بھی نمایاں ترقی نہیں کی۔ البتہ پنجاب کے بلوچوں میں سے

ایک اہم ضرورت

از جناب مولائی شیدائی

علاقہ ڈیرہ غازی خاں کے شہر جام پور کے ایک باشندے سردار غلام رسول خاں قرائی سب جج امبالہ نے ایک چھوٹی سی کتاب "تاریخ بلوچستان" شائع کرائی۔ بس یہی کچھ سرمایہ ہے جس کا نام ہے "بلوچی تاریخ"۔ اب ضرورت ہے کہ مذکورہ مورخین کی تحقیقاتی نقاب کشائی کی جائے تاکہ ناظرین کو بلوچی ادبیات کے علاوہ بلوچی تاریخ کا پتہ بھی لگ سکے۔

اخوند صاحب خدا کے فضل و کرم سے واقدی کے ہم جلیس نظر آرہے ہیں۔ کتاب فارسی زبان میں ہے۔ ان کے بیانات محض افسانہ سازی پر مبنی ہیں۔ دستارِ فضیلت کے لئے اتنا کہنا کافی ہوگا کہ آپ اس فن میں لالہ ہتو رام کے امام ہیں!!!

لالہ ہتو رام سی۔ آئی۔ ای پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے عملدار تھے۔ انہوں نے جو کچھ سنا بطور رپورٹ کے درج کیا۔ سر سنڈیمن صاحب کو بلوچستان میں اچھا رسوخ حاصل تھا۔ لالہ صاحب ان کے مشیر تھے۔ اس لئے بلوچی نامہ میں جو بلوچی قبائل کے شجرے دئے ہیں وہ قابلِ تعریف ہیں۔ بلوچی نامہ پہلی مرتبہ ۱۸۹۱ء میں بمقام لاہور اردو زبان میں شائع ہوا۔ اس کا انگریزی ترجمہ مسٹر جے۔ ایم۔ سی ڈوئی J. M. C. Douie نے ۱۸۸۵ء میں کلکتہ سے شائع کرایا۔ چونکہ ۱۹۰۰ء کے شروع تک کوئی بلوچی تاریخ تصنیف نہیں ہوئی۔ اس لئے ۱۹۰۷ء میں بلوچی نامہ دوبارہ لاہور سے شائع ہوا۔ بلوچستان کا یہ شاہنامہ تھا۔ غلام رسول خاں مرحوم و مغفور کی کتاب "تاریخ بلوچیان" ایک مختصر باب ہے اور خصوصاً اس میں پنجاب کے بلوچوں کا ذکر ہے۔ پھر لطف یہ ہے کہ اس فن میں ان کے امام لالہ ہتو رام ہیں! ؎

شد پریشاں خوابِ من از کثرتِ تعبیرہا

مذکورہ کتابوں کے علاوہ بلوچی شاہی خاندان کے

متعلق ایک مختصر کتاب مولوی دین محمد ایڈیٹر لاہور نے سپیل گزشتہ نے سنہ ۱۹۳۲ء میں سر میر اعظم جان بہادر کی تاجپوشی کے موقعہ پر شائع کی۔ گویا یہ تاجپوشی اور امراء کے حالات پر مشتمل ہے۔ یہی حال انگریزی کتابوں کا ہے۔ بلوچستان کے متعلق انگریزی میں چند کتابیں ہیں۔ جن میں سے اکثر رپورٹیں اور انگریزی فوجی عملداروں کے سیاحت نامے ہیں۔ مثلاً ہنری پاٹنجر صاحب کا سیاحت نامہ

TRAVELS IN SIND AND BAL-UCHISTAN

سر سی۔ ایم منگگومگری کی کتاب "وانڈرنگس ان بلوچستان"

"WANDERINGS IN BALUCHISTAN"

ماسن کی رپورٹ وغیرہ۔ ان سب میں قابل تعریف کتاب "بلوچستان" از اے۔ ڈبلیو۔ ہیوس A. W. HUGHES ہے۔ چونکہ آپ رائل جیاگرافیکل سوسائٹی کے ممبر تھے اس لئے ان کی کتاب جغرافیکل نقطہ نظر سے بے نظیر ہے۔ مگر بدقسمتی سے ان کا تاریخی بیان محض رپورٹوں پر منحصر ہے۔ البتہ اس میں بعض بلوچی قبائل کے شجرے بھی درج ہیں۔

یورپین مستشرقین میں سے ڈوزی نے تاریخ اندلس پر ضخیم کتاب تصنیف کی، ڈار میسٹیٹر نے فارسی زبان کی قدامت پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر گستاؤلی بان نے عربی تہذیب کی خوبی پر قلم فرسائی کی، پروفیسر راولنسن Rawlinson نے بابل اور اشوریہ بلکہ ایشیائے کوچک کے آثار قدیمہ کا انکشاف کیا۔ ماسپیرو Maspero نے وادئ نیل کے کھنڈروں پر روشنی ڈالی اور سر جان مارشل نے وادئ سندھ کی قدامت ۵ ہزار برس قبل مسیح علیہ السلام تک قرار دی مگر بلوچستان کے متعلق کوئی موثر تحقیقات ابھی تک نہیں ہوئی۔ البتہ ایس۔ پی۔ فریئر S. P. Ferrier نے سیستان کا تھوڑا سا بیان اپنے سیاحت نامہ میں درج کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت تک بلوچستان کے متعلق کوئی قابل تعریف تاریخ شائع نہیں ہوئی۔

بلوچستان خالص کے علاوہ بر اعظم ایشیا میں اور بھی بہت سی بلوچی حکومتیں قائم تھیں۔ مثلاً سندھ کے تین ٹالپور خاندان۔ (۱) شہدادانی جن کا پایۂ تخت حیدرآباد سندھ تھا۔ (۲) مانکانی جن کا پایۂ تخت میرپور خاص تھا۔ (۳) سہرابانی ان کی ریاست خیرپور اب بھی سندھ میں موجود ہے۔ ان کے حالات شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ مرحوم نے "تاریخ سندھ" اور "تاریخ خیرپور" میں درج کئے ہیں۔ مرزا صاحب تاریخ بلوچستان سے اتنے واقف نہ تھے۔ اس لئے بعض خامیاں صاف طور پر نظر آتی ہیں۔ یا یہ سمجھنا چاہیئے کہ ایک قوم کے پاس فقط یہی سرمایہ ہے۔

اس وقت تک بلوچ قوم کے متعلق مورخین کے بیانات جداجدا ہیں۔ بعض کی نظر میں بلوچ ترک ایرانی ہیں۔ بعض ان کو سامی عرب کہتے ہیں۔ بعض ان کو تورانی۔ بعض محققین بعض ان کو ساک اور بلوچوں کے زبردست قبیلے براہوئی کو ڈراویڈین کہتے ہیں۔ پھر لطف یہ کہ خود بلوچوں کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ سید الشہداء امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کی اولاد ہیں۔ حالانکہ امیر حمزہ کی اولاد نہ تھی۔ چند دن ہوئے کراچی کے ایک اخبار میں ایک مولوی صاحب نے لکھا تھا کہ بلوچ راجپوت ہیں اور یہ واقعی کمال ہے۔ اس وقت علم تاریخ کا بڑا حصہ اردو زبان میں شائع ہو چکا ہے جو زیادہ تر عرب، عجم اور یونان و ہند سے متعلق ہے۔ غرض کاشغر سے لیکر قیروان و فیض تک اردو زبان میں تاریخی کتابیں مل سکتی ہیں۔ مگر افسوس! بلوچستان جو ایک اسلامی ریاست ہے اور بلوچ قوم جس کی تعداد نصف کروڑ ہے اس سنگلاخ و صحرائی خطہ کی ایک زندہ قوم کے متعلق کوئی مستند تاریخ اردو زبان میں شائع نہیں ہوئی۔ اگر انگریزی سیاحت ناموں اور مختلف تاریخی کتابوں سے بلوچی اقوام کے حالات ایک جگہ اکٹھے کر لئے جائیں تو یقیناً ایک عمدہ کتاب "تاریخ بلوچستان" کے نام سے تصنیف ہو سکتی ہے۔ مذکورہ بیان سے صاف ظاہر ہے کہ سنہ ۱۸۶۱ء سے لیکر سنہ ۱۹۲۱ء یعنی کامل ساٹھ برس میں کوئی بلوچی مستند تاریخ شائع نہیں ہوئی۔

ہمیشہ عالمگیر پڑھیئے

عورت کی ظاہری جوانی

عورت کی شروع جوانی میں ہی اگر اُس کا سینہ یعنی پستان ڈھیلے اور نرم ہو کر نیچے کو گرے ہوئے معلوم ہوں تو بہت بد صورتی کہلاتی ہے۔ ایسی عورت میں شباب کی کشش ختم ہو جاتی ہے۔ یہ خرابی عورت کے سینہ میں اس وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب وہ ہر سال بچوں کو دودھ پلانے پر مجبور ہو جاتی ہے یا کسی بیماری یا بداحتیاطی کے باعث بھی عورت کا سینہ (یعنی پستان) ڈھیلے ہو کر بد نما معلوم ہونے لگتے ہیں اور وہ عین جوانی میں ہی شباب کی کشش ختم کر بیٹھتی ہے

ایسی عورت پھر نوجوان لڑکی نظر آ سکتی ہے!

سائینس کی جدید کرشمہ سازی کی بدولت ایک ایسی بیش بہا دوا تیار ہوئی ہے جس کے استعمال سے عورت کے ڈھیلے اور نرم اور نیچے کو گرے ہوئے پستان دوبارہ گول اور سخت ہو کر عورت کو از سرِ نو جوان لڑکی کے روپ میں پیش کرنے لگتے ہیں۔ اور اس پر شباب کی رنگینیاں پھر اپنی بہار پھیلا دیتی ہیں یہ لگانے کی دوا ہے اور اس کا نام "برسیٹین" ہے۔ یہ وہی دوا ہے جس کی بدولت اب تک سینکڑوں عورتیں اپنے سینہ میں دوبارہ شباب کا رنگ بھر چکی ہیں اور اب وہ کافی عمر کے باوجود نوخیز لڑکیاں نظر آتی ہیں اس دوا کا سب سے زبردست ثبوت یہ ہے کہ اس کے ہر روز کا استعمال عورت کو ثابت کرتا رہتا ہے کہ کتنی جلدی اس کے سینہ میں دوبارہ اُبھار اور سختی پیدا ہو رہی ہے۔ جن عورتوں کو ضرورت ہو وہ

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ ۔ اے ۔ بی ۲۴۳ دہلی کے پتہ پر خط لکھ کر ایک شیشی "برسیٹین" بذریعہ وی۔ پی پارسل منگالیں ایک شیشی ایک عورت کو پوری طرح جوان لڑکی بنا دے گی اور اس کے سینہ کی یہ خرابیاں دور ہو کر مستقل اُبھار اور سختی پیدا کر دیگی۔ ایک شیشی "برسیٹین" کی قیمت چار روپے پندرہ آنے ہے۔ پارسل پر صرف سات آنے محصول لگے گا۔

نوٹ :۔ اگر کوئی بچہ عورت کی گود میں ہے۔ تب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ دوا بچہ کے دودھ پر کوئی اثر نہیں ڈالتی۔ اور بچہ نہایت اطمینان کے ساتھ دودھ پیتا رہیگا۔ کیونکہ دوا کسی حال میں نقصان نہیں کرتی۔

سوزاک کی دوا مل گئی

اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ چھ سال کی ریسرچ اور تلاش کے بعد سوزاک کے مرض کو ختم کرنے کیلئے جو دوا "کلوزول" کے نام سے تیار کر کے ملک کے سامنے پیش کی ہے۔ وہ سوزاک کے مرض کا نہایت معقول اور کامیاب علاج ہے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اس دوا نے ہزارہا سوزاک کے مریضوں کو تندرست کر دیا۔ صرف ایک شیشی "کلوزول" ایک مریض کے لئے کافی ہو جاتی ہے۔

متعدد پرانے اور نئے مریضوں پر تجربہ کرنے سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ "کلوزول" کا استعمال شروع کرنے کے ٹھیک تیسرے دن مریض خود بول اٹھتا ہے کہ دوا "کلوزول" سے اس نے نمایاں فائدہ حاصل کرنا شروع کر دیا ہے۔ پوری شیشی میں ایک مہینہ کی دوا ہوتی ہے جسے استعمال کرنے کے بعد مریض پوری طرح سوزاک سے نجات پا جاتا ہے۔ ملک میں ہماری یہ شاندار خدمت بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھی جا رہی ہے۔ کیونکہ بدقسمتی سے اس ملک میں سوزاک کا مرض وبا کی طرح پھیل گیا تھا۔ مگر اس بروقت امداد نے مریضوں کیلئے آبِ حیات کا کام کیا ہے۔ لہٰذا اس اعلان کے ذریعہ سوزاک کے تمام مریضوں کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ اگر انہیں سوزاک کی تکلیف ہے خواہ کتنے ہی عرصے سے ہے۔ انہیں چاہیئے کہ

مینیجر زنانہ دواخانہ ۔ اے ۔ بی ۲۴۳ دہلی کے پتہ پر خط لکھ کر دوا "کلوزول" کی ایک شیشی بذریعہ وی۔ پی پارسل منگالیں۔ اور استعمال شروع کر دیں۔ ٹھیک تیسرے دن وہ خود دیکھ لیں گے کہ سوزاک کا اصلی علاج "کلوزول" ہی ہے۔ جس کی ایک شیشی کی قیمت دو روپے نو آنے ہے۔ پارسل پر سات آنے محصول ڈاک لگے گا۔ امید ہے کہ ہندوستان اس ایجاد سے بہترین فائدہ حاصل کرے گا۔

تار کا پتہ :۔ "زنانہ دواخانہ" دہلی

ٹیلی فون نمبر ۲۲۶

موت

ٹیگور کی آخری نظم ۔۔۔ بستر مرگ سے

مترجمہ حضرت طالب باغپتی

پھر وہی غم کی اندھیری رات ظالم آگئی
غمکدے پر پھر مرے یکسر اُداسی چھا گئی

اس بھیانک رات کا ہتیار کہئے پُر خطر
صرف یہ منظر جو آتا ہے لگا ہوں کو نظر

خوف سے اُلجھی ہُوئی شکنیں جبینِ کرب پر
درد سے سُکڑے ہوئے ابرو ۔ حواس مُنتشر

اُف اندھیرے میں وہ اک تلوار لہراتی ہوئی
دہشت و اندوہ کی پرچھائیں تھراتی ہوئی

آنکھ نے باور کیا جب یہ طلسمِ خوفناک
ذہن نے پائی ہمیشہ اک شکستِ دردناک

یہ شکست و فتح کی بازی ہی ہستی کا فریب
ہر بلندی سے اُترتا ہے یہ گہرا نشیب

عہدِ طفلی میں کبھی آسیب کی صورت عیاں
ہر قدم پر اک مجسم طنز ، رنج جانستاں

جس طرح اک سلسلہ خوف و ہراس و یاس کا
ہو سیہ پردے کی صورت روح پر سایہ نما

ہاں وہ پردہ دستِ مشاقِ اجل خود ہی جسے
منتشر تاریکیوں کے جال سے ترتیب دے

برابر کی چوٹ

افسانہ

از جناب ظفر واسطی شاہ آبادی

پہلا خط

شریر بہن، خدا کرے تمہارے سر سے شرارت کا بھوت اُتر جائے!

محبت نامہ ——— نہیں مَیں اسے محبت نامہ تو نہیں کہہ سکتی شرارت نامہ تھا۔ پڑھ کر ہنسی بھی آئی اور غصہ بھی۔ کاش میرے پَر ہوتے اور میں اُڑ کر تمہارے پاس پہنچ سکتی تو تمہاری خوب خبر لیتی۔ کالے کوسوں دور بیٹھ کر تمہیں ایسی باتوں کا خیال آئیگا کیوں نہ ہو تمہیں مجھ سے بڑی محبت ہے نا۔ میری یاد تمہیں آٹھوں پہر ستاتی رہتی ہے۔ میری صورت ہر وقت تمہاری آنکھوں میں پھرتی رہتی ہے۔ درست ہے جس سے انسان کو محبت ہوتی ہے اُسی کا مضحکہ اُڑایا جاتا ہے جس کی یاد آٹھوں پہر ستاتی رہتی ہے اُسی کی مصیبتوں پر ہنسا جاتا ہے اور جس کی صورت ہر وقت آنکھوں میں پھرتی رہتی ہے اُس سے مشکل وقت میں آنکھیں پھیر لی جاتی ہیں۔ شاباش ہے آنسہ بہن شاباش۔ مجھے تم سے یہی امید تھی کہ تم ایسے آڑے وقت میں میرے پاس بھی نہ پھٹکو گی۔ تم اس قدر نازک وقت میں روپوش ہو جاؤ گی ——— یہ سب بہانے ہیں کہ انہیں چھٹی نہیں ملی۔ تمہارا دل آنے کو تڑپ رہا تھا مگر مجبوری تھی۔ کیوں آنسہ میں تم سے یہ پوچھتی ہوں کہ انہیں چھٹی نہیں مل سکی تو کیا تم بھی کہیں ملازم ہو۔ تمہیں بھی تمہارے پرنسپل نے چھٹی نہیں دی۔ یہ درست ہے کہ تمہیں بھائی اختر سے اجازت لینی تھی لیکن کیا یہ بھی درست ہے کہ تم نے اُن سے آنے کی اجازت طلب کی اور انہوں نے انکار کر دیا۔ نہیں میں یہ بات کبھی نہیں مان سکتی۔ اگر تم واقعی آنا چاہتیں تو اختر تمہیں ہرگز نہ روکتے۔ یوں کہو نا کہ اُن کے بغیر تمہارا ہی جی آنے کو نہ چاہتا تھا۔ تم چار پانچ دن کے لئے اُن سے جُدا ہونا گوارا نہ کرتی تھیں۔ آنسہ تم چھ مہینے میں کتنی زیادہ بدل گئیں۔ ذرا وہ وقت بھی تو یاد کرو جب مجھے دیکھے بغیر تمہیں چین نہ آتا تھا۔

آہ! تم مجھے کتنی یاد آتی رہیں۔ قلم کی طاقت نہیں کہ بیان کر سکے رخصتی کے وقت تو خاص طور پر تمہاری یاد ستم ڈھا رہی تھی۔ مگر تمہاری بلا سے ——— گو اور سہیلیاں میرے پاس بیٹھی تھیں لیکن میری آنکھیں تمہاری صورت ——— تمہاری موہنی موہنی اور دلآویز صورت دیکھنے کو ترس رہی تھیں اور میرے کان تمہاری باتیں ——— پیاری پیاری اور شرارت آمیز باتیں سُننے کے لئے بیتاب تھے لیکن تمہیں اس سے کیا؟

آج میں اپنے گھر آئی ہوں۔ شام کو پھر اُن کے یہاں چلی جاؤنگی۔ نجمہ، گلنار اور ریحانہ سب میرے پاس بیٹھیں تمہیں بُرا بھلا کہہ رہی ہیں کہ "پیا" کی محبت میں سب سہیلیوں کو بھول گئیں لیکن میں کچھ نہیں کہتی۔ میں ملاقات پر تم سے سمجھونگی۔

اہا کیسی بھولی اور سیدھی ہو۔ تمہیں تو کسی بات کی خبر ہی نہیں۔ خدا نہ کرے تم تو بالکل ایسی ہو جیسی باپ کے گھر سے ڈولے میں بیٹھ کر گئی تھیں۔

اُن کے مزاج کے متعلق میں ابھی کیا کہہ سکتی ہوں۔ درحقیقت دو تین دن میں آدمی کسی کے مزاج کو اچھی طرح سمجھ بھی نہیں سکتا خصوصاً جب شرم و حیا بھی غالب ہو! ہاں ہنس مکھ ہیں۔ ہر وقت مسکراتے رہتے ہیں۔ اور اُن کا یہ مسکرانا کالی گھٹاؤں میں بجلی کے چمکنے کے مرادف ہوتا ہے۔ تم مجھ سے اُن کی شکل و صورت کا حال کیوں پوچھتی ہو۔ کیا بھائی اختر کو چھوڑنے کا ارادہ ہے؟ پھر تمہیں کیا، کوئی کیسا ہی ہو تم اپنے خوبصورت شوہر سے دل بہلاتی رہو۔ اگر تم شادی سے بیس پچیس دن پہلے آجاتیں تو میں تمہاری منت اپنے والدین سے ایک ایسا کام کرا سکتی جس سے میری آیندہ زندگی خوشگوار بن جاتی لیکن تم تو اختر سے چار پانچ دن کے لئے بھی جُدا نہ ہو سکیں بیس پچیس دن کا تو ذکر ہی کیا ہے۔

اچھا ——— گذر خوبصورت شوہر والی کی بھی ہو جاتی ہے اور بدصورت شوہر والی کی بھی لیکن صورت تو کوئی چیز نہیں انسان کی سیرت اچھی ہونی چاہئے۔ اور ماشاء اللہ اُن کی سیرت اُن کی صورت سے بہت زیادہ "اچھی" ہے۔ خدا مجھے معاف کرے میں یہ کیا کہہ رہی ہوں۔ اگر سچی بات ظاہر کرنا گناہ ہے تو میں یقیناً گنہگار ہوں

اسے مجھے خوف ہے کہ میں آئندہ بھی شاید اس گناہ کا ارتکاب کرتی رہوں۔

پہلے اُن کے حُسن کی تعریف سنو۔ پچھلے سال جو افریقہ میں مردانہ حُسن کی نمائش ہوئی تھی تو تم نے سنا ہی ہوگا کہ تمہارے دولہا بھائی نے شرکت نہیں کی ورنہ پہلا انعام اُنہی کو ملتا۔ اندھیری راتوں میں وہ ایک گز کے فاصلے سے بھی نظر نہیں آسکتے۔ ہاں اگر رات زیادہ اندھیری نہ ہو تو اُن کا حُسن ضرور غمازی کرتا ہے۔ تم سمجھ گئیں کہ تمہارے دولہا بھائی کا حُسن کیسا ہے اور وہ کتنے حسین ہیں۔ اب سیرت کے متعلق سُنو۔ پہلے دن ہی اُنہوں نے عورتوں سے اپنی دوستی کی باتیں شروع کردیں میں ہرچند چاہتی تھی کہ وہ گفتگو کا موضوع بدل دیں لیکن وہ نہایت فخریہ انداز میں اپنی مہمات اور بہادریوں کے قصّے سُناتے رہے۔ خیر آنسہ تم یہ قصہ سنو تمہارے نازک دل پر اس کا بُرا اثر پڑیگا۔ تم شریف زادی ہو لیکن بالآخر میری پیاری سہیلی ہو۔ ان واقعات سے تمہیں مفت میں رنج پہنچیگا۔

ہاں کچھ اپنی سُناؤ۔ بھائی اختر راضی خوشی ہیں؟ اُن کا وہ زنانہ رسالہ نکالنے کا ارادہ کیا ہوا؟ تم جیسی مضمون نگار بیوی مل جانے پر بھی وہ خاموش ہیں۔ اُن سے کہہ کر جلدی سے رسالہ جاری کرادو۔ گو ہندوستان میں دو ایک اچھے رسالے موجود ہیں لیکن حقیقی معنوں میں عورتوں کی خدمت کرنے والا ایک بھی نہیں۔ سب کے مدِنظر تجارتی مفاد ہے لیکن ہم یہ کب کہتے ہیں کہ وہ تجارتی مفاد مدِنظر نہ رکھیں۔ کیونکہ بغیر اس کے گزارا مشکل ہے تاہم وہ اپنے اُن بلند بانگ دعاوی کو بھی تو پورا کریں جو اُنہوں نے رسالہ جاری کرتے وقت کئے تھے یا جو ہر نمبر میں کئے جاتے ہیں۔

دیکھو آنسہ تم میرا یہ خط بھائی اختر کو نہ دکھانا میں جانتی ہوں کہ تمہیں اُن سے بہت زیادہ محبت ہے۔ اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ جب تک تم اُنہیں اپنی ہر ایک بات نہیں بتادیتیں تمہیں کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ لیکن اگر تم اُنہیں یہ خط نہ دکھاؤ گی تو کیا اس سے محبت میں کمی آجائیگی؟ باقی رہا کھانا ہضم ہونے کا سوال تو جس روز تمہیں میرا خط ملے اُس دن تم کھانا ہی نہ کھانا۔ تم مسکرا رہی ہو آنسہ ——— وہ تم سے ضرور پوچھینگے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ خط اُنہیں ہرگز نہ دکھانا۔ ہاں زبانی مناسب باتیں بتادینا۔ اور اگر تم نے اُنہیں خط دکھا دیا۔ تو خواہ مجھے خبر نہ بھی ملے۔ لیکن تمہیں اس کی سزا ضرور ملیگی۔

دوسرا خط

پیاری بہن ——— اپنی دُکھیا سہیلی کا سلام قبول کرو۔

مجھے پہلے ہی یقین تھا کہ تم میرے خط سے بہت زیادہ متأثر ہوگی لیکن آنسہ اب پچھتائے کیا ہوت ——— ہندوستان میں لڑکی کی قسمت کے مالک اُس کے ماں باپ ہوتے ہیں وہ جس کے ہاتھ میں چاہیں اُس کا ہاتھ پکڑا دیتے ہیں لڑکی زبان نہیں کھول سکتی۔ اگر کوئی لڑکی کبھی جرأت سے کام لے کر زبان کھولتی بھی ہے تو بُری طرح ملعون کی جاتی ہے۔ خود اُس کے قریبی رشتہ دار اُسے بُری نظر سے دیکھنے لگ جاتے ہیں۔ اور بعض وقت جاہل والدین کو ضد ہو جاتی ہے اور وہ اُس کی شادی وہیں کرتے ہیں جہاں وہ انکار کردیتی ہے خیال تو کرو آنسہ والدین کا یہ رویّہ کہاں تک درست ہے۔ اور ہمارے مذہب نے اس کی کہاں تک اجازت دی ہے۔ اس سے تو کہیں بہتر ہے کہ پیدا ہوتے ہی لڑکی کا گلا گھونٹ دیا جائے۔ یہ کیا کہ اتنی مدت پالا پوسا ناز نخرے اُٹھائے اور جب وہ جوان ہوئی کسی ظالم کے پلّے باندھ دی کہ لو تم اسے خوب تڑپا تڑپا کر مارنا۔ ہم ہر روز دیکھتے ہیں کہ لڑکیاں شادی کے بعد کسی نہ کسی مرض میں مبتلا ہو جاتی ہیں اور وہ مرض اُن کی جان لے کر ہی ٹلتا ہے۔ اکثر کو دق ہو جاتی ہے۔ یہ سب امراض اچھا شوہر نہ ملنے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ وہ بے زبان خاموشی سے یہ سب مصیبتیں جھیلتی ہیں۔ اور آخر ایک دن قبر میں جا سوتی ہیں۔ شکیلہ ہی کو دیکھو ——— بیچاری نے کُڑھ کُڑھ کر اپنی جان پر بنالی۔ لیکن شکایت کا ایک حرف تک زبان پر نہیں لائی۔ سہیلیاں بھی پوچھتی ہیں تو خاموش ہو جاتی ہے کبھی شکایت نہیں کرتی بلکہ اُلٹی تعریفیں کرنے لگ جاتی ہے لیکن اُس کی صورت اور اُسکی آنکھیں صاف ظاہر کرتی ہیں کہ اس کا دل رو رہا ہے اس پر کوئی ایسی مصیبت پڑی ہے کہ جس کے متعلق یہ کسی سے نہیں کہہ سکتی۔ ایک روز میں نے بہت پوچھا تو رونے لگی۔ آنسہ اُسے روتا دیکھ کر میرے بھی آنسو بھر آئے۔ پھر اُس نے ایسی درد بھری باتیں سنائیں کہ میں بڑی دیر تک روتی رہی۔ اُس کے والدین نے جہاں تک ممکن ہوا اچھے اچھے حکیموں سے اُس کا علاج کرایا لیکن اصل مرض کی طرف کسی نے توجہ نہ کی۔ اور جو آگ اُس کے دل میں لگی تھی اُس نے اُس کے بدن کا تمام خون جلا کر خشک کردیا۔ اب اُس کا جسم چند ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا ہے اور کچھ دنوں میں یہ ڈھانچہ بھی نہ رہیگا۔

یہ درست ہے کہ والدین جو کچھ کرتے ہیں وہ اولاد کے فائدے ہی کے لئے کرتے ہیں لیکن وہ لڑکے کو اپنی نظر سے دیکھتے ہیں لڑکی کی نظر سے نہیں دیکھتے۔ اس کے علاوہ وہ ظاہری مالی اور خاندانی باتوں پر نظر رکھتے ہیں کسی اور بات کی چھان بین نہیں کرتے۔ اگر وہ اپنے انتخاب میں لڑکی کی رائے بھی شامل کر لیا کریں تو کتنی جانیں بچ جایا کریں کتنی زندگیاں بن جایا کریں اور کتنے بگڑے ہوئے نصیب سنور جایا کریں۔ وہ گھر جو لڑکیوں کے لئے دوزخ بن جایا کرتے ہیں کسی طرح بہشت سے کم نہیں نہ جانے میں تمہیں کیا لکھ گئی۔ یہ باتیں وعظوں میں کہنے کے لئے تو مناسب ہیں مگر پیاری سہیلی تیرے خط میں ان کا کیا کام لیکن اب ہمدردی اور رنج سے کیا فائدہ آنسہ؟ ——— گلے پڑا ڈھول بجانا ہی پڑتا ہے۔ تم اپنا دل کیوں کڑھاتی ہو۔ میری قسمت پھوٹنی تھی پھوٹ گئی۔ اس کے لئے تم غم نہ کھاؤ۔ تم اپنی راحت و انبساط کی محفل کو مکدر نہ کرو۔ لیکن اس رنج و غم میں بھی تم نے شرارت کا دامن نہیں چھوڑا کمبخت یہ لکھتے ہوئے تمہارے ہاتھ نہ ٹوٹ گئے کہ "آؤ شوہروں کا تبادلہ کر لیں۔ میں خوبصورت شوہر سے نالاں ہوں اور تم بدصورت شوہر سے پریشان معلوم ہوتی ہو"۔ جب تم اختر جیسے شوہر سے بھی نالاں ہو تو دنیا کے کسی شوہر سے خوش نہیں ہو سکتیں۔ تمہاری بدگمانیاں تمہیں پریشان کر رہی ہیں۔ اور اگر ان بدگمانیوں کا یہی عالم رہا تو وہ دن دور نہیں کہ تمہیں جینا اجیرن ہو جائیگا کیا تم یہ چاہتی ہو کہ جب اختر گھر سے نکلیں تو چہرے پر نقاب ڈال کر نکلیں تاکہ اُن پر کسی عورت کی نظر نہ پڑ سکے۔ کیا خوب میں نے مانا کہ وہ ماشاءاللہ بہت حسین ہیں لیکن اس کے ساتھ یہ بھی مان لینا کہ جو عورت اُنہیں دیکھ لیتی ہے اُن پر فریفتہ ہو جاتی ہے کہاں کی عقلمندی ہے۔ عورتیں یوں فریفتہ ہوتی نہیں پھرتیں۔ یہ امتیاز تو مردوں ہی کو حاصل ہے۔ دور کیوں جاؤ تم اپنی کہو۔ کیا آج تک اختر سے زیادہ خوبصورت مرد تمہاری نظر سے نہیں گزرا۔ پھر کیا تم اُس پر فریفتہ ہو گئیں ——— نہیں جس طرح تم خیال کرتی ہو کہ اختر سے اچھا مرد کوئی نہیں اسی طرح ہر نیک عورت یہی سمجھتی ہے کہ اُس کے شوہر سے بہتر مرد دنیا کے تختے پر نہیں صاف صاف ہی کیوں نہ کہوں کہ اُس کی نظر میں پھر اور کوئی نہیں جچتا۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ دنیا میں ہر طرح کی عورتیں موجود ہیں تو اس کے لئے پہلے تم اختر کی طرف سے تسلی کر لو۔ اور اتنے عرصہ میں تم یہ تو سمجھ ہی گئی ہو گی کہ وہ کس قسم کے آدمی ہیں۔ اگر خدا نہ کرے اُن کی اپنی نیت خراب ہے تو تمہیں کوئی حق نہیں کہ دوسروں کو بُرا بھلا کہو اور اگر اُن کی نیت میں خرابی نہیں تو کسی کی پرواہ نہ کرو۔ اختر تمہارے ہیں اور تمہارے ہی رہینگے۔

یہاں تو کوئی ایسا قلعی گر ہے نہیں جو آدمی پر قلعی کرتا ہو۔ لیکن اگر وہاں موجود ہو تو انہیں تمہارے پاس بھیجدوں قلعی کرا کر واپس بھیج دینا ——— اور ذرا ناک ٹیڑھی ہو گئی ہے اسے بھی ٹھیک کرا دینا۔ ایک بات میری سمجھ میں بھی آئی ہے۔ تم اختر کے گورے گورے رنگ سے پریشان ہو تو انہیں رنگوا کیوں نہیں لیتیں۔ وہاں تو بڑے اچھے اچھے رنگ ساز ہونگے۔ کوئی اپنی پسند کا رنگ رنگوا لو۔ لیکن خدا کے لئے کالا نہ رنگوانا اس سے تو یہی بہتر ہے کہ مجھ سے رنگا رنگوا یا لے لو۔

یہ خط میں سسرال کے یہاں سے لکھ رہی ہوں۔ تمہارے دولہا بھائی سیر کو گئے ہوئے ہیں۔ اُن کے آنے سے پہلے ختم کر کے ڈاک میں ڈلوانا ہے۔ اگر اُنہیں معلوم ہو گیا کہ میں اپنی سہیلیوں کو خط لکھتی ہوں تو بہت ناراض ہونگے۔ تم بدستور پہلے پتہ پر خط لکھتی رہو۔ مجھے بحفاظت ملتے رہینگے۔ یہ ضرور ہو گا کہ کچھ گھنٹوں کی دیر ہو جائے گی لیکن یہ دوسری مصیبت سے اچھی ہے۔

تم اُن کا فوٹو کیا کرو گی۔ کیا لفظوں کی تصویر سے تسلی نہیں ہوئی۔ جو دوسرے فوٹو کی ضرورت پیش آئی گھبراتی کیوں ہو جب یہاں آؤ گی تو اپنی آنکھوں دیکھ لینا۔

ہر رات ایک نہ ایک واقعہ کسی نہ کسی عورت کا سُناتے رہتے ہیں۔ اور اس طرح سُناتے ہیں کہ میرا دل رو تا رہتا ہے گو بظاہر ہنستی رہتی ہوں۔ آنسہ! یہ مرد کتنے ظالم اور بیوفا ہوتے ہیں۔ اس شکل و صورت پر یہ حال ہے ———

جی میں آتا ہے کہ میں اُنہیں ایک قصہ سُناؤں۔ لیکن مجھے جھوٹ بولنا پڑیگا۔ وہ تو سچے واقعات سناتے ہیں مگر اُنہیں یہ تو معلوم ہو جائیگا کہ عورت کے پہلو میں بھی دل ہوتا ہے اور اُس دل میں جذبات بھی ہوتے ہیں بڑے نازک میں بھی اُنہیں سُناؤنگی کہ مجھے محلے کے ایک لڑکے سے محبت ہو گئی تھی۔ میں اور وہ الدین سے چھپ چھپ کر ملا کرتے تھے پھر اُنہیں معلوم ہو گا کہ یہ باتیں

سُن سُن کر میرے دل پر کیا گزرتی ہے۔ وہ پہلے جو کچھ تھے سو تھے لیکن آئیندہ کے لئے احتیاط کریں اور یہ واقعات مجھے سنانے سے کیا حاصل ———

وہ سیر سے واپس آگئے ہیں لہذا رخصت!

تیسرا خط

جان سے زیادہ پیارے —— اپنی خادمہ کا سلام قبول فرمائیے

جانے آپ مجھ پر کیا جادو کر گئے ہیں کہ کسی کام میں جی ہی نہیں لگتا۔ ہر وقت آپ کی صورت آنکھوں میں پھرتی رہتی ہے۔ ہر وقت آپ کا تصور پریشان کرتا رہتا ہے۔ ہر وقت آپ کی باتیں یاد آتی رہتی ہیں۔ جس گھر میں میں نے اپنی عمر کی اتنی بہاریں گزاری ہیں اب وہی گھر کاٹنے کو آتا ہے۔ اب اُس گھر سے وحشت معلوم ہوتی ہے۔ اور جب آپ کے یہاں جاتی ہوں تو وہاں بھی جی نہیں بہلتا گو آپ کی والدہ اور ہمشیرہ میری بڑی دلداری کرتی ہیں لیکن وہاں بھی میں پریشان ہی رہتی ہوں بلکہ وہاں تو میری پریشانی اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ وہاں مجھے آپ اور زیادہ شدت کے ساتھ یاد آنے لگتے ہیں۔ سوچتی ہوں کہ جُدائی کی یہ طویل گھڑیاں کب ختم ہونگی۔

جن سہیلیوں میں میں نے اپنی عمر کا اتنا حصہ گزارا اب وہ بھی مجھے خوش نہیں رکھ سکتیں۔ اب اُن کی باتیں بھی مجھے اچھی معلوم نہیں ہوتیں۔ وہ بھی میری بیخودی سے ناراض ہیں۔ لیکن میں کیا کروں۔ میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ یہ کمبخت تو یہ چاہتا ہے کہ ہر وقت آپ کا تصور کئے پڑی رہوں۔ ہر وقت آپ کو یاد کرتی رہوں۔ اور طرفہ تماشہ یہ کہ آپ کے تصور سے اور آپ کی یاد سے بھی تو نہیں بہلتا بلکہ اور زیادہ پریشان ہو جاتا ہے۔

آپ نے خط تو لکھا جس کے لئے میں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں لیکن آپ نے سیدھا اباجی کو خط لکھ دیا۔ اور میرے نام کے لفافہ پر لکھ دیا کہ یہ راحت کو دے دیجئے گا۔ اباجی آپ کی اس حرکت سے خفا تو نہیں ہوئے لیکن وہ پرانے خیالات کے آدمی ہیں۔ اُنہیں یہ باتیں اچھی معلوم نہیں ہوتیں۔ اُس وقت تو وہ کچھ نہیں بولے مجھے لفافہ دے کر باہر چلے گئے لیکن بعد میں امی سے کہے رہے تھے کہ ابھی شادی کو کتنے دن ہوئے کہ خط لکھے جانے لگے۔ آج کل کے لڑکے اور لڑکیاں اوچھی طبیعت کی ہوتی ہیں۔ میں نے اُن کی بات دوسرے کمرے میں سے سُنی تھی جب اُنہوں نے مجھے آپ کا خط دیا تھا۔ میں مارے شرم کے کٹی جا رہی تھی۔ اور اُن کے سامنے جاتے ہوئے ایک عجیب قسم کا حجاب سا محسوس ہوتا تھا۔ اُن کی یہ بات سُنی تو اور زیادہ شرم آئی آپ پر غصہ بھی آیا۔ معاف کیجئے گا۔ کہ میں نے اُنہیں سلیم کے نام خط بھیجنے کو کہا تھا۔ اُنہوں نے ابا کے نام کیوں بھیجا۔ خیر آپ کی مرضی ہے کسی کے نام بھیجئے سلیم کے نام خط لکھنے میں آپ کو یہ خیال ہوگا کہ وہ بچہ ہے یا سکول میں خط گم نہ ہو جائے۔ تو یہ آپ کا خیال ہی خیال ہے۔ ورنہ میں نے اُسے اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ خدارا ایسی باتیں نہ لکھا کیجئے۔ یہ نگوڑی باتیں بھی کہیں خط میں لکھنے کے قابل ہوتی ہیں۔ ہاں آپ نے اُس نوکرانی کے متعلق نہیں لکھا کہ آپ نے اُسے علیحدہ کر دیا ہے یا نہیں۔ جوان خادمہ کا گھر میں آنا اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ آپ تنہا رہتے ہیں۔ اس لئے بھی مناسب نہیں۔ خدا نہ کرے مجھے آپ کی طرف سے بدگمانی نہیں لیکن ایسی فیشن ایبل خادمہ کا "چھڑے" مکان میں رہنا مناسب ہی نہیں ہے۔ آپ اُن دس روپوں پر خاک ڈالئے اور اُسے علیحدہ کر دیجئے۔ آپ کو دس روپوں کی کیا پروا۔ آپ نے یہ قرض دیئے تھے تو کیا دیتے وقت آپ کو یہ خیال تھا کہ یہ وصول ہو جائینگے بس تو یہ سمجھئے کہ آپ کا صدقہ گیا۔ دس روپوں کی خاطر اُسے علیحدہ نہ کرنا میرے نزدیک تو عقلمندی ہے نہیں۔ ایسی خادمہ بدمعاش ہوتی ہے۔ کبھی وہ اپنے یار دوستوں سے مکان میں چوری کرا دے —— لہذا اُسے بہت جلد نکال دیجئے۔ جب آپ اُسے علیحدہ کر دیں تو مجھے ضرور لکھیئے گا۔

اور ابھی ساڑھیاں وغیرہ نہ خریدیئے جب میں آؤنگی اُس وقت دیکھا جائیگا۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے یہاں کوئی ساڑھی نہیں پہنتا۔ اول تو مجھے باندھنی ہی نہیں آتی اور دوسرے یہاں یہ چیزیں بیکار ہیں۔ ان چیزوں کا لطف تو آپ ہی کے پاس آئیگا

تو آپ مجھے کب بلائینگے؟

چوتھا خط

آنسہ بہن

محبت نامہ ملا۔ آج کل تمہارے محبت ناموں سے مجھے خوشی حاصل ہو جاتی ہے۔ ورنہ میں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ میرے لئے اس دنیا میں خوشی ہے ہی نہیں۔ لیکن تم اتنی دور بیٹھ کر میرے

زخموں پر مرہم لگانے کی کوشش نہ کیا کرو جتنی زیادہ تم یہ کوشش کرتی ہو اُتنا ہی زیادہ مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرہم کے پھاہے رکھنے کی بجائے تم نمک چھڑک رہی ہو۔ کیا کروں۔ اب میری طبیعت ہی ایسی ہو گئی ہے۔ گو جانتی ہوں کہ تم "حسن نیت" سے نصیحتیں کرتی ہو لیکن یہ نصیحتیں مجھے ایسی کڑوی معلوم ہوتی ہیں کہ تمہارا خط پڑھ کر دل پر تیر سے لگتے ہیں۔

یہ درست ہے کہ اب شرافت اسی میں ہے کہ انہیں اپنا دیوتا سمجھوں۔ اُن کی پرستش کروں۔ اور اُن کی ہر بات کے آگے سر تسلیم خم کر دوں لیکن یہ "شرافت" حاصل کرنے میں مجھے اپنے دل کا "اپنی خودداری کا" اور اپنے جذبات کا خون کرنا پڑتا ہے۔ اور ان سب چیزوں کا خون کرنے کے بعد بھی جب میں اُن کی خوشنودی حاصل کرنے میں ناکام رہتی ہوں تو میرے بدن کا رواں رواں "بغاوت" "بغاوت" پکارنے لگتا ہے۔ اور وہ دن دُور نہیں جب میں "اعلانِ بغاوت" کرنے پر مجبور ہو جاؤں۔

آٹھ دس دن ہوئے اُن کی چھٹی ختم ہو گئی تھی اور وہ ملازمت پر چلے گئے تھے۔ جاتے ہوئے انہوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ مجھے ساتھ لے جائیں لیکن ماں باپ کا بھلا ہو کہ انہوں نے نہ لیجانے دیا۔ پرسوں خط آیا تو اُس میں وہی بدتہذیبی اور حماقت کی باتیں لکھی تھیں۔ خط پڑھ کر مجھے غصہ آیا اور میں نے فوراً پھاڑ دیا۔ آج تمہیں خط لکھنے لگی تو تمہاری نصیحتوں اور مصلحتِ وقت نے مجبور کر دیا کہ اُن کے خط کا جواب بھی لکھ دوں۔ لہٰذا آج میں انہیں بھی خط لکھ رہی ہوں۔ اور خط لکھنے میں میں نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ شاید اپنی محبت اور خلوص کا اظہار کر کے انہیں راہِ راست پر لانے میں کامیاب ہو جاؤں۔

گلنار اور نجمہ کو بھی اُن کے شوہر اپنے ساتھ لے گئے۔ اب یہاں میں ہوں اور ریحانہ ہے۔ ریحانہ تو بیچاری کنواری ہے وہ شوہر کے دُکھوں اور مصیبتوں کو کیا جانے۔ اور میں اُس سے اتنی بے تکلف بھی نہیں کہ اپنے دل کا حال کہہ سکوں۔

تمہاری بدگمانیاں پڑھ پڑھ کر مجھے نہ جانے کیوں ہنسی آتی ہے۔ میں پہلے بھی ایک دفعہ لکھ چکی ہوں کہ تم اختر صاحب کی طرف سے اطمینان کر لو پھر بہت سی پریشانیوں سے بچ جاؤ گی۔ اور میری سمجھ میں تو یہ بھی نہیں آتا کہ پریشانیاں ہوتی ہی کیوں ہیں۔ وہ کالج کے پروفیسر ہیں۔ وہاں اُن سے لڑکیاں بھی تعلیم پاتی ہیں اگر اُن لڑکیوں کو تعلیم میں کچھ مشکلیں پیش آتی ہیں اور وہ اُن مشکلوں کو دُور کرنے کے لئے اختر صاحب کے پاس مکان پر آ جاتی ہیں۔ تو تمہیں تکلیف کیوں ہوتی ہے۔ اگر اختر صاحب انہیں خود بلاتے ہیں تو بھی تمہیں کوئی شکایت نہیں ہونی چاہئے۔ اُستاد شاگرد کے لئے باپ کے برابر ہوتا ہے۔ اور باپ اگر مقررہ وقت کے علاوہ بچوں کو اور وقت میں نصیحتیں کرے یا سبق پڑھائے تو اس میں بُرا ماننے کی کیا بات ہے۔ آخر اُن کے پاس لڑکے بھی تو آتے ہوں گے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ کہ جب لڑکے آتے ہیں تو بھی تمہیں اتنا ہی بُرا معلوم ہوتا ہے جتنا کہ لڑکیوں کی آمد پر۔

اور اگر تمہیں اس بات کا بہت ہی زیادہ خیال ہے تو اپنی آرائش پر ذرا اور وقت لگا دیا کرو۔ تم ماشاء اللہ کچھ کم حسین نہیں ہو اپنی زیبائش پر ذرا سی توجہ دینے سے مجھے یقین ہے کہ تم حُسن اور دلکشی کے اعتبار سے اُن سب سے بڑھ جاؤ گی پھر اختر صاحب فطری طور پر تمہاری ہی طرف کھنچیں گے۔ تمہیں شاید اپنی "طاقتوں" کا اندازہ نہیں۔ ورنہ تم اُن چڑیلوں سے نہ ڈرتیں میری بھولی بھالی آنسہ تم اکیلی اُن سب کے لئے کافی ہو۔ گو میں نے اُن میں سے کسی کو بھی نہیں دیکھا لیکن مجھے یقین ہے کہ اُن سب کا حسن مل کر بھی تمہاری خوبصورتی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ میں نے ہمیشہ ہر عورت کو تمہاری خوبصورتی کی تعریف ہی کرتے سُنا ہے۔ اور بڑی بڑی بوڑھی عورتوں نے مجھے مختلف موقعوں پر بتایا ہے کہ آنسہ جیسی حسین لڑکی انہوں نے عمر بھر میں کہیں نہیں دیکھی اس قدر حسین ہو کر بھی تمہیں خوف ہے کہ کہیں اختر تمہارے "دامِ محبت" سے نہ نکل جائیں۔ دیکھو اپنی بے پروائی کی پہلی عادت چھوڑ دو۔ وہ زمانہ اور تھا۔ کہ بال جس طرح پڑے ہیں پڑے ہیں۔ کپڑے میلے ہو گئے ہیں تو ہو جانے دو۔ اب تم ایک پروفیسر کی بیوی ہو۔ اب تمہیں اپنی زیادہ توجہ آرائش و زیبائش پر صرف کرنی چاہئے۔ ہر روز کپڑے بدلو۔ بال خاص طرح سے بناؤ۔ تمہارے حُسن کو بناؤ سنگار کی ضرورت تو نہیں لیکن یہ خیال رکھو کہ بناؤ سنگار کرنے سے اس کی طاقت کئی گنا زیادہ ہو جائیگی۔ لہٰذا پاؤڈر لپ اسٹک۔ کریم۔ غرضکہ مدافعت کے لئے جو بھی حربہ مفید ہو سکتا ہے اُسے استعمال کرو اور دیکھو کہ وہ لڑکیاں خود بخود ہی رفوچکر ہو جاتی ہیں کہ نہیں۔ یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ اگر اُن کا مقصد خدا نہ کرے ذلیل ہوا تو وہ تمہارا حُسن اور تمہاری زیبائش دیکھ کر بھاگ

جائینگی۔ اور اگر وہ واقعی تعلیم ہی کے لئے آتی ہیں تو تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اختر تمہارے ہیں ہاں صرف تمہارے ہیں۔ وہ کسی اور کے نہیں ہو سکتے۔

میں تمہارے خط کا نہایت بے صبری سے انتظار کرونگی۔ تم فوراً میری نصیحت پر عمل شروع کر دو۔ ناراض نہ ہو۔ واقعی چھوٹے بڑوں کو نصیحتیں نہیں کیا کرتے لیکن تم میری نصیحت پر عمل کرو اور دیکھو کہ اس سے کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ ہاں نصیحت کے لفظ پر ایک اور بات بھی یاد آ گئی۔ آپ "تم" کے لفظ سے ناراض تو نہیں ہوتیں۔ میں بے تکلفی اور محبت میں آپ کو تم سے مخاطب کرتی رہی اور اپنی مصیبتوں میں بھول گئی۔ کہ جب باتیں کرتے ہوئے ہم میں سے کوئی آپ کو تم کہہ دیا کرتی تھی تو آپ بہت خفا ہوتی تھیں لیکن وہ غصہ ہمیں بالکل ظاہری معلوم ہوا کرتا تھا۔ اگر میرا خط پڑھ کر آپ کو غصہ آتا ہوگا تو وہاں آپ کس پر خفا ہوتی ہوں گی۔ بھائی اختر پر یا اُن لڑکیوں پر ؟

پانچواں خط

(آنسہ کا راحت کے نام)

میری راحت خدا آپ کے سرتاج کو خوبصورت بنا دے!

یہ عجیب بات ہے کہ میں آپ سے ہمدردی کرتی کرتی خود مصیبت میں گرفتار ہو گئی۔ اور آپ کے آلام کو کم کرنے کی بجائے میں نے اُن میں کم از کم ایک کا اضافہ ضرور کر دیا۔ یہ خیال مجھے کاٹے کھاتا ہے کہ آپ کی اپنی پریشانیاں کیا کم تھیں جو میں نے ایک پریشانی اور بڑھا دی لیکن راحت جب میں آپ کو خط لکھتی ہوں تو مجھ سے یہ تو ہو نہیں سکتا کہ آپ سے کچھ باتیں چھپاؤں اور خاص طور پر اس وقت جبکہ آپ اتنی تفصیل سے خط لکھیں۔

میں مذاق نہیں کرتی ہوں۔ راحت آیئے شوہروں کا مبادلہ نہیں نہ کر لیں۔ میں واقعی خوب صورت شوہر سے نالاں ہوں اور آپ بدصورت شوہر سے پریشان ہیں دیکھیں تو سہی یہ تجربہ کیسا رہتا ہے۔ آپ کو اپنی آرائش کا خیال بھی بہت رہتا ہے اور اختر صاحب کو ایسی ہی بیوی چاہئیے جو گھر کے کام کاج کی طرف ذرا دھیان نہ کرے بس تمام دن اپنی زیبائش میں مشغول رہے۔ جب وہ کالج سے آئیں تو ایک ہاتھ میں لپ اسٹک ہو اور دوسرے میں پاؤڈر کا پیڈ۔ انہیں دیکھتے ہی ڈارلنگ کہتی ہوئی دروازے کی طرف لپکے۔ آپ جانتی ہیں مجھ میں یہ باتیں کہاں۔ اور آپ یہ بھی جانتی ہیں کہ آپ کو ان باتوں کا بہت شوق ہے۔ خدا نہ کرے میں یہ بات طنزاً نہیں لکھ رہی ہوں۔ اور نہ اس سے یہ مطلب ہے کہ آپ مجھ سے کم حسین ہیں یہ اپنے اپنے شوق ہیں۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ گھر کو یا بقول اختر صاحب کوٹھی کو ملازموں کے رحم و کرم پر نہ چھوڑوں۔ خود سب چیزوں کی دیکھ بھال کروں۔ اور ان کاموں سے فرصت ملے تو کتابیں پڑھوں اخبار دیکھوں مضمون لکھوں اور خدا کو یاد کروں۔ میں جو کچھ بُری بھلی ہوں سو ہوں۔ اب پاؤڈر یا خوبصورتی کی اور چیزیں استعمال کرنے سے فائدہ؟ تاہم میں نے آپ کے کہنے پر عمل کیا۔ اور ان سب چیزوں کا استعمال شروع کر دیا۔ اختر کالج سے آئے تو بہت ہنسے اور بولے "میری بھولی بھالی گڑیا ———" میں نے اُن کی بات پوری نہ سُنی۔ درمیان ہی میں بول اٹھی "بس جی اب میں یہ باتیں برداشت نہیں کر سکتی"۔ وہ حیران ہو کر میری طرف تکنے لگے۔ میں نے آگے کہا "گویا میں ایک گڑیا ہوں ——— اس سے زیادہ آپ کی نظروں میں میری کچھ وقعت نہیں"۔

لیکن راحت! یہ آرائش و زیبائش بھی کچھ مفید ثابت نہیں ہوئی۔ پچھلے ہفتہ بمبئی کی ایک مشہور ایکٹرلیس رقص کے سلسلہ میں یہاں آئی تھی۔ پروفیسر صاحب نے اُسے اپنے یہاں چائے پر مدعو کیا۔ جب وہ آئی تو مجھے دیکھ کر ہکا بکا سی رہ گئی۔ اور اختر صاحب سے کہنے لگی۔

"مجھے تعجب ہے مسٹر پروفیسر کہ اتنی خوبصورت بیوی کے ہوتے ہوئے آپ ہم ایکٹرلیسوں کو چائے پر بلاتے ہیں"۔

اُس نے یہ بات ایسے انداز سے کہی جیسے ایکٹ کر رہی ہو۔ اختر صاحب جواب میں ہنسے اور بولے۔

"کیا خوبصورت بیوی کے ہوتے ہوئے آدمی کو دنیا سے کنارہ کش ہو جانا چاہیئے"۔

پردہ والے حصے میں وہ بہت تھوڑی دیر ٹھہری۔ پھر باہر چلی گئی وہاں اور کئی پروفیسروں اور ایکٹرلیس کے دوسرے شائقین کو اختر صاحب نے جمع کر رکھا تھا۔ میں ایک کمرے میں کواڑ سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اور درزوں میں سے جھانکنے لگی لیکن صاف دکھائی نہ دیا تو میں نے دروازہ کھول دیا۔ اور چق کے پیچھے کھڑی ہو کر دیکھنے لگی۔ سب کے سب ایکٹرلیس کی صورت کو تک رہے تھے اور سب کی توجہ کی مرکز وہی ایک ایکٹرس تھی۔ اختر صاحب

اس کے برابر والی کرسی پر بیٹھے تھے۔ راحت! اُن لڑکیوں کو اختر کے پاس بیٹھا دیکھ کر مجھے اتنا رنج نہ ہوتا تھا جتنا کہ اس ایکٹرس کو دیکھ کر ہوا۔ خیر میں کھڑی دیکھتی رہی۔ ملازموں نے میزوں پر چائے کا سامان چنا۔ اختر اُٹھ کر میرے پاس آئے اور کہنے لگے "آنسہ آج میری عزت رکھ لو میرے دوست مجھے طعنے دے رہے ہیں کہ عجیب جاہل بیوی سے شادی کی جو پردہ کی اس قدر پابند ہے"

میں اُن کی اس قسم کی باتیں سُننے کی عادی ہو چکی ہوں اس سے پہلے بھی وہ دسیوں مرتبہ پردہ اُٹھانے کے متعلق کہہ چکے ہیں لہٰذا میں مُسکرائی اور بولی "میں جاہل ہی اچھی ہوں لیکن مجھے یہیں رہنے دیجئے"۔

میں اختر صاحب کو ٹال کر دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔ اُن کے جانے کے بعد پھر پہلے والے کمرے میں آ گئی۔

چائے کے بعد اختر کی فرمائش پر ایکٹرس نے جگر کی ایک غزل گائی۔ اُس کی آواز میں کتنا درد ہے اور کتنا سوز ہے راحت! ایک ایک مصرع پر سب مست ہو ہو کر جھومنے لگے۔ خود میں بھی بے خود ہو گئی۔ جب اُس نے مقطع کے بعد پھر مطلع گایا! آپ کو کم از کم مطلع تو سُنا دوں! ؎

نازک ترے مریضِ محبت کا حال ہے
دن کٹ گیا تو رات کا کٹنا محال ہے

تو میرے دل سے اُس کی طرف سے سب نفرت دور ہو گئی اور نفرت کی جگہ خواہش پیدا ہوئی کہ یہ اور چیز سنائے۔ یہی خواہش شاید سب سننے والوں کے دلوں میں پیدا ہوئی اور اُن لوگوں کے اصرار پر اُس نے جگر ہی کی ایک اور غزل گائی۔ اور یہ پہلے سے بھی زیادہ اچھی رہی۔ کیا بتاؤں وہ کس طرح بتا بتا کر گا رہی تھی۔ جگر کی یہ غزل میں کئی دفعہ پڑھ چکی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ غزل مجھے بہت پسند ہے۔ مگر یہ بات کبھی میرے خیال میں بھی نہ آئی تھی کہ اس میں اتنی لطافت اور دلآویزی بھری جا سکتی ہے جتنی کہ اُس ایکٹرس نے بھر دی۔ آپ بھی اُس کے تین چار اشعار سنئے!

عشق تنہا ہی نہیں آشفتہ سر میرے لئے
حُسن بھی ہے مضطرب اور کس قدر میرے لئے

وہ رُخِ رنگین پہ انوارِ محبت زرد زرد
وہ لبِ نازک پہ طوفانِ شرر میرے لئے

سرد سرد آہوں میں تاثیرِ محبت گرم گرم
خشک خشک آنکھوں میں جوشِ اشکِ تر میرے لئے

جب یہ محفل رقص و سرود برخواست ہوئی اور سب لوگ اپنے اپنے گھر جانے لگے تو ایکٹرس پھر میرے پاس آئی اور خاصی دیر بیٹھی باتیں کرتی رہی۔ میں نے کہا "خدا نے آپ کو حُسن اور گلا دینے میں بڑی فیاضی سے کام لیا ہے"۔

"آپ نے یہ بات رسماً کہی ہے یا درحقیقت آپ ایسا سمجھتی ہیں"

"درحقیقت"!

وہ میری بات سُن کر بہت خوش ہوئی۔ وفورِ مسرت سے اُس کے رُخسار چمکنے لگے۔ اور اُس نے ایک خاص انداز سے کہا۔

"میں نے آج تک اپنی تعریف کسی عورت سے نہیں سُنی تھی۔ اور پھر ایسی عورت سے جو مجھ سے ہر طرح بلند ہیں"۔

میں نے پوچھا۔ "آپ یہاں کتنے دن قیام فرمائینگی؟"

کہنے لگی۔ "آپ مجھ سے اتنے تکلف سے باتیں نہ کیجئے۔ میں اس قابل نہیں ہوں۔"

"آپ نے میری بات کا جواب تو دیا ہی نہیں۔"

"کوئی چھ سات دن اور"

میں سمجھتی تھی کہ وہ ایک ہی دن کی مصیبت ہے لیکن چھ سات دن۔ پورا ایک ہفتہ۔ اے خدا میں یہ سب کچھ کیسے برداشت کرونگی۔ لیکن میں نے ضبط سے کام لیا اور پوچھا۔

"آپ سینما گھروں میں ناچتی کیوں پھرتی ہیں میں نے سُنا ہے کہ آپ کسی بڑے آدمی کی لڑکی ہیں۔"

"میرے ناچ سے جتنا روپیہ جمع ہوگا وہ سب کا سب قومی مفاد کے لئے خرچ کیا جائیگا۔ اس لئے میں اسے بُرا نہیں سمجھتی۔"

اتنے میں اختر صاحب آئے اور کہنے لگے۔

"آنسہ اگر تم اجازت دو تو میں ان سے درخواست کروں کہ اپنا سامان یہاں اُٹھوا لائیں۔ یہ ہوٹل میں ٹھہری ہیں اور ہوٹل میں تم جانو گھر کا سا آرام نہیں مل سکتا۔"

اُن کی بات سُن کر میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی لیکن پھر بھی میں نے اُن کی خاطر ایکٹرس سے درخواست کے طور پر کہا کہ میں آپ کا سامان یہاں منگوا لیتی ہوں۔ اسے آپ اپنا ہی گھر سمجھئے۔ اور جب تک اس شہر میں ٹھہرنا ہو ہمارے ہی یہاں قیام فرمائیے۔

میرا خیال تھا کہ وہ اس پر راضی نہ ہوگی لیکن راحت اُس نے تکلفاً بھی تو انکار نہیں کیا۔

اب وہ ہمارے یہاں مقیم ہے اختر صاحب کی وارفتگی دیکھنے کے قابل ہے۔ کالج سے چھٹی لے لی ہے۔ وہ دن رات اس کے

ساتھ رہتے ہیں۔ اختر صاحب ہیں۔ ایکٹریس ہے اداکار ہے۔ مجھ سے بھی برائے نام پوچھا جاتا ہے سینما چلوگی؟ فلاں جگہ دوبارہ دیکھنے کو جی چاہتا ہے؟ میں جل کر انکار کر دیتی ہوں۔

راحت! مجھے یہ سب مصیبتیں خوبصورت شوہر کی وجہ سے برداشت کرنی پڑ رہی ہیں۔ خدا کا شکر ادا کیجئے کہ اُس نے آپ کو اس مصیبت میں گرفتار نہیں کیا۔ اگر اختر اتنے حسین نہ ہوتے تو یہ ایکٹریس اُن پر ہرگز اتنی مہربان نہ ہوتی۔ آخر اختر جیسے بیسیوں پروفیسر اور بھی ہیں اور میں نے سنا ہے اُن میں سے کئی ایک اسے دعوتیں بھی دے چکے ہیں دیکھئے وہ دونوں اپنے اپنے کمروں سے تیار ہو کر نکل رہے ہیں۔ آج مجھے بھی اُن کے ساتھ سینما جانا ہے۔ اچھا رخصت! میری پیاری سہیلی رخصت!! اب تو آپ کو دیکھنے کے لئے جی بہت ترسنے لگا۔ وطن کب جائینگی؟ کوئی تاریخ مقرر کیجئے تاکہ میں بھی پہنچ جاؤں

چھٹا خط

عزیز از جان آنسہ

تمہارا خط میں نے بہت زیادہ رنج وغم کے ساتھ پڑھا۔ اور جب سے خط پڑھا ہے میری نظروں میں تمام واقعات پھر رہے ہیں۔ مجھے نظر آ رہا ہے کہ اختر صاحب ایکٹریس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کمرے سے نکلتے ہیں اور کار میں سوار ہو کر تفریح کو چلے جاتے ہیں۔ پھر مجھے دکھائی دیتا ہے کہ تم اپنے کمرے کی کھڑکی سے انہیں دیکھتی ہو اور غصہ سے پیچ وتاب کھا کر صوفہ پر گر پڑتی ہو۔ میری آنسہ! کاش میں اس وقت تمہارے پاس ہوتی اور تمہارا دل بہلاتی۔ یا کاش مجھ میں اتنی طاقت ہوتی کہ یہیں سے بیٹھے بیٹھے اُس ایکٹریس کی صورت بندر کی بنا دیتی پھر تم دیکھتیں کہ اُس بندری کا کیا حشر ہوتا ہے لیکن آنسہ یہ اختر صاحب کو کیا ہو گیا۔ یہ حضرت دیکھنے میں سیدھے سادے بھولے بھالے تھے۔

میں نے آپ کے حالات پر بہت غور کیا ہے جن باتوں کو میں پہلے رقابت کے جذبہ سے زیادہ وقعت نہ دیتی تھی اب وہی باتیں مجھے بڑی اہم معلوم ہوتی ہیں۔ اب میں محسوس کر رہی ہوں کہ اختر صاحب وہ اختر ہرگز نہیں رہے جو کالج کی تعلیم کے زمانہ میں تھے یا کم از کم شادی سے پہلے تھے۔ آنسہ میری سمجھ میں آج تک یہ بات نہیں آئی کہ خدا نے مردوں کو پیدا ہی کیوں کیا ہے۔ اور اگر پیدا ہی کیا تھا تو ان میں خود غرضی اور بیوفائی اتنی زیادہ کیوں بھر دی تھی۔ ان کے حصہ کا خلوص اور وفاپرستی ہم عورتوں کو کیوں دے دی۔ اے کاش ہم میں اتنی وفاپرستی نہ ہوتی تو ہم ان ظالم اور خونخوار وحشیوں سے ان کے مظالم کا بدلہ تو لے سکتے۔ اے کاش ہم میں اتنا خلوص نہ ہوتا تو ان بیدرد اور حق ناشناس مردوں کو یہ تو پتہ چل جاتا کہ مجبور اور بے زبان عورتیں بھی کچھ کر سکتی ہیں۔

لیکن تم اتنی پریشان خاطر نہ ہو کسی پر ایک وقت ہمیشہ نہیں رہتا۔ اختر صاحب کے دل میں ہزار آوارگیاں نہ ہوں مگر وہ اس پر قائم نہیں رہ سکتے۔ آخر تمہارا خلوص، تمہاری محبت اور تمہاری وفا رنگ لائیگی اور اختر صاحب کے دل کو سب ایکٹریسوں اور کالج کی لڑکیوں سے بے نیاز کر دیگی۔

میرے اپنے ساتھ جو بیت رہی ہے وہ میں تمہیں اس خط میں نہیں لکھ سکتی۔ تم خود ہی بہت پریشان ہو۔ میں تمہیں اور زیادہ پریشان کیوں کروں۔ البتہ تمہارا خط آنے پر میں تمہیں مفصل لکھ بھیجونگی۔ بشرطیکہ تمہارا خط رنج وغم لئے ہوئے نہ ہوا۔

ساتواں خط

(آنسہ کا اپنے شوہر کے نام)

ڈیر اختر!

راحت کا دوسرا خط آنے پر تم نے مجھے رائے دی تھی کہ میں خود جا کر راحت کو سمجھاؤں اور اگر ممکن ہو تو دولہا بھائی کو بھی۔ لہذا میں ان لوگوں کو بغیر اطلاع دیئے ہی روانہ ہو گئی تھی۔

یہاں پہنچی تو میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ راحت ایک نوجوان اور خوبصورت مرد کے ساتھ بیٹھی کھانا کھا رہی تھی اور خوب کھل کھل کر باتیں کر رہی تھی۔ مجھے سخت حیرت ہوئی کہ یہ کون مرد ہے سوچا کہ راشد تو ہو نہیں سکتے۔ راحت کے خطوں میں راشد کی برائیاں پڑھ پڑھ کر میں نے راشد کا جو حلیہ اپنے ذہن میں تیار کیا تھا یہ مرد اُس راشد کے بالکل برعکس تھا۔ سب سے بڑا فرق تو یہ تھا کہ یہ خوبصورت تھا۔ اور بڑا ہنس مکھ بھی۔ اس کے علاوہ اُن کی باتوں سے ظاہر تھا کہ [illegible] بہت [illegible] دل موہ رکھا ہے۔ ایک لمحہ کے لئے اچانک مجھے خیال آیا کہ کہیں میں غلطی سے دوسرے کے مکان میں تو نہیں چلی آئی لیکن سامنے راحت بیٹھی تھی۔ اور راحت کو پہچاننے میں غلطی نہیں کر سکتی۔ گو میری طرف اُس کا چہرہ نہیں تھا لیکن اُسے تو میں بہت دور سے بغیر چہرہ دیکھے بھی پہچان سکتی ہوں۔

میں کچھ دیر یونہی کھڑی رہی۔ پھر ایک لمحہ کے لئے میرے دل میں ایک بُرا خیال آیا (خدا مجھے معاف کرے) لیکن اس خیال پر مجھے خود ہی شرم آنے لگی۔ راحت اتنی نہیں کر سکتی۔ میں کھڑی دیکھ رہی تھی۔ اور حیران ہو رہی تھی کہ اتنے میں اُس مرد کی نظر مجھ پر پڑ گئی اور میں سر سے پاؤں تک شرما گئی۔ گو آپ نے مجھ سے پردہ اُٹھوا دیا ہے۔ لیکن ابھی مجھ میں وہ باتیں نہیں آئیں جو بے پردہ عورتوں میں ہوتی ہیں۔ یا ہونی چاہئیں۔ خیر۔ اُس مرد نے راحت سے بہت آہستہ سے کچھ کہا اور راحت نے ایک دم پیچھے مُڑ کر دیکھا اور دم بخود سی رہ گئی۔ شاید اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں بھی جہاں کھڑی تھی وہیں کھڑی رہی۔ پھر دوڑ کر اُس کے گلے سے لپٹ گئی۔

اختر یہ راحت بڑی چڑیل نکلی۔ اتنے دن تک ہمیں دھوکہ دیتی رہی اور مفت میں پریشان کرتی رہی۔ وہ مرد راشد ہی تھا۔ بیچارہ کتنا شریف۔ کتنا خلیق ہے۔ اور کتنا حق شناس ہے کہ کیا کہوں۔ مگر یہ چڑیل ہمیں خطوط میں اُس کے متعلق کیسی کیسی باتیں لکھتی رہی۔ میں نے راحت کو ڈانٹا کہ تو نے ہمیں اتنے عرصہ تک کیوں روحانی تکلیف میں مبتلا رکھا۔ چڑیل ہنس کر کہنے لگی کہ تم میری شادی میں نہ آئی تھی تو میں تمہیں اس کی سزا اور کس طرح دے سکتی تھی۔

پھر وہ آپ کی باتیں کرنے لگی اور مجھ سے ہمدردی جتانے لگی۔ میں نے اُسے بتایا کہ وہ سب افسانے ہی افسانے تھے نہ کبھی کوئی لڑکی اختر صاحب سے کوٹھی پر پڑھنے آئی اور نہ اُنہوں نے کسی ایکٹرس ہی کو چائے کی دعوت دی نہ اپنے یہاں ٹھہرایا۔ یہ قصے بنا بنا کر میں تمہیں اس لئے لکھتی رہی کہ تمہارے غم کی شدت کم ہوتی رہے۔ اور تم بدصورت شوہر سے بہت زیادہ آزردہ نہ ہو جاؤ۔ تو وہ اُٹھ کر ایک دفعہ اور میرے گلے سے چمٹ گئی ٭

دردِ دل

ہم بتوں کو بھی محبت میں خدا کہتے ہیں

از حضرت ہادی مچھلی شہری

جان دینے کو محبت میں روا کہتے ہیں
زندگی موت کو اربابِ وفا کہتے ہیں

کفر و اسلام سے کچھ عشق کو مطلب ہی نہیں
ہم بتوں کو بھی محبت میں خدا کہتے ہیں

وہ نہیں ہے جو یہی نقش و نگارِ عالم
اہلِ دل جلوۂ محسوس کو کیا کہتے ہیں

تمکو مانا کہ نہیں منزلِ دشمن کی خبر
دیکھ تو کیا ترے نقشِ کفِ پا کہتے ہیں

قیس و فرہاد کے قصوں سے تو واقف ہے جہاں
آپ میرے دلِ شوریدہ کو کیا کہتے ہیں

یہی دیتی ہے پتہ کوئے بتاں کا دل کو
کششِ شوق کو ہم قبلہ نما کہتے ہیں

دردِ دل پر مرے اظہارِ تسلّی؟ لیکن
آپ سمجھے بھی کہ اس درد کو کیا کہتے ہیں

جو گھٹانے کے عوض درد بڑھا دے دل کا
ہم تو اس آہ کو بھی آہِ رسا کہتے ہیں

نہ سہی اُن کو مرے زخمِ محبت کا یقیں
مگر اس دیدۂ خونبار کو کیا کہتے ہیں

کاش وہ نقش مرے دیدہ و دل میں ہوتا
جس کو سب آپ کا نقشِ کفِ پا کہتے ہیں

ظلم پر اپنے نہ بیدرد پشیماں ہو تو
دہنِ زخمِ مرے دیکھ تو کیا کہتے ہیں

بے خبر تیشۂ فرہاد کو جو چاہیں کہیں
ہم اُسے طرّۂ دستارِ وفا کہتے ہیں

میں نے مانا کہ انہیں ذوقِ کرم ہے لیکن
میری بگڑی ہوئی قسمت کو وہ کیا کہتے ہیں

کیا نتیجہ ہے جو ہم قصۂ بیتابیٔ دل
اس جفا جو سے بہ امیدِ وفا کہتے ہیں

آجتک منزلِ جاناں کا پتہ تک نہ دیا
حضرتِ خضر کو سب راہ نما کہتے ہیں

ہے صدا ایک مگر نسبتِ حالت سے اسے
کبھی نغمہ، کبھی فریاد و بکا کہتے ہیں

کیا کہے قصۂ دل کوئی حسینوں سے کہ جو
التماسِ غمِ فرقت کو گلا کہتے ہیں

حشر کیا دیکھئے میرے دلِ بیتاب کا ہو
کہ وہ ہر بات پہ تقریبِ جفا کہتے ہیں

یہ نزاکت تو کوئی رسمِ وفا کی دیکھے
یعنی وہ آہ بھی کرنے کو گلا کہتے ہیں

کون کہتا ہے ستم ترکِ وفا کا ہے سبب
ہم تو ہر آہ کو پیمانِ وفا کہتے ہیں

اوّلِ عشق میں جو درد تھا ہادی دل کا
اب اسی درد کو ہم دل کی دوا کہتے ہیں

اولاد حاصل کرنے کا نیا طریقہ



ہر عورت کے ہاں اولاد ہو سکتی ہے

اگر کسی عورت کو حمل نہ ٹھہرتا ہو اور وہ بچہ پیدا کرنا چاہتی ہو تو اس کی آسان ترکیب یہ ہے کہ سات رات مسلسل ایک ایک خوراک دوا "محافظ اولاد" کھائے۔ ان سات دنوں تک ناس پر پرہیز کرے۔ ٹھیک آٹھویں دن یہ پرہیز توڑ دے یعنی .... تو اسی رات عورت کو حمل ٹھہر جائے گا۔ کیونکہ سات دن تک کھانے سے یہ دوا عورت کے اندرونی جسم کو بالکل صحیح اور قدرتی حالت میں کر دیتی ہے اور جب آٹھویں رات ..... تو اسی رات "اُمید" ہو جاتی ہے۔ "محافظ اولاد" دوا کی ایک شیشی جس میں ایک عورت کے لئے پوری سات خوراک دوا ہوتی ہے۔ اس کی قیمت دو روپے آٹھ آنے ہے۔ قیام حمل کے لئے یہ دوا بہترین ثابت ہو رہی ہے۔

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ ۱۰ے۔ بی ۳۲۴ دہلی کو خط لکھ کر ایک شیشی "محافظ اولاد" بذریعہ وی۔پی پارسل منگا لیں۔ پارسل پر سات آنے محصول ڈاک خرچ ہوگا۔

ٹیلی فون نمبر ۶۲۶۸

عالمگیرؒ

تاریخی مطالعہ

از جناب صائب فتحپوری

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

سلطنت حاصل کرنے کے لئے کیا کچھ نہیں ہوتا اور پھر عالمگیر سلطنت کے لئے جو کچھ بھی ہو جائے تھوڑا ہے۔ تاریخ کے صفحات قتل و غارتگری کے افسانوں سے رنگے ہوتے ہیں۔ کوئی تُغلقوں یا نادروں کا لرزہ خیز کہانی بھلا دینے کے قابل نہیں۔ کلنگا کی وحشتناک جنگ یاد ہوگی۔ غوری اور غزنوی کے ہیبتناک اور تباہ کن حملوں کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ بابر پانی پت کے میدان میں مٹھی بھر سپاہیوں کے ساتھ ٹڈی دل کا مقابلہ کرتا ہے۔ امیر تیمور کی تلوار نیام سے باہر ہے سلطنت کے لئے اور صرف سلطنت کے لئے بھائی بیٹے قتل کر دیئے جاتے ہیں۔ رعایا کا خون بہایا جاتا ہے۔ خزانے برباد ہو جاتے ہیں۔ تاریخ ایران اٹھا کر دیکھئے۔ حکومت کے مقابل باپ۔ بیٹوں۔ ماں۔ بہنوں کی کوئی حقیقت نہیں سمجھی جاتی۔ جہانگیر نے ابوالفضل کو ختم کرا دیا۔ خسرو جا کر زنداں میں پہنچ گیا۔ اورنگزیب نے شاہجہاں کو مقید کر دیا تو کیا بیجا کیا؟ ملک میں بد امنی پھیل چکی تھی۔ شاہی اقتدار رخصت ہو چکا تھا۔ طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ سلطنت کا بازو شکستہ۔ شجاعت سلطان مفقود۔ نور سلطنت ماند پڑ گیا تھا اگر اس نازک موقعے پر عالمگیر اس حکمت عملی سے کام نہ لیتا تو یقیناً سلطنت مغلیہ کا چراغ گل ہو گیا تھا۔

تاریخ کہتی ہے "زوال سلطنت کا باعث اورنگزیب ہے"۔ دُرّانی و ابدالی حملوں نے حکومت کا نقشہ بدل دیا۔ سلاطین عیش و عشرت میں کھو کر اپنے اقتدار پر پانی پھیر چکے۔ نااہل اور نکمے جانشینوں نے رقص و سرود کو حکومت سے افضل تصور کیا۔ اِدھر محی الدین کی آنکھ بند ہوئی اُدھر ملک خانہ جنگیوں کا مرکز بن گیا۔ صوبے خود مختار ہونے کا خواب دیکھنے لگے۔

بادشاہ عیش پرست ہوتے ہیں اور حکومت کے امور سے غافل بھی مگر زبردست حضرات کا فرض ہے کہ وہ اس کمی کو پورا کریں لیکن وہ تو "ایں خانہ تمام آفتاب است" کا مصداق بنے ہوئے تھے۔ "بیارید و بخورید" کے آگے کسی کی شنوائی نہ تھی۔ عالمگیر کے پہلو میں بھی ایک حساس دل تھا لیکن غیور و مدبر بادشاہ نے دُور اندیشی سے کام لیا بہت سے بیٹے ایسے ہوتے ہیں جو باپ کے نقش قدم کو قبول نہیں کرتے اس میں باپ کا کیا قصور؟

دُنیا بڑی احسان فراموش ہے۔ اکبر، جہانگیر اور شاہجہان کو بھلا بیٹھی جن کی وجہ سے ہندوستان نے جنت نشان کا لقب اختیار کیا اور بقول علامہ شبلی علیہ الرحمۃ ؎

یہی ہیں وہ شمیم انگیزیاں عطر محبت کی
کہ جن سے بوستانِ ہند برسوں تک معطر تھا

اکبر کا سب سے بڑا دشمن اگر عبدالقادر بدایونی خیال کیا جاتا ہے تو اس کے پڑپوتے کا مخالف "خافی خان" اور ڈاکٹر "برنیر" ہیں۔ موخر الذکر جھگڑے کے موقع پر موجود تھا جہاں [illegible] نے عالمگیر کے لئے قلعہ میں جال بچھا رکھا تھا قتل کی تدبیریں ہو رہی تھیں [illegible] بہن روشن آرا نے خبردار کیا کہ قلعہ میں آؤ گے تو قتل کر دیئے جاؤ گے۔ "اس موقع پر برنیر" کی تحریر غور طلب ہے۔ "عالمگیر کے لئے جو جال [illegible] کیا تھا شاہجہان اس میں خود ہی پھنس گیا۔"

آج سید حضرات کو اورنگزیب کی طرف سے بدظن کیا جاتا ہے۔ عالمگیر سیدوں کو کیا سمجھتا ہے۔ جب سید حسن علیخاں بہادر نے ہنونت مرہٹہ کی لڑائی میں عمدہ خدمات انجام دیں اور اس کے بھائی جاناجی کو گرفتار کیا تو ذوالفقار خاں بہادر نصرت جنگ نے ان دونوں بھائیوں کے اضافۂ مناصب کی درخواست کی۔ عالمگیر نے خلعت بیش بہا اور خنجر مرصع مرحمت فرما کر فرمان تحسین ارسال کیا لیکن اضافت مناصب کی بابت خان نصرت جنگ کی درخواست پر حکم دیا (اصل رقعہ فارسی میں ہے بخیال طوالت صرف ترجمہ پیش کیا جاتا ہے)

"زیادتی منصب و عہدہ کی تجویز جو تم نے پیش کی ہے وہ بہت ہی مناسب پیدا ہوگی گوشمالی تم ایسے سرداروں سے نہ ظاہر ہونا قابل افسوس لیکن ایک دن اضافہ منصب مشکل ہے۔ بلند مرتبہ سیّدوں سے محبت کرنا جزو ایمانی ہے بلکہ اصل خدا شناسی ہے اور ان سے دشمنی کرنا دوزخ میں

داخل ہونے اور رحیم کے غصّے کو بھڑکانے کا باعث ہے۔ لیکن وہ کام نہ کرنا چاہئے جو دُنیا کی ملامت اور آخرت کی بدبختی کا سبب ہو۔ بارو کے سیلوں کے ساتھ مطلق العنانی (کا) بدانجامی کا سبب ہے اس لئے کہ یہ جماعت تھوڑی ہی مرفہ الحالی اور ترقی و بلندی کے بعد اَنَا وَلَا غَیرِی کا دعویٰ کرنے لگتی ہے اور فضول ڈینگیں مار کر راہ راست سے ہٹتے ہوئے اپنی نظر کو بلندی پر پہنچا کر تنگی و پریشانی کا سبب ہوتی ہے۔ اگر ان سے غفلت برتی جائے تو دُنیا کے کاموں میں مشکلیں واقع ہوتی ہیں اور اگر کسی قسم کی تنبیہ کیجئے تو آخرت میں اپنا پیر کیچڑ میں پھنستا ہے۔ (وقائع عالمگیر ص ۶۷)

اس کے بعد سید صاحبان کے حالات پر عبور حاصل کیجئے تو معلوم ہوگا کہ "بادشاہ گر" یہی تھے۔ سلطنت کی باگ ڈور انہی کے ہاتھ تھی جسے چاہتے بادشاہ بناتے کون تھا جو چون و چرا کرتا عالمگیر کی مردم شناسی دیکھئے۔

آج عالمگیر پر اسکول کا بچہ بچہ الزام لگاتا ہے کہ تعصب و تنگ نظری کی وجہ سے اورنگ زیب غیر مسلمانوں کے ساتھ فیاضانہ سلوک نہ کرتا تھا افسوس ہے کہ ہمارے مسلمان بھائی بھی ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔

"جب میر بہاؤ الدین کے بیٹے محمد امین ہندوستان آئے تو خدمت دیرینہ کے لحاظ سے اُن کی عزت و تکریم کی گئی منصب داروں میں شامل ہو گئے۔ علم و لیاقت کے ذریعہ سے آراستہ و پیراستہ ہونے کی وجہ سے منازل ترقی طے کرتے کرتے دو ہزار سوار کے اعلیٰ درجہ میں داخل ہو گئے طبل و نقارہ مرحمت ہوا۔ لیکن انہیں رنج تھا کہ اُن کی خدمات کا واجبی حق نہیں ادا کیا گیا چنانچہ ایک موقع پر جب حسن خدمات کے صلہ میں اُن کو خلعت گراں بہا خنجر اور اسپ مرحمت فرمائے گئے تو موقع و محل دیکھ کر انہوں نے عرضی پیش کی جس میں بعض طعن کے بعد اجداد کی خدمات ظاہر کی گئی تھیں اور درخواست کی تھی کہ دونوں بخشی گری ایرانیوں کو دی گئی ہیں جو بد مذہب اور دیو سیرت ہیں بربنائے خانہ زادگی ایک خدمت ان کو ملنی چاہئے تھی"۔ عالمگیر کیا جواب دیتا ہے۔

"تم نے جو اپنی خدمات کے متعلق لکھا وہ واقعی درست ہے اندازہ کے مطابق اُن کی قدر دانی کی جاتی ہے اور تم نے جو ایرانیوں کی بدمذہبی کے متعلق لکھا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ دُنیاوی کاموں کو مذہب سے کیا تعلق اور مذہبی کاموں میں تعصب کو کیا دخل۔ لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ ۝ یعنی سلطنت کے کاموں میں معیار انتخاب ذاتی قابلیت ہے خواہ وہ کافر ہو یا مسلمان اگر یہی قاعدہ مقرر ہوتا تو ضروری تھا کہ ہم تمام راجاؤں اور ان کی رعایا کو بالکل نیست و نابود کر دیتے ذی لیاقت اصحاب کی حالت میں کسی قسم کی تبدیلی کرنا عقلمندوں کے نزدیک بُرا ہے تم نے جو ہم سے بخشی گیری کے لئے منصب کی استدعا کی ہے وہ درست ہے کیونکہ تم اس خدمت کے لائق عہدہ رکھتے ہو اور تم میں اس کی لیاقت بھی موجود ہے"۔

عالمگیر کی ہندو نوازی اکبر سے زیادہ نہ تھی لیکن ایسی کم بھی نہ تھی "وقائع عالمگیر" کے آخری پچاس ساٹھ ہزار صفحات راجگان کے مناصب و خدمات سے سیاہ نظر آتے ہیں یہاں چند ارکان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

عالمگیر پر الزام ہے کہ اس نے والیٔ جودھپور کے نابالغوں پر ایسے مظالم کئے کہ راجپوتانہ کے راجے بدظن ہو گئے اور اس واقعہ کے بعد کبھی مغلیہ جھنڈے کے نیچے لڑنے نہیں گئے یہ سرتاپا غلط اور لچر ہے۔ مہارانا اودے پور کے بھائی مہاراجہ بھیم سنگھ دکن کے مورچوں میں مغلیہ افواج کے دوش بدوش نظر آتے ہیں۔ راجہ رگھوناتھ داس عالمگیری مدار المہام تھے خدمات کے صلے میں راجہ کا خطاب ملا تھا اور منصب دو ہزاری پانصدی ذات اور پانصد سوار تھا۔ مہاراجہ جسونت سنگھ والیٔ جودھپور۔ کنور رام سنگھ آسام کی مہم پر تعینات ہوئے۔ راجہ بشن سنگھ راٹھوروں کی تنبیہ پر مامور ہوئے اور راجہ جے سنگھ دارا شکوہ کے تعاقب میں سیواجی کی مہم پر مقرر کئے گئے انہوں نے دکن کے متعدد قلعے بھی فتح کئے ہیں۔ راؤ کشور سنگھ شاہزادہ معظم کے ساتھ بیجاپور میں اور رام سنگھ ذوالفقار خاں کے ساتھ مرہٹوں سے برسرپیکار رہے۔

عہد عالمگیری میں صدہا راجگان ایسے تھے جو مناصب جلیلہ پر فائز تھے اور مہمات میں خوشدلی اور خلوص نیت سے حصہ لیکر خلعت فاخرہ اور شاہی انعام و اکرام سے متفوق ہوتے تھے۔ صاحب "وقائع عالمگیر" نے ان راجگان و مہاراجگان کی بسیط فہرست آخری صفحات میں پیش کر کے عالمگیر پر بڑا احسان کیا۔

اب ہم چند انگریز مورخوں کے اقوال نقل کریں گے تاکہ رہے سہے شکوک بھی رفع ہو جائیں نیز اولوالعزم بادشاہ کی طرز معاشرت اور تہذیب و تمدن کے مختلف ادوار پر روشنی پڑے۔

لین پول: "اورنگ زیب فرصت کے وقت کلاہ بنایا کرتا اور اپنی روزی کا سامان مہیا کرتا تھا"۔

ڈاکٹر جیملی کریری: "وہ صاف اور سفید ململ کی پوشاک پہنے ہوئے عصائے پیری کے سہارے امیروں کی جھرمٹ میں کھڑا ہوا تھا اور اس کی پگڑی میں زمرد کا ایک بڑا سا ٹکڑا لگا ہوا تھا۔ داد خواہوں کی عرضیاں لیتا جاتا تھا اور بلا عینک پڑھ کر خاص اپنے ہاتھ سے دستخط کرتا

سے "انصاف کرنا چاہئے اس لئے کہ بدصورت آدمی کی جہالت لومڑی کی سی ہے۔ (مکار عقلوں سے بہتر ہے" (وقائع عالمگیر ص ۴۹)

جاتا تھا اور اس کی بشاش بشاش چہرے سے صاف مترشح تھا کہ وہ اپنی مصروفیت سے نہایت شاداں و فرحاں ہے۔"

اس مورخ نے عالمگیر کو اٹھتر برس کی عمر میں دیکھا تھا لکھتا ہے:۔

"وہ دن میں دو تین مرتبہ دربار کرتا تھا اور مطلق کسی کو روک ٹوک نہ تھی ادنیٰ سے ادنیٰ جو چاہتا کہتا اور عالمگیر سنتا تھا۔"

لین پول:۔ "سیاحوں کی مخالفانہ نکتہ چینیاں اورنگ زیب کے چال چلن پر اسی زمانہ تک ہیں جب وہ شاہزادہ تھا لیکن جو سیاح اس کے زمانہ شاہی کا حال لکھتے ہیں وہ کلمات تحسین کے سوا کچھ نہیں لکھتے اس کے پچاس برس کے وسیع عہد حکومت میں کوئی ظالمانہ فعل بھی اس کے خلاف ثابت نہیں۔"

الفنسٹن:۔ گورنر بمبئی اپنی تاریخ ہند میں لکھتے ہیں۔ "وہ خود تن تنہا اپنی حکومت کی ہر شاخ کی کارگزاری جزوی کاموں کے لحاظ اور حیثیت سے کرتا رہا۔ لشکر کشیوں کے نقشے سوچتا تھا۔ جنگ کے زمانہ میں ہدایات جاری کرتا تھا۔ سردار اس کے قلعوں کے نقشے بغرض منظوری اس کی خدمت میں ارسال کرتے تھے کہ حملے کے مقاموں کو مقرر کرے اس کے رقعوں میں پٹھانوں کے ہموار ملکوں میں سڑکوں کے جاری کرانے اور ملتان۔ آگرہ کے فسادوں کو دبانے بلکہ قندھار کو دوبارہ حاصل کرنے کی تدبیریں مندرج ہیں اور اس عرصہ میں فوج کا کوئی ٹکڑا یا باربرداری کی کوئی رسد نہ تھی جس کا کوچ ایسے حکموں کے بدوں پایا جائے جن میں سے تھوڑے بہت احکام اورنگ زیب نے خاص اپنے ہاتھوں سے جاری نہ کئے ہوں ضلع کی مالگذاری کا ادنیٰ افسر کا تقرر یا کسی دفتر کے کسی محرر کا انتخاب اپنی توجہ فرمائی کے نامناسب نہ سمجھتا تھا اور سارے کارگذار وں کی نگرانی جاسوسوں اور آنے جانے والوں کے ذریعہ سے کرتا تھا اور ایسی خبروں کی اصل و بنیاد ہمیشہ فہمائش اور ہدایتوں کے وسیلے سے ان کو آگاہ اور خبردار کرتا تھا مگر جزئیات میں ایسے ذوق شوق سے منہمک ہونا جیسے ہوشیاری و بیداری مغز کی دلیل ہے ویسے ہی کام کاج کی اصل ترقی اور اجرائے کار کے عروج کے لئے چنداں مفید نہیں مگر اورنگ زیب کی ذات اور طبیعت میں۔ مطالعہ جزئیات کے علاوہ چابکدستی اور ہوشیاری بھی پائی جاتی تھی۔

اسی مورخ کو علامہ شبلی علیہ الرحمۃ اورنگ زیب کا سب سے بڑا دشمن تصور کرتے ہیں لیکن یہ شبلی کی دیدہ ظریفی نہیں تو اور کیا ہے؟ اس لئے کہ ہر مورخ اپنے زاویہ ہائے نگاہ سے جو مختلف امور دیکھتا ہے انہی کو بیان کرتا ہے۔

مغلوں کی تاریخ میں اورنگ زیب پہلا بادشاہ ہے جس نے مذہب کو جزو سلطنت سمجھا اور مذہب کے دوش بدوش حکومت کرنا سکھا دیا باوجودیکہ ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے مذہب سلطنت کا دشمن ہے اور حکومت مذہب کی جان لیوا۔ درحقیقت حکومت کی چولیں اکبر کے ہاتھوں ڈھیلی ہو چکی تھیں۔ باپ۔ دادا کی محنت اکارت ہو رہی تھی اورنگ زیب نے ایک ہاتھ میں تلوار لی اور مذہب کو اپنا راہبر بنایا شجاعت کے جوہر دکھائے اور داد و دہش کے دریا بہا دیئے۔ دنیا کی سمجھ پر پتھر پڑ چکے تھے وہ سنجیدہ مزاج زاہد۔ وسیع النظر۔ عدل پرور۔ انشاپرداز اور شجاع بادشاہ کی حکمت عملی کو کیا خاک سمجھ سکتے۔ اورنگ زیب پر تمام الزامات صرف اس وجہ سے عائد ہوئے کہ وہ مذہب پرست سلطان تھا باوجودیکہ اس کے ہاتھ کسی مظلوم کے خون سے نہیں رنگے اور نہ اس کی آنکھوں نے کوئی ایسا منظر ہی دیکھا لیکن زمانہ کو کیا کہئے شبلی نے کیا سچ کہا ہے ؎

تمہیں لے دے کے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا
کہ عالمگیر ہندو کش تھا۔ ظالم تھا ستمگر تھا





کاش میں عورت نہ ہوتی



ہر مہینہ تکلیف اٹھاتی ہوں

وہ رو رہی تھی اور اپنی سہیلی سے کہہ رہی تھی کہ بہن اگر میں عورت نہ ہوتی تو اچھا تھا یا اگر ہوئی تھی تو پھر مجھ میں شرم کرنے کی عادت نہ ہوتی۔ آج سات سال ہو گئے میری زندگی تمام ہوئی جاتی ہے۔ اور تمہارے بھائی کو کچھ خبر نہیں، کہ میں مر رہی ہوں۔ بس وہ یہ دریافت کر کے چپ ہو رہتے ہیں کہ "آپ زیادہ ترلیٹی کیوں رہتی ہیں" ؟ پیاری بہن! تم ہی بتلاؤ میں کس منہ سے کہوں کہ میں کیا بیمار ہوں۔ مجھے تو اپنی زبان سے کہتے ہوئے بڑی شرم آتی ہے کہ میں ماہواری ایام کی بیماری میں مبتلا ہوں اور مجھے اس زمانہ میں سخت تکلیف ہوتی ہے۔ ذرا تم کسی ذریعہ اُن تک یہ بات پہنچا دو۔ شاید وہ میرا علاج کرا دیں۔

سہیلی نے جواب دیا۔ پیاری بہن! اب ہمیں اپنے مردوں تک ایسی بات پہنچانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ میں نے بہت سے اخبارات میں پڑھا ہے کہ عورتوں کی تمام خفیہ بیماریوں کی بہترین دوائیاں دہلی کے "زنانہ دوا خانہ" میں ملتی ہیں۔ اور مجھے خود بھی تجربہ ہے کہ اس دوا خانہ کی دوا "کورس" بہت عجیب چیز ہے۔ اگر کوئی عورت ماہواری ایام کی بیماری میں مبتلا ہے۔ ایام کم آتے ہوں، رک رک کر اور تکلیف کے ساتھ آتے ہوں یا زیادہ آتے ہوں، یا مہینہ میں دو تین دفعہ آ جاتے ہوں یا بالکل نہ آتے ہوں یا اور کوئی خرابی ہو بہر صورت یہ دوا اپنا اثر کرتی ہے۔ اور خواہ کیسی ہی کمی زیادتی ہو اس دوا کو استعمال کرنیکے بعد عورت کو ہر مہینہ بالکل صحیح وقت پر اپنی مقررہ تعداد میں بغیر کسی درد اور بغیر تکلیف کے ایام ماہواری آنے لگتے ہیں۔ بڑی عجیب دوائی ہے۔ میں جانتی ہوں کہ اس دوا کو سنیکڑوں بہنوں نے استعمال کر کے اپنی صحت ٹھیک کر لی ہے۔ اسی طرح تم بھی۔

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دوا خانہ۔ اے۔ بی ۲۴ دہلی کے پتہ پر خط لکھ کر "کورس" کی ایک شیشی منگا کر استعمال کرلو۔ تندرست ہو جاؤ گی۔ اور ہاں! دوا کی قیمت بھی زیادہ نہیں ہے۔ ایک شیشی "کورس" دو روپے آٹھ آنے کو ملتی ہے۔ اور سات آنے محصول کے خرچ ہوں گے۔ چنانچہ اس بیچاری نے کورس کی شیشی منگا کر استعمال کر لی۔ اب وہ بالکل تندرست ہے۔ ہر ماہ اپنے مقررہ وقت پر وہ ایام سے فارغ ہو جاتی ہے بس جو عورتیں اس بیماری میں مبتلا ہیں وہ بھی اس کے استعمال سے تندرستی ٹھیک کر لیں۔ پھر ماہواری بغیر تکلیف اور بغیر درد کے آنے لگے گی۔

گلشن میں

جناب ملال

چھپا لینا شہیدانِ ادا کو اپنے دامن میں — نہ ان کو تم کفن دینا نہ کرنا دفن مدفن میں
نوید اُن کو جنہیں اب کے برس مےخوار بننا ہے — گھٹائیں چھا رہی ہیں جنبج پر ہر سمت ساون میں
حدیثِ لالہ و گُل مشتمل ہے چند نالوں پر — لبِ بلبل پر آجائیں جو بنے تا بانہ گلشن میں
کسی کا خرمنِ دل مستقر ہے جب سے بجلی کا — ابھی آتی نہ تھیں یہ شوخیاں بھی ان کی چتون میں
قفس کی تیلیاں صبا جس سے وضع کرتا ہے — خصوصیت ہے کیا یارب مری شاخِ نشیمن میں
فراقِ یار میں احساس غمہائے جدائی سے — مری راتیں ہوئی جاتی ہیں تاریک اور ساون میں
چمک کر دے رہے ہیں دعوتِ نظارہ خود جلوے — تجلی در نظر پہنچا الٰہی کون ایمن میں
دکھائے اپنے معجزے حُسن و محبت نے — کہیں صحرا نوردی میں کہیں گلگشت گلشن میں
خدا جانے وہ کیا سمجھیں گریباں پھاڑ لینے پر — بنی بات آج بگڑا چاہتی ہے دل کی اُلجھن میں
مبارک ہمصفیرانِ چمن کو زیب و آرائش — مری جانب سے بھی دو پھول چُن لے کوئی گلشن میں

فراقِ یار میں کٹتی ہیں شب ہائے ملال اکثر
یوں ہی پُرسوز نالوں میں یوں ہی پُر درد شیون میں

شادی

نظم

از حضرت مخمور جالندھری

سرنگوں ہے سرخ ساری میں دُلہن لپٹی ہوئی — ریشم کی زنجیر بے آواز میں جکڑی ہوئی
پاس ہی بیٹھا ہے اک بوڑھا سا دولھا شادماں — [illegible] چہرہ چھتریوں کا کارواں
ہو رہا ہے نقرئی تھیلی سے دوشیزہ کا بیاہ — کر رہے ہیں [illegible] کے سب کمسن جوانی کو تباہ
آتے ہیں "پھیروں" پہ یوں دُلہن کو بھائی تھامنے — لائیں جیسے بھیڑ کو ننگی چھُری کے سامنے
گھر لئے جاتا ہے بوڑھا دھوم سے اک زندہ لاش — ایک تار ٹکڑے ٹکڑے ایک گوہر [illegible] پاش
گھر لئے جاتا ہے یہ شعلہ بجھانے کے لئے — اپنے بچوں کی سوتیلی ماں بنانے کے لئے
گھر لئے جاتا ہے یہ کونپل مسلنے کے لئے — کہنہ سالی سے جواں عصمت کچلنے کے لئے
لے چلا ہے حُسن کو مذموم کرنے کے لئے — ازدواجی لطف سے محروم کرنے کے لئے
گھر لئے جاتا ہے یہ غنچہ مٹانے کے لئے — کمسنی ہی میں اسے بیوہ بنانے کے لئے
ہنس رہی ہے سنگدل ماں خوش ہے دُنیا دار باپ — ختم کرنے کو ہے پنڈت آخری "منتر" کا جاپ

خود غرض، مکار اور سُبزدل برائی شاد کام
ہو رہا ہے ایک دوشیزہ کے خوں کا اہتمام

بخیل کا گدھا

ایک مصری افسانے کا ترجمہ

از جناب سید اصغر علی سکندرآبادی

کسی زمانہ میں قاہرہ میں ایک آدمی تھا جسے اپنے باپ سے ورثہ میں دو ہزار قرش کی دولت ملی تھی۔ اور مصر کے ایک قرش کی قیمت ہمارے ہندوستانی سکہ کے لحاظ سے ڈھائی آنے کے برابر ہوتی ہے۔ بہرحال آپ اس کا حساب لگا کر معلوم کر سکتے ہیں کہ رجب اتنا مالدار نہ تھا جتنا بعض خیال کرنے لگتے ہیں۔

اس رقم کے مصرف کا سب سے زیادہ دانشمندانہ طریقہ بلاشبہ یہ تھا کہ اسے کسی تجارت میں لگا دیا جاتا۔ لیکن رجب ایک نہایت دلکش اور حسین لڑکی سے محبت کرتا تھا اور اس کے تمام خیالات ایک ایسا گھر بنانے کی طرف متوجہ رہتے تھے جہاں وہ شادی کے بعد خوش و خرم رہ سکیں۔

وہ اس سے بالکل اتفاقیہ طور پر باغ کے ایک حوض پر ملا تھا اور جب اس نے پانی پینے کے لئے اپنی نقاب کو سرکایا تو اس نے اس کا چہرہ دیکھ لیا۔ وہ سادہ پوشاک میں ملبوس تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک غریب لیکن باعزت خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔

رجب اس کے پیچھے پیچھے گیا یہاں تک کہ وہ ایک صاف ستھرے چھوٹے سے مکان میں داخل ہو گئی۔ جب اس نے پڑوس کے لوگوں سے دریافت کیا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ عادات کے لحاظ سے بھی اتنی ہی اچھی ہے جتنی خوبصورت ہے۔ چنانچہ وہ فوراً ہی اس کے والدین سے ملا اور ان سے درخواست کی کہ وہ اپنی لڑکی اس کے نکاح میں دیدیں۔

اُن کی باتوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اُس شخص سے شادی کرنے کے لئے آمادہ ہوں گے جس کے پاس پانچ ہزار قرش ہوں۔ اس سے رجب کو بڑا رنج ہوا اور خاص طور پر اس وقت جب وہ انہیں ان کے ارادے سے باز نہ رکھ سکا۔ بالآخر اس نے تھوڑی سی مہلت مانگی تاکہ اس عرصہ میں یہ معلوم کر سکے کہ آیا اس مطلوبہ رقم کے حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ بھی ہے۔

"افسوس!" جوان آدمی نے جب وہ وہاں سے چلا تو کہا "مجھے اپنی زندگی کے اس زمانہ کا کس قدر افسوس ہے جو میں نے ضائع کر دیا! اگر میں چند سال قبل محنت کرنا شروع کر دیتا تو میں اس بیوی کو حاصل کرنے کے لئے جس کی مجھے خواہش ہے کافی امیر ہوتا۔

اس نے اپنی رقم نکالی اور اسے بار بار گنا گویا ایسا کرنے سے وہ اس میں اضافہ کر سکتا ہے ــــ دو ہزار قرش ــــ نہ کم نہ زیادہ اور اسے چند دن میں پانچ ہزار کی ضرورت تھی ورنہ ممکن ہے کہ وہ دوشیزہ جس سے وہ محبت کرتا تھا کسی دوسرے شخص کو بیاہ دی جائے۔ یہ امر تعجب خیز نہیں کہ اس رات جب وہ بستر پر لیٹا تو اسے نیند نہ آئی۔ وہ روپیہ پیدا کرنے کے ہر ممکن اور غیر ممکن طریقہ پر غور کر رہا تھا جو اس وقت بھی اتنا ہی دشوار تھا جتنا اس سے پہلے۔

آخرکار اس کے دماغ میں ایک اُمید افزا خیال پیدا ہوا قاہرہ سے بہت دُور ایک شہر میں اس کا ایک ماموں تھا جسے بہت مالدار خیال کیا جاتا تھا۔

"میں ان کی ملاقات کو جاؤنگا" رجب نے اپنے دل میں کہا۔ "اور اگر میں ان کی امداد طلب کرنے کی وجہ انہیں سمجھا دونگا تو یقیناً ایک ماموں کے لئے ان تین ہزار قرش کے لئے جن کی مجھے ضرورت ہے انکار کرنا بالکل غیر فطری ہے۔"

جوں جوں وہ اس کے متعلق زیادہ غور کرتا اتنا ہی وہ زیادہ متفکر ہوتا جاتا تھا۔ وہ صبح ہونے کا بڑی بےچینی سے انتظار کر رہا تھا تاکہ اپنے سفر پر روانہ ہو سکے اور خرچ سے بچنے کے لئے پیدل جائے۔

جب وہ اس شہر کے قریب پہنچا جہاں اس کا ماموں رہتا تھا تو اس نے چند لڑکوں سے مالدار یوسف کے مکان تک پہنچانے کو کہا۔ انہوں نے ایک بیہودہ قہقہہ لگایا۔ "فی الحقیقت مالدار یوسف! بلکہ کنگال اور بڈھا بخیل یوسف کہئے جو اتنا کمینہ ہے کہ ایک ہڈی کو بار بار اُٹھانے کے بعد بھی نہیں پھینک دیتا۔"

ذرا غور کیجئے کہ کس طرح غریب نوجوان کا دل بیٹھ گیا ہوگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا یہ سفر بالکل بیکار رہیگا۔

اگر اس کا ماموں اتنا زیادہ کنجوس تھا ....

.... تو اس سے ایک ضرور تمند بھانجے کو تین ہزار قرش کی رقم قرض دینے کی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔ [illegible] سے

ایک کو گھر کا راستہ دکھانے کے لئے اپنے ہمراہ لیا۔ ایک میلا کچیلا اور بد مزاج شکل کا بڈھا آدمی دروازے پر آیا۔

"تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" اس نے دریافت کیا۔

غریب رجب اپنی مایوسی کو مشکل سے چھپا سکا اور اُسے بالکل یقین ہو گیا کہ درحقیقت روپیہ اُدھار لینے کے لئے بہت ہی معمولی سا ہے لیکن اس نے مصیبت کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ اس نے اپنے ماموں کو انتہائی شائستگی سے مخاطب کیا۔

"ماموں میں آپ کی حقیقی بہن کا لڑکا ہوں۔ میں قاہرہ کا رجب ہوں۔ کیا آپ میرا خیر مقدم نہیں کریں گے کیونکہ میں نے آپ کی ملاقات کے لئے اتنا لمبا سفر طے کیا ہے؟ میرے عزیز ماموں، آپ کی صحت کیسی ہے؟"

"صحت تو کافی اچھی ہے لیکن غریب ہوں ——— افسوسناک طور پر غریب" بوڑھے آدمی نے انتہائی ناخوشگوار لہجہ میں جواب دیا۔ "میرے بھانجے، درحقیقت میں تمہیں واپس نہیں کر سکتا لیکن تمہارا یہ ورود بہت ہی تکلیف دہ رہے گا۔"

"اس کا کچھ خیال نہ کیجئے" رجب نے واقعات پر قناعت کرنے کا مصمم ارادہ کرتے ہوئے کہا۔ "امیری اور غریبی دونوں خدا کی دی ہوئی ہیں۔"

یوسف کا کمرہ جس میں وہ اپنے غیر متوقع مہمان لے گیا بہت تاریک اور گندہ تھا اور ہر قسم کے فرنیچر سے خالی معلوم ہوتا تھا۔ ایک پرانی چٹائی اور پانی کے ایک گھڑے کے علاوہ وہاں کوئی چیز دیکھنے تک کو نہ تھی۔ وہ شام کا کھانا جو ناقص پنیر اور روٹی کے سوکھے ہوئے ٹکڑوں پر مشتمل تھا کھانے کے لئے زمین پر بیٹھ گئے۔

رجب کو معلوم نہ تھا کہ پنیر اس کی تواضع کے لئے لایا گیا ہے اور ہمسایہ لوگ جنہوں نے بوڑھے آدمی کو اسے خریدنے کے لئے باہر جاتے دیکھا تھا حیرت سے انگشت بدنداں رہ گئے تھے۔ انہوں نے یہ خیال کیا کہ ضعیف یوسف بالکل پاگل ہو گیا ہے۔

جوان آدمی مرغن غذائیں کھانے کا عادی نہ تھا لیکن اتنے لمبے پیدل سفر کے بعد اسے بہتر خوراک کی ضرورت تھی۔ لیکن پھر بھی اس نے اپنی تکان اور بھوک کے متعلق کچھ نہ کہا بلکہ گفتگو کا رُخ اُن موضوعات کی طرف پھیرنے لگا جو اس کے ورود سے متعلق تھے۔

بوڑھا یوسف اس کے اشارات سمجھنے کے لئے بیوقوف نہ تھا۔ "میرا خیال ہے کہ تم مجھ سے مدد چاہنے کے لئے نہیں آئے ہو" اس نے بلند آواز سے کہا۔ "میں ایک فقیر سے زیادہ نہیں۔ دُنیا میں مجھ سے زیادہ غریب کوئی دُوسرا آدمی نہیں ہے۔ میں نے فی الحقیقت اپنا آخری سکہ تمہارے کھانے پر صرف کر دیا ہے اور تمہیں انتہائی شکرگزار ہونا چاہئے کہ میرے پاس خرچ کرنے کے لئے یہی ایک سکہ تھا۔"

پھر بھی رجب نے اس لڑکی کی دلکشی اور نیکی کا تذکرہ کر کے جسے وہ اپنی بیوی بنانا چاہتا تھا بوڑھے کنجوس کا دل نرم کرنے کی کوشش کی۔ یہ دیکھ کر کہ اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا وہ آخرکار اُٹھ کھڑا ہوا اور کہا کہ میں تازہ ہوا میں گھومنا چاہتا ہوں۔

گھر کے باہر ایک چھوٹے سے چھپر میں ایک انتہائی مصیبت زدہ اور دُبلا پتلا گدھا پڑا ہوا تھا جو بچا کھچا بھُس کھا رہا تھا۔ رجب جانوروں سے بہت زیادہ محبت کرتا تھا اور ان کے ساتھ بُرا سلوک ہوتے دیکھ کر برداشت نہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ غریب حیوان پر جس کا بظاہر بھوک کے مارے لبوں پر دم تھا رحم کھا کر اس نے ایک دوکان تلاش کی جہاں سے اس نے کچھ جَو خریدے اور گدھے کے آگے ڈال دیئے۔

یوسف کے مکان پر واپس آ کر اس نے فرش پر پڑے پڑے سوتے ہی رات گزار دی کیونکہ وہاں اس کے ماموں کے لئے بھی کوئی پلنگ نہ تھا چہ جائیکہ کسی مہمان کے لئے ہو۔

صبح ناشتہ کے بعد جو پنیر کے باقیماندہ حصوں اور کچھ سوکھے ٹکڑوں پر مشتمل تھا ضعیف ماموں نے اپنے مہمان سے بازار تک ہمراہ چلنے کو کہا۔ "میں ایک گدھا فروخت کرنے جا رہا ہوں" اس نے کہا "میری ساری ملکیت میں صرف یہی ایک گدھا ہے جو باقی بچا ہے" اور یہ کہکر اس نے افسردگی سے ایک آہ کھینچی۔

رجب تیار ہو گیا اور وہ دونوں چھپر کی طرف گئے۔ جونہی اس نے غریب جانور کو چمکارا دھتکارا اور اس کی طرف ایسی آنکھوں سے دیکھا گویا بے انتہا منت سماجت کر رہا ہو۔ جوان آدمی کو یوں محسوس ہوا جیسے گدھا کہہ رہا ہو "مجھے خرید لو! مجھے خرید لو!"

رجب کا یہ اعتقاد کہ بدبخت جانور اس کی امداد اور محافظت طلب کر رہا ہے اس قدر راسخ تھا کہ بازار کو جاتے ہوئے وہ تمام رستے یہی سوچتا رہا کہ آیا اُسے اس مصیبت زدہ جانور پر رحم کھا کر خرید لینا چاہئے یا نہیں۔ وہ جوان تھا اور اس میں اس کے سوا کوئی خرابی نہ تھی کہ اسے خوراک کی ضرورت تھی۔

گدھے کی مختلف بولیاں دی گئیں۔ ایک شخص نے تین سو قرش پیش کئے۔ دوسرے نے کہا کہ میں پانچ سو دینا دوں گا۔

یہ دیکھ کر کہ اسکا ماموں آخری بولی پر نیلام بند کرنے پر آمادہ معلوم ہوتا ہے۔ رجب نے یہ یقین کرتے ہوئے کہ وہ جانور کا مالک بن جائیگا خود چند قرش اور بڑھا دیئے۔

"تم اس کا کیا کرو گے؟" اس کے ماموں نے کہا۔

"میں اسے لینا چاہتا ہوں ـــ ساری بات یہ ہے۔" رجب نے جواب دیا۔

"تو پھر تم اس وقت تک اپنی خواہش پوری نہ کر سکو گے جب تک مجھے ایک ہزار قرش نہ دو گے۔" بخیل نے زور سے کہا۔ "تمہارے واسطے میری یہ قیمت ہے، اور تمہیں یہ قم مجھے دینی چاہیئے کیونکہ تم جانتے ہو کہ میں ایک تباہ حال آدمی ہوں اور صرف یہ ایک گدھا ہے جو دنیا میں میری ملکیت ہے۔"

پھر غریب جانور کی آنکھیں رجب کے چہرے کی طرف مڑیں، اس نے قیاس کیا کہ وہ بے زبانی سے خوشامد کر رہا ہے "مجھے خرید لو! مجھے خرید لو!" اس نے اپنے اندر ایک زبردست تحریک محسوس کی جس کی وہ توضیح نہ کر سکتا تھا ـــ بھوکوں سے ادھ موئے گدھے کا مالک بننے کی تحریک۔

"بہت اچھا ماموں، میں آپ کو ایک ہزار قرش ادا کرونگا" اس نے کہا۔ "لیکن یہ کچھ مہنگا معلوم ہوتا ہے۔"

واقعہ یہ ہے کہ در اصل رجب اس رقم کو جو اس کے پاس تھی گھر پر حفاظت سے تالے میں بند کر آیا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے ماموں سے ایک ہزار قرش لانے کے لئے قاہرہ واپس چلنے کیلئے کہا اور اس کے قیام کے دوران میں اس نے ضعیف آدمی کی خاطر مدارات کرنے میں انتہائی احتیاط سے کام لیا۔ گدھا آقاؤں کی تبدیلی سے بالکل مختلف جانور معلوم ہوتا تھا۔ وہ خوب چست و چالاک ہو گیا تھا۔

دو یا تین دن بعد بوڑھا یوسف اپنے ایک ہزار قرش ہمراہ لیکر اپنے دور دراز مکان کو واپس ہوا اور اب تک یہی کہتا رہا کہ دنیا میں صرف یہی اسکی پونجی ہے جسے وہ ساری عمر اپنے ساتھ رکھے گا۔ کیونکہ اس کے پاس کوئی اور چیز فروخت کرنے کے لئے نہیں ہے لیکن اپنے گھر کو جاتے ہوئے راستہ میں غریب بوڑھے کنجوس پر قزاقوں نے حملہ کیا۔ اس کا مال لوٹ لیا اور اسے قتل کر دیا جس کی خبر جلد ہی قاہرہ پہنچ گئی۔

حصول رجب کو اپنے ماموں کی موت کا بڑا افسوس ہوا حالانکہ اب وہ اس واقعہ کی وجہ سے زیادہ مالدار ہونے کی توقع نہ رکھتا تھا۔ وہ گدھے پر سوار ہو کر یوسف کے مکان کو روانہ ہوا اور تجہیز و تکفین کا انتظام کیا۔ منحوس مکان میں کوئی قیمتی چیز پاسکہ دکھائی نہ دیتا تھا۔

لیکن گدھا جو پھر پرانے چھپر میں باندھا گیا تھا بیچین و مضطر معلوم ہوتا تھا اور اس قدر مسلسل طور پر زمین پر ٹاپیں مار رہا تھا کہ اس کا مالک پریشان ہو گیا اور اس کے آگے تازہ خوراک اور پینے کے لئے پانی لا کر رکھتا رہا۔

پھر بھی جانور ٹاپیں مارتا رہا اور سموں سے زمین کھودتا رہا یہاں تک کہ آخر کار رجب نے ایک زنگ آلود بیلچہ اٹھایا اور مٹی ہٹانی شروع کر دی۔ گدھا ایک قسم کے اطمینان سے اسے حیرت انگیز آنکھوں سے دیکھنے لگا جیسے وہ کہہ رہا ہو "کھودے جاؤ۔ کھودے جاؤ۔ تم اب سیدھے راستہ پر ہو۔"

تھوڑی دیر میں اس نے لوہے کا ایک مضبوط صندوق کھود کر نکالا جسے کھولنے پر معلوم ہوا کہ ہسپانیہ کے طلائی سکوں۔ وینس کی اشرفیوں اور ہر قسم کے قیمتی سکوں سے پر تھا۔

لیکن گدھے نے اسے آرام نہ لینے دیا۔ اس نے سائبان کے دوسرے حصہ میں زمین پر ٹاپیں مارنا شروع کر دیں۔

رجب نے پھر کدال اٹھائی اور محنت سے کھودنے کے بعد ایک دوسرا صندوق زمین سے نکالا جو یاقوت۔ زمرد اور بہت سے دیگر بیش قیمت جواہر سے بھرا ہوا ثابت ہوا۔ اس کے بعد گدھا بالکل مطمئن معلوم ہوا جس کا مطلب اس کے نوجوان آقا نے یہ اخذ کیا کہ اب اور کوئی خزانہ نہیں ہے۔

اپنی غیر متوقع دولت کے ہمراہ قاہرہ واپس آ کر رجب نے خوشی سے غور کیا کہ اس کے پاس اب ان پانچ ہزار قرش سے کہیں زیادہ دولت ہے جن کی اس لڑکی سے جس سے وہ محبت کرتا تھا شادی کرنے کے لئے ضرورت تھی۔

وہ اس لڑکی کے والدین کے گھر تیزی سے گیا اور اپنے چند جواہر دکھائے اور چند ہی دن کے عرصہ میں شادی ہو گئی۔

رجب اور اس کی بیوی بہت عرصہ تک خوش و خرم رہے۔ گدھے کے ساتھ جو ان کیلئے اس خوش قسمتی کا باعث ہوا تھا ہمیشہ خاندان کے

بدوی کی مہمان نوازی

تاریخی افسانہ

از الحاج مولینا عبدالقیوم ندوی

ملک عرب اپنی مہمان نوازی اور فیاضی و سخاوت کے لئے ہمیشہ سے مشہور ہے۔ علی الخصوص عرب کے دیہاتی قبائل اور بدوی خاندانوں کو مہمان نوازی کا جو ملکہ حاصل ہے اس پر قدیم اور جدید عربی شعراء کے دواوین اور اشعار شاہد ہیں۔

گرمیوں کا موسم تھا۔ کڑا کے کی دھوپ تھی۔ تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ ایک ہندی مسافر، زبان عربی سے ناواقف، عربی طور طریق سے ناواقف راستوں اور منزلوں سے ناواقف ....

...... قافلہ سے دور، بیاس سے نڈھال، مدینہ کے رستے میں نیم بیہوش پڑا تھا۔ امید نے آنکھیں پھیر لی تھیں۔ آسرے نے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ ذات خداوندی کے سوا کسی پر نہ بھروسہ تھا نہ اعتبار۔ موت ہر طرف منڈلا رہی تھی۔ عالم فانی کی تمام توقعات ایک ایک کر کے منقطع ہو چکی تھیں۔ بیچارہ حد درجہ مایوسی میں ایک طرف گر گیا اور گرتے ہی بالکل بیہوش ہو گیا۔ نہ معلوم اس طرح کب تک پڑا رہا اور نہ معلوم کب تک پڑا رہتا اور اس کی نعش سپرد خاک ہوتی یا جنگلی جانوروں کی غذا بنتی۔

شام ہو رہی تھی۔ عرب کی عورتیں اور دوشیزائیں بکریوں کے ریوڑ چرا کر جلد جلد اپنے اپنے قبیلوں کو واپس ہو رہی تھیں۔ عذرا نے اس زندہ نعش کو دیکھا اور اپنی سہیلی قدسی سے کہا "افسوس کوئی مسافر پانی نہ ملنے کی وجہ سے موت کے گھاٹ اتر گیا۔" قدسی نے کہا "شاید حاجی معلوم ہوتا ہے جو یا تو مدینہ منورہ جا رہا تھا یا واپس آ رہا تھا۔"

عذرا نے جاکر کیفیت معلوم کرنی چاہی مگر قدسی نے حکومت کا خطرہ یاد دلایا کہ کہیں پولیس نہ دیکھ لے اور ہم لوگ مفت میں گرفتار ہو جائیں۔ لیکن عذرا نے ــــ جو خالص النسل بدوی تھی ایک نہ مانی اور قریب جاکر گرد و پیش کے حالات کا جائزہ لینا شروع کیا۔ تو اسے معلوم ہوا کہ مسافر ابھی سانس لے رہا ہے۔ زور سے اپنی سہیلی قدسی کو پکارا اور فوراً پانی منگایا۔ قدسی دوڑ کر نزدیک کے ایک صاف و شفاف چشمے سے پانی لائی۔ عذرا اور قدسی دونوں نے اس پر پانی کے چھینٹے دئے اور منہ میں پانی کے قطرے ٹپکائے مگر وہ اسقدر بیہوش تھا کہ ہوش کا نام تک نہ تھا۔ آخر عذرا اپنی سہیلی کے ساتھ دوڑی ہوئی اپنے قبیلہ میں گئی اور اپنے والد کو اطلاع دی؛ والد یہ سنتے ہی دو ایک اور نوجوانوں کو ساتھ لے کر فوراً اسجگہ پہنچا جہاں مسافر جاں بلب پڑا تھا، یہ لوگ اسے اپنے مکان میں لے گئے۔ کچھ جڑی بوٹیوں کو پیس کر سر پر لگایا۔ کچھ ناک میں سنگھایا اور اس عمل سے مسافر کو کچھ ہوش آگیا۔ بس پھر کیا تھا سارے گھر میں خوشی ہی خوشی تھی۔ عید اور شب برات کا نقشہ تھا۔ سب سے زیادہ خوشی عذرا اور اس کے والد کو تھی۔ عذرا کی والدہ بھی خوش تھی۔

اسے آئے ہوئے تین دن گزر گئے، اب ذرا قوت بھی آگئی تھی۔ مسافر نے جانے کا ارادہ کیا۔ مگر عذرا کے باپ نے کسی طرح نہ جانے دیا۔ تب اس کی بیوی نے عربی میں کہا کہ "روک تو رہے ہو مگر کھانے کو کچھ نہیں ہے۔ تین بکریاں تھیں جو تم نے اسے تین دنوں میں کھلا دیں"۔ اس پر اس نے خاموشی اختیار کی اور قدرے سوچ میں پڑ گیا۔ اچانک کسی خیال سے وہ پھر مطمئن ہو گیا اور مسافر کی دلجوئی میں لگ گیا ــــ ان کے پاس اب صرف ایک اونٹ رہ گیا تھا جو ان کی ساری پونجی اور خاندان کا جو

عذرا، عذرا کی ماں اور باپ پر مشتمل تھا) کی روزی کا واحد ذریعہ تھا۔ آخر عذرا کے والد نے کھانے کے وقت چھری تیز کی اور اونٹ کی طرف بڑھا۔ عذرا کی والدہ سے یہ ضبط نہ ہوسکا اور فوراً اونٹ پر لیٹ گئی۔ مگر عذرا کے والد کی بدویانہ شرافت نے ہرگز گوارا نہ کیا کہ گھر میں ایک آخری چیز رہتے ہوئے بھی مہمان بھوکا رہے۔ بالآخر اس نے اونٹ ذبح کر دیا اور گھر اور خاندان کا آخری ذریعہ معاش بھی پردیسی مہمان کی نذر کر دیا۔

اب مسافر بالکل ٹھیک ہو چکا تھا اس نے جانا چاہا تو عذرا کے والد کے آنسو نکل آئے ——— اپنی بے بسی پر، اپنی بے بضاعتی پر اور مہمان کی حسب مرضی خاطر نہ کرنے پر ——— مسافر رخصت ہوا۔ یہ بھی اس کے ساتھ رستہ بتانے کے لئے چلا۔ گھر میں آج مکمل فاقہ تھا کیونکہ اُن کی تمام ظاہری کائنات مہمان نوازی کی نذر ہو چکی تھی مگر اس کے باوجود ان سب کے چہرے اس دمک رہے تھے کہ ان کا سامان ضائع نہیں گیا تھا بلکہ ایک مسافر پردیسی مہمان کی خاطر صرف ہوا تھا۔ جس سے بڑھ کر ان کے نزدیک اس کی کوئی قیمت نہ تھی!

اللہ تعالےٰ کسی کی محنت رائگاں نہیں کرتا۔ یہ مسافر حیدرآباد دکن کے کسی امیر گھرانے کا فرد تھا جو اتفاقی طور پر اس کیفیت میں مبتلا ہو گیا تھا۔ جیسے ہی وہ سڑک پہ پہنچے اس کے قافلے کے افراد سخت بے چینی میں اسے تلاش کر رہے تھے۔ مسافر کو دیکھ کر باغ باغ ہو گئے۔ ہندی مسافر نے سارا ماجرا ساتھیوں سے کہہ سنایا اور معاً بعد ایک سو نقد اشرفیاں اُسے دینا چاہیں۔ لیکن اُس نے لینے سے بالکل انکار کر دیا۔ ان لوگوں نے ہرچند کوشش کی مگر وہ نہ مانا اور یہ کہہ کر چلا گیا کہ "اس دن سے زیادہ میرے لئے شرم اور غیرت کا دن کونسا ہوگا جب ہم اپنے مہمانوں سے معاوضہ لینا شروع کر دیں گے۔"

اس واقعہ کے عین تیسرے روز حکومت کی طرف سے ایک بڑا افسر دو ہزار ریال تقریباً ۲۱۰۰ روپیہ معہ گرانقدر خلعتِ سرداری، اس کے دروازے کے سامنے لئے کھڑا تھا اور قبیلے کے افراد خوش ہو ہو کر مبارکباد پیش کر رہے تھے۔

نوائے درد

جناب معین الدین درد لکھنوی

کیوں نہ آہ و بکا کرے کوئی ۔ دل جلے جب تو کیا کرے کوئی

میرے دل میں بسا کرے کوئی پھر مجھی سے حیا کرے کوئی

کس قدر نامہ بر روانہ ہوں خط کہاں تک لکھا کرے کوئی

ٹیگور

از:

جناب عزیز احمد صاحب

چھپ گیا وہ آسمانِ شاعری کا آفتاب
جس کی پرتو سے ہیں تابندہ ہزاروں ماہتاب

یاد جس کی زندگی کا جزو بنکر رہ گئی
دیدہ و دل میں بسی ہے جس کے گیتوں کی کتاب

دہر بیت بھی معتقد تھی مادیت بھی اسیر
اہلِ یورپ کو پلائی جس نے عرفاں کی شراب

گرچہ وہ بھی تھا اسی ہندوستاں کا ایک فرد
روح آزادی کی خاطر کھا رہی تھی پیچ و تاب

دل کے گوشے میں نہاں ہے جس کی ہر سو ہے تلاش
کہہ کے یہ اُس نے کیا انوارِ حق کو بے حجاب

مُلک کی شیرازہ بندی میں ہے نصرت کی کلید
بارہا اُس نے دیا ہے یہ پیامِ لاجواب

کون کہتا ہے کہ نام اُس کا جہاں سے مٹ گیا
درحقیقت وہ پئے آسودگی ہے محوِ خواب

غزل

از:۔ جناب اختر ہوشیارپوری
بی۔اے۔ ایل ایل۔بی

یہ کرامت ہے جنوں کی، یہ ہے وحشت کا کمال
ہم نے ہر ذرّے کو رشکِ صد بیاباں کر دیا

قطرہ قطرہ میں جمالِ ہم نشیں ہے جلوہ گر
آنسوؤں نے میری محفل میں چراغاں کر دیا

مَیں تو تھا بیتاب رازِ دل چھپانے کیلئے
خامشی نے دل کو چہرے پر نمایاں کر دیا

جب یہ دیکھا تہ نشینی ہی کا رُتبہ ہے بلند
ہم نے خود اپنا سفینہ نذرِ طوفاں کر دیا

مجھ کو ہے ہر بتکدے میں یہ ملا دیدارِ دوست
کفر کو ایسی ترقی دی کہ ایماں کر دیا



یہ عورت
لیکوریا کی بیمار تھی
جوان تھی
اور اتنی خوبصورت کہ دیکھنے والے
دیکھتے رہ جاتے تھے۔ مگر جب..
سیلان الرحم کی بیمار ہوگئی
تو شباب کا رنگ روپ ڈھل گیا اور
زندگی کے لالے پڑ گئے۔
بستر پر لیٹ گئی
اس کو پانی گرنے کی بیماری ہوگئی تھی
ہر وقت یا کبھی کبھی یا ماہواری کے آگے پیچھے اس کے خفیہ جسم سے
سفید رطوبت جانے لگی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ بیماری بستر پر دراز
ہوگئی۔ جوانی کا رنگ روپ اڑ گیا۔ چہرہ زرد پڑ گیا مگر جب اس
نے اپنی سہیلیوں سے سنا کہ لیکوریا یعنی سیلان الرحم کی بیماری
کو دوا "روک" صرف تین دن میں ختم کر دیتی ہے تو اس نے
بھی ایک شیشی منگا لی۔ اور دوا کا استعمال شروع کر دیا۔
ٹھیک تیسرے دن پانی آنا بند ہوگیا اور یہ پھر تندرست ہوگئی۔
دوا "روک" اس مرض کا سب سے بڑا علاج ہے۔
جس عورت کو پانی گرنے کی بیماری (یعنی لیکوریا) ہو جائے
اُسے چاہیئے کہ
لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ اے بی ۳۲ دہلی
کے پتہ پر خط لکھ کر دوا "روک" کی ایک شیشی بذریعہ
وی پی پارسل منگا لے اور استعمال شروع
کرے۔ ٹھیک تیسرے دن ہی پانی آنا بند
ہو جائے گا۔ بارہ سال کی آزمودہ دوا ہے۔ ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں مشہور ہے کہ ایک ہی شیشی عورت کو تندرست کر دیتی ہے۔ ایک
شیشی دوا روک کی قیمت تین روپے ہے۔ سات آنے پارسل پر محصول لگتا ہے۔

حجاج کی بذلہ سنجی

لطائف العرب

از جناب نور احمد خاں منشی فاضل

قدسیوں کے بھی ہوش اڑتے ہیں ‌‌ سُن کے اس مشتِ خاک کی باتیں

حجاج کا نام ظلم وستم میں حاتم کی سخاوت سے کچھ کم مشہور نہیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز فرمایا کرتے تھے کہ اگر قیامت کے دن ساری امتیں اپنے اپنے زمانہ کے بدکاروں کو پیش کریں اور ہم مقابلے میں صرف حجاج کو کھڑا کر دیں تو واللہ ہمارا پلّہ بھاری رہے گا۔

اس میں کچھ شک نہیں۔ کہ حضرت عمرؓ کا یہ قول مبالغے سے بالکل پاک ہے۔ کیونکہ صرف صحابہ کرام اور ائمہ عظام جو اس نے قتل کرائے۔ ان کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار سے کچھ اوپر بیان کی جاتی ہے۔ یہ سفاک ترین انسان اموی عہد کا ہولناک گورنر تھا اور اس نے عبدالملک بن مروان اور ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں کوفہ، البصرہ اور حجاز کے خطہ ہائے پاک میں خون کی ندیاں بہا دی تھیں۔ یہ اتنا خونریز حاکم ہو گزرا ہے۔ کہ آج بھی عرب کی خواتین جب بچوں کو ڈرانا چاہتی ہیں تو کہتی ہیں جاء الحجاج (حجاج آیا) قارئین کرام یہ سُن کر حیران ہوں گے۔ کہ قدرت نے اسقدر تندی و تیزی کے ساتھ ساتھ حجاج کو ظرافت اور بذلہ سنجی سے حصہ عطا کرنے میں بھی کمال فیاضی سے کام لیا تھا۔ چنانچہ آج کی مجلس میں عالمگیری برادری کی ضیافت طبع کے لئے اس کے چند لطائف پیش کئے جاتے ہیں۔ جو جہاں عوام کی تفریح طبع کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ وہاں ارباب بصیرت کے لئے عبرت و حکمت کا مواد بھی۔

(۱)

امیر المومنین عبدالملک ۔ حجاج! کوئی شخص ایسا نہیں جو تیرے عیوب سے واقف نہ ہو۔ مگر پھر بھی کئی باتیں ایسی ہونگی جن کو تیری ہی ذات خوب جانتی ہوگی میں چاہتا ہوں کہ تم خود اپنے عیوب بیان کرو!۔

حجاج۔ امیر المومنین! مجھ میں تین اتنے بڑے عیب ہیں کہ شائد کسی اور کو لاحق نہ ہوں!

عبدالملک ۔ وہ کون سے؟

حجاج ۔ (۱) افسران بالا کی خوشامد کرتا ہوں۔

(۲) ہم مرتبہ لوگوں سے حسد کرتا ہوں۔

(۳) زیردستوں پر ظلم کرتا ہوں۔ (شافعی)

(۲)

حجاج نے عبدالملک کی خدمت میں ایک مکتوب لکھا کہ میں نے قرآن مجید میں جب یہ آیت پڑھی کہ

اُولٰئِکَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْہِمْ مِنَ النَّبِیِّیْنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّہَدَآءِ (یعنی وہ لوگ جن پر اللہ نے اپنی نعمتیں بھیجی ہیں۔ نبی ہیں۔ صدیق ہیں اور شہید ہیں) دل میں آیا کہ ان کے آگے لفظ والخلفاء کو بھی زیادہ کر دوں۔

عبدالملک نے خط پڑھ کر کہا۔ قاتلہ اللہ یعنی خدا حجاج کو مارے۔ نامراد قرآن میں بھی تحریف کرنے سے نہیں جھجکتا۔ (نثر الدار)

(۳)

عبدالملک ۔ اے حجاج! تجھ سے شیطان کو کیا نسبت ہے؟

حجاج ۔ جب بھی شیطان مجھے دیکھتا ہے مجھ سے مشورہ لیتا ہے۔ (شافعی)

(۴)

جن دنوں حجاز حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے قبضہ میں تھا۔ عبدالملک نے لوگوں میں ہردلعزیز بننے اور مذہبی تقدس حاصل کرنے کے لئے بیت المقدس پر توجہ مبذول کی۔ حجاج کو لکھا کہ مسجد سلیمان کے آگے میرے نام کا ایک بڑا دروازہ تعمیر کیا جائے۔ حجاج نے درخواست کی کہ مجھے بھی اپنے نام کا ایک دروازہ بنانے کی اجازت دی جائے۔ عبدالملک نے لکھا کہ ہاں تم بھی اپنے نام کا دروازہ تعمیر کر سکتے ہو۔ بشرطیکہ امیر دولت کے دروازہ سے زیادہ خوشنما اور آراستہ نہ ہو۔ حجاج "بہت خوب" کہہ کر تعمیل حکم کے لئے بیت المقدس روانہ ہو گیا۔ مسلسل تین ماہ کے بعد دونوں دروازے بن کر تیار ہو گئے جو شکل و صورت میں ایک دوسرے سے مختلف تھے ....

..... مگر قضا کار چند دنوں کے بعد عبدالملک کے دروازے پر بجلی گری۔ جس سے وہ جل کر گر پڑا۔ وہاں کے لوگوں نے عبدالملک کو "احرق الباب" کی اطلاع دی۔ جس سے وہ سخت برہم ہوا۔ حجاج کو لکھا کیا وجہ ہے۔ تیرے دروازے کو تو کچھ گزند نہیں پہنچا۔ مگر میرا جل گیا ہے۔ حجاج نے جواب میں لکھا۔

"اذ قربا قربانًا فتقبل من احدھما، ولم یتقبل من الآخر"

کہ ہابیل اور قابیل کی قربانیاں منظور ہونے کے لئے پہاڑ پر رکھی گئی تھیں۔ جس کی منظور ہونی تھی آسمان سے آگ گری اور اسے جلا گئی اور یہی کیفیت ہمارے دروازوں کی ہے۔ ہم دونوں نے دروازے بنائے اور جس کا دروازہ منظور بارگاہ ہونا تھا آسمانی آگ سے جل گیا۔ عبدالملک ان کلمات سے خوش ہو گیا۔

---

(۵)

ایک دفعہ حجاج انتہائی گرمی میں اکیلا مدینہ طیبہ (زادہ اللہ شرفاً و تعظیماً) سے نکلا۔ کچھ دور ایک بستی تھی۔ وہاں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ ایک کسان زراعت کاری کر رہا ہے۔ پوچھا:۔

حجاج ۔ میاں بوڑھے! حجاج کیسا مرد ہے؟

دہقان ۔ فاسق۔ فاجر۔ غدار اور بدکردار آدمی ہے۔

حجاج ۔ کیا تم مجھے پہچانتے ہو؟

دہقان ۔ نہیں۔

حجاج ۔ میں حجاج ہوں۔

دہقان ۔ کیا تو مجھے پہچانتا ہے؟

حجاج ۔ نہیں۔

دہقان ۔ میں ابن زبیرؓ کا غلام ہوں اور سال میں تین دن دیوانہ ہو جایا کرتا ہوں اور یہ دن ان تین دنوں میں سے ہے۔

حجاج ۔ دہقان کی حاضر جوابی سے پھڑک اٹھا اور ہنس کر واپس لوٹ آیا۔

---

(۶)

ایک دفعہ حجاج، خالد بن یزید بن معاویہؓ کے سامنے سے گزرا۔ کسی نے خالد سے پوچھا۔ یہ کون ہے؟ خالد نے جواب دیا۔ یہ آدمی "عمرو عاص" ہے یعنی مکاری اور غداری میں اس سے تشابہ رکھتا ہے۔ یہ آواز حجاج کے کانوں تک پہنچ گئی۔ واپس لوٹ آیا۔ اور بولا۔

"خدا کی قسم! میں اس بات پر راضی نہیں ہوں کہ عاص کا بیٹا کہلاؤں۔ میں قریشیوں اور ثقیفوں کے خاندان سے ہوں۔ اور میں وہ شخص ہوں جس نے ایک لاکھ آدمیوں کو صرف اس قصور پر قتل کیا۔ کہ وہ تیرے باپ یزید کو شرابی اور منافق کہتے تھے"۔

(نشر الذار)

---

(۷)

حجاج ایک دن خطبہ پڑھنے کے لئے منبر پر چڑھا اور سلیمان علیہ السلام کی طرح ذیل کی آیت پڑھی۔

رَبِّ ھَبْ لِی مُلْکًا لَا یَنْبَغِی لِاَحَدٍ مِّنْ بَعْدِی

یعنی اے میرے رب! مجھے وہ ملکیت عطا کر اور ملک کی حکمرانی دے۔ جو میرے بعد کسی کو نصیب نہ ہو۔ حجاج نے اس آیہ کریمہ کے ساتھ اِنَّہٗ کَانَ مَحْسُوْدًا ملا کر اس طرح

پڑھا۔

رَبِّ هَبْ لِیْ مُلْکاً لَّا یَنْبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْ بَعْدِیْ

اِنَّهٗ کَانَ مَحْسُوْداً

اس طرح یہ بدبخت حضرت سلیمان علیہ السلام کو حسد سے منسوب کر کے کافر ہو گیا۔

(نثر الدار)

(۸)

ایک دفعہ حجاج نے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری کو بلا کر کہا کہ میرا مال کسی ایسے شخص کو ہرگز نہ دینا جس سے میں وصول نہ کر سکوں۔ سیکرٹری نے دریافت کیا کہ ایسا کون شخص ہو سکتا ہے؟

جواب دیا "مفلس"

(۹)

ایک دفعہ توبہ بن حمیر کی معشوقہ لیلائے اخیلیہ جو بالکل بوڑھی اور بدصورت ہو چکی تھی، کسی کام کے لئے حجاج کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ حجاج اگرچہ خود پاکباز واقع ہوا تھا لیکن طبیعت کچھ حد تک حسن اور شعریت پسند ضرور واقع ہوئی تھی۔ دورانِ گفتگو میں بولا:-

حجاج - لیلیٰ! اب تو تم بوڑھی ہو چکی ہو۔ ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔ کہ توبہ اور تمہارا آپس کا کچھ ناجائز تعلق تو نہ تھا؟

لیلیٰ - واللہ! حجاج!! توبہ اپنے عشق میں ہمیشہ پاکباز رہا۔

حجاج - کیا اس نے تم سے کبھی اس قسم کا مطالبہ بھی نہ کیا تھا۔

لیلیٰ - صرف ایک دفعہ! لیکن جب میں نے اسے یہ دو شعر سنا دیئے۔ تو وہ شرمسار ہو گیا اور پھر کبھی ایسی حرکت نہ کی۔

حجاج - (مسکرا کر) ہاں! کیا وہ شعر میں سن سکتا ہوں؟

لیلیٰ - کیوں نہیں۔ یہ ہیں -

وذی حاجة قلنا له لا تبح بها　　فلیس الیها ما حییت سبیل

لنا صاحب لا ینبغی ان نخونه　　وانت لاخری فارغ وخلیل

ترجمہ:- ایک حاجت کرنے والے نے اپنی حاجت پیش کی۔ تو ہم نے کہا۔ کہ یہ تمہارے لئے جائز نہیں ہے اور زندگی بھر اس کی کوئی راہ نہ ہو گی۔

(۲) ہمارا ایک صاحب ہے جس کی ہمیں خیانت[1] نہیں کرنی چاہیئے اور تم بھی دوسری عورت سے وابستہ اور اس کے شوہر ہو۔

ان باتوں سے حجاج کی طبیعت سیر نہ ہوئی تھی۔ لیلیٰ کو مخاطب کر کے پھر سوال کیا۔

حجاج - کیا توبہ نے اس کے بعد پھر کبھی یہ خواہش ظاہر نہ کی؟

لیلیٰ - ایک دفعہ پھر اس کے دل میں اس آرزو نے جوش مارا۔ مگر اسے منہ سے کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔ ایک دوست کو بھیجا۔ جس نے ہماری فرودگاہ کے نزدیک آ کر یہ شعر پڑھا ؎

عفا اللہ عنها اهل بتین لیلة

من الدهر لا یسری الی خیالها

ترجمہ:- خدا اس کے گناہ معاف کرے۔ بھلا کبھی وہ رات مجھے نصیب ہو گی۔ جو خیال میں بھی نہیں آتی۔ میں نے یہ شعر سن کر معلوم کر لیا کہ توبہ کا قاصد ہے۔ فوراً ٹیلے کے قریب پہنچی اور اسے یہ شعر پڑھ کر سنایا ؎

وعنه عفا ربی واحسن حفظه

عزیز علینا حاجته لا تنالها

ترجمہ:- خدا اس کے گناہ معاف کرے اور اسے اپنی امان میں رکھے۔ اس کی وہ آرزو کبھی پوری نہ ہو گی جو ہمیں بیحد عزیز ہے

حجاج نے خوش ہو کر دس ہزار درہم انعام میں دیئے۔ اور اعزاز و اکرام سے رخصت کیا۔

(۱۰)

ایک عراقی امیر بغاوت کے جرم میں گرفتار ہو کر پیش ہوا حجاج نے حکم دیا کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ امیر نے کہا۔

---

[1] لیلیٰ اور توبہ دونوں شادی شدہ تھے۔ یہاں اس نے اپنے خاوند اور توبہ کی عورت کے حقوق کا اظہار کیا ہے۔ یعنی اگرچہ ہم میں عشق و محبت کا مضبوط رشتہ ہے۔ مگر چونکہ شادی شدہ ہیں۔ اس لئے باہم اختلاط نہیں کر سکتے۔ (فریدی)

عراقی امیر۔ حجاج! میرا آپ پر حق ہے!
حجاج۔ کون سا۔
عراقی امیر۔ فلاں دن عبدالرحمٰن بن اشعث آپ کو گالیاں دے رہا تھا اور یہ بات مجھے ناگوار گزری۔ چنانچہ میں نے اُسے گالیوں سے روک دیا۔
حجاج۔ کوئی گواہ ہے؟
عراقی امیر۔ ہاں میرا یہ دوست جو آپکے سامنے قید ہے۔
حجاج۔ (اس قیدی سے مخاطب ہو کر) کیوں! یہ درست ہے؟
قیدی۔ ہاں یہ بالکل سچ کہہ رہا ہے۔
حجاج۔ تو نے منع کیوں نہ کیا ——؟
قیدی۔ اگر میں سچ کہہ دوں۔ تو کیا اس سے مجھے کچھ نفع پہنچیگا۔؟
حجاج۔ ضرور!
قیدی۔ اس لئے کہ میں تجھے اور تیری قوم کو دشمن سمجھتا تھا۔
حجاج نے کہا کہ ان دونوں کو چھوڑ دیا جائے۔

(ابن خلدون)

کیف و رنگ

(وزیرزادہ) شجاعت خاں مہر جوناگڑھ

فروغِ چشمِ بینا چاہتا ہوں
تجھے ہر شے میں دیکھا چاہتا ہوں

مچا دوں عشق کی دُنیا میں ہلچل
فقط تیرا اشارا چاہتا ہوں

یہی سوزِ دروں کا ہے تقاضا
مثالِ شمع جینا چاہتا ہوں

تمنّاؤں سے عاجز آگیا ہوں۔
بس اب ترکِ تمنّا چاہتا ہوں

طبیعت ہے جو میری انقلابی
نظامِ دہر بدلا چاہتا ہوں

تڑپ کر طائرِ دل کہہ رہا ہے
کہ میں شاخِ ثریا چاہتا ہوں

ہُوا یہ عالمِ تصویر کہنہ
نیا کوئی تماشا چاہتا ہوں

معاذ اللہ مری عصیاں شعاری
تری رحمت کا سایا چاہتا ہوں

سکونِ قلب مل جائے جہاں مہرؔ
کوئی ایسی ہی دنیا چاہتا ہوں۔

خوابوں کی لڑی

حسرتناک افسانہ

از جناب امجد علی خاں یوسف زئی (عثمانیہ)

خواب بھی کبھی بڑے حسین ہوتے ہیں۔ انسان کی فطرت ہی کچھ ایسی ہے کہ اُسے تصورات کی ایک دُنیا بسانے میں خاص لطف حاصل ہوتا ہے۔ کاش وہ خواب سچے ہوتے اور مصور اپنی تصویر میں رنگ آمیزی کر کے اپنے خیال کو سچا کر کے ایک نئی دنیا آباد کر سکتا اور شاعر اپنی خیالی موجوں کو لہراتا ہوا اس میں اصلی جان دوڑا سکتا لیکن حقیقی دنیا تصورات کی دنیا سے، رنگین خوابوں کی سنہری چمک سے علیحدہ ہے اسی پردے میں انسان کی المیہ زندگی چھپی رہتی ہے اور اسی کے نیچے انسانی زندگی کی مسرت رنگینی بنتی ہے۔

تو ایسے ہی کچھ خوابوں کے سہارے زندگی کے دھارے میں رادھا بہتی چلی جا رہی تھی۔ کچھ بکھرے، کچھ سیدھے سادے اور کچھ بڑے اونچے خواب —! دنیا کی پرسکون فضا میں۔ دھان کے پیلے پیلے کھیتوں میں یا سرسوں کے پیلے پیلے پھولوں کے جھرمٹ میں چھپی ہوئی اس کی چھوٹی سی جھونپڑی تھی، پیچھے ہی ایک چھوٹی سی کل کل کرتی ہوئی ندی۔ دو چار آم کے درخت اور اردگرد ایک ہرا بھرا فرش بچھا ہوا تھا گویا دنیا نے سارا سہاگ، ساری امنگیں وہیں بھر دی تھیں ....

..........چھوٹی سی جھونپڑی کے، دو کمرے تھے، ایک میں اس کا اندھا باپ اور دوسرے میں وہ خود رہتی، صرف دو انسان۔

صبح جب افق مشرق کی مانگ سیندور سے بھر جاتی اور جب آسمان سے سورج دیوتا تجلیاں بکھیرتا آتا۔ تب رادھا ہر کو کوٹنے دور گاؤں میں مانگنے چلی آتی، اور جب دھوپ ٹھیک سر پر پڑنے لگتی وہ لوٹ آتی، اس کے بعد ندی کے کنارے دنیا کی ساری کلیلیں گویا اسی ایک لڑکی میں سمٹ آتیں، اس پار ملاحوں کی ایک چھوٹی سی بستی تھی، انسانی زندگی کے لئے سب سے ضروری شے کسب معاش ہے اسی لئے ان ملاحوں کی کشتیاں دن بھر مچھلی کے شکار میں مصروف رہتی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے بھی اس تجارت میں ان کا ہاتھ بٹاتے تھے، ان میں سب سے زیادہ چالاک رتو تھا۔

جب رتو ناؤ لے کر نکلتا، رادھا دوڑ آتی، وہ پکارتا "ماری او رادھا! آ آ جلدی آ۔ آج تو دیر گھاٹ جا رہا ہوں"۔ اور رادھا بولتی "میں ابھی آئی رے"۔ رتو رادھا کو ناؤ میں بٹھا کر کبھی مشرق کی جانب نکل جاتا تو کبھی مغرب کی طرف، اور اس کے پیچھے پیچھے اس کے ساتھی پوری قوت سے ناؤ کھینے لگتے، یوں ہی وہ لوگ کوسوں دور نکل جاتے، اس اندر مچھلی کون پکڑے۔ صرف رتو کھیلتا رہتا اور کہتا۔ دیکھ رادھا میں ہوں اس ندی کی سطح کا راجا اور تم ...... ؟ رتو اکڑ کر بیٹھ جاتا اور رادھا معصوم ہنسی میں لوٹ پوٹ ہو جاتی اور سب لڑکے تالیاں پیٹنے لگتے، کوئی کہتا "ہاں، رتو ٹھیک کہتا ہے اور یہ سب تمہارے ساتھی بھی" اور کوئی کہتا "ہاں جی! اور رادھا ہے رانی"۔ سب ہنس دیتے اور رادھا بھی ہنس دیتی، رتو کہتا تم سب سنو میں گاتا ہوں۔

بہتی ہے یہ جیون دھارا — جیون دھارا رے
آؤ ہم سب ہل مل گائیں۔
امرت کی دھارا برسائیں۔
کیا جانے ہے کون کنارا — کون کنارا رے

سب ٹولی ٹوٹی پھوٹی زبان میں گانے لگتے۔ رتو تو خوب نبھا لیتا کیونکہ وہ کبھی دو دن ایک اسکول میں سیکھا پڑھا تھا۔ گانا ختم کر کے جب یہ ٹولی لوٹتی تو رتو کی خوب مرمت ہوتی۔ کہ مچھلیاں پکڑنے کے عوض اس نے تمام دن کھیل میں گنوا دیا۔ اور رادھا لوٹتی تو ہر کو آ اسے گود میں اٹھا لیتا اور کہتا "بیٹی رتو کے ساتھ کھیل رہی تھی کیوں؟"

"ہاں دادا" وہ جواب دیتی۔

"تو تجھے بھوک نہیں لگی کیا؟ اس وقت ہی کچھ کھایا تھا آ، ذرا کھا لیں"۔ ٹٹولتے ٹٹولتے گھر پہنچتا۔ اور کھانا لا کر رادھا کو اپنے ہاتھوں سے کھلاتا۔ اس کے سوا اور کرتا بھی کیا بے چارہ؟ آنکھیں چھن جانے سے قبل وہ صرف دو نوں تھے۔ وہ اور اس کی بیوی — لیکن اندھا ہونے کے بعد بھی ایک جیوتی بچ گئی تھی۔ تو اسی ایک نور چشم کو وہ اپنے دل سے نہ لگاتا تو کیا کرتا؟ یہ تھا رادھا کا بچپن — اور خوابوں کی پہلی سیڑھی — !!

سات سال بعد——!

ایک مرتبہ پھر بسنت آیا۔ کوئل کی کوک سے سارا جنگل گونج رہا تھا اور ہوا خوشبو اٹھائے لیے لگی، کھلے کھلے سفید پیلے پھول بھنوروں کے پیچھے، پھر جھک کر انگڑائیاں لے رہے تھے، اور اسی زمانہ میں رادھا نے بھی شباب کے سندر میں قدم رکھا۔

اس دن جب رادھا ندی میں اشنان کر کے دھوپ میں بال سکھانے لگی تو بھیگے بھیگے بکھرے بال ایسے معلوم ہونے لگے، جیسے کالے بادل چاند کے پیچھے منڈلا رہے ہیں اسی وقت رتو بھی ناؤ سے کر پہنچ گیا۔ پکارا "اور رادھا رانی ادھر آ، ہم لوگوں کا ندی کا راجہ کتنا حسین دکھائی دے رہا ہے"۔ رادھا کے چہرے پر حجاب کی سرخی دوڑ گئی، سر پر تھوڑا سا کپڑا سرکا لیا۔ مگر وہاں سے نہ ہٹی، رتو نے پھر پکارا لیکن اس کی آواز وہیں فضا میں کانپتی ہوئی گم ہو گئی، رتو سمجھ نہ سکا کہ آخر بات کیا ہو سکتی تھی کل تک تو رادھا اس کے ساتھ آئی تھی، کل تک تو وہ راجہ تھا اور رادھا رانی، پھر بھی اس نے سوچا کہ شاید رادھا کو آج کچھ برا معلوم ہوا ہے اسی لئے وہ نہیں آ رہی ہے، رتو قریب چلا گیا اور پیچھے سے اس کی آنکھیں موند لیں۔ بولا "پہچانو میں کون ہوں" مگر رادھا نے جلدی سے اس کا ہاتھ ہٹا دیا۔ اور رتو کی طرف گھورنے لگی، وہ خاموش کچھ دور کھڑی ہو گئی۔ جیسے کوئی حسین مجسمہ۔ خواب کی لڑی میں سے ایک موتی ٹوٹ کر گر گیا——!

"تو تم نہیں جانتے تھے۔ کہ میری سگائی کی بات چیت پکی ہو گئی — بولو کیوں تم نے میری آنکھیں موندیں؟" وہ سسک سسک کر رونے لگی، نہ جانے جذبات کا کونسا سیلاب اس کے سینہ میں امنڈ آیا تھا۔ رتو کا چہرہ کچھ خوف، کچھ شرم، اور کچھ غم سے بالکل زرد اور پھیکا ہو گیا۔ وہ وہاں ٹھہر بھی نہ سکا تھا، جلدی جلدی قدم بڑھا کر وہ ناؤ پر جا کر بیٹھ گیا۔ ندی میں دور۔ پانی کی سطح پر جہاں آڑی لکیر دکھائی دیتی تھی، اسی لکیر میں نظریں گڑائے وہ چلا جا رہا تھا اور اسی دھارا میں ناؤ بھی اپنے آپ بہتی جا رہی تھی، رتو ایک بت کی طرح بیٹھا تھا۔ پانی کے پرندے اس کے سر پر سے ہو کر دور اڑ جاتے۔ پھولوں کی ڈالیاں اور درختوں کی شاخیں ہوا کے جھونکوں سے جھوم جھوم کر نہ معلوم کیا کہتیں لیکن وہ اتنا ہی جانتا تھا کہ آگے ایک آڑی لکیر ہے ایک وہ ہے اور ایک ناؤ۔ وہ خوابوں کی لڑی میں پھر موتی گوندھنے کی کوشش کر رہا تھا یا گیا۔ کون جانے؟

ناؤ کچھ دور نکل گئی تھی۔ تب کہیں رادھا کا دل آنسوؤں کے ذریعہ سے ٹھنڈا ہوا۔ وہ رتو کو اس نے اتنا سخت سست کیوں کہا؟ اسے اس کا کیا حق تھا؟ اس نے اس کا کیا بگاڑا تھا؟ یہ سوچتی ہوئی رادھا دھڑکتے ہوئے دل سے ادھر دوڑ رہی تھی؟ اس نے پکارا۔ رتو، رتو! سنو تو سنو تو، ہاں جی . . میں . . را . . نی . رتو—— لیکن ناؤ بہت دور نکل چکی تھی، بہاؤ تیز ہو کر پانی کے راجہ کو لئے جا رہا تھا۔ اور کچھ دیر بعد پانی میں ایک کالے دھبے کے سوا کوئی چیز دکھائی نہ دینے لگی۔ رادھا دوڑتے دوڑتے ہانپنے لگی، پیر میں کانٹے چبھ گئے تھے۔ وہ وہیں تھک کر گر گئی اور لیٹ رہی، اس کے دل اور بدن میں اضطراب کی بجلی دوڑ رہی تھی۔ سورج ٹھیک سر کے اوپر آ گیا تھا۔ اور پانی کے پرند سورج کی تیکھی کرنوں کے ڈر سے پانی کی سطح پر گھنی چھاؤں میں آرام کر رہے تھے۔ اور مچھیرے جال اٹھا کر گھر چلنے لگے تھے——!

خوابوں کی لڑی سے تیسرا اور آخری موتی بھی گر کر کب کا ٹوٹ چکا تھا۔

ایک سال بعد——!

ماگھ کا مہینہ۔ صبح کے ستارے آسمان پر کانپ رہے تھے صبح کی ٹھنڈی ہوا خوش خرامی کرتی ہوئی کہر کو پھیلا رہی تھی۔ رادھا کی جھونپڑی اس کہر میں بہت خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔ وہ تمام مہمانوں کے ساتھ اندر بیٹھی تھی۔ کل ہی بیاہ ہوا تھا۔ گاؤں کی مائیں سب ہی آئی تھیں لیکن رتو نہیں آیا تھا۔ رادھا نے یہ خیال کیا کہ کہیں وہ بیمار تو نہیں ہو گیا؟ مگر اس نے کسی سے پوچھا تک نہیں تھا؛ اس کا دل رو رہا تھا۔ شادی تو اس کے پتا نے کی تھی اس میں اس کا کیا قصور؟ اور اس سے رتو کیوں ناراض ہے؟ رادھا یہی سوچ رہی تھی۔

آج صبح ہی دولہے اور پتا کو سوتا چھوڑ وہ اٹھی اور ندی کی طرف چل پڑی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ رتو کا دادا تو گیا ہی ہوگا، اسی سے پتہ لگ جائے گا۔ کہ رتو کا کیا حال ہے؟ اور ممکن ہوا تو وہ اسی ناؤ میں چڑھ کر رتو کو دیکھنے چل جائے گی۔ یہی سوچ کر وہ آگے بڑھی جا رہی تھی، کہر بہت پھیل چکی تھی۔ ندی کے کنارے

پہنچتے ہی اسے کسی کی آہٹ سنائی دی، وہ رستہ میں چلتے چلتے کسی سے ٹکرا گئی۔

"کون؟ بیٹی! میں تو تیرے ہی گھر جا رہی تھی۔" اُسے پہچان کر عورت نے کہا۔ "رَتو بیمار ہے اس نے تیرے بیاہ پر یہ چیزیں بھیجی ہیں۔ ایک کرتی، ایک ساڑی، ایک سینڈور بالکس ایک صابن اور کیا کیا، اس نے یہ بھی کہا ہے کہ میری طرف سے رادھا کو آشیرباد کہنا، اور میری یہ آرزو ہے کہنا کہ وہ مجھے دیکھنے کے لئے نہ آئے لیکن بیٹی بیماری بڑی خطرناک ہے وید یہ کہتے ہیں کہ وہ بچے گا نہیں۔ کچھ نہ کچھ بکتا رہتا ہے۔ رادھا رانی۔۔۔ ناؤ۔۔۔ ندی کنارا۔"

یہ وہ سب کہہ رہی تھی لیکن رادھا کے دل پر کیا بیت رہی تھی اس کی اسے کیا پروا۔ رادھا کی چوٹی سے پسینہ بہنے لگا تھا، اور چہرہ پھیکا پڑ رہا تھا۔

"تو کیا رَتو نے منع کیا ہے، نہیں میں ضرور جاؤں گی ضرور" رادھا اس عورت کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور اس وقت تک روتی رہی جب تک دل کا سارا رنج و غم آنسوؤں کی صورت میں نہ بہہ گیا۔ اس کے بعد وہ بیہوش ہو گئی۔ جھونپڑی میں پہنچتے پہنچتے وہ نیم مردہ سی ہو گئی۔ سورج اب کہر میں سے ایک آدھ کرن باہر پھینک رہا تھا اور خوابوں کی لڑی کا آدھا ٹوٹا ہوا موتی تھی، چوتھائی ٹوٹ گیا تھا۔

دس دن بعد ـــــــ!

ماگھ کے مہینے کی کانپتی ہوئی شام اپنے آنچل میں سورج کی ملائم کرنوں کو جمع کر رہی تھی، ندی کی ساری سطح پر ایک دو کشتیاں نظر آ رہی تھیں۔ چاروں طرف خاموشی حکمران تھی، اور ایک دو پرند فضا میں اڑتے جا رہے تھے۔

(ترجمہ)

جریان کی بیماری —— جوانی کی خفیہ طاقت کے لئے زہر کا کام کرتی ہے
جریان کی بیماری —— انسان کی زندگی اور ازدواجی مسرتوں کا خاتمہ کر دیتی ہے
جریان کی بیماری —— اولاد جیسی بڑی نعمت سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دیتی ہے
جریان کی بیماری —— اچھے خاصے موٹے تازے آدمی کو مجنوں کی شکل بنا دیتی ہے
جریان کی بیماری —— روح کی تازگی اور بدن کی پھرتی کو آناً فاناً میں ملیامیٹ کر دیتی ہے
جریان کی بیماری —— دوستوں اور پاس بیٹھنے والوں میں بھی شرمندہ کرتی ہے
جریان کی بیماری —— انسان کو وقت سے پہلے موت کے گھاٹ اُتار دیتی ہے
جریان کی بیماری —— میں مبتلا ہو کر آدمی اپنے لئے موت کی دعائیں مانگا کرتا ہے
جریان کی بیماری —— سے غفلت کرنیوالا انسان ہمیشہ بیوقوف کہلایا جاتا ہے
جریان کی بیماری —— کا اگر فوراً علاج نہ کیا جائے تو زندگی خطرہ میں پڑ جاتی ہے
جریان کی بیماری —— کی علامت یہ ہے کہ پیشاب کیساتھ ایک سفید رطوبت خارج ہوتی ہے
جریان کی بیماری —— کی علامت یہ ہے کہ انسان کا چہرہ اور جسم زرد پڑ جاتا ہے
جریان کی بیماری —— کی علامت یہ ہے کہ انسان کی آنکھوں کے نیچے حلقہ پڑ جاتا ہے
جریان کی بیماری —— کی علامت یہ ہے کہ وہ شادی اور بیوی کے نام سے کانپتا ہے
جریان کی بیماری —— کی علامت یہ ہے کہ وہ دن بھر سست رہتا ہے اور لیٹا رہتا ہے

اگر کسی مرد کو پیشاب کے بعد سفید قطرہ نکلتا ہو

یعنی پیشاب کرنے کے بعد یا پیشاب سے پہلے سفید رنگ کا پانی خارج ہو تو یہ بہت خطرناک بات ہے اسے جریان کی بیماری کہتے ہیں رفتہ رفتہ یہ مرض بڑھ جاتا ہے۔ تو پھر آدمی شادی کے مطلب کا نہیں رہتا۔ اس کی قوتِ مردمی ختم ہو جاتی ہے۔ اس واسطے جن مردوں کو یہ شکایت ہو یعنی پیشاب کرنے سے پہلے یا پیشاب کے بعد یا . . . . سے پیشتر ہی سفید رنگ کی رطوبت خارج ہو جائے یا رات کو سوتے میں احتلام ہو جائے۔ (یعنی خواب ہو جائے) تو اس خطرناک مرض سے غفلت نہ کرنی چاہیئے۔ ورنہ ایک دن زندگی کا خاتمہ کر دے گا۔

اگرچہ بعض ڈاکٹر اور حکیم اس مرض کو بہت مشکل بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسکے علاج میں کافی روپیہ خرچ ہوگا۔ لیکن یہ اُن کی بھول ہے۔

جریان کا مرض صرف ایک ہفتہ میں ختم کیا جا سکتا ہے

اور صرف ساڑھے تین روپے خرچ ہوں گے۔ دہلی کے مشہور زنانہ دواخانہ کی تیار کردہ دوا "جوہر اعظم" اس مرض کے لئے اکسیر کا کام کرتی ہے۔ صرف ایک شیشی "جوہر اعظم" سے بڑے بڑے پرانے مریضوں کو تندرستی ہو گئی۔ اور اس کے بعد جریان کی بیماری نہیں رہی۔ پیشاب کے بعد سفید قطرہ نکلنا بند ہو گیا۔ ۱۹۲۵ء کے انعامی مقابلہ میں بھی یہ دوا سرِ فہرست رہی اور یقین کیا گیا کہ **"جوہر اعظم"** جریان کے مرض کا بہترین علاج ہے۔ چنانچہ اس وقت سے آج تک اس دوا پر محصول ڈاک معاف ہے۔ جن لوگوں کو ضرورت ہو وہ

مینیجر زنانہ دواخانہ۔ اے۔ بی ۳۴ دہلی کے پتہ پر خط لکھ کر جوہر اعظم کی شیشی بذریعہ وی۔ پی منگا لیں۔ ایک شیشی کی قیمت تین روپے آٹھ آنہ ہے۔ پارسل کا محصول کسی ہندوستانی خریدار سے نہیں لیا جاتا۔

رفتارِ زمانہ

عالمگیر واقعات پر ماہانہ تبصرہ

از ــــــــ شبلی بی کام

رُوس و جرمنی

ماہِ اگست کے شمارے میں بتایا گیا تھا۔ کہ جرمن فوجوں نے بلغاریہ اور رُومانیہ کے رستے یونان پر حملہ بول دیا اور ایک ہی ریلے میں اس مُلک کی سرزمین کے علاوہ کریٹ اور شمال مشرقی بحیرۂ روم کے بعض دیگر چھوٹے چھوٹے جزائر کو بھی اپنے سیلاب استعمار میں بہا لے گئیں۔ اس کے بعد خیال کیا جاتا تھا۔ کہ نازی طوفان اگر ایک طرف نہر سویز کے پھاٹک کھٹکھٹانے لگیگا تو دوسری طرف اس کے دامن کی وسعت جبل الطارق تک جا پہنچے گی لیکن شمالی مغربی افریقہ میں مسولینی کی فوجوں کا شیرازہ بکھر گیا۔ اور اس ریگستان کے ساحلی علاقوں پر برطانیہ کے استحکامات مضبوط ہو گئے۔ اس لئے جرمن فوجوں کو آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اتنے میں برلین و ماسکو کے تعلقات میں رخنہ پیدا ہو گیا۔ بقول ہٹلر رُوس نے ریاست ہائے بلقان اور بحیرۂ اسود میں بعض مراعات کا مطالبہ کیا۔ جن کو جرمنی نے منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رُوس و جرمنی کی نمائشی دوستی کا پردہ چاک ہو گیا۔ بھالو نے دندانِ آز تیز کر نا شروع کر دیئے۔ نازی عقاب اُس کی مملکت پر پَر تولنے لگا اور اچانک ایک صبح اکنافِ عالم میں یہ منحوس خبر سُنی گئی کہ رُوس و جرمنی کی ٹھن گئی ہے اور نازی فوجیں سفید رُوس سے لیکر بحیرۂ اسود کے مغربی ساحل تک دو ہزار میل کے محاذ پر بالشویک رُوس کے خلاف صف آرا ہیں۔ ہٹلر نے رُوس پر تین اطراف سے حملہ کیا یعنی خلیج فن لینڈ، سفید رُوس اور یوکرین۔ خرس و عقاب کی یہ جنگ جتنی خونریز و خونفشاں ثابت ہوئی اُس کی تاریخ عالم میں نظیر نہیں ملتی۔ رُوسی فوجوں نے حملہ آوروں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ لیکن آز موده کار نازی اُن کے سرحدی استحکامات کو پاش پاش کرنے میں کامیاب ہو گئے اور سفید رُوس اور یوکرین کو اپنے استعمار کا نشانہ بنانے کے بعد اب لینن گراڈ اور ماسکو کے نواح میں دندنا رہے ہیں۔ ہٹلر کا خیال ہے کہ رُوسی مہم اُس کے مجوزہ پروگرام کے مطابق کامیاب رہی۔ حالانکہ ابھی بالشویک فوجیں پوری جرأت و ہمت اور بہادری و شجاعت کے ساتھ نازی حملہ آوروں کا مقابلہ کر رہی ہیں اور چونکہ جمہوری ممالک کی امداد ایران کے رستے رُوس میں پہنچ چکی ہے۔ اس لئے کوئی عجب نہیں کہ نازی پسپا ہونے پر مجبور ہو جائیں اور ہٹلر کے مجوزہ لائحہ عمل کی دھجیاں بحیرۂ اسود کی پُرشور خرام موجوں میں غرق ہوتی ہوئی نظر آئیں۔ جس وقت یہ سطور سپردِ قلم کی جا رہی ہیں نازی فوجیں جزیرہ نمائے کریمیا میں داخل ہونے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ لیکن مارشل بڈینی نے اعلان کیا ہے کہ اُن کو روسیوں کے مقابلہ میں ذلت آمیز شکست کا سامنا ہوا ہے۔ غالباً نازی فوجیں قفقاز کی طرف بڑھنا چاہتی ہیں لیکن اگر ایران کے رستے اتحادیوں نے اُن کا آگا روک لیا تو ہٹلر کے خوابوں کا شیرازہ خود بخود پریشان ہو جائیگا۔ روس و جرمنی کی جنگ کا عبرتناک پہلو یہ ہے کہ اس لڑائی میں تباہی و بربادی اور ہلاکت و خونریزی کا ایک ایسا زہرہ گداز نمونہ پیش کیا گیا جس کے تصوّر سے بھی انسانیت کانپ اٹھتی ہے۔ چنانچہ ہٹلر کے اپنے بیان کے مطابق اس جنگ میں ڈھائی لاکھ روسیوں کو گرفتار کیا گیا۔ ہزاروں کو خاک و خون میں تڑپایا گیا اور سینکڑوں ٹینک اور ہوائی جہاز تباہ کئے گئے۔ ممکن ہے جرمن ہائی کمانڈ کے اعداد شمار غلط ہوں۔ لیکن کیا ہٹلر اس نوع کی سفاکی و خونریزی پر فخر کر کے مہذب دُنیا سے خراجِ تحسین حاصل کرنا چاہتا ہے؟

اسلامی ممالک!

یہ زمانہ ممالکِ اسلامیہ کے لئے خاص طور پر تشویش انگیز رہا۔ سب سے پہلے عراق کی جانب توجہ مبذول کی گئی۔ حکومت برطانیہ کا بیان ہے۔ کہ ایک گزشتہ عہد نامہ کی رُو سے برطانیہ کو عراقی مواصلات اور رسل و رسائل پر قبضہ کرنے کا حق حاصل تھا۔ لیکن رشید عالی جیلانی نے تعرض کیا اور برطانوی فوجوں کو عراق میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی۔ اس پر بات بڑھ گئی اور بات چیت کا کام لڑائی کو سونپا گیا۔ چنانچہ برطانوی فوجیں عراق کی حدود میں داخل ہو گئیں اور چند دن کے مقابلہ و مقاتلہ کے بعد رشید عالی کو ایران کی جانب بھاگنا پڑا۔ اس کے بعد انگریزی فوجوں نے عراقی حکومت کی باگ ڈور اپنے پُرانے دوست امیر عبدالالہ کے سپرد کر کے اس ملک کو اپنی جنگی اغراض کے لئے استعمال کیا۔

چونکہ خطرہ تھا کہ روس کی مہم سے فارغ ہو کر ہٹلر مشرق کا رخ کریگا۔ اس لئے برطانیہ نے روس کا اتحاد روکنے کے لئے تمام اہم ممالک میں اپنی پوزیشن کو مستحکم کرنا شروع کر دیا۔ ایران و شام میں انگریزی فوجوں کا داخلہ اسی پروگرام کا ایک حصہ ہے۔ آج سے چار مہینے قبل آزاد فرانس اور برطانیہ کی متحدہ فوجیں جنرل کاترو کی سرکردگی میں شام پر حملہ آور ہوئیں؛ اور بہت جلد اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئیں۔ جنرل کاترو نے اعلان کیا تھا۔ کہ شام کو مکمل آزادی سے بہرہ ور کیا جائیگا چنانچہ یہ امر اطمینان بخش ہے کہ اس وعدے کو ایفا کرتے ہوئے برطانیہ نے دفاعی و خارجی محکمے بھی آزاد جمہوریہ شام کے سپرد کر دیئے ہیں اور اب یہ ملک جمہوری آغاز میں شامل ہو گیا ہے۔

عراق و شام کے قضیہ سے نپٹنے کے بعد برطانیہ کی توجہ ایران کی طرف مبذول ہوئی۔ پہلے کہا گیا کہ مملکت ایران میں جرمنوں کی موجودگی چونکہ مستقبل کے لئے تشویشناک ثابت ہو سکتی ہے۔ اس لیے اُن کے اخراج کا حکم صادر کیا جائے۔ حکومت ایران نے جرمنوں پر کڑی نگرانی رکھنے کا وعدہ کیا لیکن اتحادی اس اقدام سے مطمئن نہ ہوئے۔ اور روس و برطانیہ کی متحدہ فوجوں نے ایران پر حملہ کر دیا۔ یہ ملک حربی لحاظ سے اس قابل نہ تھا۔ کہ اتحادی یلغار کا مقابلہ کرتا اس لئے اعلیٰ حضرت رضا شاہ خان پہلوی تاج و تخت سے دستبردار ہو گئے۔ اور اُن کی جگہ اعلیحضرت محمد رضا شاہ نے نظام حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی جب انگریزی و روسی فوجوں کا تسلط ایران پر مکمل ہو گیا تو مسٹر چرچل کے ایک بیان سے معلوم ہوا کہ دراصل ایران پر قبضہ کرنے سے منشا یہ ہے کہ روس کو مالی و فوجی امداد دی جائے۔ اگر یہ مقصد پہلے ہی واضح کر دیا جاتا اور حملہ آور ہونے کی بجائے اس گتھی کو ناخن تدبیر سے سلجھایا جاتا تو اتحادیوں کا طرز عمل تعریض و تضحیک کا مستحق نہ ہوتا۔ بہرحال ایران کو ایک فوجی انقلاب سے دوچار ہونا پڑا اور اب رائے عامہ کو دستوریت کے قیام کے لئے تیار کیا جا رہا ہے۔ خدا کرے کہ یہ مساعی بارآور ہوں اور ایران ایک آزاد جمہوریہ قائم کر سکے۔

ترکی کا مسئلہ ابھی کھٹائی میں ہے۔ دنیائے اسلام کا یہ سب سے بڑا ملک تادم تحریر غیر جانبداری کے اصول پر قائم ہے۔ لیکن چونکہ جنگ کا سیلاب مشرق کی طرف بڑھا چلا آ رہا ہے۔ اس لئے برطانیہ اور جرمنی دونوں ترکی کی دوستی کے خواہاں ہیں۔ ایک طرف اگر جرمن سفیر فان پاپن غازی سراج اوغلو اور عصمت پاشا انونو کو اپنے ڈھب پر لانے کی کوشش کر رہا ہے تو دوسری طرف برطانیہ اس ملک سے اخوت و مودت کا اظہار

دراصل ترکی کی جغرافی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایک طرف اگر جرمنی دردانیال پر قبضہ کر لے تو بحیرہ روم اور ممالک عربیہ کا تحفظ خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ دوسری طرف اگر برطانیہ یا روس کو اپنا جنگی بیڑا بحیرۂ باسفورس میں سے گزارنے کی اجازت مل جائے تو بحیرۂ اسود کی لڑائی کا رخ ہی کچھ اور نظر آئے۔ لیکن ترکی ان دونوں احتمالات کو عملی جامہ پہنتے نہیں دیکھ سکتا۔ چنانچہ حکومت انقرہ نے بارہا اعلان کیا ہے۔ کہ اگر کسی متحارب ملک نے ترکی کی طرف دست تطاول دراز کرنے کی کوشش کی تو ترکوں کی بیس لاکھ سنگینیں اسے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لئے فضا میں لہرانے لگیں گی۔ پچھلے دنوں امریکہ سے آواز اٹھی تھی کہ برطانیہ کو درہ دانیال پر قابض ہو جانا چاہیئے۔ لیکن ادھر یہ افواہیں پھیل رہی ہیں۔ کہ ترکی پر نازی قبضہ کرنے والے ہیں معلوم نہیں ان متضاد خبروں میں کہاں تک صداقت ہے۔ تاہم قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ چند ماہ میں ترکی کو بعض اضطراب انگیز حالات کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔

امریکہ جنگ کی طرف؟

زمین کا اگر مشرقی نصف کرہ آتش و خون کے سمندر میں ہلکورے لے رہا ہے تو مغربی نصف کرہ آنے والے طوفان سے بے خبر نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ مشرقی دنیا کے جمہوری ممالک کی چیخ پکار وائٹ ہاؤس سے ٹکرائے بغیر نہ رہی اور امریکہ کی رائے عامہ بھی قانون غیر جانبداری کو منسوخ کر کے میدان جنگ میں سر دھڑ کی بازی لگانے پر آمادہ ہو رہی ہے۔ ایک طرف اگر مسٹر کارڈل ہل امریکہ کو جمہوری ممالک کی زیادہ سے زیادہ امداد پر کمربستہ کر رہے ہیں تو دوسری طرف مسٹر روزویلٹ قانون اسلحہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے نظر آتے ہیں علاوہ ازیں امریکی اخبارات میں جمہوری ممالک سے اتحاد و تعاون پر زور دیا جا رہا ہے۔ کیونکہ بحر اوقیانوس اور بحر الکاہل کی آزادی ہی پر امریکہ کے مستقبل کا انحصار ہے۔ یہ قلب ماہیئت تین وجوہ کی بنا پر ظہور میں آئی۔

۱۔ نازی تحت البحر کشتیوں اور ہوائی جہازوں نے امریکی جہازوں پر حملہ کر کے نقصان پہنچایا۔

۲۔ مشرق بعید میں جاپان کی پراسرار حکمت عملی امریکی مفاد کے لئے ضرر رساں ثابت ہو رہی ہے۔

۳۔ مسٹر چرچل نے مسٹر روزویلٹ سے [illegible] اوقیانوس

کے پروانۂ آزادی پر دستخط کئے جس کا مقصد جرمنی کے غلام ممالک کو حریت و آزادی کی دولت سے مالا مال کرنا ہے۔

الغرض امریکہ آہستہ آہستہ جنگ کی راہ پر آ رہا ہے۔ اور وہ ساعت دور نہیں جب وہ اس امر کا سرکاری طور اعلان بھی کر دیگا۔ امریکہ کی مالی و تجارتی امداد تو جمہوری ممالک کو پہلے ہی میسر ہے اگر حربی و فوجی کمک بھی میدانِ جنگ میں آ گئی تو حالات میں فوری انقلاب کا ظہور بعید از قیاس نہ ہوگا۔ حال ہی میں امریکہ اس مؤتمر میں بھی شامل ہوا جو ماسکو میں روس کو مدد پہنچانے کے لئے منعقد کی گئی۔ اس لئے جنگ میں امریکہ کی عملی شمولیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

سیاساتِ ہند

عرصہ زیرِ تبصرہ میں ہندوستان کے سیاسی سمندر میں ہلکا سا تموج پیدا ہوا لیکن کوئی سریع الاثر انقلاب دیکھنے میں نہیں آیا۔ خیال تھا کہ "بحرِ اوقیانوس کے پروانہ آزادی" میں ہندوستان کو بھی شامل کر لیا جائیگا۔ لیکن مسٹر چرچل کے بیان نے ہندوستانیوں کی امیدوں پر پانی پھیر دیا اور مسٹر ایمری (وزیرِ ہند) کی روکھی پھیکی تقریروں نے سیاساتِ ہند کی گتھی کو اور بھی پیچیدہ بنا دیا ہے۔ ہمیں سر سکندر حیات خاں (وزیر اعظم پنجاب) کے اس بیان سے اتفاق ہے کہ مسٹر چرچل کا جواب توہین آمیز اور کورا ہے اور برطانیہ سے اس کی توقع نہ تھی۔ سر سکندر حیات خاں نے کہا ہے کہ اگر حکومت برطانیہ نے دو تین ہفتے تک ہندوستان کے مستقبل کے متعلق کوئی تسلی بخش اعلان نہ کیا۔ تو میں ہندوستان کی تمام سیاسی مجلسوں کو متحدہ محاذ پیش کرنے کی دعوت دوں گا۔ لیکن رونا تو یہی ہے کہ اس ملک کی سیاسی پارٹیوں میں اتحاد و اتفاق کی روح قطعاً موجود نہیں ہے۔ اگر تمام سیاسی مجلسیں ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع ہو سکتیں تو کیا ہندوستان کا خوابِ آزادی اب تک عمل و حقیقت کی راہ پر گامزن نہ ہوتا؟ ہمارے نزدیک مسٹر ایمری کا یہ مطالبہ درست نہیں کہ پہلے ہندوستانیوں کو اپنی آواز میں ہم آہنگی پیدا کرنی چاہئے۔ اس کے بعد ان کی خواہشات پر غور کیا جائے گا۔ ہندوستان ایک مختلف العناصر ملک ہے یہاں کے سیاسی اجزا کی شیرازہ بندی ممکن نہیں۔ تاہم آزادی و حریت سب کے مطالبات میں مشترک ہے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ فروعات کو "ما بہ النزاع" بنانے کی بجائے "اصل" کی طرف توجہ کی جائے اور ہندوستان کو غلامی کی بندھنوں سے آزاد کرنے کے لئے کوئی خاص مدت مقرر کر دی جائے۔ تاکہ ہندوستانی اپنے مستقبل سے بے فکر ہو کر جمہوری ممالک کی جنگی کوششوں میں زیادہ سے زیادہ حصہ لے سکیں۔

اس عرصہ میں وائسرائے ہند نے مرکزی نظامِ حکومت میں تین تبدیلیاں کیں (۱) کمانڈر انچیف کے لئے بزمِ مشاورت کا قیام (۲) نیشنل ڈیفنس کونسل کی تاسیس (۳) اگزکٹو کونسل (انتظامیہ) میں توسیع۔ کانگریس اور مسلم لیگ نے اس انتظامی ردّ و بدل میں کسی قسم کی دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔ اس لئے وائسرائے ہند نے بعض ایسے لوگ منتخب کر لئے جو ایک طرف تو برطانوی مفاد کو مدِ نظر رکھ سکتے تھے اور دوسری طرف کانگریس ہندو مہاسبھا اور مسلم لیگ سے بھی نزدیک یا دور کی دلچسپی رکھتے تھے۔ مسلمانوں سے سر سکندر حیات خاں، بیگم شاہنواز، سر محمد سعد اللہ، سر احمد سعید، مولوی فضل الحق اور سر سلطان احمد کو نیشنل ڈیفنس کونسل کی رکنیت کے لئے نامزد کیا گیا۔ لیکن یہ حضرات چونکہ مسلم لیگ کے ممبر بھی تھے اور ان کا اقدام لیگ کے فیصلے کے خلاف تھا۔ اس لئے مسٹر جناح نے ان سے استعفیٰ کا مطالبہ کیا۔ پہلے تو ان لوگوں نے عذر پیش کیا کہ ہم چونکہ انفرادی اور سرکاری حیثیت سے منتخب ہوئے ہیں۔ اس لئے ہمارے لئے مسلم لیگ کے فیصلہ کی پابندی ضروری نہیں۔ لیکن جب مسٹر جناح نے وائسرائے ہند کا وہ خط پیش کیا جس میں کہا گیا تھا۔ کہ یہ حضرات مسلمانوں کے نمائندہ ہونے کی حیثیت سے لئے گئے ہیں تو سر سکندر حیات خاں اور سر محمد سعد اللہ نیشنل ڈیفنس کونسل کی رکنیت سے مستعفی ہو گئے۔ سر سلطان احمد نے کہا کہ میرا عہدہ نیا ہے اس لئے استعفیٰ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بیگم شاہنواز نے جواب دیا کہ میں عورتوں کی نمائندہ ہوں مسلم لیگ کی نہیں۔ سر محمد سعید نواب چھتاری مسلم لیگ سے مستعفی ہو گئے اور مولوی فضل الحق نے ایک طویل بیان دینے کے بعد مسلم لیگ اور ڈیفنس کونسل دونوں کی رکنیت سے علیحدگی اختیار کر لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیگم شاہنواز اور سر سلطان احمد کو مسلم لیگ سے خارج کر دیا گیا۔ لیکن مولوی فضل الحق اپنی حرکت پر پشیمان نظر آتے ہیں اور بہت ممکن ہے کہ دوبارہ مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں۔

مسٹر گاندھی کے ستیہ گرہ کی رفتار بہت مدھم پڑ گئی ہے تاہم مسٹر ایمری کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اب تک پونے دس ہزار کانگریسیوں کو گرفتار کر کے جیلوں میں ڈالا گیا۔ تاہم اس ایثار و قربانی کا کوئی خاص نتیجہ بر آمد ہوتا نظر نہیں آتا۔

لاہور

سکندر

منروا موویٹون کی تازہ پیش کش

منروا موویٹون کا تاریخی شاہکار سکندر جو ہندوستان کی فلمی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اب فلم بندی کی تمام منزلیں طے کرکے بمبئی میں ۳۰ ستمبر سے ریلیز ہو چکا ہے۔

منروا اور سہراب مودی کی زندگی کا کارنامۂ عظیم ہونے کے علاوہ ہندوستان کی فلمی صنعت کے لئے بھی طرۂ امتیاز ثابت ہوا۔ فلم کا آغاز اس منظر پر ہوتا ہے ـــــــ جب سکندر ایران فتح کرنے کے بعد ایک ایرانی دوشیزہ سے مفتوح ہو کر رہ گیا۔ وہ اور اس کے بلند آہنگ ارادے شراب کی اس ندی میں بہ گئے جو رخسانہ کی مخمور آنکھوں سے بہتی تھی استاد ارسطو کی دانش نے آخر سکندر کو ان بھول بھلیوں سے نکالا جسے عرف عام میں محبت یا عشق کہتے ہیں اور اسے پھر اس راستہ پر لاکر کھڑا کر دیا جس پر چل کر وہ اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکتا تھا۔ اب اس نے ہندوستان کا رخ کیا۔ وہ جہاں گیا فتح نے اس کے پاؤں چومے۔ اسطرح وہ ملک پر ملک فتح کرتا ہوا آخر جہلم کے کنارے پہنچا جہاں پنجاب کے جری و جانباز حکمران مہاراجہ پورس نے اس کا راستہ روک لیا۔ سکندر ہزار کوشش کرنے پر بھی دریائے جہلم پار کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ سکندر اپنی ناکامی پر اکثر جھنجلاتا اور بگڑتا۔ آخر جب اس نے دیکھا کہ وہ کسی طرح اپنی بہادری سے پورس کو شکست نہیں دے سکتا تو اسے ایک چال سوجھی۔ ایک رات جب طوفان زوروں پر تھا اور جہلم میں طغیانی آئی ہوئی تھی وہ اپنی نصف فوج کو بیس میل دور لے گیا جہاں اس نے رات کی تاریکی میں دریا پار کیا اور پورس کی افواج پر اس حالت میں حملہ کر دیا جب وہ آنے والے خطرہ سے بالکل بے خبر تھے ایک بھیانک جنگ ہوئی اور اس کا اختتام سکندر اور پورس کی اس تاریخی ملاقات سے ہوا جسے دنیا بھر کے تاریخ دانوں نے سنہری حروف میں لکھا ہے۔ اس جنگ کا نتیجہ یہ ہوا کہ سکندر کی فوجوں نے بغاوت کر دی اور آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ سکندر کا تسخیر عالم کا خواب وہیں بکھر کر رہ گیا۔ وہ جن آرزوؤں کو لے کر ہندوستان آیا تھا۔ وہ برباد ہو گئیں۔ دوسرے دن ہندوستان کی فتح کا خیال ترک کرکے وہ پھر ہندوستان چھوڑ کر واپس جا رہی تھیں۔

سکندر ساما میں ہر جگہ ہندوستان کی عظمت گذشتہ اور ہمارے ماضی کے وقار کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ سہراب مودی نے جہاں سکندر کو ایک قابل رشک فلم بنانے میں اپنی ڈائرکشن کی تمام توجہ صرف کر دی ہیں وہاں انہوں نے مہاراجہ پورس کا پارٹ بھی غیر معمولی کامیابی سے ادا کیا ہے۔ پرتھوی راج اور ونمالا، سکندر اور رخسانہ کی حیثیت سے پیش کئے گئے ہیں۔ نیا۔ صادق علی۔ شیلا، خورشید، کے۔ این۔ سنگھ۔ لالہ یعقوب۔ گھنشیام وغیرہ جیسے شہرۂ آفاق اداکار بھی سکندر کی شان کو دوبالا کر رہے ہیں۔ جنگی مناظر میں ہزارہا اشخاص نے حصہ لیا ہے۔ سکندر کی کہانی۔ مکالمے اور گانے پنڈت سدرشن کے زور قلم کا نتیجہ ہیں۔ سکندر کے عظیم سیٹ گیگر تارا اور بھروسہ کے شہرہ آفاق آرٹ ڈائرکٹر روس بیگ نے تعمیر کئے اور اس کے نفیس برقی لباس مسٹر ایم۔ این خواجہ نے تیار کئے ہیں۔

سکندر ۳۰ ستمبر سے بمبئی کے تین تھیٹروں (ایکسیلسیئر نیو ویسٹ اینڈ منروا) میں بیک وقت نمائش کے لئے پیش کیا گیا ہے۔ یہ فلم لاہور میں ۱۷ اکتوبر کو ریلیز ہوگا۔

مخدوم علی ہجویری
قدس سرہ العزیز

عالمگیر ستمبر ۱۹۴۱ء میں الحاج مولوی عبدالقیوم ندوی حضرت شیخ الاسلام مخدوم علی ہجویری المعروف بہ داتا گنج بخش قدس سرہ العزیز کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ جب آپ اپنے پیر و مرشد کے حکم پر غزنی سے ہندوستان تشریف لائے۔ تو سب سے پہلے لاہور میں قیام کیا ان دنوں لاہور میں علم کا بہت چرچا تھا۔ اور چونکہ مغل بادشاہوں کی سلطنت تھی۔ اس لئے سارا شہر جنت کا نمونہ بنا ہوا تھا۔

عرصہ گزرا کہ اس خاکسار نے "منشی فاضل" کے کورس میں حضرت کی کتاب "کشف المحجوب" کا مطالعہ کیا تھا۔ افسوس جونہی یہ نیاز مند امتحان سے فارغ ہوا تو ایک صوفی منش بزرگ وہ کتاب اڑا کر لے گئے۔ اس کتاب کا تذکرہ تک اب دماغ میں باقی نہیں رہا اور اس نوع کی کتاب مل نہیں سکی۔ ابھی ابھی تاریخ فرشتہ کے حصہ "سیرۃ اولیاء" کی ورق گردانی کی ہے حضرت کی سیرت کے متعلق کچھ مل نہیں سکا تاہم مجھے یہ اچھی طرح یاد ہے کہ حضرت کے روضہ مبارک کے جنوب میں ایک چھوٹا سا حجرہ ہے جس پر یہ کتبہ لگا ہے۔

"حجرہ استکاف حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ"[1]

اگر واقعی میرا خیال درست ہے۔ کہ حضرت کی پائینتی میں اس قسم کا حجرہ موجود ہے تو اس کے یہ معنی ہونگے کہ حضرت مخدوم علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ حضرت شیخ الہند خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ سے بہت عرصہ پہلے کے تھے۔ اور موخر الذکر نور اللہ مرقدہ نے حضرت مخدوم علی ہجویری کے مزار گوہر بار پر اعتکاف کیا۔ یہ تمام تاریخ دان حضرات پر روشن ہے کہ حضرت شیخ الہند راے پتھورا (چوہان) کے عہد میں تشریف لائے تھے۔ اور ماہ رجب ۶۳۳ھ

یعنی سلطان رکن الدین فیروز شاہ بن سلطان شمس الدین التمش کے زمانہ میں اس دار فانی سے عالم باقی کو انتقال فرمایا تھا پس میرے لئے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ اگر حضرت علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ شیخ الہند اجمیری سے برسوں پہلے ہندوستان تشریف لا کر لاہور میں مقیم ہو گئے تھے۔ تو انہوں نے مغل زمانہ کس طرح پا لیا؟

(۲) اس زمانہ میں لاہور جنت نظیر کس طرح بنا ہوا تھا؟

[1] یہ حجرہ موجود ہے۔ ایڈیٹر

ایک تاریخی غلطی کا ازالہ

از جناب مولوی نور احمد خاں منشی فاضل

(۳) علمی شہرت منتہائے کمال کو کیسے پہنچی ہوئی تھی؟

دوسرا انکشاف مضمون نگار نے یہ کیا ہے کہ لاہور میں ان دنوں علم کا بہت چرچا تھا۔ قابل غور یہ معاملہ ہے کہ لاہور میں ان دنوں علم کا بہت چرچا تھا۔ یا حضرت کی تشریف کے بعد اس شہر کو "مدینۃ العلم" کہلانے کی عزت نصیب ہوئی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ سب سے پہلے بڑے بڑے ٹیکسلا اور ملتان علوم کے مرکز تھے جب ٹیکسلا تباہ ہو گئے۔ تو پھر ملتان اور لاہور یہ دو علمی ادارے قرار پائے۔ ملتان کی علمی شہرت۔ ملتان کے آخری مسلمان فرمانروا نواب مظفر خاں کی شہادت کے ساتھ ساتھ ہمیشہ کے لئے "مسلمانان دو گور و دو مسلمان در کتاب" تک محدود رہ گئی۔ البتہ لاہور نے ترقی کی اور اس قدر کمال حاصل کیا۔ کہ آج ہندوستان کا کوئی شہر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

باقی رہا "جنت کے نمونے" کا معاملہ سو یہ حالت اب بھی ہے جنت کی وہی فضا۔ وہی جنت کی حوریں۔ غلمان۔ بلوریں محل اور رنگین ماحول اب تک سب کچھ موجود ہے۔ بلکہ مغربی تہذیب کی برکت سے روز افزوں "حسن رہگذرے" میں بیش از بیش اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ بھلا ندوہ کے خشک ماحول کو اس کا کیا علم!

[illegible]

[illegible] بابت ماہ نومبر سنہ ۱۹۴۱ء

نمبر ۶

[illegible] محرومی خود زندگی کی لطافتوں سے محرومی ہے!

عالمگیر ہندوستان بھر کے [illegible] ادبی [illegible] رسالوں میں [illegible] چھپتا ہے

جلد ۳۵ | نمبر ۶

فہرست مضامین بابت نومبر ۱۹[illegible]

خاص نمبر [illegible] محرومی خودنمائی کی [illegible]

پنجسالہ پروگرام کی چار کتابیں [illegible]

(حافظ محمد عالم ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ عالمگیر [illegible] سے شائع کیا)

پہلے اسے پڑھیے

جنگ وجدال کی ہولناکیوں میں عالمگیر کی خیرہ کن لمعہ افشانیاں!

قارئین اس حقیقت سے ناواقف نہ ہونگے کہ جب سے موجودہ جنگ شروع ہوئی ہے کاغذ ناقابل برداشت حد تک مہنگا ہو چکا ہے وہی کاغذ جو جنگ سے قبل چھ پیسے فی پونڈ کے حساب سے بآسانی مل جاتا تھا اب آٹھ دس آنے فی پونڈ کے حساب سے بھی دستیاب نہیں ہوتا ستم بالائے ستم یہ ہے کہ آپ نقد روپیہ ہتھیلی پر رکھ کر بازار میں چلے جائیں لیکن آپ کو [illegible] کی آواز سنائی دیگی۔ کاغذ فروشوں کا کہنا ہے کہ ان کے پاس کاغذ [illegible] نے پرمٹوں کے ذریعہ سے ہر پریس اور ادارۂ نشر واشاعت کیلئے کاغذ کی [illegible] لیکن معلوم ہوتا ہے کہ دکانداروں نے کاغذ کے ذخیرے پراسرار طریقے سے اپنے [illegible] نام منتقل کر دیئے ہیں [illegible] کاغذ کی نایابی کے باعث جلب منفعت کیلئے مزید گنجائش پیدا ہو سکے ان حالات میں قارئین سمجھ سکتے ہیں کہ خاص نمبر اور سالانہ نمبر تو کجا عام رسائل وجرائد کیلئے معمولی پرچہ نکالنا بھی جوئے شیر لانے سے کم نہیں تاہم عالمگیر کے ادارۂ اہتمام کے نزدیک اردو ادب کی خدمت اس درجہ اہمیت رکھتی ہے کہ نامساعد حالات کے باوجود اس مرتبہ بھی عالمگیر کا ضخیم و معرکہ آرا خاص نمبر ۱۹۴۲ء اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ شائع کیا جائے گا اور کاغذ کی نایابی یا سامان طباعت کی گرانی اس کے ظاہری و معنوی محاسن پر اثر انداز نہ ہوگی۔ اگر قارئین کے نزدیک یہ عدیم المثال ادبی ایثار کوئی وقعت رکھتا ہے تو ان کا فرض ہے کہ نہ صرف اپنی مستقل معاونت برقرار رکھیں بلکہ عالمگیر بکڈپو سے علمی و ادبی کتابیں خریدنے کے علاوہ عالمگیر کے حلقۂ اشاعت میں بھی توسیع فرمانے کی کوشش کریں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ اس نازک دور میں عالمگیر کے نئے اور دیرینہ کرمفرما ہر لحاظ سے ہماری امداد و حوصلہ افزائی پر کمربستہ رہیں گے۔

منیجر رسالہ عالمگیر لاہور

ملاحظات

زیرِ نظر اشاعت مضامین نظم و نثر کے لحاظ سے امتیازی حیثیت کی مالک ہے۔ علمی و ادبی مضامین میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم (پروفیسر حامد حسن قادری) عرفی و فارسی کا عاشق (جلالی شاہجہانپوری) بنارسی خانہ (درنج آبادی جاوید) بنگالی کا اثر اردو پر (میرزا محمد بشیر ایم اے) تحقیق و تفحص کے آئینہ دار ہیں اور قارئین کی معلومات میں اضافہ کئے بغیر نہ رہیں گے۔

طبع زاد افسانوں اور ڈراموں میں سے مبارک سب (...) زاویہ الملس کی کاہنہ (محمود چلیانوی) نقش نگین (سید ... العزیز) اور اندھی نفرت (شوکت صدیقی) خاص طور پر کشش رکھتے ہیں۔

تراجم کا معیار خاص طور پر بلند ہے۔ چنانچہ زیرِ نظر شمارہ میں ... پشکن۔ سینٹ فرانسس اور تھامس ہک کے معرکہ آرا افسانوں کو اردو کا شگفتہ و دلآویز لباس پہنا دیا گیا ہے۔ جناب ابراہیم ... جناب شیدا جیلپوری اور سید نظر کاظمی کی مساعی قابلِ داد ہیں۔

منظومات حسبِ معمول وجد آفریں اور کیف آگیں ہیں۔ حضرت ندرت میرٹھی۔ حضرت سرخوش عسکری۔ جناب سالک مولانا داؤد لکھنوی اور حضرت انور راشدی کا تازہ ترین کلام خاص طور پر قابلِ مطالعہ ہے۔

آئندہ اشاعت خاص نمبر ۱۹۴۲ء کے نام سے موسوم ہوگی جس کی تفاصیل اسی پرچہ میں کسی دوسری جگہ ملاحظہ فرمائیے۔ مضامین نظم و نثر پر ایک سرسری نگاہ بھی ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ خاص نمبر اردو ادب میں فی الواقع ایک خاص چیز ہوگی۔

چار آنے کے ٹکٹوں کیلئے مینجر صاحب عالمگیر کی طرف سے ایک اعلان شائع ہو رہا ہے فی الواقع یہ طریقہ نہایت احسن ہے جن حضرات کی میعاد خریداری ختم نہیں ہوئی وہ ٹکٹ بھیج کر اپنا پرچہ بذریعہ رجسٹری منگائیں ورنہ عدم وصول کی صورت میں دفتر دوبارہ خاص نمبر بھیجنے سے مجبور ہوگا اور ... کو جو تکلیف ہوگی اس کا ہمیں بھی افسوس ہوگا۔ (ادارہ)

چار آنے کا ٹکٹ

جن خریداروں کا سالانہ چندہ تا حال ختم نہیں ہوا وہ خاص نمبر بصورت رجسٹری حاصل کرنے کے لئے چار آنے کے ٹکٹ بواپسی ڈاک بھیجدیں تاکہ خاص نمبر ان کی خدمت میں بذریعہ رجسٹری بھیجا جائے۔ قارئین نوٹ فرمالیں کہ ڈاک کا نقصان ناقابل برداشت حد تک پہنچ چکا ہے اس لئے عدم وصولی کی شکایت آنے پر خاص نمبر دوبارہ نہیں بھیجا جا سکے گا لہٰذا بہترین صورت یہی ہے کہ ہر خریدار جن کا چندہ ختم نہیں ہوا یہ اعلان پڑھتے ہی چار آنے کے ٹکٹ منیجر رسالہ عالمگیر لاہور کے نام بھیجدے ٹکٹ بھیجتے وقت نمبر خریداری کا لکھنا اشد ضروری ہے۔

جن معاونین کا چندہ ختم ہوگیا

جن خریداروں کے پتہ کی چٹ پر نمبر خریداری کے ساتھ نشان چھپا ہوا ہے ان کا سالانہ چندہ ختم ہو چکا ہے لہٰذا آئندہ سال کیلئے خاص نمبر ان کی خدمت میں بذریعہ وی پی ارسال ہوگا امید ہے کہ وہ ازراہ ادب نوازی اسے ضرور وصول فرمائیں گے۔ خاص نمبر کی خصوصیات کا اندازہ لگانے کے لئے زیرِ نظر اشاعت میں خاص نمبر کے اعلانات ملاحظہ فرمائیں۔

نفیس مزاج حضرات اپنے ادبی ذوق کو خاص نمبر کے مطالعہ سے آسودہ کریں

اخبار و افکار

ہندوستان کی شدھ ہندی زبان کے بارہ میں جس کوتاہ علمی، فرقہ پرستی اور تعصب و عناد کا ثبوت دیے رہی ہیں وہ محتاج تصریح نہیں۔ ریڈیو کے سامعین جانتے ہیں کہ دہلی اور لاہور کے ریڈیو سٹیشنوں سے جس زبان میں تقریریں یا خبریں براڈکاسٹ کی جاتی ہیں وہ کسی طرح "اردو" نہیں کہلا سکتی۔ اس کے باوجود ہندی اور انگریزی اخبارات میں بھی [illegible] وہ آئے دن ایسے مضامین شائع کرتے رہتے ہیں جن کی تان [illegible] پر ٹوٹتی ہے کہ ریڈیو والے اردو بولتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمارے [illegible] نے جو شذرہ سپرد قلم کیا ہے وہ درج ذیل ہے:

"ہندی کی تعریف الفاظ میں تو ہندی والوں نے یہ کی ہے کہ وہ ہندستانی جو عام طور پر ناگری حروف میں اور کبھی کبھی فارسی یا اردو حروف میں لکھی جاتی ہو لیکن سچ پوچھئے تو ہندی کی سب سے اچھی تعریف یہ ہے: وہ ہندستانی جو ابھی ہندستان والوں کی سمجھ میں بھی نہ آتی ہو۔ اس تعریف کے صحیح ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ریڈیو اور ہندی والوں کا جھگڑا ہے۔ ہندی والوں کے طرح طرح کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر ریڈیو والوں نے بالآخر وہ ہندستانی شروع کی جو ہندستان والوں کی سمجھ سے باہر ہو چنانچہ ریڈیو سے جب ہندستانی خبریں سنائی جاتی ہیں تو اکثر اوقات لوگ اپنا ریڈیو بند کر دیتے ہیں۔ مگر پروپیگنڈے اور شکایتی خطوں کی بھرمار کی بدولت ریڈیو والے صحیح ہندستانی استعمال کرتے ڈرتے ہیں لیکن خبریں سنانے کے وقت یہ ڈر کچھ کم ہو جاتا ہے اور حکومت کا مفاد پیش نظر رکھ کر خصوصاً جنگ کے زمانے میں ریڈیو والے زیادہ تر ہندستان کی عام زبان استعمال کرتے ہیں۔ ہندی اخباروں میں جو اودھم مچا ہے وہ تو رہا الگ بڑی پر لطف بات یہ ہے کہ انگریزی اخباروں اور خصوصاً امرت بازار پتریکا (کلکتہ) لیڈر (الہ آباد) نیشنل ہیرلڈ (لکھنؤ) اور ہندستان ٹائمز (دہلی) میں کبھی کبھی اپنی طرف سے نوٹ اور زیادہ تر بہی خواہان ہندی کے خطوط ریڈیو کی زبان کے خلاف شائع ہوتے رہتے ہیں۔ نوٹ ہوں چاہے خط تان اس پر ٹوٹتی ہے کہ ریڈیو والے اردو بولتے ہیں۔ ریڈیو والوں کی طرف سے جواب دینے کی ہمیں کوئی وجہ نہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ہمیں خود ریڈیو والوں کی اردو "اردو" معلوم نہیں ہوتی اور ہمیں اس کی شکایت ہے۔ اس کے باوجود جو زبان ریڈیو سے بولی جاتی ہے روز بروز ناقابل فہم ہوتی جاتی ہے اور اس تبدیلی کا سبب زیادہ تر وہ شکایتی خطوط اور غلط پروپیگنڈا ہے جس کے لئے انگریزی [illegible]

ریڈیو والے اردو بولتے ہیں

از — ادارہ

زبان کے یہ قومی اخبار اپنے کالم کھول دیتے ہیں اس لئے [illegible] ہوتی ہے کہ ان خطوط کی اصلیت ظاہر کرتے رہیں تاکہ ریڈیو کا [illegible] ان سے متاثر نہ ہونے پائے۔ اس سلسلے میں سیکڑوں شکایتی خطوط [illegible] در اصل اردو کی مخالفت میں شائع ہو چکے ہیں۔ نامہ نگاروں کا کبھی تو نام [illegible] ہوتا ہے اور کبھی محض "ایک سننے والا" یا "خادم قوم" یا "ایکس وائی زیڈ" [illegible] کی جاتی ہے ان خطوں میں سب سے مہلک زہر یہ ہوتا ہے کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے ریڈیو سے اردو بولی جاتی ہے اس لئے ہندو اسے سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ ان خطوں میں بیشتر محض شکایت ہی شکایت ہوتی ہے۔ صرف دو خط ایسے دیکھنے میں آئے۔ ایک تو ہندستان ٹائمز مورخہ ۲۰ اگست ۱۹۴۴ء میں اور دوسرا نیشنل ہیرلڈ مورخہ ۲۰ اگست ۱۹۴۴ء میں جن میں ایسے عربی فارسی الفاظ کی فہرست دی گئی تھی جو نامہ نگار کے نزدیک بی۔ اے، ایل ایل بی وکیلوں اور [illegible] کی استانیوں کی سمجھ سے باہر تھے لیکن معلوم یہ ہوا کہ قریب قریب تمام قابل اعتراض لفظ کئی روزانہ اخباروں میں اور ہندی کی مشہور مستند لغت شبد ساگر میں موجود ہیں۔ لیڈر (الہ آباد) میں مسٹر چندرا اور مسٹر نسیم کے خطوط نے ایک مستقل بحث کی صورت اختیار کر لی تھی اور ریڈیو کی زبان کا تو دو ہی ایک خطوں میں ذکر آیا باقی خط ہندی اردو اور ہندو مسلم سوال پر بحث کی نذر ہوئے نوبت یہاں تک پہنچی کہ معاصر لیڈر کو خود ہی یہ فرقہ وارانہ بحث ختم کرنا پڑی۔ نیشنل ہیرلڈ میں ایک شائع ہونے والے شکایتی خط کا عنوان تھا "زبردستی" (Linguistic Zabardasti) اسی سے اندازہ کیجئے کہ شکایت کی نوعیت کیا ہوا کرتی [illegible] لندن ریڈیو کی ہندستانی نشریات کے متعلق بھی اکثر خطوط شائع ہوتے رہتے ہیں [illegible] سب کا لب لباب یہ ہوتا ہے کہ جس ہندستانی میں تقریریں ہوتی ہیں اور خبریں سنائی جاتی ہیں وہ دراصل اردو زبان ہوتی ہے جسے سمجھنے والے ہندوستان میں بہت کم لوگ ہیں۔ ہمارا مقصد اس وقت اس ساری بحث کا تجزیہ پیش کرنا ہے۔ ایک طرف تو بہی خواہان قوم و ملک ہیں اور خصوصاً ہندی [illegible] معاصرین سے [illegible] کرنا ہے کہ خطوط لکھتے وقت اور شائع کرتے وقت اتنا لحاظ فرمایا کریں کہ [illegible] ان کے اور ملک کے شایان شان بھی ہے یا نہیں اور شکایت میں کہیں [illegible]

دوسری طرف ہم اردو اخباروں اور اردو کے ہمدردوں [illegible] کو ان شکایتوں کو قوت کے ساتھ آگے بڑھانے میں [illegible] کا حکم ان شکایات [illegible]

حقائق و معارف

اسلام اور توہم پرستی

از حضرت مولانا ظفر علی خاں مدظلہ

(۱)

دولت غزنویہ کا عہد معدلت انصاف گستر ہے۔ دار الملک غزنی اسلامی تمدن کا مرکز بنا ہوا ہے۔ عساکر اسلامیہ نے ہندوستان کے بیشتر حصے فتح کر لئے ہیں اور سلسلہ فتوحات روز بروز بڑھتا ہی جاتا ہے تمدن کے ساتھ غزنی میں بھی بڑھ چلے ہیں۔ شہر کے ایک گوشے میں ایک عمارت ہے جو در پردہ شراب خانے کا کام دیتی ہے اور شغل نائے و نوش کا کام دیتی ہے حریفان ہوا و ہوس دن بھر کی بادیہ پیمائی کے بعد شب کو یہاں بادہ پیمائی کرتے ہیں۔

رات اچھی طرح بھیگ چلی ہے خشک طبعی میں بھی تردامنی آچلی ہے اور دور شراب کا تسلسل بندھ رہا ہے۔ محفل چمک اٹھی ہے کہ حکیم سنائی جیسے ملک الشعرائے دولت غزنویہ اس کی شمع محفل ہیں۔ شغل شراب میں شریک ہوتے ہیں اپنا کلام سناتے ہیں اور یاران صحبت کو محظوظ فرماتے ہیں۔

عین گرمئ بزم کے عالم میں ایک درویش آتا ہے اور شراب کی فرمائش کرتا ہے۔ ساقی جب ایک قدح لاتا ہے تو وہ اس کو نوش جان کر لیتا ہے اور پھر کہتا ہے کہ "پیالہ دیگر بہ کوری بخت محمود کہ ملکت کشودہ و ہنوز از جمع زر و گوہر نیاسودہ"

پیالہ آتا ہے تو اسے بھی لنڈھا کر دوسرے جام کی خواہش کرتا ہے کہ "یک پیالہ دیگر بہ کوری چشم سنائی شاعر کہ بہ شعر بے خرد شدہ و بہ مدح ملوک می کوشد باد بے فروشد و آتش از سرش بے جوشد"

جب یہ پیمانہ بھی نذر غاک ہو چکا تو ایک اور ساغر طلب کیا کہ "پیالہ دیگر بہ کوری بخت مسلم کہ چہرہ مسلمانی بازدو کفر راستہ نوازد"

اس واقعہ نے حکیم سنائی کی حالت بدل دی۔ اس کی زندگی تبدیل ہو گئی اور پھر وہی شراب خوار سنائی اس کتاب "حدیقہ" کا مولف بن گیا جسے زمانہ نے بزرگ زمانہ کالانیہ ترین ثمرۂ تقویٰ و ادب مانا ہے۔

عرب میں دستور تھا کہ ہر ایک مہم میں پرندوں کی پرواز یا تیر اندازی یا منازل سیارات یا اوقات لیل و نہار سے شگون لیا کرتے تھے اور اسی کے مطابق کاربند ہوتے تھے۔ اسلام آیا تو ان توہمات کے متعلق یہ فیصلہ یوں سنایا کہ "یا ایہا الذین آمنوا انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ لعلکم تفلحون" اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو شراب اور جوا اور بت اور تیر کے پانسے ناپاک شیطانی اعمال میں سے ہیں لہذا ان سے بچو کہ تمہیں فلاح و کامیابی نصیب ہو۔

صرف یہی ایک ذرا سا اشارہ تھا جس نے عربوں کے گوناگوں توہمات کا استیصال کر دیا وہ ان اوہام سے بچے اور خوب بچے نتیجہ میں جو فلاح و کامیابی ہوئی ظاہر ہے۔

(۲)

شاید انسان کی اصلاح کے لئے خاک عرب کو قدرت نے پہلے ہی سے منتخب کر رکھا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو پھر اپنی آسمانی تجلیات سے اس سرزمین کے ذرہ ذرہ کو شمس بازغہ بنا دیا لیکن دور جاہلیت میں بھی بعض خصائص عرب میں ایسے پائے جاتے تھے جن سے آگے چل کر اس فتنہ کے قیامت بننے کے آثار صاف نمایاں تھے۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ وہ سرزمین جس کا سب سے زیادہ موزوں دنیا کا معلم بننے والا ہو۔ دور جاہلیت میں بھی جو اپنے اوہام پرستیوں اور بطالت نوازیوں کے لئے ضرب المثل رہی ہو۔ وہی سرزمین امراء القیس جیسے شخص کو پیدا کر سکے جو بت پرستی کی ناپاک ترین غلاظتوں میں لتھڑے ہوئے کی وجہ سے جب اپنے معبود (ذوالخلیصا)

سے شگون کو حسب مراد نہیں پایا تو اپنے اس خدا کے بت پر تھوک دیتا ہے اور ایک حریت نواز نے اس سے آئندہ نسلوں کے لئے یہ کتابہ چھوڑا ہے کہ دنیا کی اوہام پرستیوں کی اصلاح اگر کوئی ملک کر سکتا ہے تو وہ عرب ہی ہے۔

[illegible] کا [illegible] جس [illegible] بھی اپنی [illegible] عبادت نوازیوں کے ساتھ شمار ہے انسان کے پاؤں سے ۳۳ کروڑ دیوتاؤں کی ۳۳ ارب اگیاؤں کی فولادی بیڑیاں نہیں کاٹ سکا۔ زردشت کی ثنویت کی تیغ دودم عقل انسانی کو تیرہ بختی سے نہیں بچا سکی۔ ارسطو وافلاطون کی حکمت نہ [illegible] تختۂ مغرب [illegible] تو توڑ سکیں لیکن [illegible] کا ایک امی جو نہ وید اور نہ فلسفہ سے واقف ہے نہ [illegible] دشتکاری [illegible] [illegible] نظام عقلیت سے آشنا ہے [illegible] قرآن کی ایک آیت [illegible] طلسم اوہام کو توڑ ڈالتا ہے۔

—— (۳) ——

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرزند حضرت ابراہیم انتقال کر جاتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم [illegible] اس وقت پہ نہ تو آسمان کا شکوہ کرتے ہیں نہ ستاروں کو [illegible] دیتے ہیں نہ گردش زمانہ پہ الزام لگاتے ہیں [illegible] صرف اس قدر کہہ کے رہ جاتے ہیں کہ تدمع العین ویحزن القلب ولا نقول ما یسخط الرب وانا علیٰ فراقک یا ابراهیم لمحزونون" آنکھیں آنسو بہاتی ہیں دل رنجیدہ ہے مگر ہم ایسی بات نہیں کہتے جو خدا کو ناراض کر دے۔ ابراہیم [illegible] تیری جدائی کا ملال ہے"

انہی دنوں میں آفتاب کو گہن لگتا ہے۔ [illegible] یہ ابراہیم کی وفات کا اثر ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سنتے ہیں تو ارشاد فرماتے ہیں الشمس والقمر آیتان من آیات اللہ لا تنکسفان لموت احد [illegible] آفتاب و ماہتاب خدا کی نشانیاں ہیں کسی کے مرنے سے ان پر گہن نہیں لگا کرتا مصطفے جب خاک پر بیٹھے [illegible] خسوف [illegible]

کبھی تھی شان رسالت نے بہ صفت صبر و شکر
گرچہ تھا دل کا تقاضا بیٹھے رو دل کو گر
تھے صحابہ بھی شریک اس غم میں پیمبر کے ساتھ
سب کے دل [illegible] مدعا لکھا وقت تھے رات
آسمانا آفتاب [illegible] گہن میں آ گیا
ظلمتستاں بن گیا [illegible]
[illegible] آج
سو گیا [illegible] سوز بھی [illegible]
جو [illegible] کو [illegible] نے دیا
آب نکسے ہے نقش صفوہ تاریخ پر

کیا تعلق آدمی کے غم سے سورج کو بھلا
اک نشان قدرت حق ہے کسوف اے بے خبر

یہی شان شفقت نوازی تھی جس نے سارے عرب کی اوہام پرستی [illegible] اور ساری دنیا کو اوہام باطلہ کی غلامی سے آزاد کر دیا۔

—— (۴) ——

عرب کی لڑکیاں ماہ شوال میں شادی کرنا برا جانتی تھیں کہ یہ نحوس مہینہ ہے اس میں جو نکاح ہوگا وہ ہرگز مقرون بہ فلاح نہ ہوگا۔ اس [illegible] کو دور کرنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شوال ہی کے مہینہ میں حضرت عائشہ صدیقہ کو عقد نکاح میں لیا اور پھر کبھی رخصتی کے لئے بھی اسی مہینے کو منتخب فرمایا جب کوئی لڑکی حضرت عائشہ سے نحوست ماہ شوال کا ذکر کرتی تو آپ ناخوش ہو کر فرماتیں "تزوجنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی شوال فمن کانت احظی منی عنده" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے شوال ہی میں نسبت کی [illegible] شوال ہی میں واقعہ معاشرت پیش آیا اب بتاؤ کہ آنحضرت کے یہاں مجھ سے زیادہ کس کی منزلت تھی۔

قرآن میں "یوم نحس" یا "ایام نحسات" کے الفاظ آئے ہیں عام طور پر جانتے ہیں کہ نحوست و سعادت ایک طرح کی اوہام پرستی ہے جس کا اسلام رد [illegible] دن کی نحوست کی دو تفسیریں کی گئیں۔

(۱) نحوس دن وہ ہے جو گرد و غبار سے آلودہ ہو۔
(۲) کسی دن کی نحوست کے یہ معنی ہیں کہ اس دن فلاں شخص پر فلاں مصیبت نازل ہوئی لہذا اس کے لئے یہ مصیبت آلود یعنی منحوس دن تھا۔

قرون اولیٰ کی ساری تاریخ پڑھ جائیے اس علم و اعتقاد کے نمونے ہر جگہ نظر آئیں گے اور اس تاریخ کا ہر صفحہ اوہام و اباطیل [illegible]

تحقیق و تصحیح

غیاث اللغات مؤلفہ مولانا محمد غیاث الدین مصطفی آبادی کا دیباچہ پڑھتے وقت عربی و فارسی الفاظ کی شناخت کے جو اصول ذہن نشین ہوئے وہ برائے استفادۂ عام درج ذیل ہیں۔

عربی الفاظ

(۱) وہ لغت[1] جس میں یہ آٹھ حروف ہوں عربی ہے۔ ث۔ ح۔ ص۔ ض۔ ط۔ ظ۔ ع اور ق۔ مثلاً ثابت۔ حارث۔ صابر۔ ضبط۔ طریق۔ ظرافت۔ عزت۔ قدر وغیرہ

(۲) جن الفاظ کا آخری حرف ت ہو اور اس سے پہلے حرف پر فتحہ (زبر) ہو عربی ہے جیسے رحمت۔ شفقت۔ نعمت۔ حکمت۔ ... وغیرہ۔

(۳) ہر وہ لفظ بھی عربی ہے جس کے ابتدا میں حرف الف اور آخر میں حرف ت ہو ... مثلاً استعمال۔ استیلا۔ اشتیاق۔ استفسار۔ استقبال وغیرہ

(۴) ہر وہ لغت بھی اکثر عربی ہے جس میں الف یا ت یا م ہو مثلاً ازل۔ ابد۔ تغیر۔ تعمیر۔ ماجرا۔ مامن۔ مالک۔ ماکول وغیرہ۔

(۵) ہر وہ کلمہ جو تکرار یا تشکر یا فاعل کے وزن پر ہو اکثر عربی ہوتا ہے جیسے تکرار۔ تکلف۔ تقلیل۔ تبادلہ۔ ناظم۔ عامل وغیرہ۔

فارسی الفاظ

(۱) جن الفاظ میں مذکورہ بالا علامات نہ پائی جائیں ان کے متعلق احتمال یہی ہے کہ وہ فارسی ہوگا۔

(۲) جن الفاظ میں پ۔ چ۔ ژ۔ گ آئے وہ فارسی ہونگے مثلاً پستہ۔ چمن۔ ژالہ۔ گریہ۔ نغز۔ دیگ۔ چشمک۔ تراش۔ خوک وغیرہ۔

(۳) جن الفاظ میں واؤ یا یائے مجہول آئے وہ بھی فارسی ہوں گے مثلاً بوسہ۔ توشہ۔ بیل۔ کیش وغیرہ

(۴) جن الفاظ کے آخری حرف سے پہلے ایک یا دو حرف ساکن ہوں وہ بھی فارسی ہوں گے مثلاً ... گفت ... وغیرہ۔

خاص عربی لغت کی کتب یہ ہیں۔ (۱) قاموس (۲) صراح (۳) منتخب (۴) ... (۵) ... وغیرہ۔

خاص فارسی لغت کی کتابیں یہ ہیں۔ (۱) جہانگیری (۲) رشیدی (۳) برہان (۴) سراج اللغات۔

باقی لغات مرکب ہیں۔

زمانہ حال میں جو لغات[2] تالیف و شائع ہوئی ہیں ان میں ہر لفظ کے آگے بتا دیا گیا ہے کہ یہ کس زبان کا لفظ ہے۔ ... اکثر ان الفاظ کی ... ہے جو اردو میں عربی۔ فارسی اور ہندی کے مروج ہیں۔ اور اردو تو ہے ہی سب زبانوں کا مجموعہ۔

عبارت مندرجہ میں جن تمام الفاظ پر ۱ لکھا ہے وہ عربی ہیں اور گیارہ پر ۲ فارسی کے باقی ہندی کے۔ ملاحظہ ہو کہ اردو تینوں زبانوں کے اختلاط سے بنی ہے اور اب چوتھی زبان انگریزی کے الفاظ بھی اس میں داخل ہو رہے ہیں۔

عربی اور فارسی الفاظ کی شناخت!

از جناب پیر غلام دستگیر نامی

---

[1] قوم کی زبان خواہ کوئی ہو اور اصطلاح میں وہ الفاظ جن کے معنی مشہور نہ ہوں۔ (نامی)

ندرتِ خیال

خمسہ

از حضرت ندرت میرٹھی

وفورِ غم کا عالم یاس کا منظر بھی دیکھا ہے
اُجاڑا ہے محبت نے جسے وہ گھر بھی دیکھا ہے
تصور ... ن بے نقاب آ کبھی دیکھا ہے
کبھی تم نے تماشائے دلِ مضطر بھی دیکھا ہے
سنا ہے آپ نے ... یا محشر بھی دیکھا ہے

کلیجے میں بہت رنج و الم نشتر چبھوتے ہیں
مگر ہم آبروئے ضبطِ غم کو کب ڈبوتے ہیں
گریباں چاک کرتے ہیں دامن کو بھگوتے ہیں
یہ سچ ہے دل بھی روتا ہے ہمارا ہم بھی روتے ہیں
مگر آنسو کسی نے آنکھ سے باہر بھی دیکھا ہے

محبت کرنے والے عشق کا دم بھرنے والے ہیں
فنا ہو کر بقا کا نام زندہ کرنے والے ہیں
ترا دل بھی بخوبی جانتا ہے مرنے والے ہیں
ہمیں تو کیا ڈراتا ہے کوئی ہم ڈرنے والے ہیں
تجھے بھی ہم نے دیکھا ہے ترا خنجر بھی دیکھا ہے

کوئی بنتا ہے شمعِ عارضِ شیریں کا پروانہ
نظر آتا ہے کوئی گیسوئے لیلےٰ کا دیوانہ
جسے دیکھو وہ اک زعمِ عقیدت سے ہے بیگانہ
حرم دیکھا مسلماں نے برہمن نے صنمخانہ
کبھی ان دیکھنے والوں نے تیرا در بھی دیکھا ہے

غضب آلود وہ چتون بھی نظر بھی خشمگیں دیکھی
کبھی ابرو کے بل دیکھے کبھی چینِ جبیں دیکھی
تجھے دیکھا تری اک اک ادائے دلنشیں دیکھی
طلب جس شے کی ہے ساقی وہ شے ہم نے نہیں دیکھی
ترا شیشہ بھی دیکھا ہے ترا ساغر بھی دیکھا ہے

سمائی ہے یہ کیا جی میں سمجھائے دل ہے اے ندرت
پھنسانا چاہتا ہے جان کو مشکل میں اے ندرت
... سعی لاحاصل ہے اے ندرت
قدم رکھا ہے تو نے عشق کی منزل میں اے ندرت
کوئی ساتھی کوئی ہمدم کوئی رہبر بھی دیکھا ہے

شعروشاعری

از الحاج مولانا پروفیسر حامد حسن قادری

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بسم اللہ شریف کو شاعروں نے مصرع مانا ہے اور اس کے لئے بحر سریع تجویز کی ہے جس کا وزن یہ ہے۔

مفتعلن مفتعلن فاعلات

اس وزن پر ۳۴ مختلف شعرائے عجم و ہند نے ۶۰ مصرعے موزوں کئے ہیں۔ وہ سب میری بیاض میں یکجا لکھے ہوئے ہیں۔ ناظرین کی دلچسپی کے لئے چند مصرعے پیش کرتا ہوں۔

مجھے سب سے زیادہ نظامی گنجوی کی تضمین پسند ہے جو اُن کی مثنوی مخزن الاسرار کا مطلع ہے یعنی ؎

ہست کلید درِ گنج حکیم
بسم اللہ الرحمن الرحیم

ایک شاعر معراج الدین واصف نے نظامی کے مصرع کی جواب نگاری کی ہے لیکن وہ لطف نہیں رہا۔ کہتے ہیں ؎

مفتاح الباب الکنز الحکیم
بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظامی کے بعد مولانا جامی کی تحفۃ الاحرار کا مطلع اچھا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

ہست صلائے پلے خوانِ کریم
بسم اللہ الرحمن الرحیم

قرآن مجید خوان کریم اور اس کی طرف بلاوا بسم اللہ الرحمن الرحیم کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھتے ہیں اور یہ بھی عادت ہے کہ دستر خوان پر مہمان بیٹھ جائیں تو شروع کرنے کے لئے کہتے ہیں "بسم اللہ الرحمن الرحیم" یا "بسم اللہ کیجیے" یہ رعایتیں مولانا جامی کا خاصہ ہیں ساری "تحفۃ الاحرار" انھیں صنعتوں سے بھری پڑی ہے۔

امیر خسرو کی ذہانت سے امید تھی کہ کوئی پھڑکتا ہوا مصرع لگائیں گے لیکن صرف ایک شاندار مصرع کہدیا۔ "مطلع الانوار" کا مطلع ہے ؎

خطبۂ قدس ست بملکِ قدیم
بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس سے بہتر و برجستہ کسی اور شاعر کا یہ مصرع ہے جس کا نام دریافت نہ ہو سکا ؎

مصرعِ برجستۂ نظمِ قدیم
بسم اللہ الرحمن الرحیم

شاید اسی سے مولوی ذوالفقار علی مرشد آبادی نے یہ مضمون پیدا کیا ہے اور خوب کیا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم
خال و خطِ شاہدِ نظمِ قدیم

عرفی شیرازی نے بھی بہت اچھا مضمون نکالا۔ اپنی مثنوی "مجمع الابکار" کا مطلع لکھا ہے ؎

موجِ نخست است ز بحرِ قدیم
بسم اللہ الرحمن الرحیم

فیضی کا مصرع بھی اسی کے ہم پایہ ہے۔ مثنوی "مرکز الادوار" کا مطلع کرتے ہیں ؎

گنجِ ازل را است طلسمِ قدیم
بسم اللہ الرحمن الرحیم

بقیہ مصرعے خیال آرائیاں اور طبع آزمائیاں ہیں مگر لطافت نہیں۔ بعض نے عجیب مضامین نکالے ہیں مثلاً

از میرزا طاہر نصیر آبادی۔ ع

ارّہ کشِ تارکِ دیو رجیم

از ملا قربانی ع

سرو سیہ پوشِ ریاضِ قدیم

از عبد الاحد وحدت ع

وسمۂ ابروئے عروسِ قدیم

مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے بڑا زور لگایا تو یہ مصرع نکالا۔

تیغِ سیہ تابِ رسولِ کریم
بسم اللہ الرحمن الرحیم

"سیہ تاب" کے یہ معنی ہیں کہ صاف تلوار کو گرم کرکے اس پر نیبو کا عرق مل دیتے ہیں تو لوہے پر اودا رنگ آجاتا ہے۔ اس لئے

"تیغ بسیہ تاب" محاورہ ہے اور بسم اللہ کے لئے مناسب بھی ہے کہ سیاہی سے لکھی جاتی ہے اسی سبب سے اور شاعروں نے "سرو سیہ پوش" اور "وسمۂ ابرو" کہا ہے۔ مولانا آزاد بلگرامی نے یہی وجہ شبہ اردو کے یہاں دیکھ کر "تیغ سیہ تاب" کا لفظ تلاش کیا ہے۔

ان شاعرانہ مساعی جلیلہ یا جمیلہ کے مقابلے میں ایسے معمولی اور بے وقعت مضمون بھی ہیں جیسے عبد الحلیم عاصم مطلع نکالتے ہیں ؎

بسم اللہ الرحمن الرحیم
در غم و اندوہ و مصیبت ندیم

یہ مضمون مولوی ذو الفقار علی مرشد آبادی نے دوسری جگہ عاصم سے بہتر کہا ہے ؎

بسم اللہ الرحمن الرحیم
فِیْهِ شِفَاءٌ لِفُؤَادٍ سَقِیْمٍ

علاوہ عربی مصرع کی برجستگی کے "فواد سقیم" (دل بیمار) کے لئے شفا کہہ کر ایک بات پیدا کر دی۔ اسی "دوا دارو" کے مضمون میں کسی کا یہ مصرع بھی غنیمت ہے ؎

نسخۂ اکسیر ز کلک حکیم
بسم اللہ الرحمن الرحیم

لیکن ملک قمی ملک الشعرائے دربار ابراہیم عادل شاہ بادشاہ بیجاپور (دکن) کو سب شاعروں سے الگ سوجھی یعنی انھوں نے بسم اللہ کا یہ جدید وزن تجویز کیا۔

مفعولن مفعولن فاعلات
بسم اللہ والرحما ن الرحیم

اور اس پر مصرع لگانے کے لئے سورہ فاتحہ (الحمد شریف) کی ایک آیت کو کھینچ تان کر مصرع بنالیا اور اس کو اپنی مثنوی صنیع الا نہار کا مطلع کیا ؎

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ

"د" اور "ص" دونوں کو کھینچ کر "ی" کے ساتھ پڑھا جائیگا۔ بہرحال سوجھی دُور کی۔

تجلّیات

از: جناب امین منصوری کلکتوی

مل کے پلٹی جو آنکھ قاتل سے — دل کی حسرت لپٹ گئی دل سے
فرقتِ یار میں تڑپنے کی — لے رہا ہوں قسم۔ رگِ دل سے
کھل گئے عقدہ ہائے حسنِ ازل — موجیں ٹکرائیں جا کے ساحل سے
بن کے بجلی فلک کو توڑ گئی — آہ نکلی، جو خانۂ دل سے
پوچھ اُس سے طریق و رسم نیاز — جو مسافر ہو دُور منزل سے
عرش سے آکے فرش ٹکرایا — دل اگر مل گیا کہیں دل سے

حق کو ناحق جو کہتا ہو آمین
کیا اُمیدیں ہوں ایسے عادل سے

نقشِ غمگیں

افسانہ

ازجناب سیّد شمیم العسکری

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے ‏ ‏ سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

"ریاضِ زندگی کا ایک غنچۂ ناشگفتہ، ایک فرمانبردار بچی، ایک محبت کرنے والی بہن، جسے عمر کی تیرہویں بہار دیکھنے سے پہلے ہی موت کے بے رحم ہاتھوں نے چھین لیا"

بھوری بھوری اُداس پہاڑیاں، خاردار جھاڑیاں اور کوہستانی درختوں کے جھنڈ ـــــ کہنہ و شکستہ قبریں، منتشر، بے ترتیب، مٹتے ہوئے کتبے، بکھرے ہوئے کنارے۔ کچھ نئے لپے پُتے مزار، پھولوں سے لدے ہوئے عود و عنبر کے زردی مائل دھوئیں کے حلقوں میں محیط، مُردہ زمین، مُردہ آسمان ہوا کی سسکتی ہوئی لہریں، کبھی آہ بھرتی، کبھی خاموش ـــــ یہاں زندگی کی تمام قوتیں سرنگوں ہیں ـــــ مرتفع سنگین ٹیلوں اور ناگ پھنی کی وادی کی بائیں جانب، کوہستانی جادۂ شکستہ پر جھکے ہوئے بھاری بھاری قدموں کے غیر مربوط نقوش گذرنے والوں کے ذہنی انتشار کی عکاسی کتنی خوبی سے کر رہے ہیں ـــــ پیروں کے یہ نشان اس اندوہگیں نوجوان کے ہیں جس کی نمناک آنکھیں اس کے بحرِ جذبات کی آئینہ دار ہیں ـــــ اور جس کا سر بارِ الم سے جھک کر سینے پر آ گیا ہے۔

شکستہ رنگ و پژمردہ چہرہ ـــــ !

خمیدہ کمر، بے برگ و بار پہاڑی، درخت کے نیچے تازہ مٹی کا ایک ننھا سا ڈھیر ـــــ خزاں کی بھیانک آغوش میں بہار کا مدفن یا موت، زندگی کی امین،

"اماں! بھائیجان آ گئے!" حسرتناک استفہامیہ لہجہ، کمسنی کی تمام مضطرب طفلانہ آرزوئیں۔ آسمانی شہنشاہی کے اوامر و آئین ـــــ سے مرعوب ہو کر اپنی خوشیاں بھول گئیں۔ قدرت کا ملوکانہ اقتدار کس قدر [illegible] اس کا قوت اس کے چہرے کا رنگ، اس کا اندازِ ستصواب [illegible] اور سب سے قوی خواہش کو باانداز استفسار ظاہر کرنے پر بھی خوفزدہ تھی۔ کہیں فطرت کے آئین اس معصوم خواہش کو بھی بغاوت سے تعبیر نہ کر دیں۔؟

"اماں! بھائی جان کب آئیں گے؟"

حرماں نصیب بچی کا سہما ہوا اندازِ سوال قدرت کے رحیمانہ جذبات کو حرکت دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ بھائی آ گیا لیکن اس وقت جب زندگی کی متاع صرف گنتی کی خشک ہڈیاں اور چند غیر مربوط سانسیں رہ گئی تھیں۔ کاہیدہ تن مریضہ کے زرد چہرے پر ہلکا سا تبسم آ گیا، شاید ڈوبتے ہوئے آفتاب کی چند لرزتی ہوئی کرنیں، خشک خس و خاشاک کے ایک ڈھیر پر پڑ کر اسے چمکا سکتی ہیں، لیکن دل کے افق پر آفتابِ آرزو کی مکمل ضیاپاشی اتنی روشنی بھی اس کے بیجان جسم پر نہ ڈال سکیں۔ سوکھا ہوا ہاتھ بدقت پیشانی تک پہنچ سکا۔

"آداب بھائیجان!"

شاید لبوں کی جنبش کا مطلب یہی تھا، لیکن آہ ناطاقتی ہونٹوں کی خفیف حرکت بھی چہرہ پر کرب و تشنج بن کر رہ گئی ـــــ بھلا ایسے میں تابِ سخن کہاں؟

زندگی کتنی کور چشم ہے اس کی مجبوری کا یہ عبرتناک منظر بھی اس کے لئے سبق نہیں بنتا۔ اُف! بے بصر انسان سسکتی ہوئی تھکی ہاری زندگیوں کا کیا ٹھکانا ـــــ جب گدرائی ہوئی جوانی اور شباب کے سربلند قصر تک فطرت کے ادنےٰ اشارے کے آگے مجبورِ محض ہیں آہ کتنی بے ثبات ہے زندگی؟

وہی بھولا بھالا چہرہ جو کبھی اپنے بھائی کی آمد کی خوشی میں معصومانہ انبساط سے کھل اٹھتا تھا۔ آج ایک غیر معمولی تفکر، ایک لامعلوم تشویش کے سبب کھویا ہوا سا تھا۔ شاید فطرت کا کوئی بھیانک راز سے

نقاب ہو رہا تھا — کون جان سکتا ہے؟ انسان کا اخلاص تجسس، ان اسرار کو اسرار ہی جاننے پر مجبور رہے۔

موت، زندگی سے "آنکھ مچولی" کھیل رہی تھی۔ معصوم زندگی موت کے ہتھکنڈوں کو کیا سمجھے؟ — وہ ایک قالب خاکی میں روپوش ہو کر خوش تھی؛

اب، موت کیسے پکڑ پائے گی، آہ کھیل میں جیت کا معصومانہ فریب! لیکن موت! موت ایک گھاگ — زندگی کی فریب خوردگی پر متبسم —! آخر وہ وقت آگیا، جب موت نے تھتھار کر سہمی ہوئی زندگی کا دامن پکڑ لیا۔

"چور —!" بے شک، اب زندگی شاہ نہیں تھی۔ کھیل کا رخ پلٹ چکا تھا۔ اب زندگی چور تھی۔ اسے اب اپنی آنکھیں بند کرنی تھیں۔ اور موت؟ اس کا کام پھر ایک فریب دہ کھیل کا آغاز۔

وقت نے انگڑائی لی۔ اور ایک تھکے ہارے انسان کی طرح خستگی سے ہاتھ ڈال دیئے۔ آنکھیں بند کر لیں۔ سرما کی دوامی بہاریں، فردوسی کے خوشگوار لمحات، سب یکایک مضمحل ہو گئے۔ گرجتی ہوئی کالی کالی گھٹائیں سہانے سرمائی آسمان پر چھا گئیں۔ بہار کی دیوی نے کروٹ بدلی ایک سسکی لی اور موت کی گود میں سو گئی۔

غمگین فضا، سوگوار کائنات،

مہیب گھٹاؤں میں چھپا ہوا آفتاب چپکے ہی چپکے مغرب کی کسی وادی میں روپوش ہو گیا۔ موسم کی تاریکی پر شام کے تیرہ و تار پردے پڑنے لگے۔

دن کا دم بازپسیں — ذرہ ذرہ ساکت، ہوا خاموش، فضا گم سم! — لیکن صرف چند لمحوں کے لئے۔ فطرت کا مصور پردۂ کائنات پر ایک غمگین نقش کھینچ رہا تھا۔ اس کی لمبی لمبی انگلیوں میں پھنسا ہوا برش، تیزی سے تصویر کی تکمیل میں مصروف تھا۔

آخر تصویر بن گئی۔ ہر چیز مکمل، ہر نقش نقاش کی ہنرمندی کا آئینہ لیکن بے جان — بےحس! — خاموش، مصور کی متجسس نگاہیں ایک لمحہ بھر میں اکناف عالم میں گھوم آئیں اور آخر رک گئیں۔

"مجھ کو اس بے جان تصویر کو ذی روح بنانا ہے"

ملاء اعلیٰ کے فرشتے عالم علوی سے عالم سفلی کی طرف مائل بہ پرواز نظر آنے لگے۔ خلائے آسمانی بیشمار شہپروں کی پھڑپھڑاہٹ سے معمور ہو گئی

[illegible] کی تمام ظاہری دشمنی [illegible] لے کر بیدار ہو گئیں۔

ہیجان خیز فضا سیکڑوں دردوں کے بوجھ سے ہانپنے لگی۔ یہ سب تیاریاں تھیں ایک دلہن کی رخصتی کے لئے۔ ایک ماں کی گود میں [illegible] ڈالنے — ایک باپ کے سینے میں غم کا طوفان [illegible] دل بھائی بہنوں کے خرمن جذبات و ہوش میں آگ لگانے کی۔

رات بھر ماتمی گھٹائیں پیہم اشکباری میں مشغول رہیں — صبح ہوتے ہوتے خطۂ ارضی طبقۂ زمہریر بن گیا۔ نحیف و زار مریضہ، جس کی لبوں کی ادنیٰ جنبش بھی اس کے لئے نزع سے کم نہ تھی مسلسل تین روز سے قدرت کی بیدردانہ ستم ظریفی کا شکار بن رہی تھی — آہ جب ہونٹ حرکت سے معذور ہو چکے تو دل خود چیخ چیخ کر رونے لگا۔ یہ مرض کے شدید حملے کی صدائے بازگشت تھی اور پھر —! روشنی کی پہلی کرن پھوٹتے پھوٹتے ہزاروں امراض کا شکار لڑکی، معصوم لڑکی اپنے دونوں پھیپھڑوں پر کسی لاعلاج شدید مرض کا غلبہ محسوس کرنے لگی — آہ موت کا خونخوار پنجہ سانس کی ڈور پکڑ چکا تھا۔

پھر ایک دلخراش آہ تھی، جو بلا ایک لمحے کے وقفہ کے روح کے بستہ لبوں سے سسک سسک کر نکل رہی تھی — یہ تیر تھے جو غمزدہ تیمارداروں کے مجروح دلوں کے پار ہوئے جاتے تھے۔

زندگی کا یہ کتنا غمناک انجام تھا؟

حواس باختہ ماں اپنے کلیجہ کو دونوں ہاتھوں سے دبائے، پوری قوت سے دبائے — ناتوان باپ کمر پکڑے اور بھائی بہن حسرت سے اپنی تڑپتی ہوئی بہن کو مجبور نظروں سے دیکھا کئے۔ سب اشکوں کے سیلاب میں بہے جا رہے تھے۔

ننھے ننھے معصوم اپنے بڑوں کو ٹکٹکی باندھے حیران۔ خاموش!

ڈاکٹروں کی حکمت، طبیبوں کی مسیحا نفسی، اپنی آخری تدابیر کو بھی اس بری طرح منہ کی کھاتے دیکھ کر سرنگوں تھیں۔

مرض نے ایک اور چرکا لگایا۔ حالت بد سے بدتر ہو گئی، کمزور باپ اور الم زدہ ماں گھبرا کے سجدہ ریز ہو گئے۔

آہ! — خدا ہماری شب دروز کی الحاح و زاری کا [illegible] کوئی جواب نہیں، — قدرت کے کان بہرے ہو چکے تھے۔ آخر باپ کی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں آسمان کی طرف اٹھیں۔ اس کے [illegible]

[illegible] اور ان کے مرتعش لبوں نے انسان کی بیچارگی اور [illegible] پر اقوال کی مہر ثبت کر دی۔

"آہ محبوبہ — اب تو کب تک ہمارے صبر کا امتحان لیتا رہیگا، آنکھیں اس نظارے سے کور ہو چکیں۔ دل اس پیہم صدائے کرب کو سنتے سنتے پھٹ چکا ہے"

فطرت مسکرا دی۔

خود سر انسان کو اس عالم بیچارگی میں دیکھنا یقیناً قدرت کے لئے ایک دلچسپ منظر ہے۔ وہ کیوں نہ اپنی قوت پر مسکرائے۔

بزرگوں اور معصوم عزیزوں کی روحیں خیر مقدم کو موجود۔

مغنیان فردوس دھیمے سُروں میں موت کا غمگین راگ گانے لگے مزامیر اور نغمات کی ہم آہنگ صدائیں فضا میں منتشر ہو گئیں۔ زندگی اور موت کی کشمکش ختم ہو گئی۔ اٹکی ہوئی سانسیں یکایک پیہم ہچکیوں میں بدل گئیں۔ دو کمزور جھٹکوں کے بعد — زندگی کا طلسم ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گیا۔

آہ کتنی جلدی ایک روشن حال تاریک ماضی میں بدل جاتا ہے۔

زندگی کے ایک شگفتہ گل کی بجائے اب صرف ایک تودۂ گِل تھا — اور بس!

مصور فطرت کے نقش الم کے لئے ایک معصوم روح مل گئی۔ فطرت اپنے انتخاب پر مسکرا دی۔ آسمان کے کالے بادل چھٹ گئے۔ چاند کا دمکتا ہوا چہرہ گھٹاؤں کی اوٹ سے نکل آیا۔ چند کانپتے ہوئے ہاتھوں نے ایک دلہن بازگور کے بے رحم گود میں اپنی متاع عزیز ڈال دی۔ لمبے لمبے کالے بال دونوں شانوں پر بکھر گئے۔ دودھ سا سفید کفن معطر و معنبر — ہونٹوں کا معصوم تبسم،

کمسن عروس وداع ہو رہی تھی۔ قدرت نے بکمال فراخدلی رخصت ہونے والی دلہن پر تنویر ماہتاب نچھاور کر دی — چاندنی جسم پر لوٹنے لگی۔

انسان کا رشتہ انسان کے ساتھ صرف اس منزل تک ہے اور ختم!

ہزاروں من مٹی نے ایک پھول سے جسم کو چھپا لیا اور انسان اپنی بیچارگی پر آنسو بہاتا ہوا واپس!

آہ ماں باپ کی دعائیں، بہنوں کی التجائیں۔ بھائیوں کے شہزور بازوؤں کی قوت — کوئی بھی موت کے بیرحم ہاتھوں سے جانثار نفیس کو نہ بچا سکا۔

ٹوٹے ہوئے پہاڑی راستے پر سرنگوں نوجوان، آنسوؤں کی نہ رکنے والی جھڑی کو روکنے کی ناکام سعی کرتے ہوئے آہستہ آہستہ اُتر گیا۔ یہ بھائی تھا — اس بہن کا جو اپنے ساتھ اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی بھی لیتی گئی۔ آہ،

"غمگین بھائی! تیرے بازو کی ایک آستین گر گئی"،

قطعات

روئے فطرت سے اٹھ رہا ہے نقاب
جلوہ گر ہو رہا ہے ماہتاب
چھلکتے ہیں ساغرِ انجم
آسماں سے برس رہی ہے شراب

مثالِ شمع جلتی جا رہی ہے
ہر اک سانچے میں ڈھلتی جا رہی ہے
نہ بدلا اہلِ دنیا کا وطیرہ
مری دنیا بدلتی جا رہی ہے

لطیف انور گورداسپوری

رودادِ محبت

محبت کیلئے اُن سے محبت ہوتی جاتی ہے

ازحضرت سروش عسکری طباطبائی

محبت آئینہ دارِ حقیقت ہوتی جاتی ہے
مری نظروں میں ہر شے خوبصورت ہوتی جاتی ہے

ہر اک خواہش ہر اک امید رخصت ہوتی جاتی ہے
محبت کیلئے ان سے محبت ہوتی جاتی ہے

کبھی رازِ طرب کی جستجو تھی اب یہ عالم ہے
"خوشی" کے نام سے بھی دل کو وحشت ہوتی جاتی ہے

مبارک حسنِ بے پروا کو بے پروائیاں اپنی
محبت خود ہی غمخوارِ محبت ہوتی جاتی ہے

سکوں تو مِٹ چکا بیتابیاں بھی مٹتی جاتی ہیں
دلِ زندہ کی تکمیل شہادت ہوتی جاتی ہے

رگیں کھنچتی ہیں دل سینے سے باہر نکلا آتا ہے
گلے مل مل کے ان کی یاد رخصت ہوتی جاتی ہے

شکن لاؤ جبیں پر یا نگاہِ لطف سے دیکھو
ہر اک صورت مرے مٹنے کی صورت ہوتی جاتی ہے

الٰہی ظرفِ ضبطِ غم کی تو ہی آبرو رکھ لے
طبیعت آج لبریزِ شکایت ہوتی جاتی ہے

حکم کی ملکہ

نوشتہ :۔ اے۔ ایس۔ پشکن

مترجمہ :۔ جناب ابراہیم احمد زبیری

لفٹنٹ نرومووکے مکان پر تاش کی بازی گرم تھی۔ سردی کی رات تھی۔ وقت کا کسی کو احساس نہ تھا صبح کے پانچ بجے ناشتہ آیا۔ بھوکوں نے شکم سیر ہو کر کھایا اور باقی بے شغل بیٹھے رہے۔ شمپین کے آنے سے سب میں ایک نئی زندگی کی لہر دوڑ گئی اور سب لوگ شراب سے شغل کرنے لگے

"تمھارا کیا رہا سُورن؟" میزبان نے پوچھا۔

"حسب معمول ہارا۔ میں ہمیشہ سے بدقسمت ہوں۔ حالانکہ میں بہت خاموشی اور احتیاط سے کھیلتا ہوں مگر پھر بھی ہارتا ہوں"۔

مہمانوں میں سے ایک نے پوچھا۔ "اور تمھارا ہرمان کے متعلق کیا خیال ہے اس نے کبھی تاش کا ایک پتہ بھی نہیں چھوا اور نہ کبھی بازی لگائی پھر بھی وہ ہمیں پانچ بجے تک کھیلتا ہوا دیکھتا رہتا ہے"۔

ہرمان نے کہا۔ "تاش سے مجھے اُلفت ہے۔ مگر میں تفریح کے لئے ضروریات کی قربانی نہیں کر سکتا"۔

"ہرمان جرمن ہے اور ہوشیار ہے مجھے اس سے تعجب نہیں ہوتا"۔ ٹومسکی نے کہا۔ "میرے لئے تعجب خیز میری دادی ہے یعنی شہزادی اینا فیڈورووناؔ"

"کیوں؟ کیسے؟" تمام مہمان ایک ساتھ چلّائے۔

ٹومسکی نے کہا۔ "میں نہیں سمجھ سکتا وہ کیوں کبھی نہیں کھیلتیں؟"

"یہ کوئی نئی بات نہیں ہے"۔ نرومونے کہا۔ "تم جانتے نہیں وہ اسّی برس کی بوڑھی عورت ہے"۔

"کیا تم اس کے متعلق کچھ جانتے ہو؟"

"نہیں، کچھ نہیں"

"اچھا! میں تمھیں بتاتا ہوں۔ ساٹھ سال گذرے میری دادی پیرس گئی اور وہاں لوگوں کے لئے آماجگاہ شوق بن گئی۔ لوگ اس کی گاڑی کے پیچھے بھاگتے تھے کہ اس کی ایک جھلک ہی دیکھ لیں۔ ریشولیو نے تو اس سے اظہار محبت کیا اور ہماری دادی نے ہمیں یقین دلایا کہ اس نے خودکشی کر لی کیونکہ دادی اس سے اچھی طرح بات نہ کرتی تھی۔ اس زمانے میں وہ "فیرو" کھیلتی تھی۔ ایک دن وہ ایک اچھی خاصی رقم ڈیوک ڈی اورلینز سے ہار گئی۔ گھر پہنچکر اُس نے اپنی تمام آرائش کی چیزیں اتار دیں۔ اس نے میرے دادا سے اپنے نقصان کا ذکر کیا اور ان سے کہا کہ وہ اس کے نقصان کو پورا کریں۔ میرے دادا جو مرچکے ہیں میری دادی سے بہت ڈرتے تھے لیکن جب انھوں نے اس نقصان کا حال سُنا تو بہت خفا ہوئے اور اسے بتایا کہ وہ چھ ماہ میں لاکھوں صرف کر چکے ہیں اس لئے وہ اسے کچھ نہ دینگے۔ میری دادی کو بہت غصہ آیا اور اس رات وہ اپنی ناراضی ظاہر کرنے کے لئے اس کے پاس نہ سوئی۔ صبح کو اس نے پھر دادا سے کہا مگر ان کو ضدی اور ہٹ دھرم پایا۔

اتفاق سے دادی کی ایک بہت عجیب آدمی سے سرسری ملاقات تھی۔ تم نے کاؤنٹ سینٹ جرمین کا نام سُنا ہوگا۔ جس کے متعلق بہت سے قصے مشہور ہیں۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کے پاس آبِ حیات تھا۔ کچھ لوگ اسے دغاباز کہتے تھے۔ جرمین ایک عجیب آدمی تھا اس کے خط و خال بہت دلکش تھے۔ دادی اسے اب تک یاد کرتی ہے۔ اور اگر کوئی اسے بُرا بھلا کہتا ہے تو خفا ہوتی ہے۔ دادی نے سوچا کہ وہ اسے مالا مال کر سکتا ہے اس لئے اُس نے اُسے بلوایا اور تمام حال سنا کر اپنے خاوند کی سختیوں کا بھی ذکر کیا۔ جرمین نے اسے ایک راز بتایا جسے معلوم کرنے کے لئے ہم ایک گرانقدر رقم دے سکتے ہیں۔ اسی شام کو دادی وارسائی گئی۔ وہ وہ ڈیوک اورلینز کے ساتھ کھیلنے بیٹھی اس نے تین تاش چُنے جو اُس نے ایک دوسرے کے بعد رکھے اور ہمیشہ جیتی۔ اس نے لاکھوں جیت لیا۔

"محض اتفاق ہے"۔ مہمانوں میں سے ایک نے کہا۔

"یہ ایک فرضی قصّہ ہے"۔ ہرمان نے کہا۔

"تاشوں پر نشان لگے ہونگے"۔ تیسرے نے کہا۔

"لیکن میرا یہ خیال نہیں ہے"۔ ٹومسکی نے کہا۔

"کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تمھاری دادی کو تین جیتنے والے تاش کے پتے معلوم ہیں اور تم نے اس سے کبھی نہیں پوچھے کہ وہ کیا ہیں —؟" نرومونے کہا۔

"ہاں" ٹوسکی نے کہا۔ "اس کے چار لڑکے تھے جن میں سے ایک میرا باپ تھا اور سب کے سب جواری تھے لیکن میں نے پندار کسی ایک سے نہیں کہا حالانکہ وہ ان کے اور میرے لئے کارآمد ہوتے لیکن میرے چچا کاؤنٹ الیون ایچ نے مجھ سے کہا کہ شیپلسکی مرحوم جس نے لاکھوں کروڑوں برباد کر دیا ایک دفعہ تین لاکھ روبل زوریچ سے ہار گیا۔ دادی کو اس پر رحم آیا اور اس نے اسے تین پتے بتا دیئے اور اس سے یہ وعدہ لے لیا کہ وہ پھر کبھی اپنی زندگی میں نہ کھیلے گا۔ شیپلسکی زوریچ کے ساتھ کھیلا۔ پہلی دفعہ اس نے پچاس ہزار کی بازی لگائی اور وہ جیتا۔ اس کے بعد پھر جیتا حتیٰ کہ وہ جتنا ہارا تھا اس سے زیادہ جیت گیا۔ بہرحال اب ہمیں سو جانا چاہئے۔ چھ بج چکے ہیں۔"

بوڑھی کاؤنٹس اپنے ڈریسنگ روم میں آئینے کے سامنے بیٹھی ہے تین خادمائیں موجود ہیں ایک کے ہاتھ میں غازہ کا ڈبہ ہے دوسرے کے ہاتھ میں سر میں لگانے کے کلپ اور تیسری ایک ٹوپی لئے ہے جو خوبصورت فیتوں سے آراستہ ہے۔ کاؤنٹس بالکل حسین نہیں ہے اس کا حسن معدوم ہو چکا ہے لیکن اب بھی اس کی وہی عادتیں ہیں اور اپنے سنگار میں اتنا ہی وقت صرف کرتی ہے جتنا کہ ۶۰ برس پہلے کرتی تھی۔

"دادی سلام" ایک نوجوان نے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔ "میں آپ سے کچھ پوچھنے آیا ہوں۔"

"کیا ہے بیٹے؟"

"کیا میں اپنے ایک دوست کا آپ سے تعارف کرا سکتا ہوں؟ کیا میں اسے اپنے ساتھ جمعہ کو ڈانس میں لے آؤں؟"

"ہاں اسے وہیں لا کر مجھ سے تعارف کرانا ـــــ کیا تم ـــــ کے یہاں گئے تھے؟"

"ہاں میں گیا تھا۔ ہم پانچ بجے تک ناچتے رہے۔ ایلیٹکا یا بہت خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔"

"خوبصورت! تم نے اس کی دادی کو دیکھا ہوگا۔ شہزادی ڈاریا پیٹرو ونا میرا خیال ہے اس کی عمر کافی ہو گی۔"

"لیکن اسے مرے ہوئے سات سال ہو گئے۔" ٹوسکی نے کہا۔

"مر گئی؟" اس نے پوچھا "اور مجھے نہیں معلوم۔ میں اور وہ ....."

اور پھر کاؤنٹس نے وہی قصہ اسے سنایا جو وہ بارہا سنا چکی تھی تھوڑی دیر بعد وہ اپنی خادماؤں کے ساتھ پردے کے پیچھے چلی گئی۔ ٹوسکی لڑکی کے ساتھ وہیں رہا۔

"تمہارا کون سا دوست ہے جس سے تم تعارف کرانا چاہتے ہو؟" لزاویٹا نے پوچھا۔

"نرومووا۔ کیا تم اسے جانتی ہو؟"

"نہیں، کیا وہ سپاہی ہے؟"

"ہاں سپاہی۔"

"انجینئرز میں؟"

"نہیں کیولری نے۔ یہ تمہیں کیسے خیال آیا کہ وہ انجینئرز میں ہے؟"

لڑکی ہنسی اور اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"بیٹے!" کاؤنٹس نے پردے کے پیچھے سے کہا۔ "کوشش کر کے مجھے ایک ناول بھیج دو۔"

ٹوسکی چلا گیا۔ لزاویٹا اکیلی رہ گئی۔ وہ اپنا کام چھوڑ کر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد ایک جوان افسر سڑک کے کونے پر دکھائی دیا۔ لزاویٹا کا چہرہ تمتما اٹھا۔ وہ اپنا کام کرنے لگی۔ اسی دوران میں کاؤنٹس داخل ہوئی۔

"گاڑی تیار کراؤ لزانکا ہم باہر جائیں گے۔"

"ابھی جاتی ہوں۔" لڑکی نے کہا اور باہر بھاگ گئی۔

"کیا گاڑی تیار ہے؟"

"ہاں!" لزاویٹا نے سڑک پر جھانک کر کہا۔

"تم ابھی تک تیار کیوں نہیں ہو۔" کاؤنٹس نے کہا۔ "مجھے ہمیشہ تمہارا انتظار کرنا پڑتا ہے۔"

لزا اپنے کمرے میں بھاگ گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ داخل ہوئی۔

"کتنی اچھی زیبائش ہے۔ موسم کیسا ہے۔ میں سمجھتی ہوں ہوا تیز چل رہی ہے۔"

"نہیں ہوا تیز نہیں ہے۔" ایک خادم نے کہا۔

"کیا تمہیں یقین ہے۔ کھڑکی کھولو ـــــ تم دیکھتے ہو ہوا تیز چل رہی ہے اور ٹھنڈی ہے۔ لزانکا اب مجھے گاڑی نہیں چاہئے آج ہم باہر نہیں جا سکتے۔"

"کیا زندگی ہے؟" لزاویٹا نے سوچا۔

اور یہ واقعہ ہے کہ لزاویٹا بہت ہی بدقسمت تھی۔ کاؤنٹس دل کی خراب نہ تھی بلکہ اسے دنیا نے تباہ کر دیا تھا۔ وہ وہمی ہو گئی تھی اور اپنی تعریف خود کرتی تھی۔ وہ سوسائٹی کے تمام جلسوں میں جاتی تھی لیکن اس کی کوئی پروا نہ کرتا تھا اس کے نوکر [illegible]

گئے تھے گھر کا تمام انتظام لزاوینا کے سپرد تھا وہ اُسے پائی پائی کا حساب دینا ہوتا تھا۔ وہ اگر کبھی کاؤنٹس کے ساتھ باہر جاتی تو اس کے ہر سوال کا جواب دینا ہوتا۔ اس کی تنخواہ مقرر تھی مگر وہ اسے کبھی نہیں ملی۔ پھر بھی اس سے امید رکھی جاتی تھی اور لڑکیوں کی طرح لباس پہنے سوسائٹی میں اسے بھی ایک جانتا تھا مگر کوئی اس کی پرواہ نہ کرتا تھا حالانکہ وہ اور لڑکیوں سے جن کے پیچھے مرد مارے مارے پھرتے ہیں کافی حسین تھی۔

جس شام سے کہ یہ قصہ شروع کیا گیا ہے اس کے دو دن بعد——لزاوینا کھڑکی کے قریب بیٹھی کار چوبی کا کام کر رہی تھی۔ اس نے کھڑکی کے باہر جھانکا تو ایک جوان افسر کو سڑک پر کھڑے ہوئے دیکھا جو آس کی طرف گھور رہا تھا۔ وہ اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔ پانچ منٹ بعد اس نے دیکھا کہ نوجوان اسی طرح کھڑا ہے۔ وہ کھڑکی سے ہٹ آئی اور دو گھنٹہ تک کام کرتی رہی اتنے میں کھانے کا وقت ہو گیا۔ وہ اٹھی اور اپنا سامان رکھ دیا اتفاقاً اس نے کھڑکی کے باہر دیکھا تو اس نوجوان کو اسی طرح کھڑے ہوئے پایا۔ اسے یہ چیز نئی معلوم ہوئی۔ کھانے کے بعد اس نے آ کر دیکھا تو وہ آدمی جا چکا تھا۔ دو دن کے بعد وہ کاؤنٹس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھنے جا رہی تھی تو اس نے اس آدمی کو کھڑے دیکھا۔ وہ ڈرتی ڈرتی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ گھر واپس آ کر وہ کھڑکی کی طرف بھاگی۔ اس نے آدمی کو اسی طرح گھورتے ہوئے پایا۔ یہ چیز اس کے لئے نئی تھی۔ اس دن سے کوئی دن ناغہ نہ جاتا کہ وہ آدمی ایک مقررہ وقت پر وہاں نہ آتا ہو۔ ان دونوں میں ایک قسم کی قربت ہو گئی روز بروز وہ اس کی طرف زیادہ دیر تک دیکھتی رہتی۔ ایک ہفتہ بعد وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دی۔

جب ٹومسکی نے ایک دوست سے تعارف کرانے کی اجازت مانگی تو لڑکی گھبرا گئی تھی مگر یہ معلوم کر کے کہ نروموکیولری میں ہے اسے افسوس ہوا کہ اس نے بیکار اپنا راز ٹومسکی پر فاش کر دیا۔

ہرمان ایک جرمن لڑکا تھا جس نے کہ اس کے لئے ایک چھوٹی جائداد چھوڑی تھی لیکن ہرمان اپنی تنخواہ پر ہی گذارہ کرتا تھا۔ وہ ایک سنجیدہ آدمی تھا۔ وہ اپنی شخصیت کا اتنا مضبوط تھا کہ باوجود قدرتاً ایک جواری ہونے کے اس نے کبھی تاش نہ چھوئے تھے کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ اتنا خرچ نہیں کر سکتا۔ لیکن وہ رات بھر لوگوں کو کھیلتے ہوئے دیکھتا رہتا تھا۔

تین تاشوں کی کہانی اس کے دماغ میں سما گئی اور رات بھر اسے یہی خیال رہا۔ اس نے سینٹ پیٹرز برگ کی سڑکوں پر ٹہلتے ہوئے سوچا کہ شاید کاؤنٹس مجھے وہ تین پتے بتا دے اس لئے مجھے اپنی قسمت آزمانی چاہئے۔ اس سے ملاقات کرنا چاہئے۔ اس کا مداح ہو جانا چاہئے اور اگر ہو سکے تو اس کا عاشق بھی۔ مگر اس نے سوچا کہ اس میں وقت لگے گا۔ اس کی عمر ۸۷ سال کی ہے ممکن ہے ایک ہفتہ یا ایک ہی دن میں وہ مر جائے۔ وہ سینٹ پیٹرز برگ کی ایک خاص سڑک پر پہنچ گیا تھا۔ اس پر گاڑیاں چل رہی تھیں اور——ایک کوٹھی کی جگمگاتی برساتی میں رک جاتی تھیں۔

"یہ کوٹھی کس کی ہے؟" اس نے ایک پولیس مین سے پوچھا۔

"یہ کاؤنٹس .... کی کوٹھی ہے۔" پولیس مین نے جواب دیا۔

ہرمان چلا گیا۔ وہی کہانی پھر اس کے دماغ میں آ گئی۔ وہ کوٹھی کے آس پاس چکر لگاتا رہا بہت رات کو وہ وہاں سے واپس ہوا اور بہت دیر تک جاگتا رہا مگر جب وہ سویا تو اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ ایک میز پر بیٹھا ہے جس پر نوٹ اور سونا رکھا ہوا ہے۔ وہ تاش کھیلتا رہا اور ہمیشہ جیتتا رہا۔ وہ دیر بعد سو کر کھا اور اپنی خیالی دولت کے کھونے پر افسوس کرنے لگا۔ وہ پھر شہر میں گھومتا رہا اور اپنے آپ کو کاؤنٹس کی کوٹھی کے سامنے پایا۔ وہ رُکا اور کھڑکی کی طرف دیکھنے لگا اسے ایک سیاہ سر دکھائی دیا۔ تھوڑی دیر بعد سر اٹھا اس کے سامنے ایک خوبصورت چہرہ تھا۔ اور دو آنکھیں۔ اسی وقت اس کی زندگی بن گئی——!

لزاوینا نے ابھی اپنا کوٹ ہی اتارا تھا کہ کاؤنٹس نے اسے پھر بلایا اور گاڑی لانے کا حکم دیا۔ وہ لوگ باہر گئے۔ عین جس وقت کاؤنٹس گاڑی میں بیٹھ رہی تھی۔ لزاوینا نے اسی جوان افسر کو گاڑی کے پاس کھڑے ہوئے دیکھا۔ نوجوان نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ بہت پریشان ہوئی۔ وہ اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ کا ٹکڑا دے کر غائب ہو گیا۔ اس نے اسے اپنے دستانے میں چھپا لیا۔ راستہ بھر وہ مدہوش سی رہی۔ کاؤنٹس اس سے حسب معمول سوال کرتی رہی۔ "وہ ہمیں کون ملا تھا؟" "اس پل کا کیا نام ہے؟" "اس تختہ پر کیا لکھا ہے——؟" لزاوینا بے دلی سے جواب دیتی رہی۔ ایک آدھ جواب اس نے حماقت کا دیا۔ کاؤنٹس کو غصہ آ گیا۔

"تمھیں کیا ہوا پیاری! آج تم بالکل ایک لکڑی کا مجسمہ معلوم ہوتی ہو۔ کیا تم میری بات نہیں سن سکتیں یا سمجھ نہیں سکتیں۔ میں خدا کے فضل سے اب بھی صاف بول سکتی ہوں۔"

لزا دیٗا نے اسے نہ سُنا۔ جیسے ہی وہ لوگ گھر پہنچے وہ اپنے کمرے کی جانب بھاگی اور کاغذ نکال کر پڑھنے لگی۔ وہ عشق و محبت کی داستان سے بھرا ہوا تھا جس کا لفظ بلفظ کسی جرمن ناول سے نقل کیا گیا تھا۔

لزا دیٗا چونکہ جرمن نہیں پڑھ سکتی تھی لہٰذا وہ مطمئن ہو گئی لیکن اس خط نے اسے پریشانی میں ڈال دیا۔ اول تو یہ کہ وہ ایک نوجوان کا خط تھا اس نوجوان کی دلیری سے وہ گھبرا گئی اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے اس کھڑکی پہ کام کرنا چھوڑ دے یا اس کا خط اسے واپس کر دے اس نے اسے جواب دینے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ لکھنے بیٹھی، وہ خط پر خط لکھتی اور پھاڑتی رہی۔ آخر کار اس نے ایک خط لکھا جس سے وہ خود مطمئن ہوئی۔ اس نے لکھا۔

"میں جانتی ہوں تم شریف ہو اور تم اس ناسمجھ فعل سے ہرگز میری توہین نہ کرو گے۔ ہماری ملاقات اس طرح شروع نہ ہونا چاہئے تھی۔ بہر حال میں تمہارا خط واپس کرتی ہوں۔"

ہرمان کو سڑک پر کھڑا دیکھ کر اس نے اپنا خط نیچے پھینک دیا، ہرمان نے دوڑ کر خط اُٹھا لیا اور ایک دوکان میں پڑھنے چلا گیا۔ وہ ایسے ہی جواب کی امید رکھتا تھا اور مایوس اپنے گھر واپس چلا آیا۔

تین دن بعد ایک لڑکی لزا دیٗا کے نام ایک خط لے گئی۔ اس نے اسے بل سمجھ کر کھولا مگر وہ فوراً ہرمان کا خط پہچان گئی۔

"تم نے غلطی کی پیاری، یہ خط میرا نہیں ہے۔"

"نہیں یہ تمہارے ہی لئے ہے۔" لڑکی نے ہنسی ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "کیا تم اسے پڑھو گی؟"

لزا دیٗا نے خط پڑھا۔ ہرمان نے اس سے ملنے کی فرمائش کی تھی۔

"ناممکن!" اس نے کہا۔ "یہ ہرگز میرے لئے نہیں لکھا گیا۔" اور اس نے کاغذ کو پرزہ پرزہ کر دیا۔

"اگر تمہارے لئے نہیں تھا تو تم نے اُسے کیوں پھاڑا؟" لڑکی نے کہا "میں اس شخص کو واپس دیدیتی جس نے مجھے یہ کاغذ دیا تھا۔"

"میرے پاس آئندہ خط مت لایا کرو اور بھیجنے والے سے کہدینا کہ تمہیں شرم کرنی چاہیئے۔" لزا دیٗا نے چیخ کر کہا۔

ہرمان پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ کسی نہ کسی ذریعہ سے روز لزا دیٗا کو ہرمان کا ایک خط مل جاتا۔ وہ عشق و محبت کی داستانوں سے پُر ہوتا وہ ان کو پڑھ کر مست ہو جاتی تھی۔ آخر کار اس نے ایک دن حسب ذیل خط کھڑکی کے نیچے پھینک دیا۔

"آج رات کو ـــــــ کے یہاں ڈانس ہے کاؤنٹس وہاں جائیگی۔ ہم وہاں دو بجے تک رہینگے۔ میں تمہیں اکیلے ملنے کا موقع دیتی ہوں۔ کاؤنٹس کے گھر سے جاتے ہی تمام نوکر اپنے اپنے کمروں میں چلے جائیں گے۔ صرف ایک آدمی رہیگا اور وہ عموماً الگ بیٹھتا ہے تم یہاں ساڑھے گیارہ بجے آ جانا اگر تم سے ملے تو اس سے کاؤنٹس کی بابت پوچھنا۔ وہ یقیناً نہ ہوگی اس حالت میں تمہیں واپس جانا ہوگا لیکن میرا خیال ہے تمہیں کوئی نہ ملے گا۔ تم کوٹھے پر چڑھ جانا۔ اوپر پہنچ کر تم بائیں ہاتھ کو مُڑ جانا۔ آگے چل کر تم کاؤنٹس کے سونے کے کمرے میں پہنچو گے۔ وہاں دو پردوں کے پیچھے دو دروازے ہیں۔ سیدھے ہاتھ کا دروازہ پڑھنے کے کمرے میں کھلتا ہے لیکن وہ کبھی استعمال نہیں ہوتا اور بائیں ہاتھ کا ایک گیلری میں جو میرے کمرے کا راستہ ہے۔"

ہرمان دس ہی بجے کاؤنٹس کے مکان پر پہنچ گیا۔ سردی بہت شدید تھی۔ برف گر رہی تھی۔ ہرمان گرم کوٹ پہنے کھڑا رہا آخر کار کاؤنٹس کی گاڑی چلی گئی۔ ساڑھے گیارہ کے گھنٹے بجنے پر وہ گھر میں داخل ہو گیا، اس نے ایک نوکر کو ایک شکستہ کرسی پر سوتے ہوئے پایا۔ وہ ہمت باندھ کر اس کے پاس سے گذر گیا اور کاؤنٹس کے سونے کے کمرے میں پہنچ گیا اس نے سب کمرے اچھی طرح دیکھ لئے اور پھر پڑھنے کے کمرے میں چلا گیا۔ وقت گذرتا گیا۔ گھڑی گھنٹے بجاتی رہی۔ بارہ، ایک دو ـــ دو بجے ایک گاڑی کی آواز سنائی دی۔ بتیاں جل گئیں تین خادمائیں کاؤنٹس کو لے کر آئیں جو نیم مُردہ ایک کرسی پر آکر گر گئی لزا دیٗا اس کے پاس سے ہو کر گذری مگر اس نے اس کی طرف توجہ نہ کی۔

کاؤنٹس آئینے کے سامنے کپڑے اتارنے لگی آخر اس نے ایک ہلکا سا لباس پہنا جو اس کی عمر کے لئے موزوں تھا۔ اس نے خادماؤں کو رخصت کیا۔ بتیاں بجھ گئیں صرف ایک لیمپ جلتا رہا۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئی اور نہ معلوم کن خیالات میں کھو گئی۔

ناگہاں ایک عجیب تغیر اس کے چہرے پر آ گیا اس کے ہونٹ ہلنے بند ہو گئے اس کی آنکھیں سخت ہو گئیں ـــ ایک اجنبی اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"خدا کے واسطے مت ڈرو۔" اس آدمی نے کہا۔ "میں تمہیں نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔ میں صرف ایک درخواست لیکر آیا ہوں۔"

بوڑھی عورت اس کی طرف خاموشی سے دیکھتی رہی گویا اس نے اس کی بات نہیں سُنی۔

"تم میری قسمت جگا سکتی ہو۔" ہرمان نے کہا۔ "تم مجھے خوش کر سکتی ہو میں جانتا ہوں کہ تمہیں تین پتے تاش کے معلوم ہیں ......

"وہ ایک مذاق تھا۔" آخرکار اس نے کہا۔ "میں تمہیں یقین دلاتی ہوں۔ وہ ایک مذاق تھا۔"

"وہ مذاق نہیں تھا۔" ہرمان نے غصے سے کہا۔ "کیا تم شیپلسکی کو بھول گئیں جس کی تم نے مدد کی تھی۔ کیا تم مجھے وہ تین پتے بتا سکتی ہو؟" ہرمان نے پوچھا۔ کاؤنٹس خاموش رہی ہرمان بولتا رہا۔ "تم اپنا راز کس کے لئے چھپاتی ہو۔ اپنے پوتوں کے لئے۔ وہ کافی امیر ہیں۔ وہ روپے کی قدر نہیں جانتے۔ تمہارے تین تاش کے پتے کسی فضول خرچ کی مدد نہیں کرسکتے۔ میں فضول خرچ نہیں، میں روپے کی قدر جانتا ہوں تمہارے پتے میرے لئے بیکار نہ ہونگے۔ ہاں ——؟"

وہ جواب سننے کے لئے رکا مگر کاؤنٹس خاموش رہی۔ وہ اس کے گھٹنوں پر جھک گیا۔ "اگر تم نے کبھی محبت کی ہے اگر کبھی تم اپنے بچے کے پیدا ہونے پر خوش ہوئی ہو تو میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ تم بحیثیت ایک بیوی ہونے کے۔ ایک ماں ہونے کے میری درخواست کو رد مت کرو۔ مجھے اپنا راز بتا دو —— یاد رکھو کہ تم بوڑھی ہو اور تمہیں زیادہ زندہ رہنا نہیں ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتیں کہ ایک شخص کی خوشیوں کا دارومدار تمہارے ہاتھ میں ہے۔ صرف میں ہی نہیں میرے بچے، میرے پوتے، پوتیاں اور پوتے پوتیوں کے بچے تمہیں دعا دینگے۔"

کاؤنٹس نے کوئی جواب نہ دیا۔ ہرمان اٹھ کھڑا ہوا۔

"بوڑھی چڑیل۔" اس نے اپنے دانت بھینچ کر کہا۔ "میں تم کو بولنے پر مجبور کردونگا۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے ریوالور نکالا۔ ریوالور دیکھ کر کاؤنٹس کے ہوش ہوا ہوگئے اس کا سر نیچے کی طرف جھک گیا اس نے اپنے ہاتھ اٹھائے اور پیچھے بیہوش ہوکر گر پڑی۔

"اپنا طفلانہ کھیل چھوڑ دو۔" ہرمان نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ "میں تم سے آخری مرتبہ پوچھتا ہوں۔ تم بولوگی یا نہیں۔ مجھے تین پتے بتا دو۔"

کاؤنٹس نے کوئی جواب نہ دیا۔ ہرمان نے دیکھا کہ وہ مرچکی ہے۔

لزاویٹا اپنے ڈانس کے کپڑے پہنے ابھی تک اپنے کمرے میں خیالات میں گم بیٹھی تھی۔ وہ جب گھر آئی تو اس نے خادمہ کو رخصت کردیا اور اس سے کہدیا کہ وہ کپڑے خود اتاریگی۔ اس خیال سے اس نے یہ کہا کہ وہاں ہرمان ہوگا مگر وہ امید رکھتی تھی کہ وہ وہاں نہ ہوگا۔ کمرے میں پہنچکر اسے اس کے نہ ہونے کا یقین ہوگیا۔ لزاویٹا اپنے قسمت کے ستاروں کی شکرگزار ہوئی کہ اس سے ملاقات نہ ہوسکی۔ وہ ایک کرسی پر گر پڑی اور گذشتہ واقعات کو یاد کرنے لگی۔ وہ کبھی ہرمان سے نہ ملی تھی مگر اس کے خط میں اس کے دستخطوں سے اس کا نام معلوم ہوگیا تھا۔ اس نے سوچا آج ہی ڈانس میں ٹومسکی نے ہرمان کی تعریف کی تھی۔

یکایک دروازہ کھلا اور ہرمان داخل ہوا۔

"تم کہاں تھے؟" اس نے گھبرائے ہوئے انداز سے پوچھا۔

"کاؤنٹس کے کمرے میں۔" اس نے جواب دیا۔ "میں ابھی وہیں سے آرہا ہوں۔ کاؤنٹس مرچکی ہے۔"

"مرچکی ہے؟ میرے خدا، یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کی موت کا باعث میں ہی ہوں۔"

ہرمان بیٹھ گیا اور اسے تمام حالات سے آگاہ کردیا۔ لزاویٹا اسے سنتی رہی۔ اس نے خیال کیا کہ اس کے تمام خطوط، اس کی تمام درخواستیں محبت کی وجہ سے نہ تھیں۔ اسے روپے کا لالچ تھا وہ رونے لگی۔ ہرمان اسے دیکھتا رہا۔ آخرکار اس کا دل بھی ٹوٹ گیا۔ لزاویٹا کے رونے سے نہیں، بوڑھی عورت کی موت سے نہیں بلکہ اس خیال سے اسے افسوس ہوا کہ اس کا سہارا جاتا رہا۔ جس کی وجہ سے وہ دولت کما سکتا تھا۔

"ظالم ——!" لزاویٹا نے آخرکار کہا۔

"میں اس کی موت نہ چاہتا تھا۔" ہرمان نے جواب دیا۔ "میرا ریوالور بھرا ہوا نہ تھا۔" دونوں خاموش ہوگئے۔ صبح ہو رہی تھی ہلکی ہلکی روشنی کھڑکی میں سے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ اس نے اپنی پرنم آنکھیں اٹھائیں اور ہرمان کے چہرے پر گاڑ دیں۔ وہ کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا، اس کے چہرے سے رنج کے آثار ہویدا تھے۔

"تم مکان سے باہر کیسے جاؤگے؟" آخرکار اس نے پوچھا۔ "میں تمہیں ایک چور زینے سے نیچے پہنچا سکتی ہوں۔ مگر میں کاؤنٹس کے کمرے میں نہیں جانا چاہتی۔"

"تم مجھے رستہ بتا دو۔ میں خود چلا جاؤنگا۔"

لزاویٹا نے ایک کنجی اسے دیکر سب کچھ سمجھا دیا۔ ہرمان نے اس کا سرد ہاتھ دبایا اس کے سر پہ پیار کیا اور باہر نکل گیا۔

وہ ایک دفعہ پھر کاؤنٹس کے کمرے میں گیا۔ بوڑھی عورت اکڑی ہوئی کرسی پر بیٹھی تھی۔ وہ باہر نکل کر ایک تاریک زینے سے اترنے لگا عجیب عجیب خیال اس کے ذہن میں تھے۔ "اسی زینے سے" اس نے خیال کیا۔ "آج سے ۶۰ برس پہلے کوئی عاشق چھپ کر اترا ہوگا، ٹھیک اسی وقت ایک خوبصورت عاشق جو بہت قیمتی کپڑے پہنے ہوگا

جس کے بال اچھی طرح بنے ہونگے۔ اور اب اس عاشق کی ہڈیاں قبر میں پڑی ہیں اور اس کی بوڑھی محبوبہ کی دل کی حرکت بند ہو چکی ہے۔

اس خونیں رات کے تیسرے دن صبح ۹ بجے ہرمان ــــ خانقاہ کی طرف روانہ ہو گیا جہاں کاؤنٹس کی تجہیز و تکفین تھی۔ حالانکہ جو کچھ ہو چکا تھا اس کا اسے غم و افسوس نہ تھا۔ اس کا ضمیر اس سے کہہ رہا تھا "تم ہی نے اسے مارا ہے"۔ کیونکہ وہ کچھ وہمی تھا اس لئے اس نے سوچا کہ ممکن ہے کہ کاؤنٹس کی موت سے اسے آئندہ زندگی میں تکلیف ہو اس لئے اس نے کاؤنٹس کے کفن دفن میں شرکت کا فیصلہ کر لیا، گرجا آدمیوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہرمان بہت دقت سے بھیڑ میں داخل ہوا لاش ایک شاندار تخت پر شامیانہ کے نیچے رکھی تھی۔ مردہ عورت ایک سفید ریشمی لباس پہنے تھی اور اس کے ہاتھ اس کے سینے پر رکھے تھے اس کے رشتہ دار بہت سوگ منا رہے تھے۔ حالانکہ کسی کو ان کے مرنے کا افسوس نہ تھا کیونکہ وہ بہت بوڑھی تھی ایک جوان پادری نے جنازہ کی دعا پڑھی۔ اور مرحومہ کی خوبیاں دلکش الفاظ میں بیان کیں دعا کے بعد تمام رشتہ داروں اور ملاقاتیوں نے اپنی اپنی عقیدت مندی کا اظہار کیا اور لاش کے سامنے جا کر جھکے اور اس کے ٹھنڈے ہاتھ کو پیار کیا۔ آخر میں ہرمان لاش کے پاس گیا اور زمین پر جھک گیا، پھر وہ تخت پر چڑھا اور لاش کے سامنے جھک گیا۔ اسے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ کاؤنٹس اس کی طرف طنز سے دیکھ رہی ہے۔ ہرمان پیچھے پیچھے بہت جلدی ہٹا۔ اور گر پڑا اسے کسی نے اٹھنے میں مدد دی اسی وقت لزاویٹا بیہوش ہو کر گر پڑی۔ تھوڑی دیر کے لئے مجمع میں گڑبڑ ہو گئی بس یہی کانا پھوسی ہونے لگی۔ ایک شخص نے ــــ جو مرحومہ کا ہی عزیز تھا ــــ ایک انگریز سے جو اس کے پاس کھڑا تھا کہا۔ "یہ شخص کاؤنٹس کا ناجائز لڑکا ہے"۔ اس پر انگریز نے بہت تعجب ظاہر کیا۔

تمام دن ہرمان بہت پریشان رہا اس نے اس دن ضرورت زیادہ شراب پی اور گھر آ کر بغیر کپڑے اتارے پلنگ پر گر پڑا اور نیند سو گیا۔ وہ رات کو اٹھا تو چاند نکلا ہوا تھا اس نے گھڑی دیکھی تو پونے تین بجے تھے۔ وہ پلنگ پر بیٹھ گیا۔ ایک منٹ بعد کسی نے باہر سے کھڑکی میں جھانکا۔ ہرمان نے اس کی کوئی پروا نہ کی اس کا خیال تھا اس کا نوکر ہوگا۔ اور خیال کیا کہ وہ حسب معمول بہت زیادہ شراب پی کر مست ہو کر آیا ہے لیکن اس نے ایک اجنبی کے پاؤں کی آواز سنی اور ایک عورت سفید کپڑوں میں داخل ہوئی ہرمان اسے اپنی نرس سمجھا اور تعجب کرنے لگا کہ اتنی رات کو وہ کیوں آئی ہے؟ عورت آہستہ آہستہ آ کر سامنے کھڑی ہو گئی۔ ہرمان نے اسے پہچان لیا وہ کاؤنٹس تھی۔

"میں تمہارے پاس اپنی مرضی کے خلاف آئی ہوں"۔ اس نے مستحکم آواز میں کہا۔ "لیکن مجھے حکم ملا ہے کہ تمہاری خواہش کو پورا کروں۔ تگی ــــ ستا ــــ اور یکہ۔ جیتنے والے پتے ہیں۔ تم ایک وقت میں ایک سے زیادہ بازی مت لگاؤ اور پھر اپنی زندگی میں کبھی مت کھیلو۔ اگر تم میری لزاویٹا سے شادی کر لو۔ تو تمہیں اپنا خون معاف کر دوں گی"۔

یہ کہہ کر وہ آہستہ سے باہر نکل گئی۔ اور پھر کسی نے باہر سے کھڑکی میں جھانکا کچھ دیر بعد اس نے اپنے ہوش ٹھیک کئے۔ وہ دوسرے کمرے میں گیا۔ اس کا نوکر فرش پر سو رہا تھا۔ اس نے نوکر کو جھنجوڑ کر پوچھا مگر اس نے کوئی تسلی بخش جواب نہ دیا۔ دروازہ مقفل تھا ہرمان اپنے کمرے میں واپس آ گیا اور بتی جلا کر جو کچھ اس نے دیکھا تھا اسے لکھ لیا۔

"تگی، ستے۔ اور اکے" نے ہرمان کے دماغ میں کاؤنٹس مرحومہ کی یاد دھندلی کر دی۔ "تگی۔ ستہ۔ اور اکا" ہمیشہ اس کے دماغ میں تھے جب کبھی وہ کسی نوجوان لڑکی سے ملتا تو کہتا "کس قدر خوش اسلوب ہے بالکل پان کی "تگی" کی طرح"۔ کوئی اس سے وقت پوچھتا تو وہ کہتا، تھا "سات بجنے میں پانچ منٹ"۔ ہر موٹے آدمی کی توند اسے اکے کی یاد دلاتی تھی کیونکہ وہ اکے کی طرح گول ہوتی تھی۔ اسے سوتے میں بھی اسی کا خیال رہا۔ کبھی "تگی" اس کے سامنے ایک پودے کی طرح آتی ستا ایک نوکیلی محراب کا رستہ معلوم ہوتا تھا اور اکا ایک بہت بڑی مکڑی۔ اسے صرف ایک خیال تھا وہ یہ کہ اس راز سے فائدہ اٹھایا جائے جو اسے اس قدر مہنگا پڑا تھا۔ ایک ایسا موقع آیا جس سے اس کی پریشانیاں دور ہو گئیں۔

ماسکو میں ایک سوسائٹی امیر جواریوں کی قائم ہوئی جس کے صدر مشہور چیکالنسکی تھے جس نے اپنی زندگی تاش کھیلنے ہی میں صرف کر دی تھی اور ایک وقت میں کروڑوں جیتا تھا۔ یہ آدمی سینٹ پیٹرزبرگ آیا۔ جوان آدمی اس کی طرف مائل ہوئے۔ [illegible]

کے پاس لے گیا۔

وہاں پہنچے تو انہوں نے بہت بڑے بڑے آدمیوں کو دیکھا بڑے بڑے جرنیل اور بے یوپی کونسلر تاش کھیل رہے تھے۔ ایک بڑی میز کے چاروں طرف ۲۰ کھلاڑی بیٹھے تھے۔ وہیں میزبان بھی تھا۔ وہ ۹۰ برس کا تھا اس کے بال بالکل سفید تھے۔ صورت سے خوش اخلاق معلوم ہوتا تھا۔ نرومودو نے ہرمان سے اس کا تعارف کرایا۔ بازی کھیلی جارہی تھی اور جو جیتتا تھا اسے اس کا جیتا ہوا مال جاتا تھا جب بازی ختم ہو گئی تو چیکالنسکی نے تاش پھینٹے۔

"مجھے ایک پتہ کھیلنے دو۔" ہرمان نے کہا۔

چیکالنسکی ہنسا اور گردن کے اشارے سے رضامندی کا اظہار کیا نرومودو نے ہنس کر اسے تاش کھیلنے پر مبارکباد کہی کہ آخر کار اس نے اپنی قسم توڑدی اور اُسے ہمت دلائی۔

"میں جیتونگا۔" ہرمان نے اپنے پتہ پر بازی کا نشان لگاتے ہوئے کہا۔

"کتنا ___؟" چیکالنسکی نے پوچھا۔ "میں اچھی طرح نہیں دیکھ سکتا۔"

"۴۷ ہزار ___!" ہرمان نے کہا۔

اس کے ان الفاظ پر سب کی نظریں اس کے چہرے پر گڑ گئیں۔

"کیا اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" نرومودو نے سوچا۔

"تمہاری بازی بہت ہے۔ اگر تم مجھے کہنے کی اجازت دو۔" چیکالنسکی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "کسی نے آج تک دو سو پچھتر سے زیادہ کی بازی نہیں لگائی ہے۔"

"تم میرا پتہ لوگے یا نہیں؟" ہرمان نے پوچھا۔

"ایک بات میں تم سے کہنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ گو مجھے اپنے دوستوں پر پورا بھروسہ ہے مگر پھر بھی ٹھیک حساب کتاب کرنے کے لئے تم نے جو کچھ بازی لگائی ہے اپنے پتے پر رکھدو۔"

ہرمان نے ایک بینک نوٹ نکالا اور چیکالنسکی کو دیدیا جس نے اسے دیکھ کر اس کے پتہ پر رکھدیا۔

اس نے پتے پھینٹنے شروع کئے۔ سیدھی طرف نہلا گرا اور بائیں طرف تکی۔

"میں جیت گیا۔" ہرمان چیخا۔

"کیا آپ مجھے ادا کرینگے؟" ہرمان نے پوچھا۔

"خوشی سے۔"

چیکالنسکی نے کچھ بینک نوٹ اپنی جیب سے نکال کر اُسے دیدیئے

ہرمان میز پر سے اُٹھ کھڑا ہوا اور ایک گلاس لیمونیڈ کا پی کر گھر چلا گیا، اسی دن شام کو وہ پھر چیکالنسکی کے یہاں گیا۔ وہ میز پر پہنچا اسے دیکھ کر لوگوں نے جگہ دیدی۔ ہرمان نئی بازی کا انتظار کرنے لگا۔ اُس نے اپنا پتہ رکھا اور اس پر ۹۴ ہزار کی بازی لگائی چیکالنسکی تاش پھینکنے لگا ایک غلام سیدھی طرف گرا اور بائیں طرف ستہ سب کو بہت تعجب ہوا چیکالنسکی بہت مضطرب ہوا اس نے ۹۴ ہزار کے نوٹ گن کر ہرمان کو دیدیئے وہ خاموشی سے چلا گیا۔

اگلے دن شام کو ہرمان پھر وہاں پہنچا۔ سب اس کے منتظر تھے سب کھیل چھوڑ کر آگئے اور اس کا کھیل دیکھنے کے لئے بیتاب ہوئے چیکالنسکی نے تاش پھینکے۔ ہرمان نے اپنا پتہ لیکر اس پر ایک گڈی بینک نوٹس کی رکھدی۔ خاموشی چھا گئی۔ سیدھی طرف ملکہ آئی، اور بائیں طرف اکا۔

"اکا جیت گیا۔" ہرمان چلایا۔

"تمہاری ملکہ ہار گئی۔" چیکالنسکی نے خوش خلقی سے کہا۔

ہرمان سناٹے میں آگیا اور اس نے دیکھا کہ اکے کی جگہ حکم کی ملکہ پڑی تھی۔ اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا اسے محسوس ہوا کہ حکم کی ملکہ اس کی طرف طنز سے مسکرا رہی ہے۔

"بوڑھی عورت۔" وہ ڈر کر چیخا۔

چیکالنسکی نے نوٹ اپنی طرف کھینچ لئے۔ ہرمان اٹھ کھڑا ہوا، اور بازی پھر شروع ہو گئی۔

ہرمان پاگل ہو گیا اور اب ابھوسکی کے پاگل خانے میں وارڈ نمبر ۱۷ میں ہے۔ وہ سوالوں کا جواب نہیں دیتا۔ بلکہ ہر وقت بکتا رہتا ہے "تگی ___ ستہ ___ اکہ! ___ تگی ___ ستہ ___ اکہ!"

لزاویٹا کی شادی ایک بہت اچھے نوجوان سے ہو گئی جو ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز تھا۔ اور اس کی اپنی جائداد بھی تھی۔

شاعرِ اعظم ٹیگور

نظم

از حضرت جذب عالمپوری

فطرت کو ہے حجابِ اہلِ سخن گوارا — صدیوں میں کوئی شاعر ہوتا ہے آشکارا
کھاتا ہے آسماں جب سَو سال ایک چکر — پیدا کسی جگہ پر ہوتا ہے اک سخنور
بنگال کی حسین و دلچسپ وسعتوں میں — صنّاعیوں کی رسمی کمزور پستیوں میں
ٹیگور ایک مہرِ ضو بار بن کے آیا — ظلمات کی گھٹا میں انوار بن کے آیا
رسم و رواج اس کی ٹھوکر نے توڑ ڈالے — قیدِ زبوں کے حلقے سانسوں سے موڑ ڈالے
ٹیگور ایک شاعر، اور اک پیامبر تھا — ہر راستے سے ہٹ کر اک راہ خاص پر تھا
وہ بول میٹھے میٹھے، رس راگ وہ سُریلے — جیسے کنول میں بھر کر کوئی شراب پی لے
فطرت کا رازداں تھا اور بادیہ نشیں تھا — شہری تکلّفوں کا اُس میں پتہ نہیں تھا
رس اپنی بانسری کا ٹپکائے جا رہا تھا — ہر وقت رقص میں تھا اور گائے جا رہا تھا
وہ سادہ سادہ باتیں، لیکن بلند و بالا — ہوتے ہیں ایسے شاعر تلمیذِ حق تعالیٰ
بنگال کی فضائیں اب اس کو رو رہی ہیں — اُس کی جواں صدائیں خاموش سو رہی ہیں
دنیا کی محفلیں ہیں جس کے سخن پہ شیدا — بنگال اب کریگا شاعر نہ ایسا پیدا
ٹیگور خاک پر ہو تیری خدا کی رحمت — انسانیت کو تو نے دی جرأتِ محبت

جبتک زمیں رہیگی اور آسماں رہے گا
شہرت تری رہیگی، تیرا نشاں رہے گا

ادبی مقالہ

"فارسی اور عربی شاعری کا عاشق"

از جناب جلالی شاہجہاں پوری

— صحبت کے اثر سے بچنا ناممکن ہے۔ جب محبوب ظالم، بدعہد، سفاک اور ستمگار ٹھہرا تو اس کے اثر سے عاشق کو بھی مفر نہیں۔ معشوق چونکہ باطنی کیفیات کے لحاظ سے سوسائٹی کا بدترین ممبر تھا اس لئے عاشق کے اخلاق و عادات پر بھی اس کا بُرا اثر پڑا۔ اس کی صفات بھی بدبخت، آوارہ، بدنام، میخوار، بدمست اور مردود خلائق قرار پائیں ؎

راستی فتنہ انگیز ست سرو قامتت
ہستی عاجز دور غ مصلحت آمیز نیست (داعی بدخشی)

یہ اسی کا اثر ہے کہ فارسی شاعری کا عاشق اپنے آپ کو معشوق کے سامنے نہایت ذلیل بلکہ آبرو باختہ تصور کرتا ہے۔ اپنے آپ کو محبوب کی گلی کا کتا کہتا ہے اور اس پر ببانگ دہل فخر کرتا ہے ؎

میان ما و سگ یار فرق بسیار است
چرا کہ ما سگ ادئیم و او سگ یار است (آتی اصفہانی)

سگ محبوب کے پہلو میں بھی اگر اس غریب کو جگہ مل جاتی ہے تو وہ اس کو اپنے لئے جائے فخر و مباہات تصور کرتا ہے۔ ؎

پہلوئے سگ تو جاست مارا
جائے بہ ازیں کجاست مارا

شجاعت و مردانگی کا یہ عالم ہے کہ سگ محبوب کی طرف نظر اٹھانے کی ہمت نہیں۔

چو با سگت تو انم کہ عرض حال کنم
بخویش گویم و خود را سگت خیال کنم (دوائی ہروی)

محبوب کی گلی کے کتے کی دلجوئی اس کے فرائض میں سے ہے نالہ و فغاں کے وقت بھی اس کی ہر قسم کی خبرگیری رکھتا ہے ؎

اے دل ہمہ شب آں سگ کو خواب ندارد
از نالہ و فریاد و فغانے تو کہ تو داری

پائے سگ کو بوسہ دینے کے لئے اس کے دل میں امنگیں اٹھتی ہیں ؎

بوسیدن پائے سگش دارد لب من آرزو

عاشق اپنے آپ کو کتا تو خیال ہی کرتا ہے اس لئے جب وہ اپنے گلے کو بغیر قلادے کے دیکھتا ہے تو محبوب سے کہتا ہے ؎

شنیدہ ام کہ سگاں را قلادہ می بندی
چرا بہ گردن حافظ نمی نہی رسنے

اس کے دل کا علاج گل قند آمیختہ سے نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے ساتھ دشنام چند کی بھی اس کو ضرورت ہوتی ہے ؎

قند آمیختہ با گل نہ علاج دل ماست
بوسۂ چند بیامیز بہ دشنامے چند (حافظ)

گالیاں کھا کر اس کے مردہ قالب میں دوبارہ جان پڑ جاتی ہے ؎

زیر لب دشنام چوں اے مہرباں دادی مرا
کشتہ بودم از تغافل باز جاں دادی مرا (صبوحی ہروی)

غیرت کا یہ عالم ہے کہ بھری مجلس میں غیروں کے سامنے گالیاں سنائی جاتی ہیں تو بجائے شرم و ندامت اور خفگی کے اس پر قربان ہوتا ہے اور ان مغلظات کو لطف بے ہنگام کہتا ہے ؎

در حضور غیر با من اینہمہ دشنام چیست
اے شوم قربان تو ایں لطف بے ہنگام چیست

ادھر محبوب کی زبان سے گالی نکلتی ہے ادھر جماعت ملائکہ میں شور آفریں برپا ہوتا ہے اور روح القدس جماعت میں سے نکل کر نعرۂ تحسین بلند کرتے ہیں ؎

دشنام دہی و بر لب تو
روح القدس آفریں نوید (غزالی)

وصال محبوب سے دل کو تسلی نہیں ہوتی لیکن تغافل اور دشنام سے اس کو خوش کر لیا جاتا ہے۔

ایں دل کہ در وصال تسلی از و نبود
خرسندش از تغافل و دشنام کردہ ایم (نظیری)

ہر قسم کی ذلت و رسوائی اور بے حیائی کو اپنے لئے باعث صد فخر سمجھتا ہے عشق دوست رقیبوں کے ہاتھوں اگر اس پر سنگ زنی ہوتی ہے تو ان پتھروں کو اپنے دوستوں کے پاس بطور تحفہ کے لے جاتا ہے۔

ہر سنگ کز برائے تو ام دشمناں زنند

بردارم و بتحفہ بہ دوستاں برم (عارفی شیرازی)

یہ مانا کہ اس منزل میں قدم رکھنے کے بعد فخر و غرور اور خود بینی کے آثار مٹ جاتے ہیں ؎

خود بینی و خویشتن پرستی

رسمیست کہ در دیار ما نیست

لیکن عزت نفس اور حرمت انسانی کو نہ کھونا چاہئیے۔ مگر فارسی شاعری کا عاشق ابتدائے منزل ہی میں عزت و حرمت کے جوہر مٹا دیتا ہے غلامی و محکومی ان کی طبیعت کی نشانی بن جاتی ہے۔ جبہہ سائی اور سجدہ ریزی پر فخر کرتا ہے۔ محبوب کے ظلم و ستم سے مجبور ہو کر جو آہ و بکا کرتا ہے تو آسمان سر پر اٹھا لیتا ہے۔ محبوب کی بدزبانی اور بدکلامی کو غذائے روحانی اور لذت باطنی تصور کرتا ہے اس کے محبوب کے پاس ہر شخص کی رسائی ہو جاتی ہے اور ہر شخص بوس و کنار کی لذت سے لطف اندوز ہو سکتا ہے اس میں اتنی ہمت کہاں کہ اس ہرجائی پن سے معشوق کو منع کر سکے۔ لیکن عرب کا شجاع اور باہمت عاشق اپنی تذلیل و تحقیر کے موقع پر غضبناک اور خشم آلود ہو جاتا ہے۔ عزت نفس اس کی عاشقی کا جوہر ہے۔ محبوب کی ناز برداری کرتا ہے لیکن غلامی و محکومی پر فخر نہیں کرتا۔ ہجر و فراق کی سختیاں جھیلنے کو تیار رہتا ہے لیکن خوشامد اور در یار کی جبہ سائی سے اس کی طبع خود دار کو کوئی مناسبت نہیں محبوب کا ہرجائی پن اس کے نزدیک قابل برداشت چیز نہیں، اور نہ کسی میں اتنی جرأت و ہمت کہ اس کے محبوب کی طرف اس کی غیر موجودگی میں بھی نگاہ اٹھا کر دیکھ سکے۔ ایرانی عاشق اپنی موجودگی میں اپنے محبوب کو دوسروں کے پہلو میں دیکھتا ہے لیکن اس کو صاف طریقے سے شکایت کی بھی ہمت نہیں پڑتی بلکہ حیلے حوالے اور خوشامد درآمد سے اس کو اپنے قبضہ میں رکھنا چاہتا ہے۔

محبوب غیر کے ساتھ تفریح کو جا رہا ہے لیکن عاشق اس کو منع نہیں کر سکتا بلکہ جب معشوق عاشق سے بھی ساتھ چلنے کو کہتا ہے تو وہ اس کا شکریہ ادا کر کے صرف ساتھ چلنے سے انکار کر دیتا ہے ؎

میروی با غیر و می گوئی بیا عرفی تو ہم

لطف فرمودی برو کیں پائے رفتار نیست

لیکن یہی موقع اگر عربی عاشق کو پیش آجاتا تو وہ ضرور محبوب سے قطع تعلق کر لیتا اور جناب رقیب کا تو خاتمہ ہی کر دیتا۔ تمدن و معاشرت کی ترقی کے زمانے میں مکر و حیلے کے فنون میں بھی شباب آ جاتا ہے۔ ایران اپنے تمدن و معاشرت کے لحاظ سے یورپ کا پیرس بنا ہوا تھا اسی وجہ سے یہ بھی اپنے فن کا امام مانا جاتا تھا اس رنگ کی گرم بازاری کی وجہ سے عاشق و معشوق دونوں اس معاملہ میں استاد و فنکار کی حیثیت رکھتے تھے لیکن اس کے برخلاف، عرب اس تمدن و تہذیب کے نام سے بھی آشنا نہ تھے۔ بدویانہ طرز معاشرت ان کا تمدن تھا اور بدویت کو مکر و حیلے سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ اس رنگ میں سچائی، دیانت داری اور خوش معاملگی کا عنصر غالب ہوا کرتا ہے۔ اس وجہ سے عربی عاشق اور محبوب دونوں اس فن سے بے بہرہ تھے۔ نہ تو محبوب عاشق کو مکر و فریب کے جال میں پھانستے تھے اور نہ عاشق کسی حیلے حوالے کو کام میں لاتے تھے دونوں طرف سے بالعموم سچائی کا جوہر نمایاں رہتا تھا۔ عاشق کے دل میں جو شکایت پیدا ہوتی تھی وہ محبوب کے سامنے صاف و صریح الفاظ میں بلا کم و کاست کہہ دیتا تھا، اگر معشوق ان کے ازالے کے لئے تیار نہ ہوتا تو عاشق اپنی خودداری اور وقار کی حفاظت کے لئے اس سے نہایت شریفانہ طور پر علیحدگی اختیار کر لیتا تھا۔ ایرانی عاشق کی طرح اپنی خودداری، وقار، تمکنت، اور انسانیت کا خون نہیں کرتا تھا۔ وہ اپنی تمکنت اور وقار کے موقع پر کہتا ہے ؎

فلما بدا لی راعنی

نزعت تروع الابی الکریم!

یعنی "جب سے اس معشوقہ سے وحشت دلانے والی باتیں ظاہر ہوئیں تو میں نے خوددار اور شریف انسان کی طرح اس سے علیحدگی اختیار کر لی ہے"

وان کان ھذا منک حقا فاننی

مداوی الذی بینی و بینک بالھجر

یعنی ——— "اگر یہ تیری سرد مہریاں ٹھیک ہیں تو میں اس کا علاج جدائی سے کرونگا"

اگرچہ بعض عربی شعرا نے بھی سرد مہری اور کج ادائی کو برداشت کرتے ہوئے اپنے عشق و محبت کو قائم رکھا ہے ؎

نعم صدق الواشون انت حبیبہ

الیّ وان لم تصف منک الخلائق

"بیشک غماز سچ کہتے ہیں کہ تو مجھ کو محبوب ہے گو تو خوش اخلاقی کے ساتھ پیش نہیں آتی" لیکن یہ خیالات "الشاذ کالمعدوم" کا درجہ رکھتے ہیں۔ بحث شاذ سے نہیں کی جاتی بلکہ اکثریت سے کی جاتی ہوتی ہے۔ اکثریت کی خودداری کا یہ عالم ہے کہ [illegible]

وہ ہر قسم کی مصیبت برداشت کرنے کو ہمہ تن تیار ہے لیکن انفصال عشق کے لئے کسی طرح آمادہ نہیں ؎

فقل لخيال الحنظلية ينقلب
اليها فاني واصل حبل من وصل،

"حنظلیہ کے خیال سے کہدو کہ اسی طرف پلٹ جائے کیونکہ میں اس سے تعلق پیدا کرتا ہوں جو مجھ سے تعلق رکھتا ہے" ؎

ولست وان عزت علي بقائل
لها بعد صرم يا ثبين صليني

"خواہ مجھ پر کتنا ہی شاق کیوں نہ ہو میں قطع تعلق کے بعد یہ نہ کہونگا کہ اے ثبینہ! مجھ سے تعلق پیدا کرلے"

عربی شاعر اس معاملہ میں اس قدر بلند خیال واقع ہوا ہے کہ وہ اپنی محبوبہ کو بھی یہی تعلیم دیتا ہے کہ اگر میری کوئی عادت تجھ کو بری معلوم ہوتی ہے تو میرے خیال کو دل سے نکالدے یعنی مجھ سے قطع تعلق کرلے

وان تك قد ساءتك مني خليقة
فسلي ثيابي من ثيابك تنسل

اگرچہ ابن رشیق اور ابن قدامہ کی رائے کے مطابق عاشق کے لئے اپنی شان و شوکت اور قوت و طاقت کا اظہار زیبا نہیں لیکن غیرت و خودداری اظہار شوکت کے تحت میں نہیں آسکتی۔ عاشق کی غیرت عاشقانہ شاعری کے لئے ایک ضروری چیز ہے کیونکہ وہ اشعار جن سے محبوب کے ہرجائی اور بازاری پن کے مضامین ظاہر ہوں عشقیہ شاعری کے اصول معینہ کے سراسر خلاف ہے۔

عربی شاعر ایرانی شاعر کی طرح صرف تیغ زبان کا مالک نہیں بلکہ تلوار اور قلم دونوں کا مالک ہوتا ہے اگر ایک ہاتھ میں تلوار ہے تو دوسرے میں قلم۔ اس کی یہی فطرت میدان عشق میں بھی اپنی اصلی حالت پر برقرار معلوم ہوتی ہے۔ یہ اسی کا اثر ہے کہ عرب کا عاشق اپنی توہین کے موقع پر نہ صرف انقطاع تعلق کر لیتا ہے بلکہ ایسے موقع پر قتل معشوق کو بھی جائز تصور کرتا ہے۔ متنبی جو دور تمدن کا عربی شاعر ہے اس میں بھی یہ شرف باقی تھا کہ وہ ایرانی عاشق کی طرح اپنی ہوس پرستیوں کی وجہ سے کسی کمسن محبوب کے ہاتھ سے نہیں مارا گیا بلکہ باایں ہمہ فضیلت وہ میدان جنگ میں کام آیا۔ ایرانی شاعر بھی تیغ زنی کے واقعات بیان کرتا ہے لیکن وہ واقعات اس کے نہیں ہوتے بلکہ دوسروں سے متعلق ہوا کرتے ہیں۔ شہادت کی لذت سے وہ بھی آشنا ہونا چاہتا ہے لیکن تلوار کی صورت دیکھنا نہیں چاہتا بلکہ تیغ نگاہ کا بسمل بننے کا خواہشمند ہے

یارب شہید خنجر خونخوار کن مرا
یعنی کہ بسمل از نگہ یار کن مرا

عربی شاعری میں یہ بات آپ کو کسی جگہ نظر نہ آئیگی کہ محبوب عاشق کی موجودگی میں غیروں پر لطف و کرم کی بارش کرتا ہے اور عاشق محبوب کے خوف کی وجہ سے اس سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بلکہ جب غیر پر لطف فرمائی کا شکوہ کرتا ہے تو محبوب اُلٹا ڈانٹ دیتا ہے عاشق اس کے چہرہ کو دیکھ کر مرتعش ہو جاتا ہے اور دل ہی دل میں دعا کرتا ہے کہ خدا کرے یہ بھی میری طرح کسی پر عاشق ہو جائے تاکہ غیروں پر لطف فرمائی کی تکلیف کا اس کو بھی اچھی طرح احساس ہو جائے۔ فارسی شاعری نے اس غیرت سوز عنوان پر نئے نئے انداز سے مضمون آفرینیاں کی ہیں۔

دل آشفتہ و دیدہ خوں بار داری	مگر با محبت سر و کار داری
گذشتہ فرو برد در مغز جانت	کہ رگہائے مژگاں گہر بار داری
گل ناز پرورد من بیقراری	ہمانا کہ در پیرہن خار داری

اس معاملہ کی جزئیات کا عنوان اس سے بھی زیادہ ایک عاشق کے لئے حیا سوز ہے لیکن اس پر بھی خوب قلم فرسائیاں کی گئی ہیں۔

چشمش بر اہے میرود مژگان نماکش نگر
در سینہ دارد آتشے پیراہن چاکش نگر
شرم از میاں برخاستہ مہراز دہاں بردشتہ
خونے کہ مژگاں ریختہ بر دامن پاکش نگر

بے حیائی کا ایک موقع یہ رہ گیا تھا کہ عاشق خود محبوب سے اس کے ہجر یا وصل کے متعلق دریافت کرے۔ اس کو فارسی شاعری نے نظم کا جامہ پہنایا ہے ؎

وصالت نصیب است با آں کہ چو من
دل حسرت آگین دیدار داری

لیکن عربی شاعر اس کو اپنے عشق کی توہین سمجھتا ہے۔ وہ اپنے محبوب کو صرف اپنی طرف متوجہ دیکھنا چاہتا ہے۔ فارسی شاعری کا عاشق ایک جانباز طالب نہیں بلکہ ایک کم ہمت غلام ہے۔ اس کی ہستی محبوب کے سامنے ایک گدائے بے نوا سے زیادہ نہیں۔

ع اے بادشاہ حسن! سخن با گدا بگو

عربی شاعر اس منزل میں قدم رکھنے کے بعد ایک کم ہمت غلام نہیں ہو جاتا بلکہ اس کے دل میں یہ جذبہ اور جانبازی کی شان پیدا کر دیتا ہے۔ وہ اپنے محبوب سے مخاطب ہو کر کہتا ہے ؎

فلا تحسبی انی تخشعت بعد کم
ولا اننی بالمشی فی القید اخرق

"یہ نہ سمجھنا کہ میں تیرے بعد کم حوصلہ ہو گیا اور یہ نہ سمجھنا کہ میں پابہ زنجیر چلنے سے ڈرتا ہوں۔"

اگرچہ فارسی شاعری میں وقار عاشق کی مثالیں ملتی ہیں لیکن وہ درجۂ شاذ میں شمار کی جائینگی۔

پیش کسے رو کہ خریدار تست ۔۔۔ ناز بران کن کہ طلبگار تست
بردہر چہ می بایدت پیش گیر ۔۔۔ سر مداری سر خویش گیر

فارسی شاعری کی بوالہوسانہ تمناؤں، اور بازاری پن کا اثر جماعت پر بہت پڑا کسی ملک کی جماعت کی تعمیر میں جب خرابی کی صورت پیدا ہو جاتی ہے تو اس کا اثر وضیع و شریف، جاہل و عالم، خورد و کلاں، مرتاض و رند سب پر پڑتا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ رند و اوباش تو ان خرابیوں میں آلودہ ہو جائیں اور نیک لوگ اس کے اثر سے محفوظ رہیں۔ قریب قریب سب ایک ہی رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔

فارسی کی عشقیہ شاعری نے چونکہ اخلاقی قوتوں پر بڑا اثر ڈالا تھا اس لئے اس اثر نے ان ہستیوں کو بھی آزاد نہ چھوڑا جو زہد و اتقا کے میدان میں گامزن نظر آتی ہیں۔ ان کے رنگ عشق کو دیکھ کر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کسی پاکباز ہستی کا رنگ عشق ہے۔ شیخ سعدی نے گلستان اور بوستاں کے باب پنجم میں اپنے جو عشقیہ حالات تحریر کئے ہیں ان پر غور کیجئے۔ کیا ان میں اور بازاری رنگ میں کسی قسم کا فرق موجود ہے؟

سعدی کے علاوہ اور دوسرے جتنے متصوفین شعرا گذرے ہیں ان کا رنگ مجاز بھی بازاری پن اور ابتذال عمومی کے رنگ میں رنگا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

غرض یہ ہے کہ فارسی شاعری کا عاشق خواہ وہ کسی رنگ سے تعلق رکھتا ہو عربی شاعری کے عاشق کے سامنے نہایت سے زیادہ ذلیل و خوار نظر آتا ہے جس طرح اس کا محبوب ذلیل و ہرجائی ہے اسی طرح اس کا عاشق بھی مبتذل ہے اس کے عشق و محبت کا کوئی معیار نہیں۔

غزل

از:
جناب مولوی سید محمد عبدالرشید فاضل ایم۔ اے

کیوں دیکھتا ہے میرا دل داغدار دیکھ
گر جائے گی نظر سے جہاں کی بہار دیکھ

مرتے ہیں یہ حیاتِ ابد کے خیال میں
جیتے ہیں کس طرح ترے امیدوار دیکھ

ہوتے ہیں وار غیر پہ کھاتا ہوں زخم میں
میرا جگر تو دشنۂ مژگانِ یار دیکھ

کس ناز کا امیں بنایا گیا ہوں میں
اک مشتِ خاک پر ستمِ اعتبار دیکھ

منزل ہے دور عمر کا توسن ہے بدلگام
رستہ میں رہ نہ جائے یہ اے شہسوار دیکھ

ہاتھوں سے تیرے آہ چلا جا رہا ہے جو
یہ وقت پھر نہ آئیگا غفلت شعار دیکھ

فاضل خوشی تو اپنے نصیبوں میں ہے کہاں
الفت کا غم نہیں تو غمِ روزگار دیکھ

دلچسپ افسانہ

مُبارک منگل

ترجمہ جناب محمد عبدالرزاق شیدا جبلپوری

جزیرہ ہنولولو میں اپنی تعطیل کے دس دن سیر و سیاحت میں بسر کرنے کے بعد وہ ایک صبح جنوبی سمندروں میں چلنے والے ایک عظیم الشان سفید جہاز پر سوار ہوگیا۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا نہایت خوشگوار تھی۔ جس وقت وہ اپنے کیبن کا جائزہ لے رہا تھا اسے ایک خط ملا۔ یہ خط اس کے دفتر سے مس ولیس نے لکھا تھا۔ اس خط نے اسے پھر محنت و مشقت کی اس تلخ دنیا میں پہنچا دیا جسے وہ اپنی تعطیل کے گذشتہ دنوں میں قریب قریب بھول چکا تھا ——— اس خط کا آخری حصہ یہ تھا۔

"آپ نے مسٹر کارلسن کی برطرفی کے عام اثرات کے متعلق دریافت فرمایا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس سے سٹاف کے دوسرے لوگوں کے دلوں میں خدا کا خوف پیدا ہوگیا اور خود مسٹر کارلسن کے دل پر تو غم و اندوہ کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ شاید آپ کو علم نہیں کہ اس کی بیوی مر چکی ہے۔ اس کی دو چھوٹی چھوٹی بچیاں ہیں۔ اس کا کام بھی کچھ ایسا مخصوص ہے کہ آسانی سے اسے نئی ملازمت نہیں مل سکتی۔"

اس جگہ آرتھر فراسٹ رُک گیا۔ اپنی ٹھوڑی کو ملتے ہوئے وہ کچھ سوچنے لگا۔ اس کے خوبصورت لیکن کرخت چہرے کے خطوط زیادہ گہرے ہوتے گئے۔

"اس بات کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ میں آپ کے والد کے زمانہ سے کام کر رہی ہوں اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں کہونگی کہ مسٹر کارلسن کی خطا ایسی نہ تھی کہ ملازمت سے برطرف کیا جاتا۔ وہ غالباً پیر کا دن تھا اور پیر ہمیشہ آپ کے لئے خراب دن رہا ہے۔ یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ وہ اس دن ہنیشل کے اس ضروری کام کے لئے آپ کی کار لے گیا۔ اسے وہاں جلد پہنچنا تھا۔ موٹر چلانے میں وہ زیادہ ماہر بھی نہیں۔ علاوہ اس کے وہ ایک جلد باز نوجوان ہے۔ آپ نے اسے ملازمت سے اس وقت برطرف کیا جب وہ موٹر کی مرمّت کا بل ادا کر چکا تھا۔ براہ کرم میری اس عبارت کو اصلی معنوں میں لیجیئے جن میں اس کے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تعطیل مبارک ہو۔ خدا کرے یہ آپ کے سکون اور اطمینان کا باعث ہو۔ میرا مودّبانہ سلام قبول کیجیئے۔

آپ کی فرمانبردار ۔ ربیکا ولس

"میں نے اس خیال سے کہ شاید کبھی آپ کو ضرورت ہو مسٹر کارلسن کا پتہ لے کر رکھ لیا ہے۔ میں ایک مرتبہ اسے دیکھنے گئی تھی۔ اس وقت تک اسے کہیں ملازمت نہیں ملی۔"

خط پڑھنے کے بعد وہ بےچینی سی محسوس کرنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کمرے میں کوئی ایسی چیز داخل ہوگئی ہے جس نے اس کا اطمینان اور سکون چھین لیا ہے۔ خط میز پر رکھ کر وہ کیبن کے آئینہ میں اپنا عکس دیکھنے لگا۔ اس کا قد لمبا تھا اور شانے چوڑے۔ وہ اعلیٰ قسم کا سفید سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ عمر کے لحاظ سے نہ تو اسے جوان ہی کہا جا سکتا تھا نہ ادھیڑ عمر۔ اس کی حرکات میں تیندوے کی بےچینی پائی جاتی تھی۔ اسے آج تک اطمینان کے صحیح معنی نہیں معلوم ہوئے تھے۔ وہ یکایک آئینے سے مُڑا اور باہر ڈیک پر جاکر ہنولولو سے جہاز کی روانگی دیکھنے لگا۔ جہاز نے سیٹی دی۔ دخانی کشتیاں اسے کھینچ کر ساحل سے دور گہرے پانی میں لے چلیں۔ وہ کچھ دیر تک رخصت کرنے والوں کی بھیڑ، مقامی باشندوں کے شور ہلتے ہوئے رومال اور دخانی کشتیوں کو دیکھتا رہا۔ اتنے میں اسے خط پھر یاد آیا۔ وہ متفکر ہوگیا۔ اس کا دماغ ایک عجیب قسم کی اُلجھن میں مبتلا تھا۔ یکایک اُس نے اپنے سر کو خفیف سا جھٹکا دیا اور دل میں کہا "مجھے اس اپیل سے متأثر نہ ہونا چاہیئے۔"

ہنولولو میں اس کے دن کسی قدر اچھے گذرے تھے کام کی اُلجھنوں اور پریشانیوں کا خیال کچھ دن کے لئے دماغ سے محو ہوگیا تھا۔ اس جگہ نے اس کے دل و دماغ پر ایک نقش قائم کیا تھا۔ یہ نقش ایک عورت کی یاد تھی۔ وہ سفید رنگ کی عورت تھی اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے سنجیدگی اور فراست ظاہر ہوتی تھی۔ وہ شام کا سیاہ لباس پہنے ہوئے تھی۔ آرتھر نے اس کے ساتھ ایک ڈنر پارٹی میں رقص کیا تھا اسے اس عورت کا نام بھی یاد نہ رہا تھا اس عورت کی آنکھوں میں ایک سحر تھا اس کی ذات میں غیر معمولی کشش پائی جاتی تھی۔ اس عورت

نے دورانِ رقص میں ایک مرتبہ آرتھر کی طرف دیکھا تھا اور ایک عجیب انداز میں تبسم کیا تھا۔ آرتھر اس عورت کے اندازِ تبسم سے متفکر ہو گیا لیکن اسے موقع ملا کہ وہ اس سے تبسم کے متعلق پوچھتا۔ باجے کے بند ہوتے ہی رقص ختم ہو گیا۔ اور وہ مہمانوں کے ہجوم میں غائب ہو گئی۔

جہاز بحرالکاہل میں اپنی پوری رفتار سے چل رہا تھا وہ ڈیک پہ ٹہلنے لگا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے نوجوان کارلسن کی وہ تصویر آ گئی جب وہ اپنی برطرفی کا حکم لے رہا تھا۔ زرد چہرہ جس پر رنج و غم سے ویرانی سی چھائی ہوئی تھی۔ وہ بھی پیر کا دن تھا۔ اس دن اس کی خفگی اور مزاج کی سختی بڑھ جاتی ہے۔ ہر پیر کی خشونت آمیز صبح دفتر کی دہلیز پر اس کے استقبال کے لئے تیار رہتی تھی۔ اس پیر کی وحشت کا اس کی جسمانی اور مالی حالت پر بھی اثر پڑ رہا تھا۔

وہ دن میں اوسطاً دس گھنٹے کام کیا کرتا تھا۔ اس نے کام سے کبھی رخصت نہ لی تھی۔ ۳۷ برس کی عمر میں ڈاکٹر نے زور دے کر اسے اپنی پہلی اور طویل رخصت لینے پر مجبور کیا۔ سو جو وہ بحری سفر کی تمام آسائشوں اور عشرت سامانوں کے ہوتے ہوئے بھی وہ خوش نہ تھا۔ تمام لوگ اس کی ظاہری حالت اور شان و شوکت کو دیکھ کر اسے ایک کامیاب اور خوش نصیب انسان تصور کرتے تھے۔ صرف اس عورت نے اس کی اندرونی کیفیت کا پتہ لگا لیا تھا۔ وہ جہاز کے دوسرے مسافروں سے علیحدہ رہنے لگا۔ اس وقت اس کا دماغ ایک عجیب کشمکش میں مبتلا تھا۔ اس کے چہرے سے وحشت سی ظاہر ہو رہی تھی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ جس رات کو یہ پہلی مرتبہ جہاز پر سوار ہونے والا تھا۔ اس نے کارلسن کو ایک بنچ پر اداس و غمگین بیٹھے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ کسی خیال میں مستغرق اپنی نگاہیں نیچی کئے زمین کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے قریب دو چھوٹی چھوٹی لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں دونوں کا چہرہ کارلسن سے ملتا جلتا تھا۔

جیسے جیسے جہاز جنوب کی طرف جا رہا تھا گرمی بڑھتی جا رہی تھی۔ آرتھر نے تمام رات بے خوابی میں بسر کی۔ صبح قریب ۶ بجے وہ بستر سے اٹھا اور ڈیک کے تیرنے کے تالاب پہ گیا جس وقت وہ غوطہ مارنے کے پلیٹ فارم پہ کھڑا ہوا تھا اسے اس بات کا کچھ کچھ احساس تھا کہ دور تالاب کے دوسرے سرے پہ کوئی دوسرا شخص بھی پانی میں ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ اس نے پلیٹ فارم پر سے چھلانگ لگائی۔ پانی کی سطح پر آ کر وہ اپنے سر کو اس طرح ہلانے لگا جیسے کوئی عجیب دریائی جانور سطح بحر پر اپنے پھیپھڑوں اور نتھنوں سے پانی جھٹکتے ہوئے برآمد ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ باقاعدہ تیرنے لگا تھوڑی دیر بعد سورج نکل آیا اور تالاب میں تیرنے والا دوسرا شخص — ایک عورت پانی میں سے نکل آئی۔ اس کا قد لمبا اور اعضا نہایت متناسب تھے۔ وہ تیرنے کا سفید سوٹ پہنے ہوئے تھی۔ تالاب سے باہر آ کر اس نے اپنے سر پر سے ربڑ کی ٹوپی اتاری۔ اور اپنے سیاہ گھونگریالے بالوں کو جھٹکنے لگی۔

جب اس نے اپنے سر پر سے ٹوپی اتاری تو آرتھر نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی عورت تھی جس نے فیبر اڈسے کے ڈنر میں اس کے ساتھ رقص کیا تھا۔ جیسے ہی اس عورت نے آرتھر کو دیکھا وہ بھی اسے پہچان گئی۔ اپنی مخصوص مترنم آواز میں اس نے کہا

"یہ غسل کتنا خوشگوار ہے۔ یہ نا مسٹر فراسٹ۔ ایک خواب رات کے بعد۔ ایک گھنٹے بعد اس تالاب پہ لوگوں کا ہجوم ہو جائے گا۔ ہم لوگوں نے اچھے وقت میں غسل کیا۔"

اس کے بعد وہ دھوپ میں بیٹھ گئی۔ اس کی حرکات سے سنجیدگی اور اطمینان ظاہر ہوتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی دور کی کسی چھوٹی سی دنیا میں لوگوں سے بالکل علیحدہ رہتی ہے۔ پندرہ منٹ کے بعد وہ اٹھی اور مڑ کر آرتھر پہ ایک نظر ڈالنے کے بعد اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اس دن صبح سے دس بجے تک آرتھر کے کمرے میں اس کا ٹائپ رائٹر کھٹ کھٹ کرتا رہا۔ مس ولیس کو اس نے جواب دیا۔ کہ کارلسن کو ملازمت پر واپس نہیں لیا جا سکتا ہے۔ وہ بے باک۔ گستاخ اور بے وقوف ہے۔ جس وقت وہ خط لیٹر بکس میں ڈال چکا تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ ایک فیصلے پر جس کے لئے وہ دیر سے کشمکش میں مبتلا تھا۔ مہر تصدیق ثبت ہو گئی اسے یک گونہ اطمینان محسوس ہوا۔

سہ پہر کے وقت آرتھر نے اس عورت کو پھر دیکھا۔ ڈیک پہ اس کی کرسی آرتھر کی کرسی کے بازو میں تھی۔ وہ اس وقت سفید لباس جس کے کناروں پر سرخ دھاریاں تھیں پہنے ہوئی تھی۔ اس وقت آرتھر نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ

واقعی بے حد حسین تھی۔ اس عورت نے گائڈ بک جسے وہ دیکھ رہی تھی نیچے رکھتے ہوئے اپنی بھنوؤں کو ایک مخصوص اور دلفریب انداز میں اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"جب میں نے اپنے سر پر سے ربڑ کی ٹوپی اتار رکھی تھی آپ نے مجھے نہیں پہچانا تھا ہے نا۔ نہانے کی ٹوپی بھی کیا ہی اچھی چیز ہے۔" یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں طنز کی جھلک تھی۔

"فیرا فورسہ کے ڈنر میں میں نے آپ کو غور سے نہیں دیکھا تھا۔ وہاں تقریباً پچاس مہمان تھے۔ اور ہاں! —— آپ نے دوران رقص میں مجھے ایک عجیب انداز سے دیکھا تھا۔ آپ کی مسکراہٹ میں رحم کی آمیزش تھی۔ مجھے کسی شخص نے آج تک اس طرح نہیں دیکھا۔ میری اس وقت کی حالت سے کیا ظاہر ہوتا تھا؟"

"کوئی خاص بات نہیں۔ آپ کچھ متفکر تھے اور خود کو غیر محفوظ سا محسوس کر رہے تھے۔"

آرتھر نے دل میں کہا کہ آیندہ اسے اپنی حرکات اور ظاہری حالت پر خیال رکھنا چاہئے۔

"میں اس قدر تھکا ہوا ہوں کہ میں نے اب تک اس سفر سے دلچسپی لینا شروع نہیں کی۔ ہنولولو میں آپ کا قیاس صحیح تھا میں خوش نہ تھا۔ کام کی گزشتہ الجھنیں اور تفکرات میرا پیچھا ابھی نہیں چھوڑتی ہیں۔"

"گزری ہوئی باتوں کا خیال کر کے متفکر ہونا ایک فعل عبث ہے اپنے حال کو دیکھئے اور اس پر خیال رکھئے۔ اس سے آپ کا مستقبل بھی سدھر جائے گا۔ خیر۔ ان باتوں کو چھوڑیئے۔" وہ اپنی گائڈ بک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگی۔ اگر آپ چاہیں تو اسے میں مطالعہ کے لئے دے سکتی ہوں۔ اس سے آپ ان تمام عجیب جگہوں کے متعلق حالات معلوم کر سکیں گے۔ جہاں یہ جہاز جا رہا ہے۔ سموآ۔ جزائر فجی۔ نیوزی لینڈ۔

آرتھر نے اپنے سر کو نفی کی جنبش دیتے ہوئے کہا "میں اس کتاب میں سر کھپانا نہیں چاہتا۔ مجھے تو آپ اس مسافر کی طرح سمجھئے جو ایک رستہ بتانے والے دیہاتی گنوار کو اس لئے کرائے پر لے لیتا ہے۔ کہ وہ کرائے پر لی ہوئی موٹر کی اگلی نشست سے اس جگہ کے متعلق غلط سلط تاریخ چیخ چیخ کر بیان کرے۔ آپ اس کتاب کو دیکھئے اور جب ہم کنارے پر جائیں۔ آپ اس جگہ کے متعلق حالات مہربانی کر کے مجھے بھی بتا دیا کیجئے۔"

"بہت خوب! میں سر کھپاؤں۔ اور دو دو مرتبہ۔ ایک کتاب پڑھتے وقت اور دوسرے آپ کو حالات بیان کرتے وقت۔" اس نے ایک مترنم قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ اس کی خوبصورت اور ستواں ناک میں ہلکی ہلکی جھریاں پڑ گئیں۔

آرتھر اس کی اس نزاکت اور بچوں جیسی شوخی پر فریفتہ ہو گیا۔ "ایک تنہا شخص پر رحم کیجئے۔ کیا آپ اس سفر میں میری معیت میں نہ رہیں گی؟"

"اگر آپ اس سے کچھ خوشی محسوس کر سکیں۔" میری ونگ فیلڈ نے جواب دیا۔

"آپ پھر اس بات پر زور دے رہی ہیں۔ کہ میں خوش نہیں ہوں۔" میری نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اس موضوع کو اور بڑھانا چاہتا تھا لیکن میری کی آنکھوں کے ایک رعب اور وقار نے اسے روک دیا۔ اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں "ہمیں اس قدر جلد اتنا نہ بڑھنا چاہئے۔"

موسم روز بروز گرم تر ہوتا گیا۔ آرتھر نے میری کے متعلق یہ رائے قائم کی کہ وہ ذہانت اور فرزانگی کا مجسمہ ہے۔ اس کی فطرت میں پاکیزگی اور صداقت بدرجہ اتم ہے۔ اس میں کئی ایسی بھی خوبیاں ہیں۔ جنہیں وہ اچھی طرح نہیں سمجھ سکا ہے۔ وہ جیسے اپنی حالت کا جائزہ لیتا۔ اسے میری کی سخت ضرورت محسوس ہوتی۔ وہ جس وقت میری سے باتیں کرتا تو اسے ایسا معلوم ہوتا کہ اس کی زندگی کی بہت سی گرہیں کھل رہی ہیں۔ اسے اپنا مستقبل روشن اور درخشاں دکھائی دینے لگتا۔ میری کی ایک مرتبہ شادی ہو چکی تھی لیکن ازدواجی زندگی کا تھوڑا ہی عرصہ بسر کرنے کے بعد وہ اس سے کنارہ کش ہو گئی۔ آرتھر نے محسوس کیا کہ میری کی شادی نے اس کے تجربہ میں پختگی اور جذبات ترحم میں اضافہ کر دیا تھا۔ صبح سے لے کر رات کے سونے کے وقت تک یہ دونوں ایک ساتھ رہنے لگے۔ آرتھر نے جب ہنولولو سے پانچویں رات بے خوابی میں بسر کی تو اس نے خود سے کہا "مجھے محبت ہوتی جا رہی ہے۔"

وہ صبح اپنے بستر سے اس وقت اٹھا جب (مسافروں کو سلانے کی) اشب کی موسیقی ختم ہو چکی تھی۔ ڈیک پر جا کر اس نے معلوم کیا کہ جہاز ساحل پر کھڑا ہوا ہے۔ سموآ کے آتش فشاں پہاڑ دکھائی دے رہے تھے۔ ایک گھنٹہ کے بعد وہ میری کے ساتھ

نیچے اتر گیا - ان لوگوں نے ایک موٹر کرائے پر لی - آرتھر موٹر چلا رہا تھا - یہ لوگ شہر کے باہر ایک گاؤں میں سے گزرے گاؤں کے چھوٹے چھوٹے برہنہ بچے ان کی موٹر کو دیکھ کر خوشی سے چلاتے ہوئے سڑک کے کنارے آ گئے - یہ لوگ ایک تالاب پر پہنچے جس کے وسط میں پیتل کا ایک مجسمہ اپنے ہاتھ میں نیزہ لئے کھڑا تھا - تالاب کے کنارے ایک بڑی چٹان پر یہ لوگ چڑھ کر بیٹھ گئے - آرتھر اس وقت بہت خوش تھا - وہ میری کو اپنے حالات بتا رہا تھا - یکایک اسے کارسن کا واقعہ بھی یاد آ گیا - اس نے واقعہ بتاتے ہوئے کہا "میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس وقت غصے سے میں دیوانہ ہو گیا تھا - میری موٹر کئی دن کے لئے بیکار ہو گئی تھی - وہ پیر کا دن - اور پیر ہمیشہ میرا خراب دن رہا ہے - آفس میں یہ قابلِ لحاظ امر ہے - کارسن کو اس سے خبردار ہونا چاہیئے تھا -"

"میں نہیں سمجھ سکتی کہ برا فروختگی اور زود رنجی تا وقتیکہ اس کا سبب بیماری نہ ہو قابل لحاظ امر ہو سکتی ہے "

وہ میری کو تعجب سے دیکھنے لگا - "لیکن کارسن سے پہلے بھی کئی اشخاص اس کا شکار ہو چکے ہیں "

" اچھا آرتھر! میں سنجیدگی سے پوچھتی ہوں یہ تمہاری پیر کی وحشت کیا چیز ہے ؟ کیا تم یقینی طور پر کہہ سکتے ہو کہ یہ پیر ہمیشہ تمہارا خراب دن ہوتا ہے "

میری کی خاموش اور منصفانہ موجودگی میں آرتھر کو اپنی پیر کی وحشت پر کچھ شک سا ہونے لگا - کچھ دیر خاموش رہ کر وہ بولا -

"ہاں میری - پیر ہمیشہ میرا خراب دن ہوتا ہے - جیسے جیسے یہ دن گزرتا جاتا ہے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں کسی تاریک غار سے جس میں ہر لمحہ کسی چٹان سے ٹکرا جانے کا خوف ہے نکل رہا ہوں - میں اس پیر کی وحشت سے کس طرح رہائی پاؤں گا میری! سب سے زیادہ مجھے اس کارسن کے واقعے سے صدمہ پہنچا ہے اس کی بیوی مر چکی ہے - اس کی دو چھوٹی چھوٹی لڑکیاں ہیں -" اس کے بعد اس نے کارسن کو پارک میں دیکھنے کا واقعہ بتا دیا -

میری نے آہستہ سے گہری سانس لی -

"تمہیں اسے کام پر لے لینا چاہیئے - تم یہاں سے تار بھیج سکتے ہو - صحیح سمت میں یہ تمہارا پہلا قدم ہو گا - اس کے بعد تم خوشی محسوس کر سکو گے "

آرتھر کی خودی میں ایک ہلکی سی لہر آگئی "یہ ناممکن ہے میری دوسرے کارکنوں پر اس کا اچھا اثر نہیں پڑے گا - ڈسپلن کے لئے مجھے اپنی غلطی پر قائم رہنا ہو گا "

"یہ بات تو فوجی قسم کی معلوم ہوتی ہے " میری نے آہستہ سے کہا - اور خاموش ہو گئی اس کے بعد ایسا معلوم ہوا کہ ان دونوں کے درمیان کوئی پردہ حائل ہو گیا ہے وہ کچھ دیر تک کسی خیال میں منہمک ان مچھیروں کی طرف دیکھنے لگی جو تالاب میں نیزے سے مچھلی کا شکار کر رہے تھے کچھ دیر بعد وہ اٹھی - آرتھر بھی کھڑا ہو گیا اور یہ دونوں موٹر کی طرف چلے میری جیسے ہی موٹر میں بیٹھی آرتھر نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا

"میری! تمہیں اس بات کا علم نہیں - مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے "

میری نے اپنا ہاتھ باوقار انداز میں آہستہ سے چھڑا لیا - بھنویں اپنے مخصوص سنجیدہ اور دلفریب انداز میں اوپر اٹھیں اور اس نے کہا -

"مجھے اس کا یقین نہیں - محبت دو روحوں کے اتحاد باہمی کا نام ہے تمہاری روح میری روح سے بالکل برعکس ہے - دو ضدیں ایک جگہ کس طرح جمع ہو سکتی ہیں - اس وقت ہمیں اس موضوع کو ترک کر دینا چاہیئے مجھے صرف یہ خیال ہے کہ تم نے مجھے کارسن کا واقعہ نہ بتایا ہوتا تو بہتر تھا "

دوسرے دن گرمی نہایت سخت تھی - سمندر کے پانی کا درجہ حرارت ۸۲ درجہ تھا یہ اتوار کا دن تھا لیکن بہت ہی کم لوگ عبادت کے لئے جمع ہوئے اس دن آرتھر نے میری کی صرف ایک یا دو دفعہ جھلک دیکھی - آرتھر سمجھنے لگا کہ وہ اس سے اجتناب کر رہی ہے اور علیحدہ رہنا چاہتی ہے - کیا وہ اس بات پر ناراض ہو گئی ہے کہ میں نے کارسن کو ملازمت پر بحال نہیں کیا یا یہ صرف ایک نسوانی تجاہل اور تغافل ہے آرتھر سمجھ نہیں سکا کہ کارسن کے واقعہ نے میری کی منصفانہ اور جمیل طبیعت پر کتنا اثر کیا تھا - وہ نہایت حساس اور نرم طبیعت کی عورت تھی -

اس دن وہ افسردہ اور ملول رہا - رات کو ڈیک پر وہ اس وقت پہنچا جب تقریباً تمام مسافر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تھے میری کے ملازم سے اسے معلوم ہوا کہ وہ بہت دیر سے اپنے کیبن میں سونے کے لئے چلی گئی ہے - میری کے خیالات میں منہمک وہ ڈیک پر ٹہلنے لگا - اس نے خیال کیا کہ میری کے متعلق اس نے غلط رائے قائم کی تھی - وہ ایک چالاک اور عیار عورت ہے - کارسن کی حمایت وہ اس لئے چاہتی ہے تاکہ معلوم کر سکے کہ کون بہت سے رشتہ داروں کا

مالک ہے۔ وہ فتح حاصل کر کے مجھے عاجز دیکھنا چاہتی ہے۔" اسی قسم کے خیالات اپنے دماغ میں لئے وہ ڈیک پر ٹہل رہا تھا۔ اس کے سوا وہاں کوئی دوسرا متنفس نہ تھا۔ یکایک جہاز کے گھنٹے نے بارہ بجنے کا اعلان کیا ——— ڈیک کی تمام روشنیاں بجھ گئیں۔ سخت اندھیر چھا گیا لیکن وہ ٹہلتا ہی رہا۔ ایک گھنٹہ اور گذر گیا جس وقت وہ ڈیک کی بالکل آخری روش پر ٹہلتا رہا۔ اچانک تاریکی میں وہ ایک نرم و نازک نسوانی جسم سے ٹکرایا۔ غیر ارادی طور پر اس کے ہاتھ گرنے والے شخص کو تھامنے کے لئے بڑھے۔ اس نے ایک ہاتھ سے اس کے بازو کو پکڑ لیا۔

"آرتھر ——!" میری کے مُنہ سے نکلا۔ "مجھے نیند نہیں آئی اس لئے تالاب پر تیرنے کے لئے جا رہی تھی۔"

وہ تیرنے کا سوٹ پہنے ہوئے تھی۔ آرتھر اس کے نرم و نازک جسم کی گرمی محسوس کر رہا تھا۔ اس کے جسم کے لمس سے آرتھر کے جذبات میں ہیجان برپا ہو گیا میری کو اس نے وحشیانہ طریقے سے اپنی طرف کھینچا ایک ہاتھ سے اس کا چہرہ اُٹھایا اور چومنا شروع کر دیا —— ایک مرتبہ نہیں —— کئی بار —— نرمی اور آہستگی سے نہیں بیرحمی سے۔ جوش اور شدت کے ساتھ۔ صرف اس کے لبوں کو نہیں، اس کے رخسار، گردن، سینے اور بازوؤں کو بھی۔

میری نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ وہ گھبرا سی گئی۔ اپنی خاموش سپردگی کے سوا وہ کچھ نہ کر سکی۔ خوف سے اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے ہو گئے تھے یکایک آرتھر کو اس کا احساس ہوا۔ اس نے جلدی سے اسے چھوڑ دیا میری کا بدن پیچھے کی طرف گرنے لگا لیکن ایک کھمبے کا سہارا پا کر وہ گرنے سے بچ گئی۔ اس کی پشت کھمبے سے لگ گئی۔

تاریکی میں بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز سے آرتھر کو معلوم ہوا کہ وہ وہاں سے چلی گئی ہے۔ دوسرے دن جب وہ بیدار ہوا اس کے دماغ میں ایک عجیب الجھن اور پریشانی تھی۔ تمام دنیا اسے غلط معلوم ہو رہی تھی۔ وہ ایک قسم کی روحانی تکلیف محسوس کر رہا تھا جس وقت غسل سے فارغ ہو کر وہ ناشتہ کے لئے ٹیلیفون کر رہا تھا۔ اس کے سر کی گرانی میں کچھ کمی محسوس ہوئی اور اس کے خیالات صاف ہوئے اس وقت اُسے احساس ہوا کہ گذشتہ شب وہ کیسی ذلیل اور شرمناک حرکت کا مرتکب ہوا ہے۔ تشدد اس کا قدیمی دشمن کل نئے روپ میں آیا تھا اس نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی شکست کھائی اس ... معرکہ میں قیمتی چیز کھو دی ہے۔ وہ تشدد سے فتح حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میری پر فتح حاصل کرنا دنیا کا ایک بہت بڑا کام ہے وہ نرمی اور ملائمت کا ایک خاموش پیکر ہے۔ انسانیت اور انصاف کا مجسمہ ہے۔ شرافت اور نیکی اس کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ شب میں اس کے ساتھ وہ اس طرح پیش آیا جیسے وہ کوئی فاحشہ اور آوارہ عورت ہے۔ وہ خود کو لعنت و ملامت کرنے لگا

یکایک اس نے محسوس کیا کہ جہاز غیر متحرک ہے۔ پورٹ ہول میں اس نے ساحل پر نگاہ ڈالی۔ پلیٹ فارم پر مقامی باشندے پھول وغیرہ لئے ایک قطار میں بیٹھے تھے۔ بحری سٹیشن سے پرے صبح کے دھند میں ایک سفید شہر دکھائی دے رہا تھا۔ اسے یاد آیا یہ جگہ جزائر فجی میں سوا (سووا) تھی۔ ناشتہ کا انتظار کئے بغیر وہ تیزی سے نیچے اتر گیا خوشبودار اور دیدہ زیب پھولوں سے بھری ہوئی اس نے ایک خوشنما "فلاور باسکٹ" خریدی اسے لئے ہوئے وہ اپنے کیبن میں واپس آ گیا قلم اور کاغذ لے کر اس نے لکھنا شروع کیا۔

"کیا تم ہمیشہ کے لئے مجھے معاف کر سکو گی۔ گذشتہ شب تم سے نہ ملنے کے صدمے اور گرمی کے اثر سے مجھ پر جنون کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی تم سے مڈبھیڑ ہونے سے قبل میری حالت قابل رحم تھی میں بُری طرح تنہائی محسوس کر رہا تھا ......"

یہاں تک لکھ کر وہ رُکا۔ اور قلم ہاتھ میں لئے کچھ سوچنے لگا۔ سامنے آئینہ میں اسے اپنا عکس نظر آیا۔ چہرے پر ویرانی سی برس رہی تھی گذشتہ چند گھنٹوں کے صدمے سے اپنے چہرے کی یہ حالت دیکھ کر اسے تعجب ہوا آئینے سے گر کر اس کی نگاہیں نیچے میز پر رکھے ہوئے ایک خوبصورت کلینڈر پر ٹھہر گئیں۔ کلینڈر میں گذشتہ دن کی تاریخ تھی اتوار ۱۰ اپریل ۱۹۳۷ء یکایک ایک نامعلوم خوف سے اس کی آنکھیں پھیلنے لگیں۔ اس کا تمام جسم لرزنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس پر کوئی بھوت سوار ہو گیا ہے بخار کی سی حالت میں وہ لکھنے لگا۔

"ابھی ابھی مجھے اس خوفناک حقیقت کا علم ہوا ہے کہ آج پیر ہے تم مجھے آدھی رات کے بعد ملی تھیں۔ کاش مجھے پہلے سے اس کا علم ہو جاتا یہ منحوس پیر میری زندگی کا دشمن ثابت ہو رہا ہے۔ میں سمجھا تھا کہ اس کی تلخی اور تشدد صرف آفس تک محدود ہے لیکن میں دیکھتا ہوں کہ یہ بلا میرا پیچھا کسی جگہ نہیں چھوڑتی۔ خصوصاً اس بات پر مجھے بہت صدمہ ہے کہ تم بھی اس کا شکار ہو گئیں۔ اس وقت مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میری زندگی ایک خاص مرکز پر پہنچ کر کسی دوسری سمت میں مڑنا چاہتی ہے۔ صرف تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ کاش وقت پر تمہاری

مدد حاصل ہو جائے گی" اس نے اپنے دستخط کئے اور کیبن کی گھنٹی بجائی۔
"یہ مسز ڈنگ فیلڈ کے کمرے میں لے جاؤ۔" خط اور پھولوں کی ٹوکری ملازم کو دیتے ہوئے اس نے کہا۔ ملازم کے جانے کے بعد وہ کامل ایک گھنٹہ تک اسی جگہ فرشی قالین کے بیل بوٹے گنتا رہا۔ اس نے کئی مرتبہ پورٹ ہول سے باہر نگاہ کی۔ پھول بیچنے والے ویسی ہی قطار میں بیٹھے ہوئے تھے اسے یوں معلوم ہو رہا تھا کہ اس وقت خوشی کسی جگہ نہیں ہے نہ اس جہاز میں اور نہ ساحل پر خوشی صرف ایک عورت کے الفاظ سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اور وہ عورت شاید دنیا کی سب سے آخری عورت ہوگی جو اب خوشی حاصل کرنے میں اس کی مدد کر سکے۔ کسی نے دروازے پر دستک دی۔

"اندر آؤ۔" اس نے مُردہ آواز میں کہا۔

کمرے میں داخل ہو کر ملازم نے ایک لفافہ جس پر اس کا نام نسوانی خط میں لکھا ہوا تھا دیا اس نے جلدی سے لفافہ چاک کیا اور پڑھنے لگا خط نہایت مختصر تھا۔

"تم کس بات کی معافی مانگ رہے ہو آرتھر! تم نے کسی ایسے واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے جو صرف وہمی ہے اور کبھی وقوع پذیر نہیں ہوا۔ جہاز کے اخبار کے مطابق جو اس وقت میرے ہاتھ میں ہے آج منگل ہے ۲۰ اپریل ۱۹۳۷ء پیر کا دن تو آیا ہی نہیں۔ کیا تم آدھ گھنٹہ کے بعد ڈیک پر ملو گے میں تمہارے ساتھ سیر کے لئے جاؤنگی۔" میری!

آرتھر نے اپنا سر اٹھایا اور ملازم سے پوچھا۔

"آج کون سا دن ہے؟"

"منگل ۲۰ اپریل جناب۔" ملازم نے مستعدی سے جواب دیا۔

"تم غلطی پر ہو۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کل اتوار تھا۔ لانچ میں عبادت کی گئی تھی۔" آرتھر نے کسی قدر بلند آواز سے کہا۔

"آپ درست فرماتے ہیں۔ جناب کل اتوار تھا ــــ اور آج منگل ہے"

"کیا تم پاگل ہو یا میں ہو گیا ہوں۔" آرتھر نے وحشیانہ طریقے سے کہا

"ہم دونوں میں سے کوئی نہیں جناب۔" ملازم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا رات میں ہمارا جہاز ۱۸۰ درجہ طول البلد پر سے گذرا ہے جسے عام طور پر خط تاریخ کہتے ہیں (The International date line) اس لئے ایک دن چھوڑ دیا گیا۔ پیر کا دن اس جہاز کے کسی متنفس کے لئے نہیں ہوا۔"

ملازم دروازے کو آہستگی سے بلند کرتے ہوئے چلا گیا۔ ملازم کے جانے کے بعد آرتھر کی نظر لفافے پر پڑی۔ اس میں ایک دوسرا کاغذ بھی نہایت صفائی سے تہ کیا ہوا رکھا تھا وہ اس کاغذ کو لفافے میں سے نکال کر دیکھنے لگا۔ یہ بحری تار کا ایک سادہ فارم تھا۔ آرتھر ایک منٹ تک اس فارم کو دیکھتا رہا اس نے آہستہ سے اپنا قلم نکالا اور مس ولیس کو جیک پاس کارسن کا پتہ تھا تار لکھنے لگا لیکن اس تار کے لکھتے وقت اسے شکست و ناکامی کا خیال ذرا نہ تھا۔ میری کے اس خاموش حکم کے بجا لانے میں آج یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کوئی ایسا کام کر رہا ہے جو سچائی اور انصاف پر مبنی ہے۔ میری اسے سچائی اور انصاف کا فرشتہ معلوم ہو رہی تھی۔ میری کی ذات میں اسے بہت سی ایسی خوبیاں دکھائی دے رہی تھیں جن کی اس کی اپنی ذات میں کمی تھی وہ خیال کر رہا تھا کہ میری کی معیت میں اس کی زندگی مکمل ہو جائیگی۔ وہ میز کے قریب گیا کیلنڈر سے اتوار اور پیر کے دونوں ورق نکال کر اس نے ٹوکری میں پھینک دیئے اس کیلنڈر میں ہر تاریخ کے نیچے ایک مقولہ نہایت ہی باریک حروف میں لکھا ہوا تھا ایک نامعلوم تجسس کے ماتحت وہ اس مقولے کو جو منگل کے دن کے نیچے لکھا ہوا تھا دیکھنے لگا۔ وہ یہ تھا "Nothing is so strong as gentleness; nothing is so gentle as real Strength." (St. Francis)

عالمگیر خاص نمبر ۱۹۴۲ء

دو (۲) سو سے زائد صفحات پھیلا ہوا ادب اور تاریخ و سیاست کا زندۂ جاوید شاہکار

رسالہ عالمگیر اپنے شاندار اور معرکہ آرا خاص نمبروں کی بدولت اردو ادب میں امتیازی درجہ حاصل کر چکا ہے امسال بھی کاغذ کی حوصلہ شکن گرانی کے باوجود اس کا سحر آفریں اور بادہ نواز خاص نمبر ۱۹۴۲ء شائع ہو رہا ہے۔ یہ خاص نمبر علمی و ادبی نقطۂ نگاہ سے کس درجہ بلند پایہ اور دماغ افروز ہوگا اس کا اندازہ ذیل کی مختصر فہرست مضامین دیکھیے اور خود ہی انصاف فرمائیے:

کیا اتنا اچھوتا اور حسین و جمیل گلدستۂ علم و ادب آپ کے مشام جان کو معطر کرنے کیلئے حد درجہ ضروری بلکہ لابدی نہیں ہے ——— ؟؟؟

علمی و ادبی مضامین

تاریخی جواہر ریزے ——— (مولٰنا ظفر علی خاں)

دلچسپ واقعات و حوادث جن کو مختلف تاریخی کتب کے مطالعہ کے بعد شگفتہ اردو زبان کا جامہ پہنایا گیا ہے۔

سیرت جمال الدین افغانی ——— (مولانا اظہر امرتسری)

سید المفکرین حضرت سید جمال الدین افغانی کی سیرت کا ایک معلومات افزا باب جس میں آپ کی ولادت اور ابتدائی تعلیم پر روشنی ڈال کر بتایا گیا ہے کہ آپ نے کس ماحول میں ترقی کے مدارج طے کیے۔

ملا بدایونی اور آزاد دہلوی ——— (مولانا حامد حسن قادری)

ملا عبد القادر بدایونی کی "منتخب التواریخ" اور مولوی محمد حسین آزاد دہلوی کی "دربار اکبری" کا موازنہ۔ ایک دلچسپ تاریخی بحث جو ندرت و جدت کے اعتبار سے امتیازی درجہ کی مستحق ہے۔

ٹیپو سلطان کی رواداری ——— (پروفیسر علیم الدین سالک ایم اے)

سلطان ٹیپو کی شخصیت پر سیاسی تاریخ کا پردہ ڈال دیا گیا ہے لیکن فاضل مقالہ نویس نے تاریخی حقائق کی روشنی میں اسے نمایاں کر کے دکھایا ہے ایک قابل مطالعہ مضمون۔

(ورق الٹیے)

سلطنت عثمانیہ کا سنگ بنیاد (شاہد حسین آئی ہرکیں)

آج کل ہر دوست نما دشمن اور دشمن نما دوست بنکر ترکیہ کا امتحان لے رہا ہے اس لئے یہ جاننا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ آج سے چھ سو برس قبل سلطنت عثمانیہ ترکی کا سنگ بنیاد کس طرح رکھا گیا بلند پایہ تحقیقی مقالہ۔

شیر پنجاب! —— (شیخ عبداللہ قریشی بی اے)

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی بحیثیت تاریخی شخصیت بے شمار افسانوں سے بھری ہوئی ہے۔ اس مضمون میں اس کی زندگی کے بعض ایسے واقعات پیش کئے گئے ہیں

جن سے اس کی حوصلہ مندی و بیدار مغزی اور انصاف پروری رعایا نوازی پر تاریخی روشنی پڑتی ہے۔

مؤتمر آئین ساز —— (خواجہ احمد فاروقی ایم اے)

مؤتمر آئین ساز قانون ساز اسمبلی کا نام نہیں ہے۔ بلکہ ایک ایسی مجلس کا نام ہے جو ملک کے بنیادی اور آئینی اصول کو طے کرتی ہے۔ اس تعلق پر اس مقالہ میں اس سیاسی نظریہ کا تاریخی روشنی میں تجزیہ کیا گیا ہے۔

فتح پور سیکری —— (مولوی نور احمد خاں فریدی)

مغل آرٹ کے ایک شاہکار کی محققانہ تفصیل۔ فتحپور سیکری پر اس درجہ جامع اور مکمل تبصرہ آج تک اردو میں شائع نہیں ہوا۔ فاضل مقالہ نگار نے نہ صرف فتحپور سیکری کی مختلف عمارتوں کے حالات پیش کئے ہیں بلکہ دربار فتحپور سیکری کے بعض دلکش مناظر کو بھی الفاظ کا جامہ پہنایا ہے۔

انیسؔ کی شاعری —— (سید شہنشاہ حسین نکہت)

اگرچہ مرثیہ نگاری کی بنیاد انیسؔ سے بہت پہلے پڑ چکی تھی تاہم جو تازگی اور ندرت حضرت انیسؔ نے اردو شاعری کو عطا کی وہ محتاج تصریح نہیں۔ اس مضمون میں اسی نکتہ کی وضاحت کی گئی ہے۔

وارداتِ عشقیہ —— (علائی شاہجہانپوری)

عشق و محبت کی حالت میں جو کیفیت عاشق کے دل پر طاری ہوتی ہے اسے شاعری کی اصطلاح میں واردات کہتے ہیں۔ اردو شاعروں نے اپنی واردات کا اظہار کس طرح کیا ہے یہ اس مضمون میں ملاحظہ کیجئے۔

فسانۂ عجائب کی اہم خصوصیات (خواجہ مسعود علی ذوقی)

فسانۂ عجائب نہ صرف اپنے عہد کی انشا کا عمدہ نمونہ ہے بلکہ اس میں لکھنؤ کے طرزِ معاشرت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اس خصوصیت کی تشریح آپ کو اس عنوان کے تحت ملے گی۔

جدید ایرانی شاعری —— (میرزا محمد بشیر ایم اے)

عہد جدید کی ایرانی شاعری پر ایک مختصر تبصرہ جس میں بتایا گیا ہے کہ دورِ مشروطیت کی شاعری کی خصوصیات کیا ہیں؟

فلسفۂ عشق —— (میرزا صابر میٹھالوی)

کابل کے مشہور انشاپرداز علامہ محمود طرزی کے ایک فلسفیانہ مقالے کا ترجمہ جس میں عشق کے مفہوم و معانی اور علامات پر روشنی ڈالی گئی ہے

تہذیب کے لوازم —— (طفیل عبدالرحمٰن) تہذیب کیا ہے؟ اور وہ کن عناصر سے ترکیب پاتی ہے؟ ایک معلوماتی مقالہ

افسانے اور ڈرامے

رومیو جیولیٹ ... (سید احسان علی شاہ بی اے)

شکسپیر کی شہرۂ آفاق اور غیر فانی تمثیل کا سلیس و بامحاورہ ترجمہ عہد وسطیٰ کی المناک داستانِ عشق —— اردو میں پہلی مرتبہ پیش کی جا رہی ہے۔

سدوم کی تباہی —— (قمر اجنالوی)

حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر جو تباہی و بربادی نازل ہوئی اس کا مختصر ذکر بائیبل میں ملتا ہے لیکن افسانہ نگار نے اپنے قلم کے زور سے تاریخ کے ان مٹے ہوئے نقوش کو اجاگر کر دیا ہے لطافت اور رنگینی بیان کے لحاظ سے ایک جدا گانہ افسانہ

بدصورت بچے —— (شفیق الرحمان)

ایک نفسیاتی شاہکار جس میں جابجا ظرافت و لطافت اور شوخی و طنز جھلک رہی ہے۔

چیستاں —— (فضل حق قریشی)

ایک بیحد دلچسپ مقدمہ جو عورتوں کی عدالت میں پیش ہوا ڈرامائی عمل۔ مکالمہ اور شوخ نگاری کے اعتبار سے یہ تمثیل اس قابل ہے کہ اسے اسٹیج کیا جائے۔

رومانیہ کا تخت شاہی ایک فتنہ گر حسن کے جسم پر ——

حسن و عشق اور تاج و تخت کی معرکہ آرائی۔ میڈم لیپیسکو اور کیرول سابق شاہ رومانیہ کے رومان کا ایک باب۔

شاہی دفینہ —— (شبلی بی کام)

جنوبی ہند کی ایک پراسرار اور حیرت انگیز تاریخی کہانی ——!

ماسٹر صاحب —— (سید شمیم عزمی)

اس کی زندگی عبارت تھی صرف آہوں اور سسکیوں سے۔ آخر تغیر کیونکر آیا؟ ایک نفسیاتی افسانہ۔

چنگاری —— (امجد یوسف زئی)

ایک ایکٹ کا انقلاب انگیز ڈراما۔ جس کا ترجمہ براہ راست مرہٹی سے کیا گیا ہے۔ مہاراشٹر کے مشہور صاحب قلم پروفیسر بھڑکے کی تراوش فکر۔

نل دمینتی —— (سید ممتاز حسین بسمل)

راجہ اجتین کا وجیانگر کی راجکماری سے معاشقہ۔ حسن و عشق کی دلآویز تاریخی کہانی۔

لکیر کے فقیر —— (صدلقیہ بیگم سیوہاروی)

ایک ایکٹ کا ریڈیائی ڈراما جس میں جہالت و تعلیم کا موازنہ کیا گیا ہے۔ سبق آموز پیش۔

موہنجوداڑو کی غرقابی —— (رفعت ہاشمی)

موہنجوداڑو دریائے سندھ کے کنارے ایک پر رونق شہر تھا۔ دریا ہی میں بہتے بہتے اسے دریا نے اپنی آغوش سے باہر نکالا تھا۔ لیکن وہ غرق آب کیونکر ہوا؟ سندھ کی ایک لرزہ خیز رومانی داستان۔

چوڑیاں —— (شائب فتحپوری)

جب حسن غربت کے شکنجے میں جکڑا جاتا ہے تو اس کی کیا حالت ہوتی ہے۔ گاؤں کی ایک سادہ پر اثر کہانی۔

بیگانۂ منزل —— (شوکت صدیقی لکھنوی)

شوہر پرست کی کہانی ہیروئن کی زبانی۔ دلربا۔ دلنشین۔ دلکش۔

دو پیسے —— (آسی رامنگری)

اسے صرف دو پیسے کی ضرورت تھی۔ وہ بارونق شہروں کی سڑکوں پر پھرا لیکن —— دلگداز افسانہ۔

زندگی کا خواب —— (محمد یونس احمر)

وہ لمحہ ان کی زندگی کا ایک راز بن گیا۔ اور آخرکار ——!

بنگالی زبان کا ایک مسرت زا افسانہ۔

پگلی —— (قمرالدین رامنگری) بنگلہ کا ایک بلندپایہ، حیرت انگیز نفسیاتی شاہکار۔ کیا وہ واقعی پاگل تھی ——؟

منظومات

موجِ فصاحت —— (فصاحت جنگ حضرت جلیل مانکپوری)

ارشادات —— (مولانا حضرت سیماب اکبرآبادی)

طوفان نوح — (تاج الشعراء حضرت نوح ناروی)

بہار اندر بہار — (حضرت ہادی مچھلی شہری)

کیفیات — (حضرت آرزو یزدانی رامپوری)

دو خواب — (حضرت مقبول حسین احمد پوری)

اعتراف و یاس — (جناب عبدالرشید تبسم بی۔ اے)

شعاعِ کوکب — (حضرت کوکب شاہجہانپوری)

دو جُرعے — (جناب جنید احمد بی۔ ایس سی)

عہدِ شباب — (حضرت نشور واحدی)

علاوہ ازیں

حضرت احسان دانش۔ حضرت دعا ڈبائیوی۔ جناب عجاز صدیقی۔ جناب محمود یار خاں آثر۔ جناب حاجی نبی احمد بریلوی، جناب جلیل نیر رضوی۔ جناب ارمان عثمانی۔ جناب اندرجیت شرما۔ جناب جگر بریلوی۔ جناب فرحت شاہجہانپوری وغیرہ

کا تازہ ترین کلام

مستقل عنوانات

اشارہ و انکار — حقائق و معارف — تحقیق و تصحیح — رفتارِ زمانہ

قیمت صرف ایک روپیہ

لیکن اگر آپ خاص نمبر بالکل مفت حاصل کرنا چاہتے ہیں!

تو

آج ہی رسالہ عالمگیر کی سالانہ خریداری قبول فرمالیجئے اس صورت میں آپ کو خاص نمبر کے علاوہ اپریل میں شایع ہونے والا تاریخ نمبر اور جون میں شایع ہونے والا سالانہ نمبر ۱۹۴۲ء بھی مفت ملیگا!

سالانہ چندہ صرف چار روپے آٹھ آنے مع محصولڈاک

سالانہ خریداری میں بہر حال آپکا فائدہ ہے

رسالہ عالمگیر قلیل ترین چندہ میں زیادہ سے زیادہ علمی و ادبی اور تحقیقی و تاریخی جواہر ریزے پیش کرتا ہے!

مینجر رسالہ عالمگیر بازار سید مٹھا۔ لاہور

خمستاں

مجھے پایا ہے بھیگی رات نے اکثر ترے در پر

از جناب ملال

عجب عالم ہے ساقی بزمِ مے میں دورِ ساغر پر
کہ گویا ماہ گردش کر رہا ہو اپنے محور پر

بقدرِ ظرف ہر میکش کی پیشانی منوّر ہے
بہ مقدارِ مئے احمر ہے سرخی سطحِ ساغر پر

کواکب ہیں سبو بردوش پیمانہ بکف پروین
خمستاں در بغل ہے ماہِ کامل چرخِ اخضر پر

فروغِ مئے سے میخانے میں شمعیں سی فروزاں ہیں
پتنگے ہیں کہ رند آتش بجاں ہیں آتشِ تر پر

نگاہِ اہلِ میخانہ میں وہ مہرِ طلعت ہے
چھلک کر جم گیا جو قطرۂ مے سطحِ ساغر پر

قدح خانے میں ساقی دے رہا ہے درسِ سرمستی
نگاہِ اہلِ نائے نوش ہے تحریرِ ساغر پر

مدوّن کر رہی ہیں دفترِ رودادِ میخانہ
مئے احمر کی موجیں جمع ہو کر سطحِ ساغر پر

عبارت ہے جو طغرائے ازل سے وقتِ مینوشی
اُبھر آئی ہے جوشِ مے سے وہ تحریر ساغر پر

سمجھتے ہیں انھیں میخوار حاصل زندگانی کا
جو لمحے مشتمل ہیں صحبتِ ساقی و ساغر پر

نظر آنے لگے میکش کو جس میں دل کی کیفیت
ہزاروں جامِ جم قربان ساقی ایسے ساغر پر

نہیں یاد اور مجھکو سرگذشتِ بیخودی ساقی
مجھے پایا ہے بھیگی رات نے اکثر ترے در پر

میں اپنے ذوقِ رندانہ سے میخانے نہیں جاتا
پہنچ رہتی ہے حصے کی ملالؔ اکثر مرے گھر پر

وادئ اطلس کی کاہنہ

ایک تاریخی واقعہ

از جناب محمود بلیانوی

اگرچہ فتوحات اسلامی کا سلسلہ عہد فاروقی ہی میں بربری افریقہ تک پہنچ چکا تھا مگر رومی حکام کے اطاعت قبول کر لینے کے باعث وہاں باقاعدہ اسلامی سلطنت قائم نہ کی گئی۔ حضرت عثمانؓ کی وفات اور حضرت علیؓ اور امیر معاویہ کی باہمی کشمکش کے دوران میں یہ لوگ پھر خود مختار ہو گئے اور مسلم آبادی کو تباہ و برباد کر دیا۔ رومی عیسائیوں نے نہ صرف مسلمانوں پر ہاتھ صاف کیا بلکہ بربریوں کو بھی تنگ کرنا شروع کر دیا۔ انھوں نے تنگ آکر امیر معاویہ سے اعانت طلب کی چنانچہ مظلوموں کی نجات کا قرعہ اسلام کے نامور فرزند بطل جلیل اور مایہ ناز جرنیل عقبہ کے نام پڑا جس کے بربر پہنچتے ہی رومی دم دبا کر بھاگنے لگے اور ایک قلیل عرصے میں اس شیر بیشۂ ملت نے اپنے گھوڑے کو بحر ردم میں دھکیل کر کہا۔ "خداوندا اگر یہ عریض و بسیط سمندر درمیان میں نہ آجاتا تو میں تیرے نام کی عظمت کو پھیلاتا ہوا مغرب کی نامعلوم سرزمین میں بڑھا چلا جاتا اور تیرے دشمنوں کو تہ تیغ کرتا۔"

عقبہ کی شہادت پر بربروں کو پھر عیسائیوں اور یہودیوں نے اکسایا۔ چنانچہ ایک دفعہ پھر عربوں پر تباہی آئی۔ حضرت عبداللہ بن زبیر کی شہادت کے بعد جب عبدالملک کو کسی جانب سے کھٹکا نہ رہا تو اس نے از سر نو افریقہ کی فتح کا بیڑا اٹھایا اور عقبہ کے مشہور و معروف نائب زہیر کو ایک لشکر جرار دیکر روانہ کیا۔ زہیر کی تلوار نے تھوڑے ہی عرصہ میں بربروں کو مطیع و منقاد کر لیا مگر ایک رومی ٹڈی دل نے ایسے موقع پر آن کر اسے گھیر لیا جب وہ انتظام و انصرام سلطنت میں مصروف تھا۔ زہیر نے جام شہادت پیا اور عیسائی مظفر و منصور قیروان میں داخل ہو گئے مگر ان کی یہ کامیابی عارضی تھی۔ بارگاہ خلافت سے حسن بن نعمان کو ایک لشکر عظیم لیکر افریقہ جانے کا حکم صادر ہوا۔ اس بہادر جرنیل نے آتے ہی رومیوں کا قلع قمع کر دیا۔ ملک کو دشمنان اسلام سے پاک کر کے تنظیم مملکت میں مصروف ہو گیا۔ اس نے اپنی خدا داد قابلیت سے بہت ہی قلیل مدت میں صوبجات بربر کو ایک متمدن ملک میں بدل دیا۔ جگہ جگہ شہر آباد ہو گئے۔ زراعت اور تجارت نے فروغ حاصل کیا

اور لوگ امن و چین سے رہنے لگے۔

بربر لوگ فلسطینی الاصل تھے جن کو حضرت داؤد نے وہاں سے نکال دیا تھا اور وہ اپنے سردار جالوت کے ہمراہ شمالی افریقہ میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ یہ لوگ وحشیانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اس لئے ضرورتاً کسی ضابطہ یا قانون کی پابندی انھیں گراں گزرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ عیسائیت اتنا عرصہ مسلط رہنے کے باوجود انھیں اپنے قالب میں نہ ڈھال سکی۔ البتہ بعض ہوشیار اور چالاک یہودی خاندان ان کی واہمہ پسندی سے فائدہ اٹھاتے رہے۔ یہ لوگ ان میں کاہن یعنی جادوگر مشہور تھے اور ان کے خیال کے مطابق مافوق الفطرت امور کے ظہور میں لانے پر قادر سمجھے جاتے تھے۔

بربروں کے کسی دوسری قوم کے زیر اثر ہو جانے سے ان کاہنوں کے اقتدار میں فرق آجاتا تھا اس لئے یہ ہمیشہ ان کو نئی طاقت کے خلاف اکسایا کرتے تھے۔ رومی حکومت کے دوران میں چونکہ عیسائیت درجۂ اخلاق سے گر چکی تھی اس لئے غیروں کے لئے اس میں کوئی جاذبیت نہ تھی۔ بربر اپنے پرانے عقاید پر قائم رہے۔ یہودی کاہنوں کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہوئی مگر نیرِ اسلام کی ضیا باریوں نے جہاں اس تاریک براعظم کو نور علم سے منور کیا۔ وہاں اس کے باشندوں کے دلوں سے الحاد و زندقہ کی ظلمتوں کو بھی کافور کر دیا۔ یہودی کاہنوں کے اقتدار کے لئے یہ ایک ضرب کاری تھی جسے وہ برداشت نہ کر سکے اور اندر ہی اندر دولت اسلامیہ کی بیخکنی کے لئے تجاویز سوچنے لگے۔

وادئ اطلس کے تمام یہودی کاہن ایک معتقد کاہن جودھا کے گھر اکٹھے ہوئے اور مسلمانوں کے خلاف ایک خوفناک سازش کا نقشہ تیار کیا گیا۔ جودھا کی بیٹی جودھن اپنے حسن و جمال کے باعث تمام وادی میں شہرۂ آفاق تھی نیز کاہن مذکور نے اس کی تعلیم و تربیت بھی اس طریق سے کی تھی کہ تمام گردو نواح میں اس قتالۂ جہاں کے چرچے تھے اس کے حسن دلفریب اور عجیب و غریب کارناموں کی داستانیں مراکش سے لے کر الجزائر تک پھیلی ہوئی تھیں تمام بربر سردار جو مسلمانوں کی

اس ابتیرہ کاہنہ پر دل و جان سے شیدا تھے چنانچہ ابلیس کی اس مجلس شوریٰ نے جودھن کے حسن زاہد فریب کو ہی آلہ کار بنایا۔ تمام علاقہ میں مشہور کر دیا گیا کہ جودھن کی شادی فلاں تاریخ کو ہونے والی ہے اور یہ حسینہ حسن اپنا شوہر خود پسند کرے گی۔ تاریخ مقررہ پر تمام سرداران علاقہ وہاں جمع ہو گئے اور ہر ایک اس شان و شوکت سے آیا جیسے اس کے سوا دنیا میں کوئی صاحب مراتب ہی نہیں ہے۔ کاہنہ ایک علیحدہ کمرہ میں فروکش تھی۔ کمرہ اس زمانہ کی تہذیب کے مطابق بہترین ساز و سامان سے آراستہ تھا خوشبوؤں کے جلنے سے تمام فضا معطر ہو رہی تھی۔ وہ خود عروسی پیراہن زیب تن کئے کمرے کے وسط میں تکیہ لگائے بیٹھی تھی۔ کمرہ کی فضا کو اس قدر جاذب اور دلکش بنا دیا گیا تھا کہ جو شخص بھی اندر قدم رکھتا تھا اس کے جذبات خواہ مخواہ مشتعل ہو جاتے تھے اس کے ساتھ کاہنہ کی دلفریب صورت جلتی آگ پر تیل کا کام کرتی تھی۔ اندر آنے والے کا استقبال زیر لب مسکراہٹ سے کیا جاتا تھا اور عشوہ و انداز کی بجلیوں سے اس کے خرمن احساس میں چنگاریاں پھینکی جاتی تھیں۔

باری باری ایک ایک سردار کو اندر بلایا جاتا تھا اور اسے چند کلمات شیریں سے مسحور کر کے کہا جاتا تھا کہ "میں تیری ہوں مگر ایک رکاوٹ ہے کہ تم عربوں کے غلام ہو۔ میں یہ نہیں چاہتی کہ میرا شوہر کسی کا غلام کہلائے اگر تم کسی طرح اس جوئے کو اپنے گلے سے اتار پھینکو تو بیشک تم میری محبت کے مستحق ہو۔ عربوں کے نکالنے کے بعد میں تم سے شادی کرنے کا وعدہ کرتی ہوں۔ میں خود ان کے خلاف ایک مہم شروع کرنے والی ہوں اگر تم نے میرے ہمراہ ہو کر میدان جنگ میں ایسے جوہر دکھائے اور اپنے حریفوں سے بڑھ چڑھ کر داد شجاعت دی تو تم ہی میرے شوہر بنو گے"۔

کاہنہ کے یہ الفاظ جادو کا اثر رکھتے تھے اور سننے والے میں تاب نہ رہتی تھی وہ چاہتا تھا کہ اگر اس کے بس میں ہو تو ابھی سر عسکر اسلام کا سر کاٹ کر کاہنہ کے قدموں میں لا رکھے اور اس طرح اپنی محبت کا عملی ثبوت دے کر اسے ہمیشہ کے لئے اپنا بنا لے۔ الغرض تمام سردار اپنے محسنوں کے احسانات کو یکقلم بھول گئے اور اس پیکر رعنا کے حصول کے لئے ہر طاقت سے نبرد آزما ہونے کے لئے کمربستہ ہو گئے اور آنے والی تاریخ کے لئے مکمل تیاریاں ہونے لگیں۔

ادھر حسن کو اس کارروائی سے بے خبر رکھنے کے لئے تمام یہودی اس کے دربار میں حاضر ہوئے اور عجیب و غریب شکایات پیش کر کے اسے امور سلطنت کی انجام دہی سے بھی غافل رکھا اور آنے والے فتنے کا علم تک نہ ہونے دیا۔ بالآخر کاہنہ کی مقرر کی ہوئی تاریخ آپہنچی۔ تمام سردار وادی جبل اطلس میں اپنا اپنا لاؤ لشکر لے کر جمع ہو گئے۔ کاہنہ جنگی لباس زیب تن کئے ایک اسپ صبا رفتار پر سوار وہاں پہنچ گئی اور مجمع کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔ "اے بہادرو! ہماری کوششیں بارآور ہوئیں مگر ہمیں چاہئے کہ پہلے اپنے میں سے کسی کو اپنا امیر بنالیں تاکہ انتظام میں خلل واقع نہ ہو"۔

اس کے ان الفاظ پر یہودیوں کی ایک جماعت جو تمام مجمع میں بکھری کھڑی تھی بول اٹھی کہ آپ سے بہتر کون امیر مل سکتا ہے۔ آج سے آپ ہماری ملکہ ہیں ہم آپ کے ہر حکم پر اپنی جانیں نثار کر دیں گے کاہنہ نے بغیر کسی اور کے بولنے کا انتظار کئے پھر کہا کہ میں بڑی خوشی سے اس ذمہ داری کو قبول کرتی ہوں اگر کسی کو اعتراض ہو تو وہ ابھی واپس چلا جائے۔ اس کا جادو کام کر چکا تھا سب نے نیزے بلند کر کے اس کے ملکہ ہونے کے اعلان کو قبول کر لیا۔ اور یہ لشکر فرزندان اسلام سے نبرد آزما ہونے کے لئے پہاڑوں سے نکل کر قیروان کی جانب چل پڑا۔ ابن نعمان کو اس بغاوت کا اس وقت علم ہوا جب کاہنہ شہر سوس کے علاوہ تین اور شہروں پر قابض ہو چکی تھی۔ اور بے شمار مسلمان جام شہادت پی چکے تھے فوراً بارگاہ خلافت سے کمک طلب کی گئی اور حسن خود مقابلہ کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ کاہنہ کا ٹڈی دل لشکر جہاں جاتا مسلمانوں کی قلیل جماعت مقابلہ کرتی مگر شہید ہو جاتی۔ الغرض تھوڑے ہی عرصہ میں کاہنہ نصف سے زیادہ شمالی افریقہ پر قابض ہو گئی۔ اور مسلمان شہدا کی تعداد ایک لاکھ تک پہنچ گئی۔ عساکر اسلامیہ کے حوصلے پست دیکھ کر سپہ سالار تیزی سے دشمن کے مقابلہ کے لئے بڑھا اور برقہ کے قریب اس طاغوتی لشکر سے مقابلہ کیا۔ جرنیل کی حاضری کے باعث عرب جان توڑ کر لڑے کاہنہ کی فوج میں ابتری کے آثار رونما ہونے لگے اور اغلب تھا کہ وہ میدان چھوڑ دے مگر یہاں پھر اس نے اپنی آبائی فریب کاری سے کام لیا۔ چند یہودیوں کو جو زخمی ہو گئے تھے ایسی قبروں میں زندہ دفن کر دیا جن میں ہوا آنے کے لئے سوراخ رکھے گئے تھے اور لشکر میں مشہور کر دیا گیا کہ کاہنہ کل جنگ کے شہدا سے بات چیت کرے گی سوال و جواب ان کو پہلے ہی سے سکھلا دیئے گئے تھے۔ اگلا روز جمعہ کا تھا مسلمان نماز جمعہ میں مصروف تھے کاہنہ نے اسی وقت مفروضہ مردوں کی قبروں پر جا کر انھیں پکارا۔ انھوں نے جواباً کہا کہ ملکہ ہم بالکل آرام سے ہیں

اور خوشخبری دیتے ہیں کہ فتح آپ کی ہو گی اور جو کوئی آپ سے غداری کریگا اس کے لئے دوزخ تیار ہے۔

اب کیا تھا بربروں کے حوصلے پھر بڑھ گئے اور ادھر نومسلم اس واقعہ کو سن کر بہت حوصلہ ہارنے لگے۔ حسن نے بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا مگر بربر اس جوش سے لڑے کہ مسلمانوں کو پیچھے ہٹنا پڑا اس کامیابی کے بعد کاہنہ نے مختلف علاقوں میں یہودیوں کو صوبیدار بنایا اور انھیں حکم دیا کہ اسلامی تہذیب کے آثار تک مٹا دیں۔ بربر سردار اب اس کے حسن کے دلدادہ ہونے علاوہ کرامات کے بھی معتقد ہو گئے تھے اور باہمی رقابت کے باعث ایک لمحہ کے لئے بھی اس کی فوج سے علیحدہ نہ ہوتے تھے۔ جاہ و مراتب کی ان کو پرواہ نہ تھی۔ وہ تو اس مجسمہ حسن و فریب کے پجاری تھے۔ کاہنہ نے ابھی چند سال ہی حکومت کی تھی کہ دمشق سے مجاہدین کا ایک لشکر جرار ابن نعمان کی مدد کے لئے آن پہنچا۔ اس نے تازہ دم فوج کو لے کر آہستہ آہستہ ایک ایک شہر فتح کرنا چاہئے۔ بربروں نے بہتیری کوشش کی مگر عربوں کا سیل فتوحات بڑھتا ہی گیا۔ اب بربر سرداروں کے سر سے عشق کا بھوت بھی اترنے لگا کیونکہ اس طویل محاربہ نے ان کے حواس درست کر دیئے تھے نیز ان کے اپنے لوگ نئی ملکہ کے ظلم و ستم سے تنگ آ گئے تھے یہودی صوبیداروں نے لوگوں کو اس قدر ستایا کہ وہ تنگ آ کر دعائیں کرتے تھے کہ مسلمان دوبارہ آ جائیں اور ان کو ان ظالموں کے پنجۂ استبداد سے نجات دلائیں۔

حسن ایک کہنہ مشق اور تجربہ کار جرنیل تھا استقلال سے آگے بڑھتا گیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں برقہ، سوس وغیرہ تمام شہروں نے اس کے لئے اپنے دروازے کھول دیئے۔ کاہنہ نے جب دیکھا کہ اس کے دجل و فریب کی دھجیاں ابن نعمان کی شمشیر خارا شگاف سے ہوا میں بکھر بکھر کر اڑی جا رہی ہیں تو اپنے عشاق کو آخری حکم دیا کہ ملک کو برباد کر دو یہ لوگ خود آتش عشق میں جل بھن رہے تھے اس لئے انھوں نے شہروں اور بستیوں کو اجاڑ دیا۔ محلوں کو گرا دیا۔ نخلستان کاٹ ڈالے فصلیں جلا دیں۔ نہریں بند کر دیں اور پل گرا دیئے۔ مورخین اس بربادی کو افریقہ کی پہلی قیامت صغریٰ کہتے ہیں۔ اس تمام وحشت انگیزی کے باوجود حسن کے پائے شجاعت میں لغزش نہ آئی اور کاہنہ کو دھکیلتا ہوا اطلس کی ترائی میں لے لیا۔ ممکن تھا کہ یہ ناز فریب قتالہ نسوانی کمزوریوں کے باعث اطاعت قبول کر لیتی مگر اس نے ایسا نہ کیا۔ نہ جانے کون سا جذبۂ انتقام اس کے دل میں کارفرما تھا جو آخری دم تک اسے مسلمانوں کے خلاف ابھارتا رہا۔ اب آخری بار اس نے اپنے پروانوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ آج آخری مقابلہ ہے جو میرے ہمراہ مریگا اسی کی شادی دوسرے جہان میں میرے ساتھ ہو گی موت ابن نعمان کی تلوار کی صورت میں دیکھ کر ان پروانوں کی آنکھوں سے پردے ہٹے اور دل برداشتہ ہو کر قائد اسلام سے آ کر معافی کے طلبگار ہوئے۔ حسن نے انھیں معاف کر دیا۔ اب عربوں نے آگے بڑھ کر کاہنہ اور اس کے چند ساتھیوں کو گھیرے میں لے لیا ابن نعمان چاہتا تھا کہ اب بھی وہ اطاعت قبول کرلے مگر اس کا آخری وقت آن پہنچا تھا بڑی بے جگری سے حسن کی فوج پر حملہ آور ہوئی اور جہاں اس کی فوج کا بیشتر حصہ خاک و خون میں لوٹ رہا تھا وہیں خود بھی ڈھیر ہو گئی کوہ اطلس کی چوٹیاں اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھیں۔ حسن خود

حسن کے خیمہ میں پہنچا۔ مقتول کاہنہ کے ہاتھ میں ایک سفید کپڑا پکڑا ہوا تھا اور اس پر لکھا تھا۔ "تمہارے پیشرو عقبہ نے میری ماں کی محبت کو ٹھکرا کر یہ کہکر ٹھکرا دیا کہ مسلمان اس امر کی اجازت نہیں دیتا۔ میری ماں نے مایوس ہو کر اس سے انتقام لینے کے لئے قسم کھائی مگر دونوں ایک ہی سال میں مر گئے۔ مرتے وقت میری ماں نے مجھ سے وصیت کی کہ جس اسلام نے میری سب سے بڑی خواہش کو پورا نہ ہونے دیا تم اُسے صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لئے اپنی زندگی وقف کر دینا۔ میں آپ کو بحیثیت سپہ سالار افواج اسلامیہ ہونے کے اس بات کو گواہ بناتی ہوں کہ میں نے اپنی ماں کی وصیت کو پورا کر دیا"

حسن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس نے رو کر کہا کاش کاہنہ تو یہودن کے بطن سے پیدا ہونے کے بجائے کسی عرب گھرانے میں جنم لیتی تو آج عالم اسلام تیرے لئے دعائیں کرتا اچھا جتنی سرعت اور تندی سے تو نے اپنے وطن کو تباہ و برباد کیا ہے میں اتنی ہی جلدی اسے سرسبز و شاداب بنا دونگا تاکہ تیرے ہموطن تجھے دیر تک برائی سے یاد نہ کریں۔ یہ کہہ کر اس نے لاشوں کو دفنانے کا حکم دیا اور کاہنہ کی لاش کو ایک علیحدہ قبر میں دفنایا۔ اس کی قبر کا آج نشان بھی نہیں ملتا مگر اس کے ظلم و ستم کے افسانے ہمیشہ یادگار رہیں گے۔

قطعات!

یہیں خس و خاشاک میں مل گیا
زر و زر تہ خاک میں مل گیا
یہ پرویزی ذات کا عکس نفی
صورت باد و آب میں مل گیا

دو تماشے نیاز مل جائے
سوز کے ساتھ پیار مل جائے
ہمہ آکر ایک بس سر آنکھوں
مجھ کو میرا وہ راز مل جائے

لطیف انور گورداسپوری

عید مبارک[ل]

ڈراما

از جناب ظفر واصلی شاہ آبادی

افراد

شہناز :۔ زنانہ مدرسہ کی اُستانی جسے اس کے لکھ پتی چچا نے پرورش کیا ہے اس کے چچا کے اپنی کوئی اولاد نہیں ہے۔

شوکت :۔ شہناز کا دور کا رشتہ دار جس سے شہناز شادی کرنا چاہتی ہے اور جو مشہور فسانہ نگار بھی ہے۔

عائشہ، طاہرہ :۔ شہناز کی دو سہیلیاں وکیل اور نوکر،

(عید کا دن ہے۔ کوئی ساڑھے دس بجے ہیں۔ عائشہ اور طاہرہ شہناز کے یہاں آتی ہیں)

شہناز :۔ عید مبارک عائشہ، عید مبارک طاہرہ!

عائشہ اور طاہرہ۔ (ایک ساتھ) عید مبارک۔

(گلے ملنے کی آواز آتی ہے)

شہناز :۔ میں تم دونوں کا انتظار ہی کر رہی تھی۔

عائشہ :۔ طاہرہ نے دیر کر دی۔

طاہرہ :۔ (کچھ طنز سے) ہاں میرے ہی بال نہیں بنے تھے۔ اور پھر مجھے ہی کپڑے بدلنے میں دیر لگ گئی۔

عائشہ :۔ (ہنس کر) اچھا بال تو آپ کے جلدی بن گئے تھے لیکن ساڑیاں دو دو کس نے بدلیں؟"

شہناز :۔ تم تو بحث کرنے لگیں ـــــ عید کے دن اپنے دوستوں سے مل کر کیسی خوشی ہوتی ہے۔

عائشہ۔ ہونی بھی چاہئے۔

طاہرہ :۔ بھئی ہمیں تو بھوک لگ رہی ہے عائشہ نے جلدی میں کچھ کھانے ہی نہیں دیا۔

شہناز۔ دعوت میں کوئی گھر سے کھانا کھا کر جاتا ہوگا۔

طاہرہ۔ تو منگاؤ نا!

شہناز۔ تھوڑی دیر اور صبر کیجئے، بس شوکت آ ہی رہے ہونگے۔

عائشہ۔ ہاں شہناز تم نے اپنے چچا کی وصیت کے متعلق شوکت سے ذکر کر دیا کہ نہیں؟

شہناز۔ ابھی تو نہیں کیا، دیکھئے آج خیال ہے کہ ان سے ذکر کر ہی دوں۔

عائشہ۔ لیکن وکیل نے انھیں سب کچھ بتا دیا ہوگا۔

شہناز۔ نہیں، میں نے اسے بھی منع کر دیا تھا۔

عائشہ۔ اور تم نے کیا فیصلہ کیا؟

شہناز۔ میں تم سے پوچھتی ہوں کہ مجھے کیا فیصلہ کرنا چاہیئے؟

عائشہ۔ میرے خیال میں تو تمھیں اپنے چچا کی خواہش کا احترام کرنا چاہیئے

طاہرہ۔ یہ تم دونوں کیا پہیلیوں میں باتیں کر رہی ہو۔ میری سمجھ میں تو خاک بھی نہیں آیا۔

عائشہ :۔ تم یہاں تھیں ہی نہیں۔ جب یہ باتیں واقع ہوئیں۔ خیر میں تمھیں بتاتی ہوں۔ یہ تو تمھیں معلوم ہی ہے کہ شہناز کے چچا اس کی شادی کسی رئیس کے لڑکے سے کرنا چاہتے تھے اور یہ شوکت کو پسند کرتی تھی۔ اس بات سے ناراض ہو کر یہ ہوسٹل میں اُٹھ آئی تھی۔

طاہرہ۔ ہاں اتنا تو مجھے معلوم ہے۔

عائشہ۔ تو پچھلے دنوں ان کا انتقال ہو گیا لیکن مرتے مرتے بھی انھیں اپنی ضد کا خیال رہا لہذا وصیت کر گئے کہ اگر شہناز شوکت سے شادی کرنے سے باز نہ آئے تو میری جائداد اور دولت سے اسے ایک پیسہ نہ دیا جائے اور یہ سب چیزیں میری دوسری وصیت کے مطابق تقسیم کر دی جائیں۔ لیکن اگر شہناز شوکت سے شادی نہ کرے تو سب چیزیں اس کی۔

طاہرہ۔ تعجب ہے اور افسوس بھی۔ شہناز تمھارے چچا بڑے عجیب

ل بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو دہلی،

عائشہ۔ لیکن آخر انھیں شوکت سے ایسی کیا دشمنی تھی کہ اتنی سخت سزا دی گئی۔

شہناز۔ شوکت سے تو کیا دشمنی تھی۔ بس مجھ سے یونہی ضد ہو گئی تھی کہ میں نے ان کی پسند کے لڑکے سے شادی کرنے سے کیوں انکار کر دیا وہ چاہتے تھے کہ لکھ پتی کی بھتیجی لکھ پتی ہی کے یہاں بیاہی جائے۔

عائشہ۔ اور وکیل کیا کہتا ہے؟

شہناز۔ وکیل بھی وہی کہتا ہے جو تم کہتی ہو۔

طاہرہ۔ اور تمہارا دل کیا کہتا ہے؟

شہناز۔ (ذرا ناز سے) میرے دل کی نہ پوچھو۔

عائشہ۔ آخر ہمیں بتلانے میں کیا ہرج ہے۔

شہناز۔ ہرج تو کوئی نہیں، لیکن ——،

طاہرہ۔ (بات کاٹ کر) لیکن کیا —— ہم تمہاری رازدار سہیلیاں ہیں پھر ہم سے بھی تم اپنے دل کی بات چھپاتی ہو۔

شہناز۔ میرا دل کہتا ہے کہ آج طاہرہ کو بھوکا رکھو۔

طاہرہ۔ (ہنس کر) میں بھوکی رہ چکی۔ تھوڑی دیر اور شوکت کی راہ دیکھتی ہوں پھر طعام خانے میں جا کر جو چیز مجھے اچھی لگے گی کھا لونگی۔

عائشہ۔ (طنز سے) بس اسے تو کھانے کی پڑی رہتی ہے۔

طاہرہ۔ جیسے تم کچھ کھاتیں ہی نہیں۔

(دروازے سے ہلکی سی کھٹ کھٹ کی آواز آتی ہے)

شہناز۔ شوکت آگئے —— (ذرا بلند آواز سے) آجایئے!

(شوکت کے قدموں کی آواز)

شہناز۔ (خوشی کے لہجہ میں) عید مبارک۔ شوکت بڑی راہ دکھائی۔

شوکت۔ عید مبارک۔ آپ کے مزاج بخیر ہیں مس عائشہ! اور مس طاہرہ آپ بھی خیریت سے ہیں۔

عائشہ۔ خدا کا شکر ہے۔

طاہرہ۔ آپ کے مزاج بخیر،

شوکت۔ آج آپ دونوں سے بہت دنوں کے بعد ملاقات ہوئی۔

عائشہ۔ جی ہاں ——!

(گھنٹی بجنے کی آواز نوکر کے آنے کی آواز)

شہناز۔ کھانا لے آؤ۔

نوکر۔ بہت اچھا۔

(نوکر کے جانے کی آواز۔ پھر کرسی کی آواز پلیٹیں وغیرہ رکھنے کی آواز)

شہناز۔ بسم اللہ کیجئے۔

شوکت۔ آج تو آپ نے بہت تکلف کیا شہناز۔

عائشہ۔ ہاں آج تو بس سویاں ہی سویاں ہونا چاہیئے تھی۔

شہناز۔ تکلف کیا کیا؟ تکلف تو میں کرتی اگر دوسرا نوکر چھٹی نہ چلا جاتا۔

عائشہ۔ آج کل شوکت صاحب آپ کی فسانہ نگاری کا کیا رنگ ہے۔

طاہرہ۔ میں نے بہت دنوں سے آپ کا کوئی افسانہ نہیں پڑھا۔

شوکت۔ آج کل میں پڑھتا زیادہ ہوں اور لکھتا کم ہوں۔

شہناز۔ ہاں شوکت! میں نے بھی ایک افسانہ لکھا ہے لیکن ابھی مکمل نہیں ہوا اس کے انجام نے الجھن میں ڈال رکھا ہے۔

شوکت۔ شکر ہے کہ آپ افسانے لکھنے لگیں۔

شہناز۔ یہ افسانہ تو میں مدت سے لکھ رہی تھی۔

شوکت۔ پھر تو بہت ہی دلچسپ ہوگا۔

شہناز۔ اگر انجام بھی دلچسپ ہو جائے —— زردہ بھی تو کھاؤ عائشہ! اور شوکت تم نے تو سویوں کے علاوہ کسی چیز کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔

شوکت۔ مجھے بتایئے انشاء اللہ وہ انجام بتاؤں کہ آپ پسند ہی کریں۔

شہناز۔ بہت مختصر الفاظ میں اس کا لب لباب یہ ہے کہ ایک کروڑ پتی ہے۔ اس کا ایک لڑکا ہے۔ وہ لڑکا اپنی پسند کی شادی کرنا چاہتا ہے اور کروڑ پتی چاہتا ہے کہ اس کا لڑکا اس کی تجویز کردہ سیٹھ کی لڑکی سے شادی کرے۔ لڑکا باپ سے ناراض ہو کر الگ سکونت اختیار کر لیتا ہے۔ پھر کروڑ پتی کا اچانک انتقال ہو جاتا ہے۔ لڑکے کو باپ کی ناگہانی موت کا رنج تو ہوتا ہے لیکن دل کو اطمینان ہے کہ اب اپنی پسند کی شادی کر دیگا مگر وکیل اُسے بتاتا ہے کہ تمہارا باپ وصیت کر گیا ہے کہ اگر میرا لڑکا اس استانی سے شادی کرنے سے باز نہ آئے جس سے وہ محبت کرتا ہے تو میری تمام جائداد اور روپے میں سے اسے ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ دی جائے اور یہ سب دولت میری دوسری وصیت کے مطابق تقسیم کر دی جائے اور اگر وہ اس استانی کے بجائے کسی اور سے شادی کرے تو سب دولت اس کی۔

شوکت۔ ماشاءاللہ بہت دلچسپ پلاٹ ہے۔

عائشہ۔ کیا کہنا ہے شہناز تمہارے دماغ کا۔

طاہرہ۔ بہت خوب قصہ ہے۔

شہناز۔ لیکن اب سوچنا یہ ہے شوکت کہ آیا وہ لڑکا تمام دولت کو چھوڑ کر اس استانی سے شادی کریگا کہ نہیں؟

شوکت۔ (کچھ سوچ کر) بالکل نہیں۔

عائشہ۔ لیکن شہناز نے تو افسانے میں یہ دکھایا ہے کہ وہ استانی سے بہت زیادہ محبت کرتا ہے۔

شوکت۔ کچھ حرج نہیں بلکہ اس سے افسانہ میں اور جان پڑ جائیگی۔

شہناز۔ لیکن شوکت استانی سے شادی ہی کرنے کے لئے تو وہ باپ سے ناراض ہو کر الگ رہائش اختیار کرتا ہے۔

شوکت۔ اس وقت اسے یہ یقین ہوتا ہے کہ باپ اس کی بات مان لیگا۔ اور نہ بھی مانے تو آخر تمام جائداد وغیرہ اسی کے حصہ میں آئے گی چند دن کی تکلیف تو آدمی بآسانی اٹھا سکتا ہے۔ لیکن عمر بھر کی مصیبت ــــــ!

طاہرہ۔ تو کیا آپ کے خیال میں وہ دولت کے سامنے اپنی محبت کو حقیر سمجھیگا

شوکت۔ توقعت تو دیگا لیکن اتنی زیادہ نہیں کہ تمام جائداد اس کے لئے چھوڑ دے۔

شہناز۔ اب آپ پلاٹ کو اُلٹا سمجھئے یعنی لڑکی کو یہ اُلجھن درپیش ہے تو کیا وہ بھی دولت کے لئے اپنے دوست کو چھوڑ دیگی؟

شوکت۔ اسے آپ مجھ سے زیادہ بہتر سمجھ سکتی ہیں۔

شہناز۔ یعنی اگر افسانے میں کردار اُلٹے ہوں تو آپ کے خیال میں کون سا انجام فطری اور عین قدرت کے مطابق ہوگا۔

شوکت۔ میں نے عرض تو کر دیا کہ آپ اس بات کو مجھ سے بہتر سمجھ سکتی ہیں،

شہناز۔ طاہرہ بھئی فرنی بھی تو کھاؤ۔ تمہیں تو بھوک بہت لگ رہی تھی اور تم نے کھایا کچھ بھی نہیں۔

طاہرہ۔ فرنی کی ایک پلیٹ تو میں نے کھا لی اب دوسری بتاؤ کون سی کھاؤں؟

شہناز۔ (ہنس کر) جونسی چاہو اٹھا لو۔ ہاں شوکت میں آپ سے آپ کا افسانوی تجربہ دریافت کرنا چاہتی تھی۔

شوکت۔ افسانوی باتوں کو چھوڑیئے۔ افسانے میں تو آپ دونوں باتوں کو اتنا فطری اور اتنا قدرتی دکھا سکتی ہیں کہ پڑھنے والے عش عش کر اٹھیں۔ بس زور قلم چاہئے لیکن حقیقت اور افسانے میں بہت فرق ہے جو باتیں ہم افسانوں میں لکھتے ہیں وہ روز مرہ کی زندگی میں واقع نہیں ہوتیں۔ وہ حقیقت سے کوسوں دور ہوتی ہیں لیکن پھر بھی ہم الفاظ کے ہیر پھیر سے انہیں ایسا بنا دیتے ہیں کہ ان کا ہونا پڑھنے والے کو غیر فطری معلوم نہیں ہوتا۔

شہناز۔ آپ تو اصل مقصد سے ذرا دور ہٹ گئے۔ میں یہ دریافت کر رہی تھی کہ اپنے افسانے کا انجام کیا دکھاؤں لڑکی کو دو چیزوں میں سے ایک کو انتخاب کرنا ہے یعنی ایک طرف بے شمار دولت ہے اور دوسری طرف ایک عزیز از جان دوست۔

شوکت۔ میرے خیال میں تو اسے دولت کو انتخاب کر لینا چاہئے کیونکہ دنیا میں دولت بڑی مشکل سے ملتی ہے باقی رہے دوست تو دنیا کی انسان کو کمی نہیں بشرطیکہ اس کے پاس دولت ہو۔

شہناز۔ (پرجذبات آواز میں) یہ آپ کے خیالات ہیں شوکت مجھے تو یقین نہیں آتا نہیں اور اگر آپ نے سوچ سمجھ کر یہ باتیں کہی ہیں تو ان سے مجھے بڑا رنج پہنچا۔

شوکت۔ آپ افسانوں کی باتیں کر رہی ہیں۔ پھر اگر آپ کسی افسانے کا انجام ایک طرح دکھانا چاہیں اور میں دوسری طرح تجویز کروں تو اس میں رنج پہنچنے کی کیا بات ہے۔

شہناز۔ ہاں مگر بعض دفعہ افسانوں پہ حقیقتیں تعمیر ہوتی ہیں۔

عائشہ۔ شوکت صاحب! آپ کو شاید معلوم نہیں کہ شہناز کے چچا وصیت کر گئے ہیں۔

شہناز۔ عائشہ یہ تم کیا کہنے لگیں۔

عائشہ۔ (شہناز کی بات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے) یوں سمجھئے کہ یہ مشکل شہناز ہی کو درپیش ہے۔

شہناز۔ عائشہ تم نے بُرا کیا تمہیں شوکت کو اس وصیت کے متعلق نہ بتانا چاہئے تھا۔

شوکت۔ (پرغم آواز میں) انہوں نے بُرا نہیں کیا۔ بلکہ بہت اچھا کیا تاہم میں جو کچھ کہہ چکا ہوں اس پر پشیمان نہیں بلکہ اب تو میں منت کروں دونگا کہ آپ اس افسانے کا انجام میرا بتایا ہوا ہی رکھیں۔ شہناز میں جانتا ہوں کہ آپ مجھ ناچیز کی بڑی قدر کرتی ہیں لیکن پھر بھی میں یہی درخواست کرونگا کہ آپ مجھے بھول جائیں۔ آج کی ملاقات ہماری آخری ملاقات ہونا چاہئے۔

طاہرہ۔ شوکت صاحب! اس وقت اس بات کے فیصلہ کرنے کا تو دور رہنے دیجئے ــــــ!

شہناز۔ (ہلکی آواز میں) خیر فیصلہ تو اسی وقت ہوگا۔

عائشہ۔ فیصلہ تو ہو چکا اب اور کیا فیصلہ ہوگا۔

(نوکر کے آنے کی آواز)

نوکر۔ وکیل صاحب آئے ہیں۔

عائشہ۔ (زور دے کر) وکیل صاحب؟

نوکر۔ وہ کہتے ہیں بہت ضروری کام ہے۔

شہناز۔ بھیجدو ــــــ!

(نوکر کے جانے کی آواز۔ وکیل کے آنے کی آواز)

شہناز۔ آیئے وکیل صاحب!

وکیل۔ میں آپ سب کی خدمت میں عید مبارک پیش کرتا ہوں اور آپ کی دعوت میں مخل انداز ہونے کی معافی چاہتا ہوں۔

شہناز۔ عید کے دن آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ کچھ کھایئے گا، آپ کے لئے کھانا منگاؤں؟

وکیل۔ جی نہیں، مہربانی!

شہناز۔ تو فرمایئے خیریت ہے۔

عائشہ۔ شہناز ہم سب کھا چکے یہ برتن اٹھوا دو تو اچھا ہے۔

شہناز۔ بہرے ——!

نوکر۔ جی ——!

شہناز۔ یہ برتن اٹھا لے جاؤ اور چا لے آؤ۔

(برتن جمع کرنے کی آواز۔ نوکر کے جانے کی آواز)

شوکت۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں سگار سلگا لوں۔

عائشہ۔ شوق سے۔

شہناز۔ ضرور ——!

شوکت۔ وکیل صاحب! آپ شوق فرمائیں گے؟

وکیل۔ جی نہیں، میں اس نعمت سے محروم ہوں۔

(دیاسلائی جلانے کی آواز)

شہناز۔ ہاں وکیل صاحب! آپ نے کچھ فرمایا نہیں۔

وکیل۔ آج مجھے ایک ریاست کا تار ملا۔ کسی مقدمہ کے لئے انھیں میری خدمات کی سخت ضرورت ہے۔ میں ابھی دو گھنٹہ کے بعد روانہ ہو رہا ہوں اور خبر نہیں مجھے وہاں کتنی مدت لگ جائے میں نے سوچا کہ آپ کے چچا کی دونوں وصیتیں آپ کو دیتا جاؤں اور یہاں آپ نے اس عرصہ میں کیا فیصلہ کیا؟

شہناز۔ یہاں ابھی اسی فیصلہ کا ذکر ہو رہا تھا۔

وکیل۔ اور پیشتر اس کے کہ اپنا فیصلہ بتائیں میں ایک دفعہ اور نصیحت کرونگا کہ آپ اپنے چچا کی خواہش کا احترام کریں۔ جیسا کہ آپ جانتی ہیں مرحوم میرے بڑے دوست تھے انہی کی دوستی کی بنا پر میں چاہتا ہوں کہ آپ کو ایک دفعہ اور سمجھانے کی کوشش کروں۔

عائشہ۔ ہم سب بھی انھیں یہی سمجھا رہے ہیں۔

(نوکر کے آنے کی آواز اور چا کی ٹرے میز پر رکھنے کی آواز)

شہناز۔ (ہلکی آواز سے) وکیل صاحب بات یہ ہے کہ جو کچھ میں شوکت سے وعدہ کر چکی ہوں اس سے نہیں ٹل سکتی۔ پانچ لاکھ تو کیا دُنیا کا کوئی بڑے سے بڑا لالچ میرے قدم نہیں ڈگمگا سکتا۔

وکیل۔ (حیرت سے) یعنی آپ شوکت صاحب ہی سے شادی کرینگی؟

شہناز۔ (ہلکی آواز میں) میں نے آپ کو یہی بتایا تھا۔

عائشہ اور طاہرہ۔ (ایک ساتھ) آفریں ہے شہناز تم پر آفریں ہے۔

وکیل۔ تو اس صورت میں دوسری وصیت پر عمل کرنا ہوگا۔ یہ مرحوم نے کسی دوسرے وکیل سے مرتب کرائی تھی اور سربمہر لفافہ میں میرے سپرد کی تھی اور تاکید کی تھی کہ شہناز کے نکاح کے بعد اسے کھولا جائے۔

عائشہ۔ تو کھولئے اس میں بھی دیکھ لیں کیا گل کھلائے ہیں مرحوم نے۔

(لفافہ پھاڑنے کی آواز اور اس میں سے دستاویز نکالنے کی آواز) (وقفہ)

طاہرہ۔ (بےچینی سے) کیا لکھا ہے اس میں وکیل صاحب! یہ وصیت نامہ آپکو ابھی نہیں کھولنا چاہئے تھا۔

وکیل۔ (ذرا بلند آواز اور جوش کے ساتھ) شوکت صاحب مبارک ہو مرحوم نے کمال کر دیا۔

شوکت۔ (دبی زبان سے) شکریہ۔ لیکن یہ تو فرمایئے ——،

وکیل۔ (شوکت کی بات کی پروا نہ کرتے ہوئے) میرے دوست کا بھی کیا دماغ تھا۔ اس وصیت میں لکھا ہے کہ اگر شہناز اپنی ضد سے باز نہ آئے اور شوکت سے ہی شادی کرے تو میری تمام جائداد وغیرہ شوکت کے نام کر دی جائے۔

طاہرہ اور عائشہ۔ (یک زبان ہو کر) خوب، بہت خوب!

عائشہ۔ کتنی مبارک عید ہے، میرا دل تو خوشی سے پھولا نہیں سماتا، شوکت صاحب میں آپ کو دُہری مبارکباد دیتی ہوں۔

طاہرہ۔ اور میں بھی مبارکباد دیتی ہوں۔

شوکت۔ وکیل صاحب! یہ وصیت نامہ شہناز کے قدموں میں ڈال دیجئے۔

عائشہ۔ (بہت زیادہ مسرت کے لہجہ میں) شہناز تمھیں بھی ہزار ہزار مبارک، خدا نے صداقت اور خلوص کا تمھیں کیا اچھا بدلہ دیا۔

شہناز۔ (دبی زبان سے) اب مبارکباد ہی دیتی رہو گی یا ان لوگوں کو چائے بھی پلاؤ گی۔

عائشہ۔ مجھے تو آج کی مبارک عید ساری عمر یاد رہے گی اور تم کیا اس مبارک عید کو بھول جاؤ گی شہناز؟

فریبِ ترکِ وفا

وہ آنکھ اُٹھا نہ سکے میں نظر ملا نہ سکا

از مولنا ابو داؤد لکھنوی

ترے تبسمِ رنگیں کا رنگ اُڑا نہ سکا، ادا سے غنچۂ نوخیز مسکرا نہ سکا
انھیں بھی پاسِ حیا تھا مجھے بھی پاسِ ادب وہ آنکھ اُٹھا نہ سکے میں نظر ملا نہ سکا
ترا خیال مرا ہمکنارِ شوق رہا مگر جمال کی رعنائیوں کو پا نہ سکا
کلیمِ طور کو نازِ کلام زیبا ہے میں دل کو عرضِ تمنا سے جگمگا نہ سکا
خجل ہے شوق، نظر شرمسار، دل مجبوب کہ عرضِ دید تو کی تابِ دید لا نہ سکا
دیئے زمانے نے دل کو فریبِ ترکِ وفا
میں خود فریبِ وفا تھا فریب کھا نہ سکا

عروجِ ماہ

از حضرت نشور واحدی گورکھپوری

عروجِ ماہ میں جب وقتِ شام ہوتا ہے خیال آپ کا محشر خرام ہوتا ہے
محبتوں میں یہ رنگِ کلام ہوتا ہے ہر اک نگاہ میں دل کا پیام ہوتا ہے
کسی کی یاد میں پھر دورِ جام ہوتا ہے خرابِ میکدہ پھر تازہ کام ہوتا ہے
شرابِ حسن سے مستی ٹپکنے لگتی ہے عجیب رنگ ترا صبح و شام ہوتا ہے
وفورِ شوق تو دامن پکڑ ہی لیتا ہے اگر خموش لبِ احترام ہوتا ہے
کسی کو آتشِ ہجراں سے پھونکنے والے بہار جاتی ہے ساون تمام ہوتا ہے
ہر ایک شعر پہ گویا پھڑک اُٹھی محفل
نشور آپ کا بھی کیا کلام ہوتا ہے

عورت کی تخلیق

دلچسپ ہندو روایت

از جناب سید علی ملتانی ۔ منشی فاضل

جب سرو شکتی مان (قادر مطلق) مہادیو خوبصورت بھارت ورش (ہندوستان) کو بنا چکا تو وہ ایک بار اس کے اوپر اڑا تاکہ بچشم خود یہ دیکھے کہ ہر چیز مناسب اور بجا ہے اور کہیں کوئی خامی تو نہیں رہ گئی۔ بھگوان مہادیو کی اس پرواز سے زندگی بخشنے والی خوشبو سے بسی ہوئی ہوا کا ایک جھونکا پیدا ہوا جس پر سر بفلک تاڑ کے درختوں نے بھگوان مہادیو کا سواگت (خوش آمدید) کرنے کے لئے اپنا سر ادب سے نیچے جھکا لیا۔

پھر بھگوان مہادیو نے جب زمین پر اپنی نظر عنایت ڈالی تو ایسا ہوا کہ ہر طرف کنول کے خوشبودار نرم و نازک اور سفید پھول کھل اٹھے۔ اس پر بھگوان نے ایک پھول دیکھنے کے لئے توڑا اور جب اچھی طرح سے دیکھ چکے تو اسے اتھاہ نیلگوں سمندر میں جو قریب ہی موجزن تھا ڈال دیا۔ پھول کو سمندر کے صاف و شفاف پانی میں رہتے ہوئے جب کچھ عرصہ گذر گیا تو ہوا کی لہروں سے پیدا ہونے والی جھاگ نے اسے ہر طرف سے ڈھانپ لیا۔

ڈھانپے جانے کے کچھ عرصہ بعد اس پھول سے ایک عورت نکلی جو کنول کی طرح خوبصورت، نرم و نازک، نسیم سحر کی طرح سبک رفتار سمندر کی طرح متلون مزاج اور جھاگ کی طرح چمکیلی تھی۔

عورت نے سب سے پہلے پانی کو دیکھا جو بلور کی طرح صاف و شفاف تھا اور چلا کر بولی۔ "اوہ! میں کس قدر خوبصورت ہوں"

پھر اس نے ارد گرد نظر ڈالی اور بولی۔ "واہ واہ یہ سنسار (دنیا) کتنا سندر (خوبصورت) ہے"

کنول کے پھول کی طرح سبکبار ہونے کی وجہ سے عورت سمندر کے کنارے ایسے حال میں پہنچی کہ پانی کی ایک بوند بھی اس کے بدن کو نہیں چھو پائی تھی۔

عورت کو دیکھ کر زمین پر جتنے بھی پھولوں کے پیڑ تھے پھولوں سے لد گئے اور آسمان سے ہزاروں واقفیت حاصل کرنے کی خواہاں نظریں اس (عورت) پر گڑ گئیں۔ (یہ ستارے اسی وقت سے چمکتے ہیں)

اور زہرہ نام کا ستارہ رشک کے مارے جل اٹھا۔ (یہی وجہ ہے کہ وہ سب سے زیادہ چمکتا ہے)

اب عورت جنگلوں اور چراگاہوں کی سیر کو نکلی جو ہر طرف پھیلے ہوئے تھے بن (جنگل) کی سب چیزیں بھی (شانتی) خاموشی کے ساتھ اس کی خوبصورتی کو دیکھتی اور دل ہی دل میں اس کی تعریف و توصیف کرتی تھیں۔ جب عورت کو سیر کرتے ہوئے کافی عرصہ گذر گیا تو وہ گھبرا گئی اور بھگوان کو پکار کر کہنے لگی۔

"اے سرو شکتی مان بھگوان مہادیو! میں آپ کی بیحد ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے لاثانی حسن عطا فرما کر سنسار بھر کا محبوب بنا دیا ہے دنیا کی سب چیزیں مجھے پیار کی نظر سے دیکھتی ہیں مگر صرف آنکھوں کے ذریعے سے پیار کا اظہار کرنے سے کیا ہوتا ہے اگر وہ اپنی زبان سے بھی میری تعریف و توصیف اور اپنی محبت کا اظہار کرتے تو کتنا اچھا ہوتا"

بھگوان مہادیو نے یہ شکایت سن کر بے شمار پرندے پیدا کر دیئے جو رات دن عورت کی تعریف میں پیارے پیارے پریم بھرے گیت گاتے تھے۔ عورت نے جب اپنی خوبصورتی کی تعریف کے گیت سنے تو وہ مسکرائی اور کئی دن تک ان گیتوں کو سنتی اور لطف اندوز ہوتی رہی لیکن کچھ عرصہ بعد گیتوں سے بھی اس کا دل بھر گیا۔ اور وہ پھر مہادیو کو پکار کر بولی —— "اے سرو شکتی مان مہادیو! یہ پرندے تو صرف میری خوبصورتی کے گیت گانا اور مجھ سے محبت جتانا ہی جانتے ہیں۔ وہ خوبصورتی کس کام کی جسے نہ تو کوئی اِدھر اُدھر گھومنے کے لئے باہر لے جائے نہ ہی کوئی اسے پیار کرے اور نہ ہی اسے اپنے سینے سے لگائے"

یہ شکایت سن کر مہادیو نے ایک خوبصورت بل کھانے والا سانپ پیدا کیا جو عورت کے آگے رینگتا ہوا جاتا اور اسے ادھر ادھر کی سیر کرا لاتا اور جب کبھی وہ کوئی ناز و ادا کی بات کرتی تو وہ اس سے پیار کرتا اور سینے سے سینہ ملا کر اسے خوب بھینچتا تھا۔ چند روز تک تو عورت مطمئن رہی لیکن پھر گھبراہٹ نے زور پکڑا اور وہ دل ہی دل میں کہنے لگی۔ "سانپ میں اس قدر خوبصورت نہیں جس قدر کہ جنگل کے پرندے اپنے گیتوں

میں بتاتے ہیں۔ اگر میں واقعی خوبصورت ہوتی تو یقیناً دوسری چیزیں میری نقل اتارتیں۔ بلبل کو دیکھو، کتنا اچھا گاتی ہے جبھی تو جنگل کے بہت سے پرندے اس کے گانوں کی نقل کرتے ہیں"۔

مہادیو نے جب یہ زیر لب شکایت سنی تو عورت کا دل رکھنے کے لئے ایک بندر پیدا کر دیا جو عورت کی سب حرکات و سکنات کی نقل اتارتا تھا۔ بندر کو دیکھ کر عورت کچھ عرصہ تک تو بہت خوش و خرم رہی، لیکن گھبراہٹ نے اسے پھر آ لیا اور وہ بھگوان سے رو رو کر اس طرح درخواست گذار ہوئی کہ "اے سرو شکتی مان مہادیو! آپ کی کرپا سے میں اس قدر خوبصورت واقع ہوئی ہوں کہ میرے حسن کی تعریف میں گیت گائے جاتے ہیں اور جب سیر کو نکلتی ہوں تو خدمتگار آگے آگے چلتے ہیں۔ مجھ سے پیار کیا جاتا ہے۔ میری نقل اتاری جاتی ہے۔ یہ سب کچھ ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ سنسار (دنیا) کی بہت سی چیزیں مجھ سے رشک کرتی ہیں۔ اگر خدانخواستہ ان چیزوں میں سے کسی نے حسد کے مارے مجھے نقصان پہنچانا چاہا تو میری رکھشا (محافظت) کون کرے گا؟"

دوسرے دن مہادیو بھگوان نے ایک طاقتور اور مضبوط شیر پیدا کر دیا جو رات دن عورت کے ارد گرد پہرا دیتا اور غیر ضروری چیزوں کو اس کے پاس آنے سے روکتا تھا۔ یہ دیکھ کر عورت کچھ دن تک تو چپ رہی لیکن پھر ایک دن یکایک گھبراہٹ کا بھوت اس کے سر پر سوار ہو گیا، اور وہ چیخ کر بولی۔ "اے بھگوان مہادیو! میں اس قدر خوبصورت ہوں کہ سب مجھ سے پیار کرتے ہیں لیکن میں تو کسی سے پیار نہیں کرتی۔ اس خوفناک شیر سے تو مجھے ڈر سا معلوم ہوتا ہے۔ بندر اور سانپ تو محبت کے لائق ہی نہیں۔ میں اگر محبت کروں تو کس سے کروں؟" ابھی اس نے یہ بات ختم بھی نہ کی تھی کہ ایک چھوٹا سا کتا دم ہلاتا ہوا اس کے سامنے آ نمودار ہوا۔ کتے کو دیکھ کر عورت بڑے زور سے بولی۔ "اہا ہا! کتنا پیارا جانور ہے!" اور جھٹ اس سے پیار کرنے لگی۔

اب تو عورت کے پاس محبت کرنے والے۔ محبت کئے جانے والے نوکر چاکر اور نقال وغیرہ سب کے سب موجود تھے۔ وہ مہادیو سے شکایت جس کی وہ عادی ہو گئی تھی کرتی تو کیسے اور کس بات کے لئے؟ اس نے لاکھ لاکھ دماغ لڑایا مگر کوئی بھی قابل شکایت بات اس کے دماغ میں نہ آئی۔ جب ہر طرح سے مایوس ہو گئی تو اسے اپنے اوپر بڑا غصہ آیا اور غصہ اتارنے کے لئے اس نے سب سے پہلے تو کتے کو تاکا جو پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔ چنانچہ اس نے لاٹھی اٹھائی اور لگی اس بیچارے کو مارنے، کتا ٹائیں ٹائیں کرتا۔ چیختا چلاتا دور جنگل میں بھاگ گیا۔ پھر اس نے اسی لاٹھی سے شیر کی خبر لی جو گرجتا اور گونجتا ہوا پہاڑوں کی طرف چلا گیا۔ پھر اس نے سانپ کی دم کو پاؤں سے کچل دیا جو پھنکارتا ہوا کہیں جھاڑیوں میں جا چھپا۔ غرضیکہ اس نے اسی طرح سب پرندوں اور جانوروں کو اپنے غصہ سے بھگا دیا اور پہلے کی طرح تنہا رہ گئی۔

اب عورت نے اپنے سر کے بال نوچ کر بڑی گڑگڑاہٹ کے ساتھ مہادیو سے بنتی (گذارش) کی کہ اے بھگوان مجھ بدنصیب کی خبر لے۔ میں بڑی مصیبتوں میں آگھری ہوں یہ سب چیزیں جو آپ نے میرے لئے بنائی ہیں میں ان کا رفاقت صرف اس شرط پر قبول کرتی ہوں کہ میں ان کے ساتھ ہر وقت اور ہر موقع پر نیک برتاؤ کے ساتھ پیش آؤں۔ میرا مزاج ٹھیک ہو یا نہ ان کو اس سے کوئی سروکار نہیں اب میں آپ سے آخری مرتبہ پرارتھنا (مناجات) کرتی ہوں کہ آپ میرے لئے ایسا پرانی (جاندار) پیدا کریں جو میرا غصہ بھی سہ سکے اور اگر اسے کبھی مار بیٹھوں تو مار بھی برداشت کرے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے دل میں میرے پاس سے بھاگ جانے کا خیال بھی نہ آئے!

بھگوان مہادیو نے سمادھی (مراقبہ) لگائی اور کافی سوچ بچار کے بعد اس کے لئے شوہر یعنی مرد کو پیدا فرما دیا۔ (ترجمہ از اسپانش)

باغی کون تھا؟

نوشتہ تھامس برک

از جناب سید منظر کاظمی بی۔ اے آنرز

سمندر کے مغربی گوشہ سے چمکیلے آفتاب نے سر نکالا اور لال لال آنکھوں سے دنیا کا جائزہ لینے لگا تا حدِ نظر پھیلی ہوئی نیلی سطح پر ایک چھوٹی سی کشتی آہستہ آہستہ یوں بہہ رہی تھی گویا آسمانی رنگ کی چادر پر کوئی چھوٹا سا لمبی ٹانگوں والا کیڑا چل رہا ہو۔

آفتاب ذرا اونچا ہوا اور اس کی کرنیں کشتی کے تختوں پر بکھرنے لگیں کشتی نہایت ہی دھیمی رفتار سے چل رہی تھی۔ اور تھی بھی نہایت ہی معمولی کشتی۔ اس قسم کی جو مسافروں کو جہاز سے بندرگاہ تک لیجانے کے کام میں لائی جاتی ہے۔ اس کشتی کے ایک سرے پر "لاگرد" لکھا ہوا تھا میلہ زمین پر ابھرے ہوئے سفید حروف آفتاب کی روشنی میں چمکتے نظر آرہے تھے کشتی کے وسط میں بادبان کے لئے ایک چھوٹا سا مستول تھا جس میں ایک بوسیدہ بادبان بندھا ہوا تھا۔ جو ہوا کے تھپیڑوں کی وجہ سے ایک جانب جھول رہا تھا۔ اور کشتی کو اس سے کچھ بھی مدد نہ مل رہی تھی۔

دونوں ملاح ہر دیکھنے والے کو پہلی ہی نظر میں غیر معمولی اور ایک دوسرے سے بالکل مختلف نظر آتے تھے۔ وہ جو کشتی کے اگلے حصّہ پر بیٹھا ہوا تھا ٹھنا اسپات کے لوہے کی طرح کالا اور پتلا تھا۔ اس میں حبشی خون ملا ہوا تھا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ اس کی کالی آنکھیں دھنسی ہوئی پیشانی میں پاس پاس جڑی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں جیسے اوپر کھلی ہوئی دیوار کی طرح پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کی ناک ان سے تھوڑی کچھ اس قطع کی تھی کہ دیکھنے میں معلوم ہوتا کہ کسی نے بچہ کو ڈرانے کے لئے بندر نما سا منہ بنا لیا ہے

دوسرا ملاح چوڑا چکلا اور مناسب جسم کا مالک تھا اس کی آنکھوں کو گوشی پلکیں ڈھانپے ہوئے تھیں۔ اور اس طرح پھیلی ہوئی تھیں۔ جیسے گھنے جنگل کے درمیان کوئی جھیل ہو اس کی آنکھوں کی چمک میں عقلمندی اور حماقت دونوں کا اظہار ایک ساتھ ہو رہا تھا۔ یہ ان لوگوں میں سے تھا جو بیل کی طرح خاموشی سے محنت کرنے کے ساتھ ساتھ حیوانوں کی طرح خونخوار بھی بن سکتے تھے۔

اس ناطے ملاح نے پتوار اٹھائی اور کھڑے ہو کر کندھے سیدھے کئے۔ پھر کشتی میں پڑے ہوئے نیلے رنگ کے بنڈل میں ایک ٹھوکر لگائی فوراً ہی اس بنڈل نما شے میں خفیف سی حرکت ہوئی۔ اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ اس کشتی کا تیسرا مسافر تھا۔ ایک کمسن لڑکا۔ اپنے نیلے کپڑوں میں بالکل ہی سمٹا ہوا۔ ان دونوں کا ملازم یا شاید غلام ۔۔۔ اس کی عمر بیس سے چالیس سال تک کچھ بھی ہو سکتی تھی۔ اس قسم کے چینی لڑکے عموماً جہازوں پر کھانا وغیرہ پکانے کے لئے رہا کرتے ہیں۔

"اٹھ بے وانگ! پیلے کیڑے چل کافی لا!"

اس سیاہ فام حبشی کے منہ سے نکلی ہوئی لندن کے ادنیٰ طبقہ کی انگریزی بالکل ہی عجیب سی معلوم ہو رہی تھی۔ اور واقعی جارج معکس کیونکہ یہی اس حبشی کا نام تھا لندن ہی کے ایک غریب محلہ میں پیدا ہوا تھا۔ اور دریائے ٹیمس کے کنارے بسی ہوئی مفلوک الحال بستیوں میں اس نے پرورش پائی تھی یہ کمبخت بد معاش اور بیحد چالاک۔ اس کا باپ افریقہ سے آیا ہوا ایک حبشی ملاح تھا اور ماں اسی بستی کی کوئی ذلیل فاحشہ۔۔۔۔ اس کی خاندانی تاریخ بہت ہی گھناونی تھی۔

چار پانچ انسانی خونوں میں اس کا زبردست ہاتھ تھا۔ واقعات کے تفصیل کی کوچنداں ضرورت نہیں۔ لیکن اس قدر بتا دینا ضروری ہے۔ کہ "لاگرد" جہاز پر ایک غدر سا مچ گیا تھا۔ جہاز کا ایک ایک افسر بیدردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ کپتان بیچارہ جھکا ہوا انقلاب نما دیکھ رہا تھا کہ سر پر لوہے کا بھاری ڈنڈا پڑا اور سر پاش پاش ہو گیا۔ مستقل چوبیس گھنٹہ تک قتل و خون کا ہنگامہ گرم تھا اور جارج ہی اس باغی جماعت کا سرغنہ تھا۔ کچھ ہی دیر بعد خود باغی ملاحوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ اور انہوں نے نہایت ہی سرگرمی سے ایک دوسرے کی گردن پر چاقو تیز کئے۔ اب صرف یہی دو ملاح بچ رہے تھے۔ جو اس وقت اس چھوٹی سی کشتی میں سفر کر رہے تھے۔

دوسرا ملاح جسے لوگ ڈچ سیم کہتے تھے۔ جہاز کے رجسٹر میں سیموئل۔ کا ترک کے نام سے بھرتی ہوا تھا۔ وہ دیکھنے میں تو نہایت ہی سیدھا سادہ اکوڑے برداشت کرنے والا ملاح تھا۔ لیکن موقع آنے پر نہایت

ہی تیز چالاک اور جارج کا بہترین مددگار ثابت ہوا۔ حد تو یہ ہے کہ اُس کی درندگی کو دیکھ کر خود بخود خونخوار وحشی جارج بھی دنگ رہ گیا اُس نے تو......!۔

جانے دیجئے کبھی کا عیب ظاہر کرنے سے کیا حاصل۔ اس راز کو اب سمندر کی آغوش ہی میں دفن ہو جانے دیجئے۔ لیکن مر جانے کیوں ان باغی ملاحوں نے اس چینی چھوکرے کی جان بخشی کر دی تھی میرا گمان ہے کہ باوجود اس حیوانیت اور درندگی کے اُن میں کچھ انسانیت باقی رہ گئی تھی۔ جب بغاوت اور قتل و خون کا بازار کچھ ٹھنڈا پڑا تو اُن دونوں نے جہاز کی تلاشی لینا شروع کی۔ اور یہ چینی لڑکا اُنہیں کیبن کے ایک کونے میں کانپتا ہوا ملا۔ وانگ سے ان باغیوں کو کسی قسم کے خطرہ کا خوف نہ تھا۔ بلکہ اُسکی ذات سے کچھ فائدہ اور آرام ہی کی امید تھی۔ ورنہ اُسے تو کب کا ذبح کر چکے ہوتے۔ اور سچ پوچھئے تو اُسے زندہ چھوڑنے کی سب سے بڑی وجہ انسان کی شان و شوکت کی رغبت اور کمزوری تھی۔ یہی کمزوری ہزاروں کی تباہی و بربادی کا سبب اور اکثر غلطیوں اور گناہوں کا پیش خیمہ ثابت ہو چکی ہے۔ یہ باغی آج سے چند روز قبل کسی کے ملازم اور غلام تھے۔ جہاز کے ادنیٰ ملاح ۔۔۔ اور آج وہی اُس جہاز کے مالک تھے۔ تو بھلا ممکن تھا کہ مالک ہوتے ہوئے وہ بغیر کسی ملازم یا غلام کے رہتے اور جب پہلے ہی مالک کا نوکر ہاتھ آ جائے تو پھر اُس شان کا کیا پوچھنا ۔۔۔!! اسی خیال کے زیر اثر اُن دونوں نے وانگ کو زندہ چھوڑ دیا۔ بیچارے کو بالوں سے پکڑ کر کیبن کے باہر گھسیٹ لائے۔ اور حکم ملا کہ لاشوں کے ڈھیر کو فوراً سمندر میں پھینک دے۔ آن کی آن میں بیچارے بغیر کسی مذہبی رسوم کے آبی قبروں میں سما گئے۔ پھر حکم ہوا کہ تمام کیبن کی صفائی جلد از جلد کر کے اُن کے لئے کھانا تیار کر دے۔

اب یہی وانگ اُن کے لئے کھانا پکاتا۔ اُن کے بوٹ صاف کرتا۔ اُن کے کپڑے دھوتا اور اس کے عوض اُس کی تواضع لاتوں اور جوتوں سے کی جاتی۔ یا کبھی کبھی سگریٹ کا جلتا ہوا ٹکڑا جسم پر چپکا دیا جاتا ۔۔۔!

دو ایک روز بعد جب باغیوں نے محسوس کیا کہ اب جہاز کئی جگہ سے ٹوٹ جانے کی وجہ سے ناکارہ ہو گیا ہے۔ تو وہ دونوں اس کشتی میں اُتر آئے۔ اور اُن کے ساتھ ہی وانگ اور کوئلے کی انگیٹھی بھی اُتار لی گئی۔

آفتاب آسمان پر اونچا ہو آیا۔ فضا میں کافی کی تیز اور سوندھی بو پھیل گئی۔ کشتی آہستہ آہستہ بہتی جا رہی تھی۔ اور جارج ہیگن بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتا جاتا تھا۔ دفعتاً وہ اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اور اپنی موٹی موٹی بھٹی ہوئی انگلیوں سے داہنی جانب اشارہ کرنے لگا۔ اُس کا ہمراہی بھی اُچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اور اُس کے اشارے کی جانب دیکھنے لگا۔ وانگ بدستور کافی تیار کرنے میں مشغول رہا۔

اُن لوگوں کے لئے جو جہاز کے کسی حادثہ کا شکار ہو جانے کے بعد کسی چھوٹی سی کشتی میں خشکی کی اُمید میں سفر کرتے ہیں۔ اُن کے لئے دور اُفق پر کسی گہری سیاہ لکیر کا نظر آ جانا جنت مل جانے کے برابر ہوتا ہے۔ اور وہ اپنے طریقے اور عقیدے کے مطابق، مزاج اور طبیعت کے موافق، موقع اور محل کے لحاظ سے دوبارہ زندگی بخشنے والے خشکی کے ٹکڑے کا جو آہستہ آہستہ اُن کی جانب بڑھتا ہوا آتا ہے۔ خیر مقدم کرتے ہیں ۔۔۔ وہ روتے بھی ہیں۔ چلاتے اور ہنستے بھی ہیں کبھی ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں۔ اور کبھی گالیاں بکتے ہیں۔

ان دو گنہگاروں کے دل میں اس وقت دو مختلف جذبے اُبلنے لگے۔ ابھی تک وہ دونوں خود غرضی کی وجہ سے ایک دوسرے کے دُکھ سُکھ کے شریک اور مددگار رہتے۔ کیونکہ ان کو یہ احساس تھا کہ سمندر میں ڈوب کر مر جانے سے محفوظ رہنے کے لئے انہیں ایک دوسرے کا سہارا ضروری اور لازمی ہے۔ اس لئے وہ تمام باہمی اختلافات کو بھول کر ایک دوسرے کا ساتھ دے رہے تھے۔ لیکن اب ....

اب بات بدلی ہوئی تھی۔

اُنہوں نے جلد از جلد اُس چینی چھوکرے کی تیار کی ہوئی کافی چڑھائی اور دو چار بسکٹ چٹ کر ڈالے۔ پھر دونوں نے تازہ جوش و خروش کے ساتھ پتوار چلانا شروع کر دیا۔ درمیان میں پیچھے مڑ مڑ کر دور زمین کے دھندلے نقش بھی دیکھتے جاتے تھے۔ وہاں سے پلٹ کر اُن کی نظریں کشتی میں رکھی ہوئی ایک چیز پر جم جاتیں۔ اور یہ چیز کشتی میں نہایت ہی حفاظت سے رکھا ہوا لوہے کا ایک صندوق تھا۔ جس کے اندر تقریباً پانچ سو روپے تھے۔ اور اسی کے لئے انہوں نے گیارہ خون بہائے تھے۔ اور اسی کیلئے وہ دونوں خون کے دھبے دامن سے باندھے رہے تھے ۔۔۔ بات یہ ہے کہ صلاگرد کوئی بدنام جہاز تھا۔ بغاوت صرف چاندی کے ٹکڑوں کے لئے ہی ہوئی تھی۔

یہ تو ان دونوں نے آپس میں پیشتر ہی طے کر لیا تھا کہ جب اُس کی ضرورت باقی نہ رہ جائے گی۔ تو اس چینی چھوکرے کا بھی خاتمہ کر دیا جائیگا ۔۔۔ بغاوت کے مال کو تین حصوں میں تقسیم کرنے

کی کیا ضرورت تھی محض حماقت۔ اور یہ تو یقینی تھا کہ حصہ بٹتے ہی وہ خود مجھ پر چھپٹے گا۔ اور اس طرح مشکل آن پڑے گی۔ اور بہت ممکن ہے کہ ساری محنت اکارت جائے۔

لیکن اس وقت اُن دونوں کے دماغ میں اسکے علاوہ ایک اور نیا خیال بھی چکر لگا رہا تھا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ یہ محسوس کر رہے تھے کہ اگر اب اس چینی لڑکے کی کوئی ضرورت نہیں تو دوسرا ساتھی بھی اس مالِ غنیمت پر کوئی حق نہیں رکھتا اور اس کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے تو خواہ مخواہ کے مال کو دو حصوں میں بھی کیوں تقسیم کیا جائے ——

اور اب وہ دونوں اپنے اپنے دل میں تدبیریں سوچ رہے تھے کہ کس طرح اپنے ساتھی کا خون کر کے مالِ غنیمت کا تنہا مالک بن جائے۔

"یہ تو نہایت ہی آسان ہے۔ بالکل!" جارج نے اپنے تئیں کہا۔ اور پہلو سے لٹکتے ہوئے چھرے سے اس کی موٹی موٹی انگلیاں کھیلنے لگیں۔ اپنے ساتھی کے چوڑے چکلے سینے میں وہ اپنا چاقو دستے تک پیوست دیکھنے لگا۔

ڈچ سیم نے سوچا "اوہ۔ کتنا آسان ہے۔!" اور اس نے دیکھا کہ اس کی مضبوط انگلیاں جارج کی گردن کے گرد جکڑی ہوئی ہیں —— اس تصور کے ساتھ ہی ساتھ اس کی بھدے ہونٹوں پر شریر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

کشتی آہستہ آہستہ بہتی جا رہی تھی۔ جب ایک تھک جاتا تو وہ کشتی میں کچھ دیر آرام کر لیتا اور اسکی جگہ وانگ کو بٹھا دیا جاتا آفتاب سر پر پہنچا۔ اور پھر نیچے سرکنے لگا۔ دور افق کا وہ سیاہ دھبہ اب بڑا صاف نظر آنے لگا۔ پہاڑوں کا ناہموار سلسلہ بھی نمایاں ہوتا جا رہا تھا۔

"وانگ۔ اُٹھ کافی بنا!" اب کی ڈچ سیم کے ٹھوکر لگانے کی باری تھی۔

چینی لڑکا خاموشی سے اُٹھا اور اپنے کام میں مشغول ہو گیا اُسکے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ اُس نے جھک کر جیب سے ایک چھوٹی سی پڑیا نکالی اور کافی تیار کرنے لگا۔ بدمعاشوں نے ایک دوسرے کی جانب معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔ اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ دیا کہ اب یہ آخری مرتبہ کافی بنا رہا ہے!۔

وانگ نے کافی تیار کی اور ٹین کے بڑے پیالہ میں اُلٹ دی —— بہت ہی لذیذ کافی بنی تھی۔ تمام دنوں سے زیادہ لذیذ اور خوش ذائقہ دار! منہ سے لگا کر وہ کئی پیالے چڑھا گئے۔

کشتی لہروں پر ہچکولے کھاتی چلی جا رہی تھی۔ ہچکولوں اور ٹھنڈی ہوا نے جلد ہی اُن دونوں کو نیند کی آغوش میں پہنچا دیا۔ کچھ ہی دیر بعد دونوں ایک ایک سمت لڑھک گئے گویا اُن میں جان ہی نہیں رہی۔

دفعتاً چینی لڑکا اپنی جگہ سے اُٹھا۔ پہلے ایک کے قریب گیا پھر دوسرے کے۔ اُس نے اُن کی پلکیں اُٹھائیں۔ اور آنکھوں میں جھانکا۔ دونوں قطعی بیہوش تھے۔ یہ اطمینان ہو جانے کے بعد وہ مسکرایا —— شاید بغاوت کے بعد پہلی بار پھر اس نے بازو سے پکڑ کر جارج کو کشتی کے کنارے گھسیٹنا شروع کیا۔ اُسے اُٹھانے میں کافی محنت کی لیکن جارج نے ذرا بھی حرکت نہ کی۔ صرف اسکی سانس چل رہی تھی۔ ایک دھماکے کے ساتھ جارج کا جسم پانی پر اور پھر پانی کے اندر تھا شارک مچھلی کے آنے کے ساتھ ہی خون کی ایک لمبی لکیر سطح آب پر نمودار ہوئی اور پانی پھر خاموش ہو گیا۔

اب چت پڑے ہوئے ڈچ سیم کی باری تھی۔ وہ کافی طاقتور اور وزنی تھا۔ اور اُسے کشتی کے کنارے تک لانے میں وانگ کو بہت دقت ہوئی۔ کچھ دیر بعد پھر "دھماکہ" ہوا۔ شارک مچھلی کے آنے کی شپر شپر ہوئی۔ دوسری خون کی لکیر سطح پر ظاہر ہوئی۔ اور پانی پھر پہلے کی طرح خاموش اور ساکت ہو گیا۔

وانگ نے لوہے کے صندوق کو اُٹھایا۔ قفل پڑا ہوا تھا۔ لیکن کنجی ایک زنجیر کے ساتھ کڑے میں لٹک رہی تھی۔ دونوں بدمعاشوں کو ایک دوسرے پر اعتبار نہ تھا۔ اس لئے انہوں نے کنجی صندوق ہی سے لٹکا رکھی تھی۔ اُس نے صندوق کھولا۔ احتیاط اور قرینے سے رکھے ہوئے روپیوں کو حفاظت سے جیب میں رکھا۔ اور صندوق اُٹھا کر پانی میں پھینک دیا۔ وہ اُچھل کر اپنے پُرانے مالکوں کے پیچھے ڈوبا۔ شارک مچھلی پھر اُچھلی لیکن اس بار پہلے دو جیسا لذیذ اور پسندیدہ تحفہ نہ پا کر مایوس واپس چلی گئی۔

شام کی ہوا اور سمندر کے مد و جزر نے خود بخود کشتی کو ساحل پہ لگا دیا۔ نیلی کرتے پہنے وانگ کنارے پر اُتر پڑا۔ اور شمالی جانب تیزی سے چلنے لگا کیونکہ اُسے گمان تھا۔ کہ اُس جانب نزدیک ہی کوئی بڑی بندرگاہ ہے۔

"لانگرو" جہاز کی پتلی کشتی ایک ویران ساحل سے لگی ہوئی تھی ایک ننھی چڑیا اس کے ارد گرد منڈلا رہی تھی۔ کہ شاید کچھ ہاتھ آ جائے۔ اور۔ دور —— مالِ غنیمت جیب میں سنبھالے نیلی کرتی والا چینی چھوکرا تیز قدموں سے چلا جا رہا تھا۔

بنارسی خانم فرخ آبادی

ایک غیر معروف اور اُمّی شاعرہ

از جناب جاوید قیصری ایم۔ اے

وہ دیکھیے بی بنارسی خانم لٹھیا ٹیکتی، سر سفید، کمر جھکائے چلی آ رہی ہیں، گول چکلا، چوڑا چہرہ، مضبوط ہاڑ گورا سرخی مائل رنگ، گڑھے میں دھنسی ہوئی بڑی بڑی بارعب آنکھیں۔ دُبلا مگر درمیانہ قد۔ سفید کلی دار پائجامہ پہنے۔ سفید شلوکہ اور سفید باریک ململ کا دوپٹہ، سر سفید ہونے کی وجہ سے کاتے کی بڑھیا معلوم ہوتی ہیں، نواب علی مردان خاں کو گودیوں میں کھلایا ہے۔ بڑے محل کی مغلانی ہیں بڑے گھرانے کی عورت ہیں۔ مگر کیا کریں وقت بُرا ہے۔ شوہر کا انتقال ہو گیا نواب فرخ جہاں بیگم کے قدموں سے لگی پڑی ہیں توڑے دار دو دو بندوقیں اب بھی ان کے پاس ہیں ۱۸۱۲ء کے لگ بھگ قائم گنج میں پیدا ہوئی تھیں مگر ذرا سی تھیں جب سے شاہی محلات میں آمد و رفت شروع کر دی تھی۔ ان کے والد خدا داد خاں گولہ انداز تھے ان کے بھی بڑے کارخانے رہ چکے ہیں۔

بڑی بوڑھی ہیں شاہی محلات کے بچوں کا کھلونا ہیں جسے دیکھو بی مغلانی کو گھیرے ہیں۔ کہانی کہو، کہانی کہو کی رٹ لگی ہے ان کے آگے اچھے اچھے داستان گو مات ہیں لفظوں کا ایسا طلسم بناتی ہیں کہ عقل چکرا جائے پھر کمال یہ ہے کہ بوڑھے اور بچے برابر کا مزا لے کر ان کے قصے سنتے ہیں۔ رٹے رٹائے قصے کہتی ہیں روز ایک نئی کہانی لے لیجیے۔ ان کے قصے تو بڑے محل میں بھی سنے جاتے ہیں اور اسی صلہ میں نواب فرخ جہاں نے ان کے پانچ روپے بلا قید حاضری ماہوار باندھ دیے ہیں ان کا اکیلا دم ہے۔ کون ننھا چھوٹا بیٹھا ہے کہ جس کا خرچ ہو ان کی دو روٹیاں کس کو بھاری ہیں سب ہی آس لگائے رہتے ہیں کہ بی مغلانی چار دن ہمارے یہاں رہ جائیں مگر ان کا تلوہ کہیں نہیں ٹکتا۔ اِس محل سے اُس محل میں اور اُس محل سے اِس محل میں بس یہی کیا کرتی ہیں ایک جگہ نہیں بیٹھتیں اور بڑا مزا یہ ہے کہ پڑھی لکھی کچھ نہیں مگر پہیلیاں دوہے اور گیت اور غزلیں ایسی ایسی کہتی ہیں کہ اچھے اچھے پڑھے لکھے ان کے سامنے مات ہیں۔ طبیعت کچھ ایسی موزوں واقع ہوئی ہے کہ ادھر آپ کے منہ سے مصرع نکلا اور ادھر گرہ لگی تیار ہے۔ کبھی کسی استاد سے اصلاح بھی نہیں لی۔ خود ہی کہتی ہیں اور خود ہی گاتی ہیں۔ آواز ایسی پُر درد ہے کہ اللہ اللہ۔ لوگ کہتے ہیں کہ جب یہ مہندی باغ میں گاتی تھیں تو پرانی گڈھی کے پھاٹک سے صاف آواز سنائی دیتی تھی، ہائے وہ برسات کی راتیں۔ گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی، خانہ باغ میں بیگمات کے جھولے پڑے ہوئے اور اس پر بنارسی خانم کے پُر درد تانیں۔ "دلم در عاشقی آوارہ تر آوارہ تر بادا"۔ کیا کہنا۔ معلوم ہوتا تھا کوئل کوک رہی ہے یا مور جھنکار رہا ہے مگر اب تو نہ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت، زندگی کے دن کاٹ رہی ہیں آج مریں کل دوسرا دن سب افسانے خواب و خیال ہو جائیں گے رہے نام اللہ کا!

ان کے خیال میں ایران اور ہندوستان میں بس ایک شاعر ہوا اور وہ خسرو تھے تمام دیوان ان کا دیوان انھیں حفظ ہے ہر جمعرات کو حضرت نظام الدین اولیا کے اور حضرت امیر خسرو کے نیاز اب تک یاد کر کے دلاتی ہیں۔ سال میں ایک بار دلی ضرور جاتی ہیں وہاں بھی قلعہ میں ان کی رسائی ہے نواب زینت محل کے بہت منہ چڑھی ہوئی ہیں حضرت ظل سبحانی بھی ان کو بی مغلانی کہتے ہیں بڑی وقت شناس اور بذلہ سنج ہیں۔

ایک مرتبہ بڑا مزہ ہوا یہ دلی سے آ رہی تھیں گرمیوں کے دن تھے پیاس کے مارے بُرا حال تھا۔ ہندوؤں کے ہاتھ کی چیزوں سے سخت پرہیز تھا شامت اعمال نہ معلوم کس کنوئیں کا پانی پی گئیں پیٹ پھول کے کُپّا ہو گیا جان پر بن گئی وہ تو خیر گذری کہ مریں نہیں لوٹ پوٹ کے بھلی چنگی ہو گئیں ورنہ بیگمات کا کھلونا ہاتھ سے گیا تھا

غدر میں جب بھگدڑ مچی اور فرخ آباد کے نواب نے بغاوت کی تو یہ بھی سر پر پیر رکھ کر بھاگیں اور جدھر سینگ سمایا نکل چلیں، ان کے ساتھ چھوٹی بہو منڈے والی اور لچھمن دائی بھی تھی خدا جانے کدھر کا ارادہ تھا مگر پہنچ گئی میرے دادا میر دلاور علی ڈپٹی کلکٹر

کے کیمپ میں۔ وہاں وہ تلنگے پکڑ کر دادا کے پاس لائے وہ پہچانتے تھے کہ یہ نواب علی مردان خان صاحب (میرے نانا) کی کلائی میں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ پھر کیا تھا تلنگوں پر برس پڑیں اور خدا اور رسول سے لیکر شیخ سدو تک کی مار اُن مصیبت کے ماروں پر ڈالی۔ دادا کھڑے ہنستے رہے تلنگوں سے کہا میاں کیمپ میں جاؤ یہ ابھی ہم کو بھی کچھ سنا چلیں گی۔ مارنے کا ہاتھ تو سب روک لیتے ہیں ان کی کترنی سی زبان کون روکے گا۔ وہ بیچارے بھی دم دبا کر نو دو گیارہ ہوئے کہیں الٹی آنتیں گلے نہ پڑیں نہ جانے یہ بڑی بی ڈپٹی صاحب کی کون نکلیں اس دن سے تمام غدر بھر بڑے مزے سے رہیں مگر فرخ آباد کے اجڑنے پر زار و قطار روتی تھیں اور ایسا پیٹتی تھیں کہ الٰہی توبہ۔ ادھر دادا کا بُرا حال تھا کہ کہیں افسران بالا کو نہ معلوم ہو جائے کہ یہ فرخ آباد کے شاہی خاندان سے بھی متعلق ہیں تو نوکری تو نوکری ہے جان کے لینے کے دینے پڑ جائیں۔ وہ تو بارے خدا خدا کرکے غدر ختم ہوا جان میں جان آئی جیسے تیسے ان کو فرخ آباد بھیجا اس دن سے آخر عمر تک برابر رویا کیں ان کے سامنے ہی تمام فرخ آباد تہ و بالا ہو گیا۔

انگریزوں کو ہمیشہ "پیڑو والا" کہا کرتی تھیں "صورت حرام" خطاب دیا تھا۔ ایک مرتبہ کا لطیفہ سنئے کہ ایک پادری صاحب جن کی شامت نے گھیرا تو پرانی گڈھی میں عیسائیت کی تبلیغ کے لئے بوریا بستر سمیت نازل ہوئے تھے تو انگریز مگر وضع قطع ہندوستانی مسلمان علماء کی سی تھی۔ اُردو بھی بڑی اچھی بولتے تھے۔ یہ اتفاق سے کہیں جا رہی تھیں پردہ تو خیر کسی سے کرتی ہی نہ تھیں انھوں نے جو مولوی صاحب کو دیکھا، مسلمان ملا سمجھ کے بلا لائیں ادھر پادری صاحب سمجھے کہ یہ عیسائی ہونا چاہتی ہیں لگے کچھ دینے۔ پہلے تو سٹ پٹائیں اس کے بعد کچھ سمجھیں گھر میں گئیں۔ خوب تنبا کو ڈال کے پان چبایا اور ہاتھ میں جھاڑو لیکر باہر آئیں اُدھر پادری صاحب چشم براہ تھے آنے کے ساتھ ہی "عاق تھو" تمام مُنہ کا اگالدان پادری صاحب کے چہرے پر انڈیل دیا۔ ایک تو پہلے ہی سے چقندر بنے تھے اس پر اور لالوں لال ہو گئے تمام سفید جبہ اور غفہ ستیا ناس ہو گیا اس کے بعد جھاڑو سے وہ مرمت کی کہ یہ بیچارے تمام گڈھی میں لاٹ صاحب اور کمپنی بہادر کی دہائی دیتے پھرتے تھے اور بندی خانم ان کو دوڑاتی پھرتی تھیں بڑی مشکل سے ان کی جان بچی بیچارے تھے غیرت دار اس دن سے ایسے گئے کہ لوٹ کے کبھی مُنہ سے

ہم آج ہو کہاں ہی یہ کیا۔ بیساکھی کیسے بنتے اور خیا بھی کون سلا کہ کیسے پہنے ہوں گے مگر سب تو نہیں بیچتے تھے چلیے قصہ ختم ہوا، اس وقت سے لوگ انہیں غازی صاحب بھی کہنے لگے تھے۔ جب کوئی یہ واقعہ یاد دلا دیتا تھا تو بہت خوش ہوتی تھیں۔

خوش خوراک ایسی تھیں کہ ان کا کھانا ضرب المثل بن گیا تھا، بھرا ہوا تھالی آم رکھ دیجئے ذرا دیر میں سب صاف، ایک بکرا حلال ہو دوسرے دن ندارد۔ لوگ مذاق کرتے تھے کہ بی مغلانی تھا! پیٹ کہ "بہان کوٹ" جو کچھ ہے عمرو عیار کی زنبیل کی طرح چلا ہی جاتا ہے۔ کچھ تو واقعی خوراک تھی اور کچھ ہوگا بھی تھا۔ جو کچھ مل گیا سب بھر گئیں چنانچہ گرمیوں کے دن تھے خربوزہ اور تربوزوں کی فصل تھی۔ تربوز آج بھی جیسا فرخ آباد میں ہوتا ہے دنیا کے پردہ پر نہیں ہوتا پھر بھلا یہ کاہے کو چھوڑنے والی تھیں۔ چھلکا چوسنے والا ہر سال رتیاں کیا کرتا تھا وہی ان کا لگا بندھا تھا۔ مفت میں رتی پر سے دو ایک تربوز روز آ جاتے اور یہ شام تک نپٹا دیتی تھیں مگر عمر کے ساتھ ساتھ انسان کے سب ہی قوی جواب دے بیٹھتے ہیں وہی ان کا حال ہوا مگر عادت کیسے چھوٹتی خوب تربوز کھائے آخر کو دست آنے لگے مگر پھر بھی کھاتی رہیں نتیجہ وہی ہوا جو ہونا تھا ہیضہ ہو گیا اور یاد و گھنٹہ میں چٹ پٹ ہو گئیں۔ مرتے وقت خانہ باغ میں گڑنے کی وصیت کی تھی اس لئے وہیں کیتھے تلے دفن کی گئیں سارا فرخ آباد ان کے جنازے میں شامل تھا بوڑھے اور بچے سب ہی زار و قطار رو رہے تھے۔

ان کی غزلوں میں صفائی اور برجستگی بدرجہ اتم موجود ہے کلام بیحد شگفتہ اور روزمرہ ہوتا تھا جیسی باتیں کرتی تھیں ویسی ہی غزل بھی کہتی تھیں۔ میرے ماموں نواب اکبر محمد خاں کو ان کا بہت سا کلام یاد ہے انھوں نے اپنے والد نواب علی مردان خاں سے یہ غزلیں سنی سنائی تھیں۔ معلا انتخاب حسب ذیل ہے اس کو اسی دور کے معیار سے جانچئے اور پھر فرمائیے کہ اس خاتون نے اس دور میں کیسا پاکیزہ کلام پیش کیا ہے آج بھی قوال ان کی غزلیں بغیر تخلص کے گاتے ہیں۔ تخلص سے انھیں بیر تھا۔ کبھی مقطع کہا ہی نہیں اچھا سنئے ؎

جوشِ وحشت میں یہ بتا مرا دل سمجھا | طوق بالوں کو تو زلفوں کو سلاسل سمجھا
واجب الرحم تھی بے جرم کیا اس کو شہید | قتل کر کے مجھے افسوس یہ قاتل سمجھا
دیکھ کر مجھ کو مسیحا کی بھی نبضیں چھوٹیں | انتقال اپنا نزاکت سے جو وہ سل سمجھا
عقل کیا خاک تھی مجنوں کو میانِ صحرا | ہر بگولہ کو جو لیلےٰ کا وہ محمل سمجھا
روشنی عقل کی رکھتا ہے وہی دنیا میں | نقش پا کو جو تمہارے مہِ کامل سمجھا

سچ پوچھئے تو دل سے نہ یاد خدا کیا | قصداً نماز چھوڑی تو روزہ قضا کیا
اے عشق آبرو نہ رہی تو نے کیا کیا | سوتے میں میری آنکھوں سے دریا بہا گیا
مسی لگا کے کھو نہ دنداں کی آب کو | نیلم کسی نے دُر کو نہ اے دلربا کیا
مرجاں کا پنجہ کر دیا قاتل کے ہاتھ کو | عاشق کے خون نے دیکھئے کار حنا کیا
کیونکر شگفتہ غنچۂ دل ہوتا ہجر میں | صدمہ ہمیشہ صرصرِ غم کا رہا کیا
صیاد کا ستم کہوں یا ظلم باغباں | بلبل کو عشقِ گل کا نتیجہ ملا کیا
حاصل نہ وصلِ لیلیٰ اسے ایک شب ہوا | واللیل برسوں رات کو مجنوں پڑھا کیا

غزل

از ———

جناب فیاض ہاشمی

شکوہ لب کبھی نہ ہو شرطِ وفا نبھائے جا | ابرو پہ بل نہ آنے دے لطفِ ستم اٹھائے جا
بادۂ جامِ بیخودی بہرِ خدا لنڈھائے جا | "مستِ نظر کا واسطہ مستِ نظر بنائے جا"
فکرِ مواخذہ نہ کر وہ ہے رحیم تو نہ ڈر | رحمتِ حق پہ رکھ نظر اپنی خطا بھلائے جا
خانۂ دل میں اب کہاں پہلی سی وہ تجلیاں | عمر تری ہو جاوداں اجڑا نگر بسائے جا
دامنِ صبر کو نہ چھوڑ راہِ وفا سے منہ نہ موڑ | سینہ سپر ہو دل نہ چھوڑ تیر پہ تیر کھائے جا
مفلس و بینوا ہوں میں رنج میں مبتلا ہوں میں | در پہ ترے پڑا ہوں میں بگڑی مری بنائے جا



ہندوستان کے ہزاروں انسان اپنے ہاتھوں سے جوانی کو برباد کر بیٹھے

آؤ! جوان بن جاؤ!

جتنی وبا ہندوستان میں نامردی کی پھیلی ہے شاید ہی کسی ملک میں ہو۔ اور جتنی لوٹ یہاں کے اشتہار بازوں نے مچا رکھی ہے۔ اور پبلک کی صحت کو برباد کر رکھا ہے۔ ایسی دنیا کے کسی خطہ میں نہیں ہے۔ کیا آپ کی آنکھیں ابھی تک نہیں کھلیں جبکہ آپ بھی جھوٹ اور فریب میں پھنس کر اپنا روپیہ اور صحت کھو بیٹھے ہیں۔ اس اندھیر گردی اور عام صحتوں کے برباد ہونے سے متاثر ہو کر آیور، ویدک اور یونانی طب کے فلاسفروں نے ایک وقت میں بیٹھ کر بڑے غور و فکر کے بعد نامردی، جریان، سرعت انزال۔ احتلام۔ ٹیڑھا پن۔ کجی۔ لاغری سستی اور عام جسمانی کمزوری کا صرف سات دن کا علاج معلوم کر لیا۔ اور اس علاج سے ہندوستان کے لاکھوں انسانوں کو دوبارہ جوانی مل گئی۔ جن کی وجہ سے ان کے گھر کی خوشی قائم رہ گئی اور ہزاروں برباد گھر آباد ہو گئے۔ جو لوگ جوانی کے لئے ٹکریں مارتے پھرتے ہیں۔ راتوں کی تنہائی میں اپنے کئے پر آٹھ آٹھ آنسو رویا کرتے تھے۔ آج ان کے گھروں میں جا کر دیکھیے وہ اولاد سے کھیلتے نظر آتے ہیں۔ اور ان کے گھروں میں خوشی اور چین نظر آتا ہے۔

سات دن میں جوانی کس طرح مل سکتی ہے

بڑی حیرت کی بات یہ ہے کہ جوانی کو لوٹانے کا علاج صرف سات دن میں ہو جاتا ہے مگر ان سات دنوں کے اندر عورت کے پاس جانے کا پرہیز بہت ضروری ہے کیونکہ اس علاج کی پوشیدہ ترکیب کے اصول میں خرابی آ جاتی ہے۔ اس لیے صرف ان ہی لوگوں کو یہ کورس استعمال کرنا چاہیئے جو سات دن تک ضبط سے کام لینے کا اقرار کریں گے۔ بڑے غضب کی طاقت چوتھے دن ہی پیدا ہونے لگتی ہے۔ بس اس طاقت کو سات دن تک روک لینے سے انسان برس طاقت سے کھیل سکتا ہے۔ اور اس کی قوت کم نہیں ہو سکتی۔ اس علاج میں دو دوائیں ہوتی ہیں ایک کھانے کی اور ایک لگانے کی۔ دونوں دوائیوں کے کورس کا نام "ری جوینا" ہے۔ کھانے کی دوا پہلی خوراک حلق سے اترتی اور اس نے تمام اعصاب کو ہوشیار کرنا شروع کر دیا اور کمزوری کو بدن سے اس طرح نکالنا شروع کر دیا جیسے گند دور کر دی۔ لگانے کی دوا بھی اپنے ایک قطرے کا کمال دکھاتی ہے۔ عضو پر پھیلتے ہی مریض خود حیرت زدہ ہو جاتا ہے کیونکہ بجلی کی طرح ہر رگ میں دوڑنے لگتی ہیں۔ اور طاقت کا سمندر ابل پڑتا ہے اس کورس میں عجیب و غریب صفات بند ہیں۔ اگر کوئی تندرست انسان بھی ایک دفعہ استعمال کرے تو جوانی کا پورا سماں دیکھ لے۔ گارنٹی:- اس بات کی گارنٹی تحریری دی جاتی ہے کہ "ری جوینا" کورس سے اگر سات دن میں انسان تندرست نہ ہو تو قیمت واپس کی جاتی ہے اور ایک پیسہ رکھنا برا سمجھا جاتا ہے یا دوبارہ مشورہ یا دوا مفت دی جاتی ہے پورے کورس کی قیمت پانچ روپے ہے۔ ڈاک خرچ آٹھ آنے علاوہ یہ کورس صرف ان ہی لوگوں کو بھیجا جائے گا جو سات دن تک ضبط سے کام لینے کا اقرار کریں گے۔

مینجر اکسیری دواخانہ۔ کلاں محل ۱۰۶ دہلی

پرتگالی کا اثر اردو پر

علمی مقالہ

از جناب میرزا محمد بشیر ایم اے

یورپ میں پرتگال ایک جمہوری سلطنت ہے جس کے شمال و شرق میں ہسپانیہ اور جنوب و مغرب میں بحر اطلانتک ہے اس کا دارالسلطنت لزبن ہے پرتگالیوں کو قومی انفرادیت گیارہویں صدی کے بعد حاصل ہوئی۔ بارہویں صدی میں یہ اہل مراکش سے برسر پیکار رہے۔

ہندوستان سے اہل پرتگال کے تعلقات پندرھویں صدی میں قائم ہوئے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ان کا بحری اقتدار عروج پر تھا۔ ۱۴۹۸ء میں واسکوڈی گاما عربوں کی رہنمائی میں مالابار آیا، اور کالی کٹ پہنچا جہاں وہ زمورن سے ملا یہاں سے انھوں نے تجارت کا سلسلہ شروع کیا اور "جواہرات اور مسالے" لے جانے لگے آہستہ آہستہ انھوں نے اپنے قدم ہندوستان میں جما لئے۔ شہنشاہ اکبر کے زمانے میں انھوں نے ایک صلحنامہ کیا اور حاجیوں کے جہاز لے جانے لگے۔ عہد جہانگیری میں بھی ان کے حقوق قائم رہے اور دربار میں رسوخ بھی رہا۔ "بنگال کے حکمرانوں کی اجازت سے پرتگال والے ہگلی میں آباد ہوگئے تھے[۱]" یہاں ان کے فوجی اقتدار میں بہت اضافہ ہوا وہ تجارتی مال پر چنگی لگانے لگے اور لوگوں کو زبردستی عیسائی بنانے لگے۔ ان کی زیادتیاں اس قدر بڑھ گئیں کہ انھوں نے ایک مرتبہ دو شاہی کنیزوں کو گرفتار کرلیا آخر شاہجہاں نے ان کو سخت سزا دی اور ان کی نوآبادی برباد کردی گئی۔

باشندگان پرتگال کی مادری زبان پرتگالی ہے جو "رومانس" کے لسانی خاندان کی ایک شاخ سے نکلی ہے[۳] لیکن بعد میں عربی حملہ آوروں کے زیر اثر بہت سے عربی عناصر اس میں شامل ہوگئے اس زبان کا سب سے بڑا ادیب کیمونس (Camoens) ۱۵۲۴ء تا ۱۵۸۰ء تھا۔

اس مختصر تاریخی خاکے کو پیش نظر رکھ کر اگر ہم غور کریں تو یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ پرتگالیوں کو اپنے دوران اقتدار میں ہندوستانیوں سے تجارتی، مذہبی اور سیاسی حیثیت سے برابر سابقہ پڑتا رہا ایسی صورتوں میں لامحالہ ان کو اسی ملک کی زبان بولنی پڑتی ہوگی اور وہ پرتگالی الفاظ ملا جلا کر اپنا مفہوم ادا کرتے ہونگے۔

آج اردو زبان میں جو پرتگالی الفاظ مستعمل ہیں وہ اسی دور کی یادگار ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ انگریزی کے بعد پرتگالی الفاظ کی تعداد اردو میں خاصی ہے حالانکہ ہماری زبان نے اپنے دامن میں دیگر یورپین زبانوں کے الفاظ کو بھی جگہ دی مثلاً فرانسیسی، اطالوی روسی وغیرہ[۱]

آزاد مرحوم آبحیات میں فرماتے ہیں "دو قوموں کے ارتباط سے ایسا اختلاط ضرور ہوتا ہے اور اس کے کئی سبب ہیں۔ اکثر نئی چیزیں ایسی ہوتی جو اپنے نام اپنے ساتھ لاتی ہیں۔ پرتگالی بعض میووں کے پودے یا بیج اپنے ساتھ لائے ان کے پرتگالی نام کچھ تغیر کے ساتھ رائج ہوگئے اور آج بھی نام ہیں۔ مثلاً

اردو	پرتگالی
اناناس	Anannas,
سنترہ	[۲]Cintra
موسمبی	Mozambique

ایک مورخ کہتا ہے کہ "اکبر کی وفات کے بعد زراعت میں ایک نئی بات یہ ہوئی کہ تمباکو کی کاشت شروع ہوگئی جس کا علم ہندوستان کو پرتگالیوں سے ہوا"[۳] تمباکو اور ساگودانہ دونوں الفاظ پرتگالی ہیں۔

---

[۱] سماوار	Samovaru	(روسی)
قرابین	Carabine	(فرانسیسی)

[۲] پرتگال کے شہر سنترے cintra سے اس کا بیج لایا گیا تھا۔

[۳] "ہند کے مغل راج" از ایڈورڈس اینڈ گیرٹ صفحہ ۲۶۲

---

[۱] پائنیرس ان انڈیا صفحہ ۱۱۰

[۲] مسلم رول ان انڈیا صفحہ ۵۴۸

[۳] چیمبرس انسائیکلوپیڈیا۔

تمباکو	Tobaccoo,
ساگودانہ	Sago,

لباس اور اس کی ضروریات کے لحاظ سے بھی چند پرتگالی الفاظ ہماری زبان میں داخل ہوگئے۔

سایا	Saia
بٹن	Boutan
فیتہ	Fita

بعض ایسی اشیاء بھی ہیں جو عموماً ہندوستانی گھروں میں ہوتی ہیں لیکن ان کے نام پرتگالی ہیں۔

بالٹی	Baldi,
بوتل	Bottle,
الماری	Almario,
میز	Meza,

پرتگالی الفاظ ہماری زبان کا جزو لاینفک بن گئے ہیں ہم اگر ان کے بجائے عربی، فارسی یا سنسکرت کے الفاظ استعمال کریں تو صرف فصاحت ہی کا خون نہ ہوگا بلکہ سمجھنا بھی مشکل ہو جائے گا

اس میں شک نہیں کہ ہماری زبان میں جو پرتگالی الفاظ مستعمل ہیں ان کا تلفظ بہت کچھ بدل گیا ہے اور بدل جانا لازمی بھی تھا ورنہ ان کی غرابت و اجنبیت نہ زائل ہوتی۔ یہی سبب ہے کہ ہم ان کو اپنے الفاظ سمجھتے ہیں۔

یہ فہرست ملاحظہ ہو

اردو	پرتگالی
مارتول	Martel
کارتوس	Cartoncho,
نیلام	Lelam,
پادری	Padre
گنڈا	Gandaia,
انگریز	Ingrez,

یہ الفاظ پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ اردو نے بحیثیت ایک زندہ زبان کے مشرق ہی نہیں بلکہ مغرب کی زبانوں کے الفاظ بھی کس حسن خوبی سے اپنا لیے اس کی یہ بلند نظری بتا رہی ہے کہ اس میں بین الاقوامی زبان بننے کی کتنی صلاحیت پوشیدہ ہے۔

اندھی نفرت

افسانہ

جناب شوکت صدیقی لکھنوی

یونہی کیا کم اُلجھن تھی کہ اُس پر ان کمبخت مچھروں نے بے وقت بھنبھنا کر اور بھی ناک میں دم کر دیا۔ باہر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی ہے۔ غالباً اُس کمرہ کی کھڑکی ابھی تک کھلی ہے، جبھی تو روشندان سے بجلی کی مدھم زرد شعاعیں پھیل پھیل کر سامنے والی دیوار پر ایک دہکتے ہوئے دھبہ میں سمٹ کر رہ گئی ہیں۔ کیا کروں دیکھ کے، اب وہاں دھرا ہی کیا ہے۔ ایک موٹی موٹی تیلیوں والی چلمن جس سے ہلکی ہلکی روشنیاں جھانک رہی ہوں بس اور کیا۔ مجھے یاد ہے، برسات کی وہ طوفانی رات جب اسی طرح طبیعت اُلجھ رہی تھی، نگاہوں میں نہ معلوم کون کون سے واقعات کی جھلکتی ہوئی پرچھائیاں لہرا رہی تھیں۔ برسوں کے گڑے مُردے اکھڑنے لگے۔ لطف یہ کہ یاد بھی وہی کچھ آ رہا تھا جو نیند تو نیند سکون کی بھی بستیوں میں ہل چل مچا دے۔ لاکھ بن بن کے سونے کی کوشش کی مگر نیند کہاں؟ آنکھیں کھٹکنے بھی لگیں۔ لیکن ان خواب شکن واقعات کی دھند پر وہ دماغ پر اسی طرح حاوی تھی۔

پھر یہ سب دفعتہً لمحہ بھر میں زائل بھی ہو گئی تھی۔ وہ لمحات ابھی تک میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ دروازہ کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے۔ سامنے مہیش شنکر بھون کی عالیشان عمارت تھی، شب کے گہرے سیاہ سایوں میں لپٹی جیسے اونگھ رہی ہو۔ آسمان کی وسعتوں میں متوالی گھٹائیں گھر گھر کر آ رہی تھیں اور جب کبھی وہ جھوم جھوم کر ٹکرائیں تو گونگی فضا سہم کر چیخ پڑتی۔ ہاں! اُس روز بھی کھڑکی کھلی تھی۔ مگر یہ نہیں، وہ مشرقی کونے والا کمرہ ابھی تک روشن تھا۔ روشنیاں ہلکے ریشمی پردہ سے چھلک چھلک کر باہر آ رہی تھیں۔ اُن دنوں اس میں پروفیسر جٹلناگر رہا کرتے تھے۔ شاید اس وقت بھی وہ ماحول سے بے نیاز فلسفہ کے کسی دقیق مسئلہ پر غور کرنے میں محو تھے۔

اچھی طرح خیال ہے بھیانک سکوت کو چیرتی "پھٹ پھٹ" کی ایک دھیمی سی آواز اُبھری، رات آدھی سے زائد گزر چکی تھی، میں سب کچھ بھول کر جلدی سے اُٹھ بیٹھا۔ دروازہ سے جھجکتے ہوئے منہ نکال کر باہر دیکھا۔ اُدھر اندھیرے میں کوئی دیوار سے لگا کھڑا اُس دروازہ کو آہستہ آہستہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ جس میں پروفیسر کا ملازم موہن رہا کرتا تھا۔ اُس وقت معمولی سی بارش شروع ہو گئی تھی ننھی ننھی بوندیں در و دیوار سے ٹکرا کر ساز کے آخری نغموں کی طرح مدھم آواز پیدا کرنے لگیں۔ سڑک کے کنارے پیپل کا بھی پرانا درخت کھڑا تھا۔ ہوا جب پتیوں سے اُلجھ اُلجھ کر جھنجھلاتی ہوئی گزرتی تو وہ کھِل کھِلا اُٹھتا۔ مجھے بھی اپنے چہرہ پر نمی رینگتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ اب کھٹکھٹانے کی آواز کے ساتھ موہن کو پکارنے کی بھی ملی جلی آوازیں آنے لگیں۔ مسلسل پیہم، مگر کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ حالانکہ کمرہ روشنیوں میں نہایا اسی طرح جھلملا رہا تھا۔ ہاں! یکایک، بجلی کالی بلا بدلیوں کے آغوش میں زور سے کڑکی، سونے کے تار کی سی ایک پتلی سی روشنی کی لکیر تلملا کر رہ گئی۔ اندھیرے میں منہ اوندھائے پڑی ہوئی زمین میں زندگی کی خفیف سی رمق جھلکی، ساتھ ہی زور کی بارش شروع ہو گئی۔ موٹے موٹے قطرے چیختے ہوئے سڑک پر لوٹنے لگے۔ وہ آواز بھی اس شور میں دب کر رہ گئی۔ پانی اب اندر آنے لگا تھا۔ اس لئے دروازہ بند کر دیا۔ نالیوں کے بے پناہ شور نے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ بھیگی ہوئی ہوا سسکیاں بھرتی ہوئی بے تحاشہ بھاگ رہی تھی۔

پانی کی گھڑ گھڑاہٹ میں گھٹی ہوئی ایک بار "چپ چپ" کی آواز سنائی دی اور میرے دروازہ تک آ کر ٹھیر گئی۔ خوب یاد ہے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا تھا۔ دیوار سے دبکا کوئی کھڑا تھا۔ میں نے خوفزدہ ہو کر ذرا چیخ کر پوچھا تھا۔

"کون؟"

اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ لیمپ کی دھندلی روشنی میں صاف طور سے کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ میں نے لنجی انگلیوں سے لیمپ کی روشنی تیز کی، خوب غور سے گھور کر دیکھا۔ ایک عورت پانی میں شرابور کھڑی تھی۔ میں نے اطمینان سے پلنگ پر

بیٹھئے ہم نے کہا۔

"اندر چلی آؤ بڑے زور کی بارش ہو رہی ہے"

وہ زبان سے ایک لفظ نکالے بغیر جھجکتی ہوئی اندر چلی آئی اور گم سم سی کھڑی ہو کر بھٹکی بھٹکی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ سفید ساڑھی میں ملبوس جو بھیگ کر بالکل جسم میں پیوست ہو کر رہ گئی تھی۔ بظاہر شریف خاندان معلوم ہوتی تھی۔ میں برابر اس کو تحیر خیز نظروں سے دیکھتا رہا۔ وہ کچھ پریشان سی نظر آ رہی تھی۔ چہرہ پر زردی سی بکھری ہوئی تھی اور حسین بھی لیکن حسن نڈھال اور جوانی جیسے سو رہی ہو۔ میں نے پھر کہا۔

"یوں کب تک کھڑی رہیئےگا۔ بیٹھ جائیے نا۔ پانی ابھی تھمنے کا نہیں"

"جی" وہ چونک کر بولی اور کھوئی کھوئی سی پاس پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ ایک موٹر اُدھر سے چھینٹوں کے شور میں سر سر کرتی آئی اور پانی کو تیزی سے روندتی ہوئی دوڑ گئی وہ دور تک اس کو دیکھتی رہی۔

پھر میں نے کسی قدر ہمت کر کے پوچھا تھا "ابھی آپ ہی آواز دے رہی تھیں نا ابھی یہ لڑکے بھی خوب ہیں اتنی دور رلتیا ہوا میں جاگ اٹھا۔ مگر وہاں کسی نے کروٹ تک نہ لی۔ ہاں رات بھی تو زیادہ آگئی ہے"

"جی ہاں"

"کوئی ضروری ہی کام ہوگا" میں بے تکلف ہوئے جا رہا تھا۔ "ورنہ اتنی رات گئے اور پھر اس اندھیری رات میں کون نکلنے کی جرأت کر سکتا ہے"

اُس نے صرف گردن موڑ کر ایک لمحہ کے لئے میرے چہرہ پر نگاہیں بکھیر دیں۔ اور کوئی جواب نہ دیا۔ کمرہ میں گہری خاموشی طاری ہو گئی۔ آگے پوچھنے کی مجھ کو ہمت نہ ہوئی۔ بھیکی پھیکی روشنی میں اس کا اُداس چہرہ کچھ سوچتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اور پھر دور سے قلعہ کے بوڑھے گھڑیال کے چیخنے کی آواز گرجنے لگی۔

وہ چونک کر بولی "دو بجے ہیں" اور جواب کا انتظار کئے بغیر پوچھا۔

"پروفیسر بھٹناگر کو تو آپ جانتے ہی ہوں گے؟"

"ضرور! میرے پڑوسی جو ٹھہرے"

"اگر مناسب سمجھیں تو کل دن میں کسی وقت اُن سے اتنا کہہ دیجئے گا کہ کل آپ سے کوئی ملنے آیا تھا اور شاید اب پھر کبھی ملاقات نہ ہو" اُس کی آنکھوں میں ایک شبنمی سی چمک روشنی میں جھلکتی صاف نظر آ رہی تھی "ہاں اتنی مجھ پر دیا کیجئے گا کہ بات صرف آپ ہی تک رہے" اور پھر کرسی کا بازو پکڑ کر میری طرف دیکھنے لگی۔

میں جلدی سے بولا "آپ اطمینان رکھیں"

"میرے حال پر بڑی مہربانی ہوگی" اس نے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اب میں جا رہی ہوں"

"کیا غضب کرتی ہیں۔ کس قیامت کی بارش ہو رہی ہے"

"پھر کیا کیا جائے۔ مجھے ابھی جانا ہے"

اس نے مجھے ایک بار اور سائلانہ انداز سے دیکھا اور باہر نکل گئی۔ میں اٹھ کر دہلیز تک گیا۔ وہ تیز تیز قدموں سے پانی میں گنگناتی ہوئی سڑک کو عبور کر کے بجلی کے کھمبے کے پاس سے ہوتی ہوئی گلی کے نکڑ پر مڑ گئی۔ میں دروازہ سے لگا اسی کے متعلق سوچتا رہ گیا

اچھی طرح خیال ہے۔ دوسرے روز رات کو میں پروفیسر سے ملا تھا۔ صبح تو ملاقات ہو نہ سکی۔ گزشتہ شب کی بیداری سے آنکھ اس وقت کھلی تھی جب وہ یونیورسٹی جا چکے تھے۔ ورنہ جن سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ نو بجے رات سے ادھر نہیں مل سکتے۔

میرے اُن کے تعلقات بس یونہی رسمی سے تھے۔ شاید اسکی بھی نوبت نہ آتی۔ ملنے جلنے کے معاملہ میں وہ بڑے محتاط واقع ہوئے تھے۔ ماحول سے بیگانہ، دُنیا سے الگ تھلگ اس مکان میں ان کو رہتے کم و بیش ایک سال ہو گیا تھا۔ لیکن میں نے تو اُن کو آج تک فردوس کے کسی آدمی سے کبھی بات کرتے نہیں دیکھا میرے لئے کوئی خصوصیت نہ تھی۔ وہ تو کہئے ایک صورت پیدا ہو گئی شہر میں میرے چند ایسے بھی دوست ہیں جن سے گفتگو کے لئے ٹیلیفون کی ضرورت اکثر لاحق ہوتی ہے۔ محلہ بھر میں صرف انہی کے یہاں ٹیلیفون ہے۔ بالکل مکان سے متصل جب چاہا ضرورت پوری کر لی۔ وہ کبھی مخل نہ ہوئے۔ اکثر جب وہ مکان پر آتے جاتے ملے تو کبھی کبھی معمولی سی گفتگو بھی ہو جاتی۔ یونہی سرسری طور پر بس یہی جنگ کی موجودہ صورت حال پر سیاسی کشمکش پر موسم پر۔ نہ معلوم کتنی ہی ایسی باتوں پر گفتگو کرنے کے لئے موضوع کی ضرورت نہیں ہوا کرتی یہ تو اپنے بس کی بات ہے۔ جب چاہا منہ کو ذرا سا کھولا زبان کو متحرک کیا۔ پھر کیا ہے، جدھر چاہا بات موڑ دی۔

نو بجے ہی ہوں گے۔ کہ میں پروفیسر صاحب کے یہاں جا دھمکا۔ جانے کو تو چلے گئے۔ مگر ڈرائنگ رُوم میں جاتے ہوئے جھجک سی معلوم ہوئی۔ وہ اس وقت موجود تھے۔ مجھے ملازم نے پہلے ہی بتا دیا تھا۔ نہ معلوم کیا خیال کریں ممکن ہے برافروختہ ہو جائیں۔ بات ... تھی۔ کون اپنے متعلق یہ سُننا گوارا کرے گا کہ رات کے ...س سے ایک نوجوان عورت ملنے آئی تھی پھر وہ بھی ...ربائی سے۔

...میں انگلی دبلانے میں اسی پس و پیش میں کھڑا تھا۔ کہ جاؤں یا نہ جاؤں۔ اسی اثنا میں سامنے والے دروازہ پر چرڑ چرڑ کی آواز پیدا ہوئی۔ سانولے رنگ کی ایک اکہرے بدن کی لڑکی کمرہ سے باہر آئی۔ کچھ گھبرائی ہوئی سی۔ بہکی بہکی نظریں۔ پتلے پتلے لب لرز رہے تھے۔ مجھے سامنے کھڑا دیکھکر وہ ٹھٹک کے رہ گئی۔ بڑی بڑی آنکھیں پھیل کر اور کشادہ ہو گئیں۔ پھر کچھ ایسی بوکھلائی کہ گرتے گرتے بچی۔ نہ جانے مجھے کیا سمجھا۔ ٹھیک تو ہے رات کے وقت کسی کے مکان میں اس طرح کھڑا ہونا کہاں تک مناسب ہے۔

کمرہ میں داخل ہو جانا ہی میرے حق میں بہتر تھا۔ میں نے پردہ اُٹھایا اور ایکبار اندر چلا ہی تو گیا۔ پروفیسر خاموش سر جھکائے بیٹھا تھا۔ سامنے جاپانی وضع کی ایک چھوٹی سی آبنوسی میز رکھی تھی۔ جس پر کئی جام اور چند بوتلیں بے ترتیبی سے اِدھر اُدھر رکھی ہوئی تھیں میں ہکا بکا سا وہیں ٹھٹک کر رہ گیا۔ قدم آگے بڑھائے نہ بڑھتے تھے جیسے پیروں کو زمین نے مضبوطی سے تھام لیا ہو وہ ابھی تک اسی حالت میں بیٹھا تھا۔ موقع غنیمت تھا، چاہا کہ نگاہ بچا کر نکل جاؤں لیکن نہ معلوم کس طرح اُن کی نظر پڑ گئی، وہیں سے بیٹھے بیٹھے کہا۔

"ارے بھئی کہاں، کھڑے کیوں ہو آتے کیوں نہیں؟"

مجبوراً پلٹنا پڑا اور جھینپتا ہوا جا کر صوفہ پہ بیٹھ گیا انہوں نے پتلون کی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور میری طرف بڑھایا۔ میں نے عذر کرتے ہوئے کہا:۔

"میں اس سے محروم ہوں"

بولے "آج اس وقت کہاں بھول پڑے"

اُنہوں نے تو یونہی ایک سوال کر لیا۔ مگر میرے اوپر آ گئی مصیبت کہوں تو کیا کہوں کبھی اس وقت آنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ نہ اُن کی طبیعت ہی کا صحیح اندازہ تھا۔ کچھ نہ کچھ تو جواب دینا ہی تھا میں نے بھی آخر رومال سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہدیا "یونہی چلا آیا۔ آج گرمی کچھ زیادہ ہے"

بات بن گئی۔ کہنے لگے "غالباً پانی پڑے گا کل تو اس زور و شور کی بارش ہوئی کہ بس کچھ پوچھو نہیں"

یہاں تو یہی طے کئے بیٹھے تھے۔ کہ اُن سے بھول کر بھی اس بات کے متعلق تذکرہ نہ کرونگا مگر بارش کی گفتگو چھیڑ کر انہوں نے میری ہمت بڑھا دی سوچا لگے ہاتھ اس طرف بھی کچھ اشارہ کر دوں۔ میں نے کہا:۔

"جی ہاں! میرے خیال میں تو تمام برسات بھر ایسی زبردست بارش نہ ہوئی ہوگی۔ سڑک پر بلا مبالغہ گھٹنوں گھٹنوں تک پانی تھا آپ تو اس وقت سو رہے ہوں گے۔ ہاں خوب یاد آیا۔ آپ سے ملنے کوئی صاحبہ آئی تھیں۔ کوئی عزیز ہی ہوں گی۔ بیچاری پانی میں لت پت ہو گئی تھیں۔ میں نے کمرہ میں بٹھا لیا کہیں باہر جا رہی ہیں شاید"،

میں نے دیکھا اُن کی نگاہیں سامنے دیوار پر تھیں پتلیاں ایک جگہ پر قائم ہو کر رہ گئی تھیں ہونٹوں پر بھی خفیف سی لرزش ہویدا تھی۔ نشانہ بہک رہا تھا۔ میں نے جلدی سے بات کا پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"کیوں پروفیسر صاحب آپ تو جلدی سونے کے عادی ہوں گے بھئی آپ لوگ ٹھیرے دماغی کام کرنے والے آدمی تمام دن تو یونیورسٹی میں سر کھپانا پڑتا ہے"

"کہاں مسٹر" انہوں نے ہتھیلیوں سے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔ کل اس وقت تک میں جاگ رہا تھا۔ مجھے سب معلوم ہے۔ ہاں!"— وہ کہتے کہتے رُک گئے اور ایک پیر پر دوسرا پیر رکھ کر اطمینان سے سگریٹ پینے لگے۔ آگے کچھ کہنا بے سود تھا۔ خاموش بیٹھا اُن کی ہر حرکت کا جائزہ لیتا رہا۔ سگریٹ پیتے پیتے ایک بار وہ بولے:۔

"کیا اُس نے تم سے کچھ کہا تھا؟"

واقعات معلوم کرنے کے لئے میں نے جھوٹ بول دیا "جی ہاں بہت کچھ"

"ہُوں" انہوں نے گردن کو ہلکی سی جنبش دی اور ایک طویل گہری سانس بھرتے ہوئے کہا "اچھا" ساتھ ہی گردن صوفہ کی پشت پر ٹکا دی اور نگاہیں چھت پر جذب کر دیں۔ کچھ دیر اسی انداز میں وہ پڑے رہے پھر بغیر کچھ کہے کمرہ سے باہر چلے گئے۔

اب دس بجنے کے قریب تھے وہ جب کے گئے گئے اب تک نہ لوٹے تھے۔ اکیلے بیٹھے بیٹھے طبیعت بھی اُکتا گئی۔ آخر اُٹھ کر کمرہ سے باہر نکل آیا۔ سامنے "وزیٹرز ڈول" کے کھمبے کا سہارا لئے وہ چُپ

چلپ بت بنے کھڑے تھے۔ پاس ہی امرود کے کئی چھوٹے چھوٹے پیڑ تھے۔ ایک بھولا بھٹکا جگنو کسی شاخ سے لپٹا رک رک کر روشنی اگل رہا تھا۔ میرے قدموں کی چاپ سن کر وہ پلٹے اور ایک شکستہ انگڑائی لیکر بولے۔

"بیٹھو ابھی سے چل دیئے۔ رات گئی کتنی ہے"

پھر میرے بازو میں اپنا ہاتھ ڈالے کمرہ میں لے آئے اور اپنے برابر ہی بٹھا کر بولے۔

"ہاں! تو اس نے تم سے بہت کچھ کہا۔ اچھا کیا اور بہت اچھا کیا۔ جب اس نے خود ہی تم پر واقعات روشن کر دیئے تو جو کچھ رہ بھی گیا ہے اس سے کیوں لاعلم رہ جاؤ۔ حالانکہ یہ اس کا زبردست راز ہے"

مجھے بڑی ندامت ہوئی۔ کہ محض اپنی دلچسپی کی خاطر کسی کا اس قدر گہرا راز معلوم کر دل جس سے میرا دور کا بھی لگاؤ نہیں۔ مگر اب کچھ کہنا بھی بیسود تھا۔

وہ کہہ رہے تھے: "مجھے افسوس ہے کہ میری ذات سے اسے بڑی تکلیف ہوئی۔ مگر اس میں میرا کیا قصور سارا کیا دھرا تو اسی کا ہے۔ سیدھی صاف بات یہ ہے کہ وہ میرے ایک دوست کی بیوی ہے جس کا کوئی سال بھر ہوا انتقال ہو گیا۔ اس کی حیات میں میں اسی کے ہمراہ ہی رہا کرتا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد ہی میں نے مکان تبدیل کر لیا۔ لیکن آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہا۔ تم جانتے ہو جوانی کی آگ کس قدر حشر سامان ہوتی ہے۔ پھر عورت کی جوانی اور ایک ایسی عورت کی جس کے سینہ میں شباب کی چنگاریاں سلگتے سلگتے بھڑک اٹھی ہیں۔ آگ جب خوب پھیل جاتی ہے تو اس کا بجھانا ذرا مشکل ہو جاتا ہے۔ ہم ایک دوسرے سے برابر ملتے رہے تا اس کے گھر والوں پر بھی سب کچھ روشن ہو گیا۔ وہ اسے گھر سے نکال دینے پر آمادہ ہیں، ناموس کے تحفظ کی خاطر، وہ مجھے کہتی ہے کہ مجھے اپنے ہمراہ انگلستان لے چلو۔ شاید تمہیں نہیں معلوم میں عنقریب ہی پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کی غرض سے کیمبرج میں داخل ہونے والا ہوں مگر تم اس کے لئے آمادہ نہیں۔ تمہیں یاد ہوگا۔ جب تم میرے کمرہ میں داخل ہو رہے تھے تمہیں اس کمرہ سے ایک دبلی پتلی سی لڑکی نکلتی دکھائی دی ہوگی۔ سچ کہو کس غضب کی حسین ہے۔ رنگ ذرا دبتا ہوا ہے۔ مگر پھر اس سے ہر حال میں چوکھی ہے۔ میری تو اسے دیکھ کر بھوک پیاس اڑ جاتی ہے۔ دیکھتا ہوں تو بس دیکھتا ہی رہ جاتا ہوں۔ تم سے اب پردہ ہی کیا سب کچھ تو تمہارے سامنے اگل دیا۔ جانتے ہو یہ لڑکی کون ہے؟ اس کا باپ مر چکا ہے ایک ماں کا دم ہے، آمدنی کی کوئی صورت نہیں، تعلیم کا بے حد شوق ہے، یقین مانو تو اسے تعلیم سے عشق ہے، اپنے زمانہ تعلیم میں میں نے اسے پڑھایا بھی ہے۔ اس وقت تو بچہ تھی، اب خوب سیانی ہو گئی ہے جوانی ہے کہ پھٹی پڑتی ہے۔ ہاں تو وہ اس سال کسی امتحان میں شریک ہو رہی ہے۔ مگر امتحان کی فیس دینے بھر کی رقم مہیا کرنا اس کی بات نہیں۔ وہ مجھ سے امداد کی طالب ہے۔ بھلا میں انکار نہ کر دوں یعنی ضرور کر دونگا۔ وہ جوان ہے اور پھر خوبصورت"

وہ مسکرا مسکرا کر۔ ذرا اگر دن ہلا کے، ہاتھوں کو پھیلا کر کہے جا رہا تھا۔ اور ادھر میری یہ حالت کہ کبھی تو تمام رگوں کا خون سمٹ کر کھنچتی ہوئی انگلیوں میں آ جاتا، کبھی جبڑے سے کھولتا تو ہونٹ چپک رہ جاتا۔ کبھی کانوں میں تو کبھی آنکھوں میں آگ کی طرح سلگنے لگتا۔ نہ معلوم وہ ابھی کیا کیا کچھ کہتا۔ مجھ میں اب ضبط کا یارا نہ تھا۔ اس کے سینہ میں تو پتھر کا ٹکڑا دھرا تھا۔ میں کہاں سے ایسا سنگلاخ دل لاتا۔ آخر کچھ کہے سنے بغیر کمرہ سے باہر نکل آیا۔ اچھی طرح یاد ہے جب میں باغ کی پگڈنڈی کو عبور کر رہا تھا۔ تو کمرہ سے اس کے بھیانک قہقہوں کی آواز آ رہی تھی۔

کئی ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ لیکن اس دوران میں میں نے بھول کر بھی پروفیسر کے مکان کا رخ نہ کیا۔ رستہ میں اگر مڈبھیڑ ہو جاتی تو کترا کر نکل جاتا۔ اس کی صورت دیکھ کر میرے جسم میں چنگاریاں سی چھلنے لگتیں مجھے اس سے بڑی نفرت ہو گئی۔ بس چلتا تو اس کی بوٹیاں نوچ ڈالتا۔

انہی دنوں میں ایک روز شب کو وہ جن مجھے بلانے آیا۔ میں نے جانے سے صاف انکار کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد پھر آیا۔ کہنے لگا کہ پروفیسر نے کہلوایا ہے کہ صرف ایک لمحہ کے لئے چلے آیئے۔ کھڑے کھڑے دو باتیں کرنا ہیں۔ بادل نخواستہ اٹھ کر ساتھ ہو لیا۔ وہ بڑی خندہ پیشانی سے پیش آیا۔

ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ مگر میں نے جلد ہی اندازہ لگا لیا کہ اس کو میرے نفرت انگیز جذبات کا پورا پورا احساس ہے جب رات زیادہ آ گئی اور میرے گھر جانے کا وقت قریب آ گیا تو اس نے مجھ پر وہ حقیقت بھی منکشف کر دی جس نے اس کو اس انسانیت سوز رویّہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

دراصل واقعہ یوں تھا۔ آج سے کچھ سال ادھر کی بات ہے

جب وہ جوان تھا۔ امنگوں میں جان اور ارمانوں میں تڑپ تھی۔ اُسے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی۔ وہ اُسے اپنا بنانا چاہتا تھا۔ مگر والدین کو اس سے اختلاف تھا۔ بھلا وہ ایک ایسی لڑکی کو اپنی بہو بناتا کیونکر گوارا کر سکتے تھے۔ جسے شدھ شن بابو نے رتھ یاترا کے جلوس میں روتے ہوئے پایا تھا۔ اُس کی اُس وقت عمر ہی کیا تھی جو گھر بار کا کچھ نشان بتاتی۔ نہ ہی سے اُن کے پاس کوئی آیا۔ اُن کے کوئی اولاد نہ تھی۔ اُنہوں نے اُس کی پرورش کا بار اپنے سر لے لیا۔ چند سال کی معصوم جوان ہو گئی تھی، کلی پھول بن چکی تھی۔ مگر مسرتوں پر بہار آتی نظر نہیں آتی تھی۔ کون اُس سے شادی کرے۔ جس کے ماں باپ تک کا پتہ نہیں، معلوم کس ذات کی ہو۔ وہ سینہ پر پتھر رکھ کر اپنی محبت کو ویران ہوتے دیکھتا تھا۔ مگر ایک مجبور محض پر اس قسم کی ستم زائیاں دیکھتا۔ اس کے نزدیک ضمیر فروشی سے بدتر تھا۔ جانتے بوجھتے وہ آگ کے شعلوں میں پھاند پڑا۔ مصائب کے کیا کیا طوفان نہ امڈے۔ ایک دُنیا اس سے نالاں ہو گئی۔ اپنے بیگانے ہو گئے۔ باپ نے لیا منہ موڑ تا کہ آخر دم تک اس کا مُنہ نہ دیکھا۔ عزیزوں نے نکو بنا دیا۔ مگر اُس نے سب کچھ برداشت کیا۔ کسی طرف مطلق توجہ نہ دی، اس کی صرف ایک کاوش تھی، اور وہ تھی حصولِ دولت کی واحد تمنا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ ان مصیبتوں کا ردِعمل صرف اسی سے ممکن ہے۔ آخر وہ وقت آ گیا جب تکالیف کے بادل چھٹ گئے۔ اب رُت بدل گئی تھی۔ مسرت و ابتہاج کا دَور دورہ تھا۔ وہ خود کو تاروں کی سہیں سرزمین میں سانس لیتے ہوئے محسوس کرتا۔ مگر تباہیوں کی ایک نئی سیلاب بحت موج عزاتی ہوئی اُٹھی، مسرتوں کا سفینہ اس میں ایسا غرق ہوا کہ پھر نہ اُبھرا۔

اُس کی بیوی اپنے ایک نوجوان پڑوسی کے ساتھ فرار ہو گئی۔ اُس نے پھٹی پھٹی آنکھوں اور دھڑکتے ہوئے دل سے یہ سُنا اور کچھ بولے بغیر سیدھا جا کر سر تھام کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ دن گزرتے گئے۔ اِدھر دُنیا کے طعنے چھید رہے تھے تو اُدھر چھ ماہ کا لڑکا ماں کی یاد میں تڑپ تڑپ کر دم توڑ رہا تھا۔ ان تمام باتوں نے اُسے دُنیا سے باغی کر دیا۔ عورت ذات سے بے پناہ نفرت ہو گئی۔ اسی لئے وہ کبھی کسی سے ملتا جلتا نہ تھا۔ حالانکہ کتنی ہی ہوں گی جو اُس کے ظلم کا نشانہ بنیں، مگر کسی کو وہ خود بلانے نہ گیا تھا۔ آنے والے کو اُس نے روکا بھی نہیں۔ اس کا دل اب اس قدر سخت ہو گیا تھا۔ کہ اس میں نام کو بھی نرمی نہ تھی۔

دوسرے دن پروفیسر اپنے سفرِ انگلستان پر روانہ ہو گئے۔ کوئی ایک ہفتہ بعد اُن کا خط آیا۔ خیال تھا کہ وہ اِن سفر میں تحریر کیا ہوگا مگر کہاں وہ ابھی تک بمبئی ہی میں پڑے ہوئے تھے۔ ایک پارسی دوشیزہ کا ضیا بار حُسن اُن کے شبستانِ تاریک کو منور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پارسی ہو یا یہودی مگر ہو گی دُکھوں کی ماری۔

پروفیسر کو گئے ایک مدت ہو گئی۔ خبر نہیں کس حال میں ہیں اُنکی کوٹھی میں آجکل ایک گورنمنٹ ریٹائرڈ آفیسر مقیم ہیں۔ اُن کی ایک لڑکی بھی ہے۔ بڑی بڑی آنکھوں والی جن میں کہکشاں کے زریں خواب جھلکا کرتے ہیں۔ جوانی کا الھڑپن بھی ہے اور مزاج میں شوخی بھی، اس کا کمرہ بالکل میرے کمرہ کے مقابل ہے۔ زیادہ تر میں اس کو اسی کمرہ میں کچھ نہ کچھ کرتے ہوئے دیکھتا ہوں کبھی سر جھکائے پڑھنے میں مصروف کبھی میز بجا بجا کر خوب گاتی ہے۔ اکثر بید مجنوں کی سی لوچدار کمر کو خم دیتی ہوئی رقص کی بھی مشق کرتی ہے۔ بید و زکھڑکی پر بیٹھا یہ تماشے دیکھا کرتا ہوں۔ مجھے یوں بیٹھا دیکھ کر اکثر ذرا لجاتے ہوئے دروازہ کی پشت پر ہو جاتی ہے۔ پھر لمحہ لمحہ بعد بالوں کی کچھ لٹیں۔ ایک آنکھ اور مرمریں پیشانی کا کچھ حصہ باہر نکالتی ہے۔ مجھے اس کی یہ شوخیاں کچھ اس قدر بھاتی ہیں۔ کہ گھنٹوں بیٹھا دیکھتا رہتا ہوں کمرہ سے باہر جاتی بھی ہے تو لحظہ بھر میں گنگناتی ہوئی چلی آتی ہے

اُس دن دوپہر کو بھی یونہی بیٹھا اسی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ میز پر سر جھکائے بیٹھی کچھ لکھنے میں مصروف تھی لکھتے لکھتے اُٹھ کر کھڑکی پر آ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اُس کے نم آلود ارغوانی لبوں پر ایک ہلکا سا تبسم پھیل گیا۔ تبسم اور پھر ایک دوشیزہ کا کس قدر تمنا خیز ہوتا ہے۔ مگر معلوم بیٹھے بیٹھائے پروفیسر کا کیسے خیال آ گیا۔ خیال آنا تھا کہ قیامت آ گئی خوب یاد ہے بھولنے سے بھی نہیں بھول سکتا۔ میں نے اس کی طرف نفرت سے کسی قدر ہونٹ سمٹا کر کھنچی ہوئی بھنوؤں سے دیکھا تھا اور جھٹ کھڑکی کے دونوں پٹ بند کر دیئے۔ شام کو مجھے کھڑکی پر چلمن پڑی دکھائی دی۔ نہ معلوم کیوں دل پر ایک بوجھ سا ہو گیا۔ آنکھیں اب دیکھنے کو ترستی ہیں مگر جلوؤں کی وہ ارزانی اب کہاں۔ کبھی کالج جاتے ہوئے نظر آتی بھی تو آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتی۔ کبھی اپنی حماقت یاد آتی پر طیش آتا ہے کبھی پروفیسر کو کوسنے کو دل چاہتا ہے۔ اس وقت بارش کے ننھے ننھے قطرے دروازوں پر گنگناتے ہوئے گر رہے ہیں۔ اور یہاں سینہ میں رہ رہ کر ایک ہوک سی اُٹھتی ہے اور لبوں تک آتے آتے ایک جھلسی ہوئی آہ بن کر پھیل جاتی ہے ۔

فنون جمیلہ

فلمی اطلاعات

از:— فلم بین !!

"سکندر" کا شاندار خیر مقدم!

ٹکٹ گھروں کی کھڑکیاں ٹوٹ گئیں۔ سینماؤں میں شائقین کے بے پناہ ہجوم۔ مقبولیت کے تمام ریکارڈ مات ہوگئے۔ یہ ان تاروں کے اقتباسات ہیں جو شمالی ہند کے کئی ان شہروں سے وصول ہوئے ہیں جہاں "سکندر" عظیم الشان کامیابیاں حاصل کر رہا ہے۔ یہ خبریں مختلف وجوہ کی بنا پر تعجب خیز نہیں۔ سکندر کو منروا نے پیش کیا ہے سکندر کو سہراب مودی نے ڈائرکٹ کیا ہے۔ سکندر کو دس لاکھ روپے کے کثیر مصارف سے اور بارہ ہزار اشخاص کے جم غفیر کے ساتھ فلمایا گیا ہے اس کے علاوہ منروا کا یہ عظیم تاریخی شاہکار کئی ایسے عناصر رکھتا ہے جن کی بدولت مختلف مذاق رکھنے والے اصحاب بھی اس بات پر متفق ہیں کہ سکندر ہندوستانی فلمی صنعت کا شاہکار ہے۔ کئی اصحاب سکندر کی عجیب و غریب شخصیت سے (جس نے ایک دنیا کو فتح کیا مگر اپنا دل ایک ایرانی دوشیزہ کے قدموں میں رکھدیا) متاثر ہوتے ہیں۔ متعدد اصحاب کے دلوں پر مہاراجہ پورس کی شجاعت اور حب الوطنی گہرا اثر کرتے ہیں۔ ہزاروں شائقین سہراب مودی۔ پرتھوی راج کی بہترین تمثیل نگاری کے لئے سکندر کی تعریف کرتے ہیں اور مہاراجہ پورس کے محل کے مناظر بھی اپنی مقناطیسی کشش سے دیکھنے والوں پر سحر کا عالم طاری کر دیتے ہیں۔ ان سب سے بڑھکر سکندر کے جنگی مناظر ہیں جنھوں نے اپنی واحد نوعیت کی بدولت ہمارے فلم سازوں کے لئے ایک نئی شاہراہ کھولی ہے۔ ناطق فلموں کے آغاز سے آج تک ہندوستان اتنا جامع اور مکمل فلم پیش نہیں کر سکا۔ سکندر کی کہانی تاریخ عالم کے اس دور سے تعلق رکھتی ہے جب سکندر تسخیر ہند کے ارادے سے ہمارے ملک پر حملہ آور ہوا لیکن مہاراجہ پورس نے اپنی شجاعت اور بہادری سے اس کے خواب کو مٹی میں بکھیر دیا۔ سکندر کا پس منظر، سکندر اور پورس کی وہ خونریز جنگ ہے جو جہلم کے کنارے ایک لاکھ بیس ہزار یونانیوں اور صرف تیس ہزار ہندوستانی سپاہیوں کے درمیان لڑی گئی۔ سکندر کی تاریخی کہانی کو پنڈت سدرشن نے جس کامیابی سے فلم کا لباس پہنایا ہے اس کے لئے (باقی برصفحہ ۷۱)

میاں بیوی کا افسانہ

ان دونوں میں بے حد محبت تھی۔ ایک دوسرے کو چاہتے تھے لوگ کہتے تھے یہ سارس کی جوڑی ہے۔ اور ان دونوں کی زندگی پر رشک کرتے تھے۔

بیوی حسین تھی۔ اور شوخ بھی، انہی شوخیوں میں اس کی زندگی بہار سے کھیل رہی تھی۔ شوہر اس کی اداؤں کا دیوانہ تھا۔ لیکن واہ رے انقلاب! ...... وقت کو بدلتے دیر نہیں لگتی۔ پتہ نہیں کیوں خوبصورت پھول مرجھانے لگا۔ شوہر گھبرا گیا۔ بے چین ہو گیا۔ بیوی کے خوبصورت چہرہ پر اداسیاں چھا گئیں اور رفتہ رفتہ ایسا معلوم ہونے لگا۔ جیسے اس کا حسن ہوا میں بکھر گیا ہے۔ دیکھنے والے کہنے لگے۔ دق کی بیمار ہے۔ کیونکہ رفتہ رفتہ اس کا چلنا پھرنا بہت ہی کم ہو گیا تھا۔ چہرہ پر زردی چھا گئی تھی۔ ڈاکٹر آئے، حکیم آئے طرح طرح کے علاج ہوئے لیکن مریضہ کا چہرہ اترتا ہی چلا گیا۔ وہ خود کچھ نہ کہتی تھی چپ تھی یہاں تک کہ اس کی زندگی کے لالے پڑ گئے۔ چہرہ بھیانک ہو گیا۔ یہ وہی خوبصورت اور حسن کا پتلہ عورت تھی جو کبھی شوہر کی نظروں میں سمائی رہتی تھی۔ آج اس کا یہ حال دیکھ کر شوہر بھی بچنے لگا۔ مرد کی محبت بے نقاب ہو گئی۔ اور لوگوں نے سمجھ لیا کہ مرد عورت کے حسن سے اور اس کی جوانی سے محبت کرتا ہے۔ عورت سے نہیں۔

سخت بیماری کے باوجود وہ سب کچھ سمجھ رہی تھی۔ مگر کرتی کیا۔ اتفاق کی بات کہ اس نے ایک دن کسی اخبار میں کچھ پڑھ لیا۔ وہ سمجھ گئی اُسے کیا بیماری ہے۔ اور اس کا انجام کیا ہو گا۔ ساتھ ہی اُسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس بیماری کا اصلی علاج کیا ہے۔ چنانچہ اس نے مسہری پر لیٹے لیٹے ایک خط لکھا اور نہ جانے کہاں سے دوا کا پارسل منگا لیا۔ اور دوا شروع کر دی۔ آہستہ آہستہ لوگوں نے دیکھا اُس کے چہرہ پر پھر رونق آنے لگی اور رفتہ رفتہ وہ پھر خوبصورت پھول بن گئی۔ اور وہی شوہر جو کل تک الگ الگ رہنے لگا تھا۔ پروانہ کی طرح اس کے چاروں طرف چھا گیا۔ (شمع پھر روشن ہو گئی تھی۔ اور پروانہ کا آنا ضروری ہو گیا تھا)

بہت دن بعد پتہ چلا کہ وہ سیلان الرحم یعنی لیکوریا کی بیمار تھی۔ اور وقت بیوقت سفید پانی خارج ہونے لگا تھا جو رفتہ رفتہ بڑھ گیا اور بیماری خطرناک صورت اختیار کر گئی۔ چہرہ کا رنگ روپ اڑ گیا۔ اتفاق سے اس نے دوا "روک" کی خبر اخبار میں پڑھ لی جس سے اُسے معلوم ہوا کہ لیکوریا کی بیماری کے لئے یہ دوا سب سے بڑا علاج ہے چنانچہ اُس نے

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ ۲۴ بی دہلی کو

خط لکھ کر دوا روک کی شیشی بذریعہ وی پی پارسل منگائی اور استعمال کی۔ تیسرے دن سفید پانی کا آنا بند ہو گیا۔ اور پوری شیشی ختم ہونے تک بیماری کا نام نشان بھی نہ رہا۔ اُس کے بعد اس نے بے شمار سہیلیوں کو دوا روک کا حال بتایا۔ اور ان میں سے جس کسی کو بھی لیکوریا کی بیماری تھی۔ اُس نے دوا روک کے استعمال سے صحت حاصل کر لی۔ ایک شیشی دوا روک کی قیمت تین روپے ہے۔ پارسل پر محصول سات آنے لگتا ہے۔

نوٹ: سیلان الرحم یعنی لیکوریا کی بیماری کیلئے دوا روک اتنی بہترین ثابت ہوئی ہے کہ آج ہزاروں حکیم ڈاکٹر لیکوریا کی مریض عورتوں کو صرف اسی دوا کا مشورہ دیتے ہیں کیونکہ دوا روک کے استعمال شروع کرنے کے تیسرے ہی دن سفید پانی گرنا بند ہو جاتا ہے۔ لہٰذا جن عورتوں کو ضرورت ہو انہیں مندرجہ بالا پتہ پر خط لکھ کر دوا روک منگا لینی چاہیئے۔ ایک ہی شیشی سے یہ بیماری ختم ہو جاتی ہے۔

تار کا پتہ: "زنانہ دواخانہ" دہلی

ٹیلی فون نمبر ۶۲۶۸

دماغ میں کیل ٹھونک دی



جریان کی بیماری کا افسوسناک انجام

اگر کسی مرد کو پیشاب سے پہلے یا پیشاب کرنے کے بعد سفید قطرہ آتا ہو یا دھات گرنے کی شکایت ہو یا رات کو سوتے میں خواب (یعنی احتلام) ہو جاتا ہو تو اس کا نہایت آسان علاج یہ ہے کہ وہ صرف ایک شیشی دوا "جوہر اعظم" استعمال کرے۔ یہ وہ دوا ہے جس نے یورپ اور امریکہ سے آئی ہوئی دواؤں سے ٹکر لی ہے۔ اور ان سے بہتر ثابت ہوئی ہے۔ جریان کا مرض دور کرنے کیلئے ابھی تک اس سے بہتر علاج نہیں بن سکا ہے۔ ایک شیشی میں پوری دوا ہوتی ہے۔ اگرچہ اپنا اثر مریض پر چوتھے دن صاف طور سے ظاہر کر دیتی ہے۔ لیکن مریض کو چاہیئے کہ وہ پوری شیشی استعمال کرے تاکہ مرض کی اصلی جڑ ختم ہو جائے۔ سینکڑوں مریض اس دوا سے تندرست ہو چکے ہیں۔ اور بڑی تیزی کے ساتھ ملک میں یہ دوا فروخت ہو رہی ہے۔ لاتعداد حکیم اور ڈاکٹر اس دوا کو اپنے مریضوں پر استعمال کرا کے نیک نامی حاصل کر رہے ہیں۔ ایک شیشی "جوہر اعظم" کی قیمت تین روپے آٹھ آنے ہے ایک شیشی ایک مریض کو تندرست کر دیتی ہے۔ اور اس سے بڑے بڑے پرانے مریضوں کو تندرستی ہو گئی ہے۔ جن لوگوں کو ضرورت ہو وہ

منیجر زنانہ دواخانہ۔ اے بی ۳۴ دہلی

کے پتہ پر خط لکھ کر یہ دوا بذریعہ وی پی پارسل منگا لیجئے۔ اس دوا پر پارسل کا محصول معاف ہے

(بقیہ صفحہ ۶۸)

وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ سہراب مودی جو تاریخی فلموں کے تاریخی ڈائریکٹر ہیں پہلا ہندوستانی تاریخی فلم بنا کر فلم ڈائریکٹروں کی پہلی صف میں اپنے لئے سب سے نمایاں جگہ حاصل کر چکے ہیں۔ انہوں نے اپنی ڈائرکشن کے اعجاز اور اس زمانہ کی تاریخ کے وسیع مطالعے کی مدد سے سکندر کو ایک ایسا فلم بنا دیا ہے جو اہل ہندوستان ہی نہیں یورپ بھی بڑی مشکل سے پیش کر سکتا ہے۔ راجہ پورس کے روپ میں ان کی بےنظیر اداکاری، بہترین تمثیل ماضی میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ نہ صرف یہ کہ انہوں نے ماضی کے ایک انسان کی روح کو انتہائی کامیابی سے اپنے جسم میں داخل کر لیا ہے بلکہ انہوں نے مکالمے بھی اس انداز سے ادا کئے ہیں کہ جو لفظ ان کے ہونٹوں سے نکلتا ہے وہ نشتر بن کر سننے والوں کے دلوں میں پیوست ہو جاتا ہے۔ پرتھوی راج کو اپنے فن کے جوہر دکھانے کا سکندر میں بہترین موقع ملا ہے۔ رخسانہ کی حیثیت سے ونمالا بھی حد درجہ کامیاب ہے۔ سکندر کو انتہائی بلند مرتبہ فلم بنانے کے لئے سہراب مودی نے اسے بیسیوں درخشاں ستاروں مثلاً مینا، صادق علی، شیلا، ظہور راجہ، لالہ یعقوب۔ کے این سنگھ، شاکر، جلّو وغیرہ سے مزین کیا ہے اس کے جنگی مناظر میں بارہ ہزار نفوس نے حصہ لیا ہے۔ سکندر، ہماری فلمی صنعت کا ناقابل فراموش کارنامہ ہے جس کے لئے سہراب مودی کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ یہ ان کی ڈائرکشن، پروڈکشن اور اداکاری کا اتنا بلند پایہ نمونہ ہے جس کی نظیر ہماری فلمی تاریخ اپنے کیسہ میں نہیں رکھتی۔

"پردہ نشین" میں نئے چہرے

ہندوستان فلم کارپوریشن کے پہلے سوشل فلم "پردہ نشین" کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہونہار، اولوالعزم مگر گمنام آرٹسٹوں کو اپنے جوہر دکھانے کا موقع دیا گیا ہے چنانچہ حسینہ۔ کنیزہ۔ فیروز بیگم۔ وید مترا۔ شرما۔ نوازش وغیرہ "پردہ نشین" میں جس خوبی سے کام کر رہے ہیں اسے دیکھ کر یہ پیش گوئی باطمینان کی جا سکتی ہے کہ اس فلم کے بعد ان کا شمار صف اوّل کے آرٹسٹوں میں ہونے لگے گا۔ یہ فلم اردو سٹڈیو میں مسٹر حافظ جی کی نگرانی میں بڑی مستعدی سے تیار ہو رہا ہے۔

سکھو بائی کے اداکار

فلم "سکھو بائی" میں تین باکمال ایکٹرسیں اپنے جوہر پیش کر رہی ہیں۔

اس فلم کو پربھات کے سوانح حیات کے سلسلے کا بالکل تازہ ترین شاہکار ہونے کا فخر حاصل ہے جسے دور حاضر سے بہت بڑا تعلق ہے اور اس کی یہ ایک خصوصیت ہے۔ ہنسا جس کے ہونٹوں کا ایک تبسم دلوں پر بجلیاں گرانے میں مشہور ہے ایک حسین دلربا اور وفا شعار تینی کی شکل میں آپ کے سامنے پیش کی جا رہی ہے۔ ہر وہ شخص جس نے ہنسا کو بذات خود پردۂ فلم پر یا اس کے علاوہ کہیں اور دیکھا ہے وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ سکھو میں اس کا کیریکٹر بالکل قدرتی ہے اور تصنع اور بناوٹ سے کوسوں دور ہے گویا دوسرے لفظوں میں یہ کیریکٹر اس کی اپنی زندگی کا ایک دلکش چربہ ہے۔ دوسری گوری ہے۔ فلم تکارام میں تکارام کی تینی کا پارٹ لوگوں کے دلوں سے اب تک محو نہیں ہوا ہے۔ اس کی تعریف کے پل کبھی ٹوٹ نہیں سکتے اور وہ لوگ جو سکھو کی تاریخ سے کسی قدر واقف ہیں وہ بھی سکھو میں گوری کے پارٹ کا صحیح تصویر کھینچنے میں ناکام نہیں رہ سکتے۔ یہ گوری وہی تکارام کی تینی ہے جو اپنے کمالات کی گہرائیوں میں غوطہ مار کر آپ کی نظروں سے اوجھل ہوئی اور اب سکھو میں پھر اُبھری ہے تیسری باکمال لڑکی جو سکھو بائی میں آپ کے قلوب کو شادابی بخشیگی وہ سمترا ہے۔ وہی سمترا جس نے اپنی سحرکاریوں سے فلم دھیا نیشور میں اس کی بہن منا بائی کے روپ میں آپ سے خراج تحسین حاصل کیا تھا اس فلم میں سکھو کے پتی کا پارٹ بھی بہت اہمیت رکھتا ہے اُس کا سہرا شنکر کلکرنی کے سر ہے جس نے پربھات کے مشہور فلم گوپال کرشنا میں رادھا کے پتی کا نہایت مخلص اور ہمدردانہ پارٹ بڑی حسن و خوبی سے ادا کیا ہے۔ لوگوں کے دماغ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں گے سکھو بائی عنقریب ہی آپ کے شہر میں پیش ہونے والا ہے اسے پربھات کے مایہ ناز ڈائریکٹرز داملے اور فتح لال کے ہاتھوں تکمیل و تشکیل کا فخر حاصل ہے۔ اس کی خوبیوں کا اندازہ صرف دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا ہے علی الخصوص جبکہ ڈائریکٹر راجہ نینی نے بھی اپنے دماغی جوہر سکھو بائی کی تکمیل میں صرف کر دیئے ہوں۔

شالامار پکچرز



شالامار پکچرز کا پہلا شاہکار "ایک رات" دسمبر کے اواخر تک مکمل ہو جائے گا۔ مسٹر ڈبلیو۔ زیڈ۔ احمد اسے کامیاب بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایک انٹرویو میں ڈائریکٹر احمد نے بتایا کہ اگرچہ اس فلم میں ایک نیا چہرہ بھی پیش کیا جا رہا ہے تاہم افسانے کے لحاظ سے یہ کہانی بہت زیادہ موثر اور کامیاب ثابت ہوگی یہ نیا چہرہ نینا" کا ہے۔ مسٹر احمد ابھی بالکل نوجوان ہیں تاہم آپ مدت سے صنعت فلم سازی سے متعلق رہے ہیں اس لئے امید کی جاتی ہے کہ آپ کی یہ پیشکش بے حد کشش انگیز ثابت ہوگی۔

"گناہ معصوم" تکمیل کے قریب ہے

ڈائرکٹر حسنین کا یہ مایہ ناز اسلامی جواہر پارہ "گناہ معصوم" جس کا ہر خاص و عام میں ایک مدت مدید سے شدید بے چینی کے ساتھ انتظار کیا جا رہا ہے۔ اب قریب قریب پایہ تکمیل کو پہنچ چکا ہے بس اب عنقریب ہی اپنی جملہ رعنائیوں اور ضیا باریوں کے ساتھ فلمی دنیا کو منور کرنے کے لئے آسمان فلم پر نمودار ہوا چاہتا ہے۔ "معصوم" میں نظر خاں۔ رمولا۔ انیس۔ مہتاب۔ امجد۔ خواجہ صاحب اور نظیر کاشمیری جیسے درخشندہ ستاروں کا شاندار اجتماع یقیناً بے نظیر ہوگا۔

چورنگی

ڈائرکٹر ایس فضلی نے اپنے اولیں اخلاقی مزاحیہ شاہکار چورنگی کی باقاعدہ شوٹنگ نانی ورڈ اسٹوڈیو میں شروع کر دی ہے۔ چورنگی اُردو اور بنگلہ دو زبانوں میں بیک وقت تیار ہو رہا ہے چورنگی کا ایک امتیازی پہلو یہ ہے کہ اس کے گانے دنیائے شاعری کے ممتاز شاعر حضرت آنند لکھنوی کے ممنون قلم ہیں مزید چورنگی (بنگلہ) کے گانوں اور میوزک ڈائرکشن کیلئے بنگال کے جادو رقم آتش نوا شاعر جناب قاضی نذر الاسلام صاحب کی خدمات حاصل کر لی گئی ہیں چورنگی اُردو کے اداکاروں میں صرف ابتک انیس مہتاب اور خواجہ صابر کا نام سنا گیا ہے اور بنگال کی محبوب مشہور چھایا دیوی اور نیو تھیٹرز کی شہرت یافتہ مینا (چورنگی، بنگلہ میں) نوٹ ہم کر دلانے کیلئے

رفتارِ زمانہ

عالمگیر واقعات پر ماہانہ تبصرہ

از — شبلی بی کام

روس و جرمنی

مہینہ روس کے لئے بہت زیادہ تشویشناک ثابت ہوا۔ بالشویک سپاہی اگرچہ نازی قشون قاہرہ کا جان توڑ مقابلہ کر رہے ہیں اور اپنے ملک کی آزادی و حریت کو برقرار رکھنے کا عزم صمیم کر چکے ہیں تاہم نازیوں کی پیش قدمی جاری ہے اور وہ روس کے بعض اہم ترین صنعتی و زرعی علاقوں پر قابض بھی ہو چکے ہیں۔ یہ لڑائی دو ہزار میل طویل محاذ پر لڑی جا رہی ہے اور چونکہ ہٹلر کے اقدامات کافی حد تک پر پیچ اور ناقابل فہم رہے اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ روس کے جرنیل ہر طرف سے نازی سیلاب کی روک تھام نہ کر سکے چنانچہ جرمن فوجوں کو روس کی قلعہ بندیاں پھاند کر آگے بڑھ جانے کا موقع مل گیا اور موجودہ صورت حال یہ ہے کہ نازیوں کا دباؤ اب زیادہ تر جنوب کی طرف پڑ رہا ہے۔ اس دباؤ کے تین رستے ہیں ایک بحر ازوف کے کنارے کے ساتھ ساتھ روستاف کی طرف دوسرے کریمیا کے خلاف۔ تیسرے شمال میں سٹالینو اور ڈونیٹز کی ترائی کی طرف۔ تازہ ترین اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ جرمن فوجیں کریمیا اور سٹالینو میں داخل ہو چکی ہیں۔ جس کے نتیجہ میں نازیوں کا میمنہ، میسرہ اور عقب بڑی حد تک محفوظ ہو چکا ہے اور اب وہ نہایت آسانی کے ساتھ کوہ قاف کی طرف پیش قدمی کر سکتے ہیں۔ یوکرین اور کریمیا پر جرمن قبضہ کے یہ معنی ہیں کہ نہ صرف نازیوں کے خطوط رسل و رسائل محفوظ ہو جائیں گے۔ بلکہ وہ بحیرۂ ازوف اور بحیرۂ اسود سے بھی مزید اقدامات کے لئے استفادہ کر سکیں گے۔ تاہم مارشل تموشنکو روس کے جنوبی محاذ کو محفوظ رکھنے کے لئے سر توڑ کوشش کر رہا ہے لیکن اگر وہ کامیاب نہ ہوا تو جنوب مشرقی روس کا مستقبل جس درجہ تشویشناک ہو جائے گا وہ محتاج تصریح نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اتحادی فوجیں ایران کی روسی سرحد پر جمع ہو رہی ہیں تاکہ اگر آئندہ موسم بہار تک جنگ کا طوفان اس علاقے کا رخ کرے تو اُسے وہیں روکنے کی کوشش کی جائے۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہٹلر برفباری سے پہلے ہی روس کا خاتمہ کر دینا چاہتا ہے۔ لیکن کیا وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکے گا؟ جب ہم روس کی وسعت اور اتحادی فوجوں کے عزم و ارادہ پر غور کرتے ہیں تو اس سوال کا جواب نفی میں دینا پڑتا ہے روس کے جنگی وسائل بہت زیادہ وسیع ہیں۔ اس کے علاوہ بالشویک فوجوں کی مستعدی اور ہمت و شجاعت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ پھر جمہوری ممالک بھی روس کی زیادہ سے زیادہ امداد پر کمربستہ نظر آتے ہیں۔ ان حالات میں یہ کہنا ناممکن ہے کہ جرمنی آئندہ چند ماہ تک روس کے طول و عرض پر چھا جانے کے قابل ہو جائیگا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جنگ کا سیلاب اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ مشرق کی طرف امڈا چلا آ رہا ہے اس لئے عجب نہیں کہ آئندہ سال جنگ کا محاذ مغرب کی بجائے مشرق میں قائم ہو جائے اور بحیرۂ کیسپین سے لے کر دریائے نیل تک ایک ایسی خونریز جنگ ہو جس کے نتائج و اثرات سے بھی انسانیت کانپ اٹھتی ہے۔

جاپان کے عزائم

معلوم ہوتا ہے کہ یورپ میں جرمنی کی جارحانہ پیش قدمی نے جاپان کے سمندِ شوق پر تازیانہ لگایا ہے اور وہ اپنی معاشی و تجارتی مجبوریوں کے باوجود اس صورت حال سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ چنانچہ ایک طرف اگر وہ مجروح و زخمی روس کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کے منصوبے باندھ رہا ہے تو دوسری طرف بحرالکاہل کے امریکی و برطانی مفاد سے الجھنے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ جب سے توجو (وزیر اعظم) برسر اقتدار آیا ہے جاپان کی جنگی سرگرمیوں میں اضافہ نظر آتا ہے اور وہ غیر فوجی ہونے کے باوجود اپنے ملک کو اسی راہ پر چلانا چاہتا ہے

خاص نمبر کی ظاہری شکل و صورت بھی از حد باصرہ نواز ہے

جس پر پرنس کنوئی اور مسٹر مٹسوکا نے اسے ڈال رکھا تھا۔ آج (یکم نومبر) کی ایک اطلاع مظہر ہے کہ امیر البحر لسٹراڈ (جرمن نمائندہ) نے حکومت جاپان کو مشورہ دیا ہے کہ وہ آسٹریلیا پر حملہ کر دے۔ لیکن اول تو امید نہیں کہ جاپان اس مضحکہ خیز مشورہ کو درخور اعتنا سمجھے۔ لیکن اگر وہ نازی غداروں کے بھرے میں آ گیا تو بلاشبہ اس کی قوت کا شیرازہ بحرالکاہل کی موجوں پر بکھرتا ہوا نظر آئے گا۔ جاپان زیادہ سے زیادہ اپنی بحری طاقت پر ناز کر سکتا ہے لیکن جب ہم مسٹر کرٹن وزیر اعظم کی زبانی آسٹریلیا کے استحکامات کی تفصیل سنتے ہیں تو جاپان کے عزائم کی کوئی حقیقت نظر نہیں آتی۔ پھر اس سلسلے میں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ جنگ چین نے جاپان کو تقریباً دیوالیہ بنا رکھا ہے اور اب وہ اس قابل نہیں کہ کسی طویل جنگ میں شریک ہو سکے۔ اسے زیادہ سے زیادہ جرمنی و اطالیہ سے امید ہو سکتی تھی کہ وہ "محوری تکڈم" کی رُو سے اس کی مدد کریں گے۔ لیکن اطالیہ کی طاقت تو افریقہ کے صحراؤں میں ختم ہو چکی ہے اور جرمنی کو بحر اوقیانوس اور روس کے محاذوں ہی سے فرصت نہیں ہے اس لئے اگر جاپان نے برطانیہ و امریکہ سے ٹکر لینے کی کوشش کی تو وہ "ہیراکری" (جاپانی طریقہ خودکشی) کا مرتکب ہوگا۔ اور بہت ممکن ہے کہ وہ صدیوں تک دوبارہ نہ ابھر سکے۔ امریکہ و برطانیہ نے اب تک جاپان کی اچھل کود کو زیادہ وقعت نہیں دی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر وہ مشرق بعید کی طرف متوجہ ہوئے تو ہٹلر کو یورپ میں کھلی چھٹی مل جائے گی اور وہ جمہوری ممالک کی مصروفیات سے فائدہ اٹھا کر اپنے عزائم کو عملی جامہ پہنانے پر قادر ہو جائے گا۔ لیکن اب ایک تو جنگ کا سیلاب خودبخود مشرق کی طرف آ رہا ہے۔ دوسرے جاپان کی پیش قدمیاں بہت زیادہ تشویشناک ثابت ہو رہی ہیں اور اگر بروقت ان کی روک تھام نہ کی گئی تو اندیشہ ہے کہ مشرق بعید کے حالات نازک مرحلے پر پہنچ جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اب امریکہ و برطانیہ دونوں جاپانی فتنے کو سر اٹھانے سے پہلے ہی کچل دینے پر آمادہ نظر آتے ہیں لیکن اگر جاپان کی جنگ شروع ہو گئی تو ہندوستان بہرحال فائدے میں رہے گا کیونکہ اس لڑائی میں جاپان کی شکست یقینی ہے اور اگر جاپان ہار گیا تو مشرق بعید کی طرف سے ہندوستان ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جائے گا۔

مسٹر روزویلٹ کی تقریر

اب تک امریکہ نے برطانیہ کو تجارتی سہولتیں فراہم کرنے کے سوا جنگ میں کوئی عملی حصہ نہیں لیا۔ تاہم معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف ہٹلر کا بڑھتا ہوا اقتدار اور دوسری طرف جاپان کے خوفناک عزائم "وائٹ ہاؤس" کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکے۔ اور اب امریکہ نے محسوس کر لیا ہے کہ میدان جنگ میں نہ کودا تو بہت ممکن ہے کہ جنگ کا طوفان مستقبل کو بھی معرض خطر میں ڈال دے۔ اس مہینے بحر اوقیانوس میں امریکہ کے متعدد جہازوں کو جرمن تحت البحر کشتیوں نے ہدف بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ ۲۷ اکتوبر کو مسٹر روزویلٹ نے ایک تقریر نشر کرتے ہوئے کہا: "ہٹلر کے تارپیڈو کا رخ ہر امریکی کی طرف ہے"۔ اس کے علاوہ امریکہ چونکہ چین کی مالی و تجارتی امداد کر رہا ہے اس لئے جاپان اس کے بحرالکاہلی مفاد کو نقصان پہنچانے کے درپے ہے الغرض حالات اب ایسی کروٹ لے رہے ہیں جس کے نتیجہ میں امریکہ بھی کیل کانٹے سے لیس ہو کر میدان کارزار میں کودنے پر آمادہ نظر آتا ہے۔ اس کے ثبوت میں مسٹر روزویلٹ کی وہ تقریر پیش کی جا سکتی ہے جو آپ نے "نیوی ڈے" کے موقع پر براڈکاسٹ کی۔ آپ نے کہا۔ "ہٹلر سمندر میں امریکیوں کو خوفزدہ کرنا چاہتا ہے لیکن اس نے امریکہ کے عزائم کا غلط اندازہ لگایا ہے۔ اب حالات ناقابل برداشت ہو چکے ہیں"۔ پھر مسٹر روزویلٹ نے یہ حیرت انگیز انکشاف کیا کہ ان کے پاس ایک خفیہ نقشہ ہے جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہٹلر وسطی اور جنوبی امریکہ کو بھی اپنے "نئے نظام" میں شامل کرنا چاہتا ہے اس کے بعد مسٹر روزویلٹ نے بتایا کہ ہٹلر تمام موجودہ مذاہب کو مٹا کر نازی ازم کو فروغ دینا چاہتا ہے۔ اس کا منشا یہ ہے کہ صلیب کی جگہ "سواستکا" کا جھنڈا لہرائے اور رحیم و کریم خدا کی جگہ لوہے اور خون کا دیوتا دنیا پر حکومت کرے"۔ الغرض مسٹر روزویلٹ نے امریکیوں کو ان خطرات سے آگاہ کیا جو جنگ میں شریک نہ ہونے کی وجہ سے انہیں پیش آ سکتے ہیں۔ اس تقریر کے بعد امید کی جاتی ہے کہ امریکہ کی رائے عامہ اس راہ پر آ جائے گی جو جنگ کی منزل سے بہت قریب ہے۔ سردست "غیر جانبداری" (باقی برصفحہ ۷۷)

سفید بال تھے - ایک ہفتہ میں سیاہ ہو گئے

سفید بالوں کو ہمیشہ کیلئے کالا کردینا اور آئندہ کالا بال نکلنا اب بہت آسان ہو گیا۔ لگانے کا خضاب سفید بالوں کو صرف ایک ہفتہ کے لئے ہے۔ اور پھر سفیدی آجاتی ہے۔ لیکن تحقیقات کے بعد اب ایک ایسی عجیب و غریب دوا ایجاد ہوئی ہے جس کے کھانے سے سفید بال تے ہیں۔ اور پھر کالے ہی رہتے ہیں۔ کیونکہ بالوں کی جڑیں تک سیاہ ہو جاتی ہیں۔ اس دوا کا نام "کیشول" ہے۔ تجربہ سے یہ ثابت دوا کیشول کے صرف ایک ہفتہ استعمال کر لینے سے ہی سفید بالوں پر سیاہی پھیلنے لگتی ہے۔ اور پوری شیشی "کیشول" کی استعمال کرنے کا مطلب ہے کہ بال کالے بھی ہو جائیں گے اور آئندہ کالے ہی نکلیں گے۔

چار روپے میں تمام بال سیاہ ہو جائینگے دوا کیشول قطعی بے ضرر ہے۔ عام طور پر لوگ اسے کھانے کا خضاب کہنے لگے ہیں۔ اور یہ کسی حال میں استعمال کرنے والے کو نقصان نہیں کرتا۔ دنیا میں اس سے بہتر خضاب شاید آپ حاصل نہ کر سکیں گے۔ ایک شیشی کیشول جو ایک ضرورتمند کے لئے قطعی کافی ہے اسکی قیمت للعہ ہے۔ **منیجر زنانہ دواخانہ اے۔ بی ۳۴ دہلی** کو خط لکھ کر دوا کیشول بذریعہ وی۔ پی پارسل منگا لیجئے۔ رسل پر گیارہ آنے محصول خرچ ہوگا۔ اور اس معمولی رقم میں آپ اپنی ضرورت کا ایک لافانی تحفہ حاصل کر لینگے کیونکہ اس دوا کے استعمال سے لگانیکے خضاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ بال از خود کالے نکلنے لگتے ہیں۔

عورت کی ظاہری جوانی

عورت کی شروع جوانی میں ہی اگر اس کا سینہ یعنی پستان ڈھیلے اور نرم ہو کر نیچے کو گرے ہوئے معلوم ہوں تو یہ بہت بدصورتی کہلاتی ہے۔ ایسی عورت میں شباب کی کشش ختم ہو جاتی ہے یہ خرابی عورت کے سینہ میں اسوقت پیدا ہوتی ہے جب وہ ہر سال بچوں کو دودھ پلانے پر مجبور ہو جائے یا کسی بیماری یا بد احتیاطی کے باعث بھی عورت کا سینہ (یعنی پستان) ڈھیلے ہو کر بدنما معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اور وہ عین جوانی میں ہی شباب کی کشش ختم کر بیٹھتی ہے۔

ایسی عورت پھر نوجوان لڑکی نظر آسکتی ہے سائنس کی جدید کرشمہ سازی کی بدولت ایک ایسی بیش بہا دوا تیار ہوئی ہے۔ جس کے استعمال سے عورت کے ڈھیلے اور نرم اور نیچے کو گرے ہوئے پستان دوبارہ گول اور سخت ہو کر عورت کو از سر نو جوان لڑکی کے روپ میں پیش کرنے لگتے ہیں۔ اور اس پر شباب کی رنگینیاں پھر اپنی بہار پھیلا دیتی ہیں۔ یہ لگانے کی دوا ہے اور اسکا نام "برسٹین" ہے۔ یہ وہی دوا ہے جس کی بدولت ابتک سینکڑوں عورتیں اپنے سینہ میں دوبارہ شباب کا رنگ بھر چکی ہیں۔ اور اب وہ کافی عمر کے باوجود نوخیز لڑکیاں نظر آتی ہیں۔ دوا کا سب سے زبردست ثبوت یہ ہے کہ اس کے ہر روز کا استعمال عورت کو ثابت کرتا رہتا ہے کہ کتنی جلدی اس کے سینہ میں دوبارہ اُبھار اور سختی پیدا ہو رہی ہے۔ جن عورتوں کو ضرورت ہو ——— وہ

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ اے۔ بی ۳۴ دہلی کے پتہ پر خط لکھ کر ایک شیشی "برسٹین" بذریعہ وی۔ پی پارسل منگا لیں ایک شیشی ایک عورت کو پوری طرح جوان لڑکی بنا دیگی اور اس کے سینہ کی یہ سب خرابیاں دور ہو کر مستقل ابھار اور سختی پیدا کر دیگی۔ ایک شیشی "برسٹین" کی قیمت چار روپے پندرہ آنے ہے۔ پارسل پر صرف سات آنے محصول لگیگا۔ نوٹ:۔ اگر کوئی بچہ عورت کی گود میں ہے۔ تب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ دوا بچے کے دودھ پر کوئی اثر نہیں ڈالتی۔ اور بچہ نہایت اطمینان کے ساتھ دودھ پیتا رہیگا۔ کیونکہ دوا کسی حال میں نقصان نہیں کرتی۔

عورت ہر مہینہ روتی ہے

عجیب آفت ہے



تیرہ چودہ سال کی نوجوان لڑکی سے لیکر چالیس سال عمر تک کی عورت کیلئے ہر مہینہ ماہواری ایام کا بغیر کسی درد اور بغیر تکلیف کے باقاعدہ آنا بہت ضروری ہے لیکن اگر کسی عورت کو ماہواری آنے میں تکلیف اور درد ہوتا ہے یا ماہواری خون باقاعدہ نہیں آتا۔ یا مہینہ میں دو بار یا دو تین مہینے میں ایکبار آتا ہے یا زیادہ دن تک آتا رہتا ہے یا ماہواری کے دنوں میں اسکی کمر اور ناف تلوں میں یا بدن میں سخت درد ہو جاتا ہے یا کسی عورت کو ماہواری رک رک کر آتی ہے۔ یا عرصہ سے بند ہے یا ماہواری کی اور کوئی خرابی ہے تو اسکا مطلب یہ ہے کہ ایسی عورت بہت جلد کسی خطرناک مرض کا شکار ہو جائیگی اور پھر اسکا علاج بیحد دشوار ہو جائیگا۔ لہذا ماہواری کی خرابی اور اس زمانہ کے درد وغیرہ کو ہرگز معمولی بات نہ سمجھئے۔ بلکہ جلد سے جلد ماہواری کی ان خرابیوں کا علاج کر لینا چاہیئے۔

ماہواری کو باقاعدہ کرنیکی ترکیب یہ ہے کہ ایسی بیمار عورت جو مندرجہ بالا خرابیوں میں یا ماہواری کی کمی تکلیف میں مبتلا ہو اُسکو ایک ایسی دوا "کورس" استعمال کرا دیجائے۔ اس دوا کے استعمال کرنیکے بعد عورت کو ہر مہینہ بغیر درد اور بغیر کسی تکلیف کے ماہواری باقاعدہ ٹھیک وقت پر اور صحیح مقدار میں آنے لگتی ہے اور اس سے ہر قسم کی ماہواری کی خرابی اور بے قاعدگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ نہایت کارگر دوا ہے۔ اور تقریباً بارہ تیرہ سال سے ہندوستانی عورتوں میں مشہور ہے۔ ایک شیشی دوا کورس کی قیمت دو روپے آٹھ آنے ہے۔

لیڈی ڈاکٹر زنانہ دواخانہ نمبر ۱ بی ۲۴ **دہلی** کے پتہ پر خط لکھ کر بذریعہ وی۔ پی پارسل منگالیں۔ پارسل پر سات آنے محصول ڈاک خرچ ہوگا۔

(بقیہ صفحہ ۴۷)

کے قانون کو منسوخ کرکے امریکی تاجروں کو مسلح کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اگر یہ تجویز عمل میں آگئی تو بحر اوقیانوس میں امریکی جہاز بے فکری سے نقل و حرکت کر سکیں گے۔

سیاسیات ہند

ماہ سیاسیات ہند کا سب سے اہم واقعہ یہ ہے کہ مسلم لیگ نے مرکزی اسمبلی کا مقاطعہ کر دیا۔ "واک آؤٹ" سے پہلے مسٹر جناح نے ایک مختصر مگر مدلل تقریر کی جس میں اپنے اقدام کے وجوہ پر روشنی ڈالی۔ آپ نے کہا۔ "ہم شروع ہی سے کہتے چلے آئے ہیں کہ اصل مسئلہ کا تصفیہ بعد میں ہوگا۔ فی الحال اگر حکومت کو ہمارے تعاون کی ضرورت ہے تو ہمیں مرکزی اور صوبائی نظام حکومت میں جائز تناسب سے شریک کیا جائے لیکن حکومت نے اس مطالبہ کی پروا نہ کرتے ہوئے وائسرائے کی انتظامیہ میں ہمارے مشورہ کے بغیر توسیع کر دی اس لئے ہم احتجاج کے طور پر مرکزی اسمبلی کے حالیہ اجلاس کا مقاطعہ کر رہے ہیں۔" مسٹر جناح کے الفاظ کسی تشریح کے محتاج نہیں۔ مسلم لیگ چاہتی تھی کہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل اور ڈیفنس ایڈوائزری کمیٹی میں مسلمانوں کو پچاس فیصدی حصہ دیا جائے لیکن حکومت نے اس مطالبہ کی اہمیت پر غور نہ کیا اس لئے اگر مسٹر جناح نے اس مرتبہ مرکزی اسمبلی کی کارروائی میں حصہ نہ لینے کا فیصلہ کیا ہے تو وہ ہر لحاظ سے مستحسن اور جائز ہے۔ مخالف طبقہ مسلم لیگ کے اس اقدام کو کانگرس کی تقلید قرار دے رہا ہے حالانکہ دونوں کے نقطۂ نظر میں بعد المشرقین ہے۔ کانگرس برطانیہ کی جنگی امداد کرنے سے انکار کر رہی ہے لیکن مسلم لیگ ناراضی کے باوجود اتحادیوں کا ساتھ دینے پر آمادہ ہے۔

کانگرس کے ستیہ گرہ کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اکثر کانگرسی جیل سے رہا ہوتے ہی اس بے معنی حرکت سے بیزار نظر آتے ہیں چنانچہ مسٹر ستیہ مورتی جیسے گاندھی بھگت کانگرس کو مشورہ دے رہے ہیں کہ عہدے دوبارہ قبول کر لئے جائیں۔ لیکن مسٹر گاندھی اپنے فیصلہ پر مصر ہیں اور انھوں نے صاف کہدیا ہے کہ جو لوگ میری تجویز کو قابل عمل نہیں سمجھتے وہ کانگرس سے علیحدہ ہو جائیں۔ دوسرے الفاظ میں کانگرسیوں کے سامنے دو ہی رستے ہیں۔ تو وہ مسٹر گاندھی کو اپنا روحانی پیشوا تسلیم کرکے ان کی اندھا دھند تقلید کریں خواہ ایسا کرنے میں ملک و ملت کے مفاد کو کتنا ہی ضعف اور نقصان پہنچے یا اپنے ضمیر کو شمع راہ بنائیں اور اپنے اپنے طریق پر ملکی سیاست میں حصہ لیں چنانچہ بعض کانگرسیوں نے مسٹر گاندھی سے قطع تعلق بھی کر لیا ہے وہ اپنے معتقدات کو کانگرسیوں میں پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انہی "مخرجین" میں سے مسٹر منشی بھی ہیں جو وزارت بمبئی کی کرسی پر متمکن رہ چکے ہیں انھوں نے پاکستان کے مقابلہ میں اکھنڈ بھارت کا پاکھنڈ کھڑا کیا ہے اور رام راجیہ کے قیام کے لئے تشدد کا کھلے بندوں پرچار کر رہے ہیں۔ پچھلے دنوں آپ پنجاب میں تشریف لائے تھے انھوں نے جو تقریریں کیں اس کے ایک ایک فقرہ سے فرقہ پرستی تعصب اور اسلام دشمنی کی بو آتی ہے کاش وہ پاکستان پر تبصرہ کرنے سے قبل یہ غور فرما لیتے کہ یہ تحریک دراصل ردعمل ہے ان مظالم کی جن کا تختۂ مشق مسلمانوں کو ہندو اکثریت کے صوبوں میں بنایا جاتا ہے۔ اگر مسلمانوں کے بنیادی مطالبات تسلیم کر لئے جائیں تو ظاہر ہے کہ پاکستان کے قیام کی ضرورت ہی پیش نہ آئیگی اس کے علاوہ مسٹر منشی کو سوچنا چاہئے کہ آخر اس قسم کی زہر چکاں تقریروں سے ان کا مقصد کیا ہے؟ اگر وہ مسلمانوں کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں خطرہ ہے کہ ان کی خواہش پوری نہ ہو سکے گی کیونکہ مسلمان بہرحال اپنے صحیح و صالح اور جائز حقوق حاصل کرنے کا عزم صمیم کر چکے ہیں۔

لاہور ——— یکم نومبر ۱۹۴۱ء

رازونیاز

کسی کے درِ محبت کا آسرا ہوں میں

از خان حبیب الرحمان خان کابلی



تمہارے حسنِ تصور کا آئینہ ہوں میں! مجھی سے شکوہ ہے تم کو کہ بیوفا ہوں میں

مری وفا پہ تمھیں بدگمانیاں ہی سہی مگر تمھیں تو اسی ڈھب سے دیکھتا ہوں میں

خدا تجھے نہ دکھائے، ہے یہ دُعا میری اذیتیں، جو ترے غم میں سہہ رہا ہوں میں

خیالِ ترکِ محبت، ارے خدا کی پناہ! بنا بنا کے گھروندے گرا رہا ہوں میں

مٹی مٹی سی نمودِ بہارِ ہستی ہوں بجھا بجھا سا چراغِ رہِ نفا ہوں میں

خوشی ہی اس کی کہ شاید اسی میں تو خوش ہے کچھ اس کا غم نہیں برباد ہو گیا ہوں میں

ہے ثبت صفحۂ ہستی پہ میرا نقش دوام کسی کے درِ محبت کا آسرا ہوں میں

ہو یورشِ غم و آلام کاش میرے لئے کہ یورشِ غم و آلام پر فدا ہوں میں

کبھی وہ خان پلائیں شرابِ وصلِ دوام

اسی خیال سے مر مر کے جی رہا ہوں میں

R.L.No 1691,



SOHRAB MODI
as Porus in
Minerva's "Sikandar"